لا رطب و لا یابس الا فی کتٰب مبین

ملفوظات طیبات حضرت مولانا سید غوث علی شاہ قلندر قادری پانی پتی قدس سرہٗ

الموسوم بہ

شجرۂ معرفت سنہ ۱۲۵۸ھ

ترتیب مولوی شاہ گل حسن رح خادم حضرت مولانا موصوف

تذکرۂ غوثیہ



شیخ غلام علی اینڈ سنز، تاجرانِ کتب،

کشمیری بازار لاہور ★ بندر روڈ کراچی

معرفہ ۱۱ مارچ ۱۹۴۸ مطابق یکم ربیع الثانی ۱۳۶۷ھ

بزرگی شیخ علیم اللہ صاحب رحمت اللہ علیہ سجادہ نشگاہ

حضرت مولانا سید غوث علی شاہ صاحب اپنی حیات ہی

میں اس خادم کو اپنا جانشین مقرر فرما گئے ہیں

لیکن میں بوجہ اپنی علالت طویل و لاعلاج کے خدمت مفوضہ

انجام دہی کے ناقابل ہو چکا ہوں لہذا میں اپنی بوجہ

زنانہ اور اپنی بجائے محمد سلیم صاحب سیفی ساکن محلہ مشائخان

شہر میرٹھ کو اپنا جانشین مقرر کر کے سبکدوش

ہوتا ہوں۔ اللہ ان کے حق میں جملہ برادران

طریقت سے دعا کا طالب ہوں۔ بشیر الدین پسر

مولوی سید نصیر الدین صاحب مرحوم ساکن محلہ نیاریان شہر دہلی

گواہ شد

محمد عبداللہ ... بقلم خود

گواہ شد

عبدالسلام

... بقلم خود

از بشیر منزل محلہ خانقاہان شہر

مقدّمہ

تذکرۂ غوثیہ

(از محمد اسلم سیفی)

"تذکرۂ غوثیہ" نہایت مشہور و مقبول کتاب ہے۔ اس کی دلچسپی اور پسندیدگی کا یہ ثبوت ہے کہ اب تک چھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ پہلی مرتبہ یہ کتاب ۹۔ جون ۱۸۸۷ء کو مطبع ہاشمی میرٹھ میں طبع ہوئی۔ زیادہ تر جلدیں پیر بھائیوں کی خدمت میں "تحفۃً" پیش کی گئیں۔ طباعت کے تمام تر مصارف کا بار جناب منشی نجم الدین صاحبؒ المخاطب بہ "سفید قلندر" نے برداشت کیا۔ یہ بزرگ بھی حضرت قبلہ کے مریدانِ خاص میں سے تھے۔

تذکرۂ غوثیہ کی ترتیب و تیاری، لطفِ زبان اور ندرتِ بیان پر اگر غور کیا جائے تو اس کو حضرت مولانا غوث علی شاہ صاحبؒ کے تصرّفِ روحانی پر محمول کرنا بے جا نہ ہوگا۔ اس خیال کی بناء محض عقیدت پر ہے۔

بعد وصال جناب و قبلہ اس تذکرہ کی ترتیب و تدوین کا خیال پہلے پہل مولانا شاہ گل حسنؒ کے دل میں پیدا ہوا۔ ان ہی کو یہ شرف بھی حاصل تھا کہ جناب و قبلہ کے قیام پانی پت میں، جو اٹھارہ سال اور کچھ روز پر مشتمل تھا، وہ تقریباً بارہ برس تک حاضر خدمت مبارک رہے۔ مولانائے موصوف جناب و قبلہ کے آخری قیام پانی پت کے شروع ہی میں طلب علم اور تلاشِ شیخ کی آرزو لیے ہوئے پانی پت آپہونچے تھے۔ آپ سرحدی علاقہ کے باشندے تھے۔ ان کے ورودِ پانی پت کی کیفیت آخر حصۂ کتاب میں صفحہ نمبر ۴۶۰ پر درج ہے۔ ظاہر ہے کہ جناب و قبلہ کے ذاتی حالات اور سلوک کے بارے میں "ارشادات" ان سے زیادہ کس کو معلوم ہو سکتے تھے۔ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ مولانا گل حسنؒ نے کوئی روزنامچہ، جس میں ارشادات عالیہ کے بارے میں یادداشتیں منضبط کر لی گئی ہوں، تحریر نہیں فرمایا تھا۔ ان کے علاوہ

دوسرے مریدوں اور جناب وقبلہ کی صحبت میں حاضر ہونے والوں نے بھی وقتاً فوقتاً ارشادات سُنے تھے۔ مگر کسی نے آنجناب کی حیات میں ان کو قلم بند نہ کیا۔ البتہ جناب وقبلہ کے وصال کے بعد جب اکثر مرید میرٹھ آنے لگے تو مولانا گُل حسنؒ کی تحریک پر وہ ارشادات جمع کیے گئے۔ اور جس کسی پیر بھائی نے جو کچھ سنا تھا اس کو معرضِ تحریر میں لایا گیا۔ پھر مریدانِ خاص کی کونسل میں یہ تبصرہ ہوا کہ ان میں سے کون سے ارشادات شاملِ کتاب کیے جائیں۔ جب یہ کام انجام پا چکا تو پیر بھائیوں نے مولانا محمد اسمٰعیلؒ کو اس خدمت کے واسطے انتخاب کیا کہ وہ انھیں ادبی جامہ پہنا کر دلچسپ پیرایہ میں تحریر فرمائیں۔ زہے قسمت کہ یہ اہم خدمت ان کے سپرد ہوئی اور شیخ کے فیضِ صحبت نے اس دشوار منزل کو آسان کر دیا۔

"تذکرۂ غوثیہ" کا جو قلمی نسخہ مولانا محمد اسمٰعیلؒ کے کتب خانے سے دستیاب ہوا ہے اس کا بیشتر حصّہ خود مولانا اسمٰعیلؒ کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔ اور وہ عبارت بجنسہٖ مطبوعہ تذکرہ میں موجود ہے۔ اس انکشاف کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس سلسلہ میں جو ادبی خدمت مولانا اسمٰعیلؒ نے انجام دی وہ اہلِ فن سے پوشیدہ نہ رہے۔ ورنہ اس کتاب کے معرضِ ظہور میں لانے کا سہرا تو درحقیقت قبلہ مولانا گُل حسنؒ کے سر پر ہی خوب سجتا ہے۔ یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ خود مولانا گل حسنؒ نے اس امر کا اظہار فرمایا ہے کہ وہ نہ اس ملک کے باشندے تھے اور نہ یہاں کی زبان اور اس کے محاوروں سے واقف۔ پھر یہ دل نشین اندازِ بیان اور لطفِ زبان آیا تو کہاں سے۔ بعض اہلِ قلم فطرتاً اس کے جویا ہوا کرتے ہیں اس لیے اس طرف اشارہ ضروری سمجھا گیا۔

یہ مسئلۂ زبان مزید وضاحت کا تشنہ ہے یعنی مولانا اسمٰعیلؒ نے اُس وقت تک کوئی بلند پایہ کتاب اُردو زبان میں نہیں لکھی تھی۔ البتہ فارسی کی چند کتابیں اور اُردو میں ایک کتاب الموسوم بہ "طلسمِ اخلاق"، یا تصوّف پر اُردو کی چند رباعیاں اور اپنے مخصوص انداز کی جدید اُردو نظمیں تصنیف کر چکے تھے۔ مولانا کو اپنے شیخ سے جو روحانی تعلق اور جذبۂ عقیدت تھا اُس نے فطری طور پر انھیں اس تذکرہ کی تحریر پر ہمہ تن مشغول کر دیا۔ یہ بھی واضح رہے کہ مولانا اسمٰعیلؒ زبانِ انگریزی میں دستگاہ نہیں رکھتے تھے اس لیے "بیاگرافی" لکھنے

کے مخصوص انداز سے بھی ناواقف تھے۔

"تذکرۂ غوثیہ" کا طرزِ نگارش صاف بتا رہا ہے کہ یہ کتاب صحیح معنوں میں ایک "آٹو بیاگرافی" ہے۔ زبان کی سادگی اور حکایات کی دل فریبی نے ایک ایسا ادبی گلدستہ مرتب کیا ہے کہ پڑھنے والا دوگونہ لطف اندوز ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے چھ ایڈیشن طبع ہوئے پھر بھی اہل ذوق کا تقاضا باقی ہے۔

ہمارے پاس پانچ ایڈیشن موجود ہیں۔ پہلا میرٹھ کا مطبوعہ اور دوسرا، تیسرا، چوتھا اور پانچواں دہلی کا۔ پانچواں ایڈیشن قاضی محتشم الدین احمد کے اہتمام اور مولانا گل حسنؒ کی اجازت سے ان کے وصال سے ایک سال پہلے ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا۔ اس ایڈیشن کے صفحہ ۱۰۶ پر جو تین جدید ارشادات اضافہ کیے گئے ہیں ان کی زبان شہادت دیتی ہے کہ ادب کی رنگینی اور چاشنی سے محروم ہیں۔ اسی طرح آخر کتاب میں اضافہ شدہ دستور العمل اور درگاہ شریف کی آراضی کے متعلق پنجاب ہائیکورٹ کے چند مقدمات کے فیصلے بھی درج ہیں۔ ان تحریروں کا تقابل اصل کتاب کے لطفِ زبان سے کچھ مناسبت نہیں رکھتا۔

کتاب تیار ہو جانے پر مولانا شاہ گل حسنؒ کا نام سرورق پر شائع ہونا بجا اور درست تھا کہ وہ ہی ارشادات کے جمع کرنے والے اور ان ہی کی ذاتِ سامی اس تحریک کا موجب تھی۔ پیر بھائیوں کے نزدیک وہ ہی شیخ کے جانشین بھی تھے۔ جہاں تک مولانا اسمٰعیلؒ کی اس قدر و منزلت کا تعلق ہے جس کے وہ بہ حیثیت پیر بھائی مستحق تھے اس کا اظہار خود مولانا گل حسنؒ نے بزبانِ شیخ تذکرۂ غوثیہ کے صفحہ ۲۷۲ پر کیا ہے۔

مولانا گل حسنؒ نے اپنی حیات کے آخر حصہ میں ایک اور کتاب "تعلیم غوثیہ" کے نام سے شائع کرائی تھی۔ اس کتاب کے ابتدائی تین جزو اور تین نظمیں بھی مولانا گل حسنؒ کی فرمائش سے مولانا اسمٰعیلؒ نے لکھی تھیں۔ ان ادبی خدمات کے اصل محرکات مولانا اسمٰعیلؒ کا اپنے شیخ سے روحانی تعلق، اپنے پیر بھائی مولانا شاہ گل حسنؒ سے محبت، اور حضورِ شیخ میں نذرِ عقیدت پیش کرنا تھا۔

چھٹا ایڈیشن سید محمد علی صاحب، چوتھے سجادہ نشیں، کے زمانہ میں طبع ہوا تھا۔

ان کا زمانۂ سجادگی ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۶ء تک رہا۔ اس ایڈیشن میں جناب وقبلہ کی خیالی تصویر دہلی کے ایک مصور سے کچھوا کر فوٹو کی کاپیاں شامل کتاب کی گئیں تھیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی نئی بات اس طباعت میں نہیں تھی۔

اہل ذوق کے اصرار پر اب یہ ساتواں ایڈیشن پیش کیا جاتا ہے۔ چونکہ "تذکرۂ غوثیہ" کا حق اشاعت مولانا شاہ گل حسنؒ نے درگاہ عالیہ غوثیہ کے نام ہبہ فرما دیا تھا اس لیے درگاہِ غوثیہ ہی کی طرف سے یہ مستند ایڈیشن شائع کیا جاتا ہے۔ سید بشیر الدین صاحبؒ، جو ۸۔ جولائی ۱۹۴۷ء کو سجادہ نشین ہوے تھے، ان کی بڑی تمنّا تھی کہ درگاہ غوثیہ کی جانب سے جلد تر "تذکرۂ غوثیہ"، طبع کرادیا جائے۔ اس خواہش کی تکمیل میں ایک طویل عرصہ گذر گیا۔ اس کا افسوس ہے۔

شیخ کا تو منشا، یہ نہ تھا کہ جو واقعات اُنھیں پیش آئے اُنھیں شائع کیا جائے۔ مگر فطرت انسانی کا ضرور یہ تقاضا تھا کہ شیخ سے جدا ہونے کے بعد مُرید کسی نہ کسی طرح اپنے قلب کو حالتِ فراق میں تسکین پہونچائے شیخ کی باتوں کو یاد کرنا، اُس کی تعریف میں قصیدے اور نظمیں لکھنا، مزار شریف، مہمان خانے، مطبخ اور کنوئیں تعمیر کرنے، مسجد بنوانا، شیخ کا سالانہ عرس منعقد کرنا۔ مریدوں کا اجتماع، مہمانوں کی آمد، عوام کی کثرت، یہ باتیں ضرور دل بہلاتی ہیں۔ لیکن ان تمام دلچسپیوں سے بہتر، پائدار اور معنی خیز تحفہ یہ کتاب ہے۔

"تذکرۂ غوثیہ"، چھ باب اور ایک "خاتمہ" پر مشتمل ہے۔ باب اول سے پہلے چار مضمون ہیں۔ غزل در مدحتِ شیخ، حمد، نعت اور التماسِ مؤلف۔ ندرتِ خیال اور لطفِ زبان ان مضامین کے مطالعہ سے ٹپکتا ہے۔

بابِ اوّل (صفحات ۸ لغایۃ ۱۶)۔ اس میں خاندانی حالات کا تذکرہ ہے۔

بابِ دوم (صفحات ۷، الغایۃ ۲۶)۔ اس میں تعلیم و تربیت و نیز بیعت کا حال بیان کیا گیا ہے۔ خاندان اور بیعت کے منظوم شجرے بھی درج ہیں۔

بابِ سوم (صفحات ۲۷ لغایۃ ۱۴۱)۔ سیاحت کے بارے میں ایک سو پانچ (۱۰۵) ارشادات ہیں۔

باب چہارم (صفحات ۴۲ لغایۃ ۱۶۱)۔ اس میں توحید کا بیان ہے ۔ گویا ایک بحرِ ذخّار کو کوزے میں بند کیا گیا ہے ۔ کچھ شک نہیں کہ سالک کے لیے اس کا مطالعہ بے حد مفید ثابت ہوگا ۔

باب پنجم ۔ (صفحات ۱۶۲ لغایۃ ۴۲۳)۔ اس میں تین سو اکتیس (۳۳۱) ارشادات ہیں ۔

باب ششم ۔ (صفحات ۴۲۴ لغایۃ ۴۸۰)۔ متفرق حالات و منظومات پر مشتمل ہے ۔

دوسرے ایڈیشن سے اس نئی اشاعت کی کتابت کی گئی ہے ۔

جویائے حق کے لیے ان ارشاداتِ عالیہ میں بہت سی راہیں کھلتی ہوئی نظر آئیں گی ۔ سالک کی فکر اسی کے اندر ہے ۔ عاقل کے لیے صرف اشارے کافی ہوتے ہیں ۔

اس نئی اشاعت ، یعنی ساتویں ایڈیشن ، کی ترتیب میں چند نئی باتیں اختیار کی گئیں ہیں :-

(۱) جو مضمون متنِ ارشاد میں بطور نوٹ درج تھا اس کو پائینِ صفحہ میں لکھ دیا ہے ۔

(۲) ہر ارشاد جداگانہ پیراگراف میں لکھا گیا ہے ۔

(۳) ہر ارشاد پر سلسلہ وار نمبر درج کیا گیا ہے ۔

(۴) فہرستِ مضامین (جو کافی طویل ہو گئی ہے) میں ہر ارشاد کا نمبر اور اس کے مضمون کا خلاصہ درج کیا گیا ہے ۔ یہ اہتمام کسی پہلے ایڈیشن میں نہیں پایا جاتا ۔

(۵) اگر نفسِ عبارت میں کہیں کوئی مصرعہ آیا ہے تو اس کو بہ نظرِ امتیاز جداگانہ سطر میں تحریر کیا گیا ہے ۔

(۶) اشعار عموماً دو مصرعی لکھے ہیں تاکہ پڑھنے میں آسانی ہو ۔ صرف مثنوی "دورِ آخر" میں سہ مصرعی اشعار درج ہیں ۔

(۷) اس اشاعت میں ایک "مقدمہ" کا اضافہ کیا گیا ہے ۔

(۸) صفحۂ اول پر مولانا محمد اسمٰعیل رح کی تصنیف کردہ ایک غزل شیخ کی تعریف میں درج کی گئی ہے ۔

(۹) اس زمانہ میں اخراجات و لوازماتِ طباعت میں شدید اضافہ ہوگیا ہے
اس لیے "دستور العمل" اور مقدماتِ عدالت کے فیصلوں کا طبع کرنا
غیر ضروری سمجھ کر حذف کر دیا گیا ہے۔

(۱۰) یہ ساتواں مستند ایڈیشن منجانب درگاہِ عالیہ غوثیہ شائع کیا جارہا ہے۔
اس سے اگر قدرے منفعت ہوئی تو کارِ خیر میں صرف کی جائے گی۔
اہلِ ذوق کی خاطر قیمت کم مقرر کی گئی ہے۔

(۱۱) اس اڈیشن میں ختم کتاب پر "انڈیکس" کا اضافہ کیا گیا ہے جو
سولہ صفحات پر مشتمل ہے۔

مثنوی نذرِ عقیدت

(از مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی)

لب پہ آیا نامِ شہِ غوثِ علیؒ — بے تکلف کِھل گئی دل کی کلی
پھر صبا سبزے کو لہرانے لگی — باغِ معنی میں بہار آنے لگی
پھر لگا دی ابرِ رحمت نے جھڑی — پھر وہی بادِ بہاری چل پڑی
پھر وہی محمل وہی ہے کارواں — ناقہ سرمست وحدی خواں ساروان
پھر اُسی منزل میں جا کھولی کمر — دشت چٹیل اور ویرانہ نگر
پھر کُھلا در حجرۂ انوار کا — قفل ٹوٹا قبۂ اسرار کا
پھر وہی صحبت وہی لیل و نہار — پھر لگے ہونے دُرِ معنی نثار
پھر خزانہ غیب کا لٹنے لگا — رشک سے حاتم کا دَم گھٹنے لگا
پھر لگی سانچہ میں ڈھلنے بات بات — عارفانہ رمز و مردانہ نکات
پھر الاپے نئے اسرارِ قدم — ذرہ ذرہ بن گیا منصور دَم
پھر وہی ساغر وہی بزمِ سرور — پھر لگا بہنے وہی دریائے نور
پھر وہی ساقی وہی دیرینہ خُم — کُفر و ایماں کا ہوا سر رشتہ گُم
ہوگئے رل مل کے سب پھر ایک شے — دورِ ساغر دستِ ساقی مست مے
مدحِ حاضر میں بھی لکھا اب چند بیت — تو ہی لکھ خود مَا رَمَیتَ اِذ رَمَیتَ
اے تجلیِ اخیرِ ذوالجلال — تھا کمالِ بندگی تیرا کمال
ہاں محمدؐ وار تو نامِ خدا — کر گیا ہے بندگی کا حق ادا
ترکِ دنیا ترکِ عقبےٰ ترکِ جاں — قول و فعل و حال سے تیرے عیاں
خوب توڑا تو نے ہر بندِ کہن — تھا مگر تو حیدرِ خیبر شکن
ہر توسل سے تجھے اعراض تھا — شیرِ خوارِ مبدءِ فیاض تھا
دادِ حق تھی تیری قوت اور قوت — تھا خیالِ غیر بیتِ عنکبوت
فقرِ فخری کی صدا بھائی تجھے — حق نے بخشی ارثِ آبائی تجھے
مدتوں کے بعد ایک آدم بنا — ہفت خوانِ فقر کا رستم بنا

شاذ و نادر کوئی شہ بازِ جلال — کھولتا ہے اس ہوا میں پر و بال
شیخ و صوفی رند و زاہد پارسا — سیکڑوں ہیں پر کہاں مردِ خدا
غوثِ اعظمؒ یا جنیدؒ و بایزیدؒ — یا نظام الدینؒ یا بابا فریدؒ
یا معین الدینؒ و عطارؒ و شہابؒ — اپنے اپنے وقت کے تھے آفتاب
مجمع البحرین تجھ سا بعد ازاں — گردشِ دوراں نے دیکھا تھا کہاں
اے محیطِ اوّلین و آخرین — آفریں! صد آفریں!! صد آفریں!!!
جس کسی پر تو نے پھونکا کچھ فسوں — اک نہ اک دن اس کو ابھرے گا جنوں
رسم و عادت کا گریباں پھاڑ کر — دینِ تقلیدی سے دامن جھاڑ کر
کفر پر یاروں کے ایماں لائے گا — وار مَردوں کا نہ خالی جائے گا
فقر فقر آیا تو کیا باقی رہا — بادہ کش باقی نہ خود ساقی رہا
اے فنائے فقر تجھ کو مرحبا — عین عریانی ہے بس تیری عبا
مرحبا اے خازنِ اسرارِ غیب — کیا چھپایا ہے ہنر کو مثلِ عیب
ہاں! خزانے کا چھپانا فرض تھا — گرچہ بیرونِ سما و ارض تھا
تو نہ تھا کچھ عینِ عین اللہ تھا — ظاہراً بندہ نہانی شاہ تھا
بندگی کے بھیس میں اے جامہ زیب — دے گیا واللہ تو سب کو فریب
تو بھری محفل میں سب کچھ کہہ گیا — گوشِ جاں میں کہہ جو باقی رہ گیا
مَنْ رَّاٰنِیْ کے معانی صاف صاف — شرح فرما تو ہی اے عنقائے قاف
مَنْ رَّاٰنِیْ منہ زبانی جس کی ہے — ہے اسی کا آئینہ ہر ایک شئے
تیری مجلس مجلسِ اللہ تھی — دونوں عالم کی جہاں گم راہ تھی
راہ گم ہوتا ہے راہِ مستقیم — حاشا لِلّٰہِ ثُمَّ بِاللّٰہِ الْعَظِیْم

آپ کو گم کر کہ تو ہی راہ ہے
راہ کو طے کر حریمِ شاہ ہے

نوٹ:- اس مثنوی میں کُل (۵۷) اشعار ہیں۔ جگہ کی قلّت کے باعث (۳۲) اشعار حذف کردیے گئے ہیں۔ یہ پوری
"تعلیم غوثیہ" اور "کلّیات اسمٰعیل" میں طبع ہو چکی ہے۔

له بائیں صفحہ پر جو نوٹ ہے اس ارشاد کا نمبر ۱۱۳ ہوگا۔ ارشاد ۱۱۳ صفحہ ۲۶۹ کے بعد جو ارشاد تحریر ہے اس کا نمبر ۱۱۵ ڈالا گیا ہے اس لیے قصیدہ شیخ فریدالدین عطارؒ صفحہ ۲۶۹ پر ارشاد ۱۱۴ ہونا چاہیے۔

لہ سلسلہ ۳۴۱ ۔ ارشاد "ماسوا اللہ سب ہیچ ہے" اس کا ارشاد نمبر ۱۹۴/۱ ہوگا کیونکہ اس سے قبل کے ارشاد کا ۱۹۴ ہے ۔

باب ششم

انڈکس تذکرۂ غوثیہ

(طبع ہفتم)

ن

غزل در مدحت شیخ

(از مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھیؒ)

ساقیٔ خم خانہ تھا جو صبح و شام — روزِ آدینہ تھا مسجد میں امام

جس نے چشمِ مستِ ساقی دیکھ لی — تا قیامت اُس پہ ہشیاری حرام

اُس لبِ جاں بخش کی باتیں تھیں، یا — معجزاتِ عیسٰیؑ گردوں مقام

ہوگیا اُس کو قیامت کا یقیں — جس نے دیکھا سرو قامت کا خرام

چشمۂ آبِ بقا کی لہر تھی — وہ عبارت، وہ اشارت لاکلام

مرحبا عطرِ گریباں کی شمیم — ہے معطّر جس سے روحانی مشام

تھی زباں، یا قاطعِ اوہام، یا — ذوالفقارِ حیدری تھی بے نیام

جس نے دیکھا نرگسِ شہلا کا خواب — اُس نے پایا رمزِ قلبی لاینام

قَالَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ — ہوگئیں سب خوبیاں اس پر تمام

جس نے چاٹی عتبۂ علیا کی خاک — تلخیٔ دوراں سے ہو کیوں تلخ کام

اے صبا صحرائے جاں میں کر تلاش — کس طرف ہیں وہ سرادق وہ خیام

خلوتِ لیلیٰ میں تو گذرے اگر — تو یہ کہہ دینا ہمارا بھی پیام

تشنگانِ شوق ہیں گم کردہ راہ — تو بھی چل بہرِ خدا دو چار گام

بحر میں برپا ہوا جوش و خروش — حبذا رشحاتِ کاساتِ الکرام

سونپ دی تھی دستِ قدرت نے تجھے — ناقۂ لیلائے معنی کی زمام

فہرست مضامین

تذکرۂ غوثیہ (طبع ہفتم)

[1] سلسلہ ۲۰۶ پر جس ارشاد کا حوالہ ہے اس کا نمبر صفحہ ۲۲۶ پر کتابت کی غلطی سے بجائے ۵۹ کے ۶۰ لکھا گیا ہے جس کے باعث آگے تمام نمبران ارشاد غلط ہوگئے

لا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین ۰

حالات بابرکات و ملفوظات طیبات حضرت مولانا سید غوث علی شاہ قلندر قادری

پانی پتی قدس سرہٗ الموسوم بہ شجرۂ معرفت سنہ ۱۲۹۰ھ

وما ارسلنا من قبلک الا رجالا نوحی الیہم فاسئلوا

تذکرہ غوثیہ

اہل الذکر ان کنتم لا تعلمون ۰

تالیف شریف مولوی شاہ گل حسن خادم حضرت مولانا موصوف

کہا دیکھ کر اس کو اہل سخن نے
لکھا شجرۂ معرفت گل حسن نے

بہ ترمیم و ترتیب و

باجازت مولوی محمد اسلم سیفی منجانب درگاہ غوثیہ پانی پت

سنہ ۱۹۵۳ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حمد

یَا مَنۡ بِکَ حَاجَتِیۡ وَرُوۡحِیۡ بِیَدَیۡکَ ۔ مِنۡ غَیۡرِکَ اَعۡرَضۡتُ وَاَقۡبَلۡتُ اِلَیۡکَ
مَالِیۡ عَمَلِیۡ صَالِحٌ اِسۡتَظۡہَرۡتُ بِہٖ ۔ قَدۡ جِئۡتُکَ رَاجِیًا تَوَکَّلۡتُ عَلَیۡکَ

حمد وثنا، سہو وخطا، شکر وسپاس، وہم ووسواس، کیسی حمد اور کس کا شکر، حامد کون محمود کیا، شاکر کدھر مشکور کہاں۔ قطرہ ہے تو دریا موہوم، دریا ہے تو قطرہ معدوم۔ جب تک ذرہ ذرہ ہے۔ آفتاب نہاں ہے۔ جب وجودِ آفتاب نمودار ہوا تو ذرہ کہاں ہے۔ قطرہ امر اعتباری ہے۔ ہر قطرہ میں دریا جاری ہے آفتاب سے ذرہ کا وجود۔ ذرہ سے آفتاب کی نمود۔ قطرہ سے دریا کا ظہور۔ قطرے قطرے میں دریا معمور۔ لیکن نہ قطرہ نہ دریا، نہ ذرہ نہ آفتاب، وہ خود نیست یہ خود نایاب۔ نہ اس کا پتہ۔ نہ اس کا نشان۔ نہ اس کا ٹھکانا نہ اُس کا مکان۔ تحریر وتقریر سے پاک خارج از فہم وادراک۔ جو سمجھے سو غلط، جو لکھا سو خبط۔ جو کہا سو جنون۔ تعالیٰ شانہٗ عما یصفون ؎

زبس کہ حسن فزود وغمش گداخت مرا ۔ نہ من شناختم اورا نہ او شناخت مرا

نہیں نہیں صواب وخطا۔ عتاب وعطا۔ فراق ووصال۔ وہم وخیال۔ ذکر ونسیان۔ طاعت وعصیان۔ سب منظور، سب مقبول۔ سب معتبر، سب معقول۔ جب واحد و اثنین نہیں تو سوائے عین العین نہیں۔ کُلُّ شَیۡءٍ ہَالِکٌ اِلَّا وَجۡہَہٗ ؎

انت پھوٹ سب ماٹی ہوئے۔ لینا ایک نہ دینا دوئے

کہاں کا وہم، کیسا قیاس، اپنی حمد، اپنا سپاس اپنی داستان، اپنا بیان، اپنی مقال، اپنا حال، خود شاکر و خود مشکور، خود ذاکر و خود مذکور، قطرے میں دریا غرق۔ دریا میں قطرہ فنا، ذرے پر آفتاب محیط، آفتاب پر ذرہ حاوی دانے میں شجر کے آثار۔ شجر میں دانہ آشکار، وجود میں شہود، شہود میں وجود، ہوالاول ہوالآخر ہوالظاہر ہوالباطن۔ شعر

چوں آئینہ بدست من ومن در آئینہ	او در دل من است و دلِ مَن بدستِ اوست

نہ ہجر نہ وصال، نہ اتصال نہ انفصال، نہ یکی نہ دوئی نہ مائی نہ توئی، نہ اقرار سے سود نہ انکار سے زیاں، نہ کسی سے نیاز، نہ کسی سے راز۔ نہ کچھ برا نہ کچھ بھلا، نہ اس کی تمنا نہ اس کی پروا، یہ بھی درست وہ بھی بجا، اطلاق سے مطلق، قید سے آزاد، نہ یاد سے فراموش نہ فراموشی میں یاد، نہ کنارہ نہ حد، نہ شمار نہ عدد۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝

اسم و مسمیٰ میں تمیز نہیں، لفظ و معنی دو چیز نہیں، ذات سمجھو یا صفات، وہی ایک بات، خیال شخص ہے عمر و زید کہاں، اگر ہے تو وہی وہ ہے۔ اگر نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ رباعی

لا آدم فی الکون ولا ابلیس	لا ملک سلیمان ولا بلقیس
فالکل عبارۃ وانت المعنی	یا من ہو للقلوب مقناطیس

آفتاب کی دید بدونِ آفتاب ناپدید۔ نورِ آفتاب نظر میں سمایا تو آفتاب نظر آیا۔ خود نقاب و خود حجاب، خود ضیا و خود آفتاب، نور میں آفتاب مستور، آفتاب ہمہ تن نور، خود ناظر خود منظور، خود شاہد و خود مشہود، خود گویا و خود گفتگو۔

وَحْدَهٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا هُوَ ۝

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے	حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

(غالب)

حمد ہے تو غیر کا نشان نہیں۔ شکر ہے تو کسی کا احسان نہیں۔ خود سمیع و خود بصیر، خود کلام و خود کلیم، جو چاہا سو کیا۔ کس نے کہا اور کس نے کیا۔

وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی ۔ رباعی

از حق جز حق دگر چہ روید بابا — از حق جز حق دگر کہ گوید بابا
در شدتِ ایں ظہورِ معجز صفت — حق را جز حق دگر کہ جوید بابا

حمد عینِ محمود ہے اور شکر عینِ مشکور۔ دریائے قِدَم کی موج، حدوث کا اوج، وجود کی نمود، عدم کا شہود، وحدت میں کثرت کی ترکتاز، حقیقت عینِ مجاز، مدح و ذم ہم قدم۔ رنگ و بے رنگی بہم صورت و معنی ہم قافلہ نہ کسی سے شکایت نہ کسی کا گلہ۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا۔

ذات سے صفات، صفات سے افعال۔ کمال سے نقصان، نقصان سے کمال، آشکار ہے، مسمّٰی سے اسم، روح سے جسم، بلندی سے پستی، نیستی سے ہستی نمودار ہے ؎

برہم بولی کایا کی اولی — کایا بن برہم کیا بولی

بیت

ذاتِ حق با ما کند گفت و شنید — ذاتِ او را بے صفاتش کس ندید

وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ؕ

نعت

حُسن کو پردہ میں قرار نہیں۔ خوبی بدون اظہار نہیں، معشوق کو حجاب۔ عاشق کو تاب کہاں۔ جمال بے تجلّی اور طالب کو تسلّی محال ع

کہ حُسن از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخارا

حُسنِ ذات نے حلیۂ صفات میں، نگارِ بے رنگی نے لباسِ تعینات میں ظہور کیا۔ وہی روزِ ازل، وہی موج اوّل، وہی تجلّی، وہی نزول وہی مرتبۂ اولیٰ، وہی شانِ اُخریٰ، جو حال جو قال جو عبارت جو اشارت چاہو قرار دو۔ اعتبار، اظہار، تجلّی، تفصیل، تغیّر، تبدّل، تصوّر، تخیّل، تشخّص، تعیّن، حُدوث، خلق، کون و فساد سب کا ایجاد۔

اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ ؎

اے پردہ برگرفتہ ببازار آمدہ — خلقے دریں طلسم گرفتار آمدہ

یعنی غایتِ مقصود علم میں مُقدّم مگر ظہور میں مؤخر ہے۔ تخم ریزی سے پہلے ثمر مدِ نظر ہے۔ بعدہٗ ظہورِ شجر ہے۔ شاخ و برگ و پھل پھول یہ سب اُسی اجمال کی تفصیل ہے۔ انجامِ کار ثمر کا اظہار۔ ثمر میں تخم مُندرج۔ تخم کے اندر ثمر موجود۔ خفا میں ظہور۔ ظہور میں خفا، غیب میں شہادت۔ شہادت میں غیب۔ ظاہر میں باطن۔ باطن میں ظاہر، ہوالاول ہوالآخرہ

اے ختمِ رسل قربِ تو معلومم شد
دیر آمدہٗ ز راہِ دور آمدہٗ

صورت عابد، معنی معبود، ظاہر ساجد، باطن مسجود، شریعت احمد، حقیقت احد، خود وحی و خود الہام، خود صلوٰۃ و خود سلام، خود پیمبر و خود پیام، خود مرسل و خود مرسل الیہ ع

از من بمن سلام و ہم از من بمن پیام

آمدم بر سرِ مطلب، نہ ما و من نہ کلام و سخن نہ دید و شنید۔ نہ قریب و بعید نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ نہ شریعت نہ طریقت۔ نہ حق نہ حقیقت۔ وہی دائرہ وہی پرکار۔ وہی مرکز وہی مدار ہ

پھر پھر کے دائرے ہی میں رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردشِ پرکار پاؤں میں

چیست توحید آنکہ از غیرِ خدا
فرد آئی در خلا و در ملا

وہی علم وہی ارادہ، وہی ازل وہی ابد، وہی دور جاری و ساری، وہی آثار و اطوار طاری۔ وہی سُبو وہی پیالہ، وہی خُم وہی خمخانہ، دریا کا وہی جوش و خروش، موج و حباب کی وہی آب و تاب، اُسی شان بیچون و بیچگون، بے شبہ و بے نمون، نے پردۂ اسرار سے یہ تجلی نمودار کی کہ حضرت قبلہ و کعبہ شہنشاہِ والاجاہ، شاہبازِ بلند پرواز، شہسوارِ معارک تجرید، تاج دارِ کشورِ توحید، مردِ میدانِ تفرید، عارفِ بیباک، اکمل الکملا، واراالورا داصلِ بے حجاب، شاہدِ بے نقاب، دریائے بے کنار، بحرِ زخار، جہانِ عرفان، آفتابِ حقیقت، برزخِ کبریٰ، تارکِ ماسوا، جہاں سوز، بزم افروز خانماں برباد۔ فردُ الافراد۔ اعنی سید **غوث علی شاہ** قلندر قادری رحمۃ اللہ علیہ دسادہ آرائے ہدایت وارشاد ہوئے۔

راقمؔ:۔ خانہ بدوش جامِ ارادت سے مدہوش کبھی بادیہ گردی اور صحرا نوردی کی خاک اُڑاتا کبھی آستانۂ علیا پر جبیں سائی کی دولت پاتا۔

دیباچہ

اب بھی ہے دھیان میں سایہ تیری دیواروں کا

مدت ہائے دراز یہی سوز و ساز رہا ہر روز نعمتِ ہم کلامی، حاشیہ بوسی بساطِ گرامی، اجلاس عام کی حضوری، بزم اُنس کا اختصاص، زیارتِ صبح وشام، گویا شرب مُدام تھا۔ ذوقِ لقا ولطفِ وصال میں تحریر حالات کی پروا اور تدوین نکات کا دماغ کہاں تھا۔ اور نیز ابتدائے حال سے حضرت قبلۂ عالم کو کبھی تصنیف و تالیف منظور خاطر نہ ہوئی۔ عالمِ بے نشانی مدنظر رہا، پابندی و تقلید سے طبع آزاد ونفور تھی۔ جو اشعار و نکات یا رموز و اسرار کہ وقتاً فوقتاً زبان فیض ترجمان پر جوششِ دریائے غیب نے جاری کیے یا تعلیم وتلقینِ اصحاب کے اقتضا سے اظہار و بیان میں آئے۔ بعض ارادت مندوں نے تحریر و تالیف کی اجازت چاہی تو زنہار مرضیٔ مبارک کا میلان اس طرف نہ پایا۔ نقشِ اول و آخر کو کفِ دست سے مٹایا۔ البتہ آخر ایام میں اس خاکسار کو ازراہِ غایتِ عنایت صرف اتنی اجازت حاصل ہوئی کہ اشعار و مقالات، اشلوک و دوہے وچوپائی وغیرہ جو ارشادِ مبارک میں حسبِ موقع وارد ہوتے تھے یہ کمترین یادداشت کے لیے فوراً تحریر کر لیتا تھا۔ بجز اس کے کوئی حرف وحکایت یا نقل و روایت سوائے سماعت کے سپردِ قلم نہیں کی گئی۔ جب کہ اُس شہبازِ کنگرۂ تقدیس اور آفتابِ جہانِ تنزیہ نے حجاب ونقابِ ظہور چہرۂ ذاتِ بے نشاں سے اُٹھا لیا ؎

آن قدح بشکست وآں ساقی نماند

تو دلِ بے تاب گھبرایا۔ وصل وبے غمی کا زمانہ، نشاط و ہمدمی کا کارخانہ یاد آیا۔ جوشِ وحشت حد سے زیادہ ہوا۔ کوئی سبیل کوئی شغل کوئی کام اس کے علاوہ ذہن میں نہ آیا کہ جس کے قرب و وصال اور لقاء جمال میں اتنی عمر گذری بقیہ عمر بھی اُسی کی یادگاری بس ہے۔

قول من احب شیئاً اکثر ذکرہ ؎

طالب حق ذکر حق دارد مدام ذکر غیر حق حرام آمد حرام

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

جملہ احباب نے یہ امر پسند کیا اور اظہارِ اشتیاق سے دلِ شکستہ کی ہمت کو سہارا دیا۔ ناچار قلم اُٹھایا، وحشتِ جدائی اور غم تنہائی کو اس طرح دور کیا۔ اگرچہ اس ہنگامۂ قیامت کے بعد فراموشی کا غلبہ اور نسیان کا طغیان تھا لیکن جب فکر ادھر مصروف ہوئی تو عالم غیب سے وہ شاہدان سخن جو از یاد رفتہ ہو گئے تھے جلوہ گری کرنے لگے۔ ذرا سی بات یاد آئی اور تمام قصہ نے ہنگامۂ گذشتہ کا سماں باندھ دیا۔ وہی مُرشد وہی ارشاد۔ وہی کلیم وہی کلام، وہی بیان وہی زمان، وہی چشم و گوش وہی صدائے نوشانوش، بزم خیال میں موجود ہو گئے۔ اسی طرح جو کچھ یاد آ گیا قلم بند کیا۔ لیکن بہت کچھ مقالات ہیں کہ ان کا نقش دل و دماغ سے بالکل مٹ گیا اور بے شمار ایسے حالات و معاملات ہیں کہ روزمرّہ اطراف و جوانب اور ممالکِ دور دراز سے حلِ مشکلات و مہمّات کے لیے خلقِ خدا آتی تھی اور اپنی مراد و مقاصد اور مدّعا و مطالب جناب و قبلہ کی فیض نظر اور برکاتِ انفاس سے پاتی تھی اور عجیب و غریب تصرفات و کراماتِ روزانہ ظہور میں آتے۔ میں نے اُن تمام باتوں کو اس نظر سے قلم انداز کیا کہ کبھی جناب و قبلہ نے ان اُمور کو اپنی طرف منسوب کیا نہ قابلِ اظہار و مایۂ افتخار سمجھا بلکہ ہمیشہ دریائے توحید کی موّاجی میں کشف و کرامات اور ظہور کمالات کو ہیچ فرماتے رہے اور تَطْهِيْرُ الْقَلْبِ عَنْ مَا سِوَى اللهِ کو اصل مقصود سمجھا ؎

یہ جو کچھ ہونا جسے کہتے ہیں پستی ہے میاں فقر میں پستی یہی ہے اور پستی کچھ نہیں

اور اگر کسی ارشاد میں اس قسم کی کوئی بات نکلتی ہے تو وہ خوش طبعی کے طور پر مذکور ہوتی ہے ؎

راہ را ایں جا درِ ناکامی است کامِ مردِ نیک در بدنامی است

اس کے علاوہ طوالتِ کتاب کے لحاظ سے[1] بھی اس کے ترک کا خیال رہا۔

---

[1] بعض حکایات و مضامین مصلحتاً بوقت طبع کتاب خارج کر دیے گئے ہر سخن جائے و ہر نکتہ مکانے دارد۔ ناظرین معاف فرمائیں۔

اب التماس یہ ہے کہ یہ نیاز مند خاکسار خادم الفقرا گل حسن قادری نہ اُردو کا اہل
زبان نہ اس دیار کی پیدائش، آوارہ گرد بے وطن نہ کوئی ماویٰ نہ کہیں مسکن ؎

آں وطن مصر و عراق و شام نیست　　آں وطن شہریست کاں را نام نیست

عبارت والفاظِ دل پسند۔ یا شاعرانہ جوڑ بند کہاں سے لاتا۔ ان اوراق کے پڑھنے والے
مجھ کو معاف فرمائیں۔ الفاظ و عبارت سے قطع نظر کریں مضمون و مطالب کو اصل مقصد
سمجھیں۔ شعر

قال را بگذار و مردِ حال شو　　پیشِ مردِ کاملے پامال شو

یہ کتاب جس کا نام تذکرہ غوثیہ رکھا گیا چھ باب اور ایک خاتمہ پر تقسیم کیا گیا۔
وَمَا تَوۡفِیۡقِیۡ اِلَّا بِاللّٰہِ

بابِ اوّل

احوالِ دودمان شریف۔ آباو اجداد کا حال

جناب وقبلہ کا سلسلۂ نسبی سترہ واسطوں سے حضرت غوث الاعظم شیخ محی الدین سید عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہونچتا ہے۔ اور سترہویں پشت میں تیس واسطوں سے ذاتِ بابرکاتِ حضرتِ سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم پر منتہی ہوتا ہے تفصیل اس سلسلۂ گرامی کی ذکر بیعت میں درج ہوگی۔ یہاں صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اس دودمانِ ذیشان کے قدوم فیض لزوم سے خاکِ ہندوسندھ کو کن بزرگوں نے معزز و مشرف فرمایا اور یہ بحرِ عز کے گوہر شہوار سرزمینِ بہار[۱] میں کس طرح منتقل ہوئے۔ کتاب اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ "مخدوم شیخ محمد الحسنی الجیلانی روم سے خراسان میں اور خراسان سے ملتان میں پہونچے اور شہر اوچھ واقع ملکِ سندھ میں اقامت اختیار فرمائی" انتہیٰ کلامہ آپ کے چار صاحب زادے ہوئے اوّل سید عبد القادر ثانی۔ دوم سید عبد اللہ ربانی۔ سوم سید مبارک حقانی چہارم سید محمد نورانی۔ چوتھے صاحبزادے تو لاولد فوت ہوگئے اور تین

---

[۱] صوبہ بہار مشرق ہندوستان میں ہے ۱۲ سابق مضافات منگیر سے تھا اب متعلق پٹنہ ہے ۱۲۔

صاحبزادوں کے اولاد ہوئی۔ چنانچہ ہمارے حضرت قبلہ وکعبہ سید محمد غوث علی شاہ قلندر قادری رحمۃ اللہ علیہ سید مبارک حقانی کی اولاد میں ہیں پھر مخدوم صاحب کی اولاد میں سے بعض بزرگ تو پنجاب کو تشریف لے گئے اور بعض وہیں سکونت پذیر رہے۔ ساتویں پشت میں جناب وقبلہ کے جدِّ امجد حضرت سید ظہور الحسن صاحب نے ظہور فرمایا۔ سیر و سیاحتِ ہندوستان کے بعد صوبۂ بہار میں وارد ہوئے اور موضع استھاواں ضلع مونگیر کو وطن کے لیے پسند فرمایا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہمارے جدِّ بزرگوار سید ظہور الحسن صاحب عرف سید ظہور محمد صاحب نے علومِ ظاہری کی تحصیل و تکمیل کے بعد اپنے والدِ ماجد سید محمد علی عرف سید محمود صاحب سے علم باطن کی تعلیم پائی۔ جب اُن کے والد نے رحلت فرمائی تو سندھ سے عزمِ ہندوستان کیا اور امصار و دیار کی سیر فرماتے ہوئے مقام مونگیر مضافاتِ صوبۂ بہار میں قیام کیا اور موضع استھاواں میں کہ ضلع مذکور میں ساداتِ عُظّام کی بستی ہے ایک سید بزرگ کی دخترِ عالی گھر سے نکاح ہوگیا! اللہ تعالےٰ نے دو فرزندِ ارجمند عطا فرمائے۔ ایک سید احمد حسن عرف سید احمد علی صاحب دوسرے سید محمد حسن عرف سید محمد علی صاحب۔ المختصر سید ظہور الحسن صاحب تا زیست وہیں رہے اور ہزار ہا آدمی آپ کے شرفِ بعیت اور فیضانِ صحبت سے مشرف ہوئے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت جدِّ امجد رحمۃ اللہ علیہ کے چھوٹے بھائی نے جب سُنا کہ بڑے بھائی صاحب نے صوبۂ بہار میں سکونت اختیار کی ہے تو وہ بھی مع قبائل و عشائر ملکِ سندھ سے نہضت فرمائے ملک بہار ہوئے اور موضع استھاواں میں پہونچ کر برادرِ بزرگ کے شامل ہوگئے چونکہ ان کے اولادِ صلبی نہ تھی اس لیے ہمارے والدِ بزرگوار سید احمد علی صاحب کو اپنی فرزندی میں لے لیا۔ ان کی گذر اوقات کی عجیب صورت تھی۔ چار ٹکے لے کر حال کھیلا کرتے۔ کوئی ہنسی کرے یا بُرا کہے اس کی کچھ پروا نہ تھی۔ اکثر بیاہ شادی کی محفلوں میں اِن کے حال کا تماشا بھی مروّج و معمول ہوگیا تھا۔ حضرت سید ظہور الحسن صاحب کو یہ امر ناپسند ہوا۔ بارہا سمجھاتے کہ بھائی اس نازیبا حرکت

سے باز آؤ کیوں بزرگوں کو بدنام کرتے ہو۔ وہ جواب دیتے کہ مجھ کو حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کا یہی حکم ہے۔ یہ جواب سُن کر وہ خاموش ہو جاتے کچھ مدت اسی طور سے گذری۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک روز کسی امیر کے لڑکے کی شادی تھی حضرت کو چار ٹکے دے کر بلایا۔ حسبِ عادت مجلس قوالی میں حال آیا۔ تماشائی تمسخر سے پیش آئے۔ اتفاقاً نوشاہ نے بھی دستِ گستاخی دراز کیا اور شکم مبارک میں انگلی ماری۔ وہ اور لوگوں سے تو یوں خطاب کرتے تھے "ابے کیوں چھیڑتا ہے کیا کرتا ہے" لیکن نوشہ کو کہا "ابے کیوں لونڈیوں کے سے کام کرتا ہے"۔ یہ کہنا تھا کہ تمام آثار عورتوں کے نمودار ہو گئے ؎

سمجھے آتش نہ کوئی آدمِ خاکی کو حقیر نہیں اسرار سے یہ خاک کا پتلا خالی

وَاِذَا اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنَ ۝۔

بالآخر لڑکا گھبرا کر اپنی ماں کے پاس گیا اور حقیقتِ حال سُنائی وہ بھی حیرت زدہ ہو گئی۔ فوراً اُس کے باپ کو خبر کی۔ امیر اور اُس کے صَلَاح کار و مشیر آپ کے بڑے بھائی صاحب کی خدمت میں آئے۔ کیفیتِ واقعہ عرض کی۔ وہ بھی بہت متعجب ہوئے کہ ہم تو ان کو ایسا نہیں جانتے تھے۔ ع

مارا ازیں گیاہِ ضعیف ایں گماں نہ بود

پھر مع اُن سب آدمیوں کے اُن کے پاس گئے۔ دیکھ کر بولے کہ بھائی صاحب خیر ہے یہ مجمع کیسا ہے؟۔ اُنھوں نے فرمایا کہ بھائی یہ سب تمھاری ہی تو خوبیاں ہیں۔ آج تم نے کیا کہہ دیا۔ بولے کہ حضرت اُس وقت نہ تو زبان میری ہوتی ہے نہ میرے اختیار میں ہوتی ہے۔ پوچھا کہ اب کیا علاج؟۔ جواب دیا خیر۔ "قہرِ درویش بر جانِ درویش"۔ یہ لوگ پھر مجلس منعقد کرائیں اور یاروں کے چار ٹکے دلوائیں اگر اُس وقت حال وارد ہو، اور لڑکا پھر اسی طرح چھیڑے تو دیکھیے زبان سے کیا نکلتا ہے۔ الحاصل پھر وہی سامان کیا گیا۔ حال وارد ہوا اور لڑکے نے چھیڑنا شروع کیا تو آپ کی زبانِ مبارک سے نکلا "ابے لونڈے کیا کرتا ہے"۔ یہ کہنا تھا کہ وہ حالتِ اصلی پر آ گیا۔ اُس دن سے آپ نے حال ترک فرما دیا۔ چونکہ کمال ظاہر ہو گیا تھا۔ سب لوگ تعظیم

کرنے لگے۔ یہ بات پسند نہ آئی۔ ناچار وطن چھوڑا اور موضع جھٹلی شہور جھبر نامیں جا رہے جو وہاں سے تین کوس پر تھا۔ جب تک جیے خشت سازی اور لڑائی سے اوقات بسر کرتے رہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک دن گاؤں کے آدمی مجتمع ہو کر آپ کی خدمت میں آئے اور بیان کیا کہ حضرت ہمارے گاؤں کو گنگا کاٹتی چلی آتی ہے۔ اگر چندے یہی حال رہا تو ہماری بستی دریا برد ہو جائے گی۔ ایسی ہمت فرمائیے کہ دریا ہٹ جائے۔ فرمایا تم سب لوگ پھاوڑے اور کدال لے کر آجاؤ۔ وہ آگئے تو آپ نے بھی کدال سنبھالا اور سب کو حکم دیا کہ کراڑے کو کاٹ کر دریا میں ڈالو کہ دریا ہٹ جائے۔ وہ نادان اس رمز کو کیا سمجھتے۔ بولے کہ صاحب اس میں تو اور ہمارا ہی نقصان ہے۔ فرمایا کہ بھائی ہم نے تو اسی طرح دریا ہٹتے سُنے ہیں۔ لوگوں نے کہا ارے چلو بھی یہ تو خبطی سا معلوم ہوتا ہے۔ وہ تو چل دیے اور آپ بذاتِ واحد دن بھر مٹی کاٹ کر دریا میں ڈالتے رہے۔ شام کو گھر میں تشریف لائے۔ صبح کو لوگوں نے جا کر دیکھا تو دریا تین کوس پرے ہٹ گیا تھا۔ سب متعجب ہوئے اور حاضرِ خدمت ہو کر اپنے قصور کی معافی چاہی اور پوچھا کہ حضرت یہ کیا بھید تھا فرمایا کہ میاں جدھر رب اُدھر سب بھلا اُس کی مرضی کے خلاف ہم کیا کر سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کو تو کراڑے کا گرانا منظور تھا۔ ہم بھی گرانے لگے۔ جب ہم نے خدا کی مرضی پر کام کیا۔ تو خدا نے ہمارا مُدعا پورا کر دیا۔[1]

زاولیا اہلِ دعا خود دیگر ند	گہ ہمی دوزند و گاہے می درند
قومِ دیگر می شناسم زاولیا	کہ دہان شاں بستہ باشد از دعا
از رضا کہ ہست رام آنِ کرام	جستن دفعِ قضا شاں شد حرام
در قضا ذوقے ہمی بینند خاص	کفرِ شاں آمد طلب کردن خلاص
ہرچہ آید پیشِ ایشاں خوش بود	آبِ حیواں گردد ار آتش بود
زہر در حلقومِ شاں شکر بود	سنگ اندر راہِ شاں گوہر بود
جملگی یکساں بود شاں نیک و بد	از چہ باشد ایں ز حُسنِ ظن بود

[1] مثنوی دفتر ۳۔

کفر باشد نزد شاں کردن دُعا　　　کاے الٰہ از ما بگرداں ایں قضا

القصہ باقی عمر وہیں بسر کی اور بعدِ وفات ایک عالی شان گنبد مزار پر بنایا گیا جواب تک زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب چھوٹے دادا صاحب نے رحلت فرمائی تو ہمارے والدِ ماجد سید احمد علی صاحب اپنی تائی صاحبہ کی خدمت میں ریاض و محنت سے اوقات بسر کرتے رہے۔ جب تائی صاحبہ نے بھی وفات پائی تو اپنے والدِ ماجد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اگرچہ فیضِ بطون تایا صاحب سے بھی حاصل کیا تھا مگر بیعت نہ تھی۔ کیونکہ اس خاندان میں اول والدِ ماجد سے بیعت کرتے ہیں۔ من بعد اجازت دی جاتی ہے کہ اگر زیادہ ہمت و حوصلہ ہو تو اور بزرگوں کی خدمت میں طلب کرو۔ اس وقت حضرتِ والدِ ماجد کی عمر شریف سولہ برس کی تھی۔ اپنے پدرِ بزرگوار سے شرفِ بیعت حاصل کیا۔ سترھویں سال آپ کی پہلی شادی ہوئی۔ پھر دوسرے اور تیسرے نکاح کی نوبت پہونچی۔ اس کے بعد سواروں میں نوکری کرلی۔ رفتہ رفتہ رسالدار بہادر ہو گئے۔ مدت تک اسی عہدہ پر مامور رہے۔ آخر کار پنشن لے کر گھر آن بیٹھے اور گوشۂ عافیت میں یادِ الٰہی کرتے رہے۔ قوت جسمانی بھی آپ کی ایسی تھی کہ بڑا چرس ڈول کی طرح کھینچ لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بارہ فرزندِ ارجمند عطا فرمائے تھے۔ زوجۂ اول سے سات۔ انوارالحسن، حیدر حسن، فیض الحسن (چار صاحبزادوں کے نام یاد نہیں رہے) زوجۂ ثانی سے دو۔ ابوالحسن عرف غوث علی اور سید الحسن۔ زوجۂ ثالث سے تین صاحبزادے تھے (ان کے نام بھی یاد نہیں رہے)

آپ کے بھائی سید محمد حسن صاحب کے پانچ فرزند تھے۔ قاسم علی، حیدر علی۔ عباس علی (دو کے نام یاد نہیں رہے)۔

حالاتِ بنی اعمام و اِخوانِ حضرت قبلہ و کعبہ

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہمارے برادرِ عم زاد سید قاسم علی صاحب ہمارے

والدِ ماجد کی معرفت رسالہ میں نوکر ہوئے۔ چند روز کے بعد ایک انگریز کو جو رسالہ کا افسر تھا اُردو پڑھانے لگے۔ چونکہ بھائی آزادوضع اور رنگین طبع آدمی تھے دیوالی۔ دسہرہ محرم شب برات۔ رمضان سب کا لطف اُٹھاتے تھے۔ الّا میخواری و زناکاری سے نہایت محترز و مجتنب رہتے تھے۔ منشی و نقاش و مصور بھی بے بدل تھے۔ لکھنے میں یہ کمال تھا کہ ہر خط میں خط ملا دیتے تھے۔ اتفاق سے دیوالی آئی۔ خرچ پاس نہ تھا اُس انگریز کے نام سے تنخواہ کا بل بنایا اور بعینہ اُس کے سے دستخط کرکے خزانہ سے پیشگی روپیہ وصول کرلیا اور ایام دیوالی میں خوب کھایا اُڑایا۔ جب انگریز نے حسبِ معمول خزانہ پر بل بھیجا تو افسر خزانہ نے وہ پہلا بل دکھایا اور کہا کہ روپیہ تم وصول کرچکے ہو۔ دیکھا تو بعینہ اُس کے دستخط موجود تھے۔ متحیّر ہوگیا۔ بعد تحقیق پتہ لگا کہ یہ صناعی سیّد قاسم علی صاحب کے سوا کوئی نہیں کرسکتا۔ اُن کو بُلا کر حال دریافت کیا تو آپ نے سارا حال سچ سچ بیان کردیا۔ ضابطہ کے موافق سنگین پہرہ میں نظر بند کیے گئے۔ تیسرے دن پہرہ والوں سے بولے کہ میاں اب تو جی گھبرا گیا۔ ہم جاتے ہیں۔ یہ کہہ کر آنکھوں آنکھوں میں غائب ہوگئے۔ بیڑی اور ہتھکڑی پڑی رہ گئی۔ پھر جو دیکھا تو کچھ فاصلہ پر کھڑے ہوئے بے باکانہ کہتے ہیں کہ صاحب سے ہمارا سلام کہہ دینا لو بھائی ہم تو جاتے ہیں۔ اگر کچھ حوصلہ پکڑنے کا رکھتے ہو تو آجاؤ ؎

نہ چارہ کر سکے کچھ موج دریا کی روانی کا — کہیں وارستگاں زنجیر جکڑے سے ٹھہرتے ہیں

پہرہ والوں نے دوڑ کر صاحب کو اطلاع دی اس نے فوراً رسالہ کو تیار کیا اور گرفتاری کا حکم دیا۔ سواروں نے آن کر چار طرف سے محاصرہ کرلیا اور چاہا کہ گرفتار کریں۔ دیکھا تو صرف ایک جھنڈا کھڑا ہے۔ وہاں سے غائب ہوکر دور جا کھڑے ہوئے اور بولے کہ صاحب سلام۔ اب جاتے ہیں، صاحب سے بھی سلام کہنا۔ پھر سوار دوڑے اور ہر طرف سے گھیر لیا۔ دیکھا کہ ایک ببول کا درخت کھڑا ہے اور سیّد صاحب کا پتہ نہیں، ادھر اُدھر تلاش کرنے لگے۔ اسی میدان میں ایک ندی بہتی تھی دیکھا کہ ندی کے اُس کنارہ پر کھڑے ہوئے کہتے ہیں کہ لو یہ آخری سلام ہے ؎

اب تو جاتے ہیں میکدہ سے میر — پھر ملیں گے اگر خدا لایا

پھر نظر نہ آئے۔ رسالہ واپس چلا آیا۔ صاحب نے یہ ماجرا سُن کر سخت افسوس کیا اور کہا کہ میں اس کا دشمن نہ تھا۔ اگر اب بھی آجائے تو میں اپنی تنخواہ کا اختیار دیتا ہوں۔ خود کھائے اور مجھے کھلائے۔ لیکن افسوس چلا ہی گیا بہت خوب آدمی تھا۔ قدرِ نعمت ست بعدِ زوال۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب سرکارِ انگریزی اور راجہ رنجیت سنگھ والیٔ پنجاب میں اتفاق و اتحاد کا سلسلہ قائم ہوا تو ملکۂ انگلستان نے خلعتِ فاخرہ بھیجا۔ جنرل صاحب نے حکم دیا کہ اس خلعت کے ساتھ میر احمد علی صاحب رسالدار مع اپنے رسالہ کے جائیں اُس زمانہ میں ہم بھی والدہ کی خدمت میں تھے۔ ان کے ہمراہ منزل بمنزل لاہور پہونچے۔ وہاں بھائی قاسم علی ملے جو غائب ہو گئے تھے۔ معلوم ہوا کہ رنجیت سنگھ کے رسالہ میں نوکر ہیں۔ ہر چند والد نے فرمایا کہ ہمارے ساتھ چلو تمہارا قصور معاف کرا دیں گے مگر آنا قبول نہ کیا۔ پھر ہم دہلی کو واپس آئے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ بھائی سید حیدر علی صاحب ابنِ عم کا بھی عجیب حال گذرا ہے۔ سترہ برس کے سن میں والدین نے ان کی شادی کردی۔ اُسی زمانہ میں ایک فقیر صاحب سالک مجذوب پنجاب سے تشریف لائے۔ چونکہ یہ خاندان ہمیشہ سے محبُّ الفقرا اور طالب خدا رہا ہے۔ ان کو بھی اہل اللہ سے محبت و ارادت تھی۔ اُس درویش کو ٹھہرایا اور خدمت مدارات کی۔ جب چھ مہینے گذر گئے تو فقیر صاحب جانے لگے۔ بھائی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت مجھ کو کیا حکم ہے۔ فرمایا کہ اگر تمھاری والدہ ڈیوڑھی تک آکر اجازت دیدیں تو میں ابھی تم کو فقیر بنا دوں۔ بھائی صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ کسی طرح والدہ صاحبہ سے اجازت دلوا دیجیے میں نے چچی صاحبہ کی خدمت میں عرض کیا۔ اُنھوں نے فرمایا کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنا سا دیوانہ بنا دے۔ میں نے کہا کہ حضرت دولت فقر گھر بیٹھے ہاتھ آتی ہے کچھ تردد نہ کیجیے۔ خیر دروازے تک تشریف لائیں اور فرمایا کہ اجازت ہے فقیر بنائیے مگر ہمارے کام سے نہ جاتا رہے۔ فقیر صاحب نے کہا کہ جب اجازت ہو ہی گئی تو ہم کو اختیار ہے جو چاہیں سو کریں۔ یہ کہہ کر بھائی صاحب کو بلایا اور اُن کی پیشانی پر کچھ لکیریں کھینچ کر فرمایا "جاؤ ہم نے تم کو فقیر بنا دیا" یہ بات فرما کر رخصت ہوئے۔ ہم نے بھائی صاحب سے پوچھا کہ تم کو کچھ اثر معلوم ہوا۔ کہا کہ نہیں۔ دوپہر کو جب دونوں

گھر میں جاکر ایک جگہ سو رہے تو دو گھڑی کے بعد بھائی صاحب چلائے۔ میں بولا خیر ہے۔ کہا میرے قلب میں ایک سرخ سانپ نے کاٹا ہے۔ تھوڑی دیر میں منھ سے کف آنے لگے۔ تمام بدن پر آبلے پڑ گئے۔ زبان بند آنکھیں کھلی ہوئیں سکتہ کا سا عالم طاری نہ خواب نہ بیداری نہ دیوانگی نہ ہوشیاری ؎

بے خودی بے سبب نہیں غالب ۔۔۔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

دن رات بے ہوش پڑے رہتے نہ اور کی سنتے نہ اپنی کہتے۔ اگر کوئی کھلاتا کھاتے، اٹھاتا اٹھتے، بٹھاتا بیٹھتے۔ ہر وقت آدمی نگہبان رہتے مع

دیوانہ باش تا غمِ تو دیگراں خورند

عجب شان ایزد سبحان ہے ؎

ایکن کو دیت پھر آپکے ایکن کو مانگے نہ دیت ہے ۔۔۔ ایکن کو جیٹھے دیت ایکن کو دیت نہ لیت ہے

سال بھر یہی حال رہا۔ اس بعد ایک دن دفعۃً ہوش میں آئے اور کہا کہ بھائی جی میں برہنہ ہوں اپنی چادر دو کہ وہی فقیر صاحب آتے ہیں۔ ہم نے چادر دی اور پوچھا کہ وہ کہاں ہیں۔ کہا قریب آ گئے ہیں۔ یہ کہتے ہی تھے کہ فقیر صاحب تشریف لے آئے۔ بھائی صاحب چادر اوڑھ دست بستہ گردن جھکائے سامنے آئے فقیر صاحب نے فرمایا کہ کیوں فقیری کا مزا چکھا۔ کیا کہیں تم زبردست کی اولاد ہو گردن پکڑ لی ہے ہم کو بھیجدیا ورنہ ہم تو خوب دق کرتے۔ خیر اب کہو کیا کہتے ہو۔ بھائی صاحب تو چپ تھے ہم نے کہا **قطعہ**

ارے او مے کدہ کے جانے والے ۔۔۔ ذرا کہہ دیجیو پیر مُغاں کو
شرابِ شوق کا کم ہوگیا کیف ۔۔۔ پلا ایسی کہ بھولے دو جہاں کو

فرمایا کہ اچھا ٹوپی کُرتہ تہ بند لاؤ۔ میں حسب طلب لایا۔ دونوں صاحب نہائے۔ لنگوٹے کھولے۔ کپڑے پہنے۔ مسجد میں آئے۔ مجھ سے فرمایا تم دروازہ پر کھڑے رہو۔ کسی کو مسجد کے اندر نہ آنے دو۔ دو گھنٹہ تک اُن کو تعلیم کیا۔ باہر آئے اور لنگوٹا باندھ کر چل دیے۔ پھر کبھی نہ آئے۔ بھائی حیدر علی صاحب اُسی مسجد میں ہمیشہ گوشہ نشین رہے اور تا حیات اسی قسم کا لباس رکھا۔ نہ دنیا و مافیہا سے کام نہ کسی سے کلام ؎

نہیں ملتے ہیں جہاں میں وہ کسی سے جُرات مل گیا جن کو مزا گوشۂ تنہائی کا

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہم چھ سات برس کی عمر میں ایک دن بھائی انوار الحسن کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ دفعۃً جو آسمان کی طرف نگاہ گئی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک دستہ سواروں کا بڑے زرق برق سے ایک کوتل گھوڑا ہمراہ لیے چلا آتا ہے۔ جب قریب آئے تو ایک سوار نے کہا کہ انوار الحسن آؤ۔ یہ سنتے ہی اُس گھوڑے پر سوار ہو کر اُڑے اور ہماری نظروں سے غائب ہو گئے۔ ہم نے چلا کر والدہ صاحبہ سے کہا کہ بھائی انوار الحسن کو آسمانی سوار اُڑا کر لے گئے۔ والدہ صاحبہ نے فرمایا "چپ چپ شور نہ مچا۔ پہلے بھی کئی بار ایسا معاملہ ہو چکا ہے بلکہ ایامِ شیر خواری میں بھی بارہا میری نظروں سے غائب ہو کر پھر آجاتے تھے"۔ لیکن ہم نے اُس روز کے بعد پھر بہ ظاہر گھر میں آتے نہیں دیکھا۔ البتہ شبِ جمعہ کو چھپ کر والدہ صاحبہ سے مل جاتے تھے۔ ایک بار والدہ صاحبہ نے اُن سے کہا کہ اپنے والد سے بھی تو ملو۔ وہ تمہارے مشتاقِ دیدار ہیں۔ کہا کہ بہت اچھا بلائیے۔ حضرت والد تشریف لائے اور فرمایا کہ میاں تم نے تو صورت دکھانی بھی چھوڑ دی کہاں رہتے ہو۔ عرض کیا میرا مسکن و مقام دیکھیے گا۔ فرمایا کہ اچھا۔ والد اور والدہ دونوں کی آنکھیں بند کرائیں۔ پھر جو کھولیں تو ایک دِل کشا باغ دیکھا۔ نہریں لبریز۔ سبزہ لہلہاتا۔ پھول کھلے ہوئے۔ درخت میوے سے لدے ہوئے۔ مرغانِ خوش الحان نغمہ سنج۔ عمارتیں خوش نما ہیں ؎

مبارک منزلے فرخندہ جائے

سات دن اسی باغ میں پھرتے رہے۔ نہ کہیں اُس کا آغاز ملا نہ انجام۔ نہ انوار الحسن کا نشان نظر آیا۔ جب بھوک لگتی میوے کھاتے۔ نہروں کا پانی پی لیتے۔ جس مکان میں جی چاہتا رات کو سو رہتے۔ آٹھویں دن میاں انوار الحسن بھی ہنستے ہوئے آئے اور کہا حضرت میں یہاں رہتا ہوں۔ فرمایا کہ تم ہم کو چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے۔ آج شکل دکھائی ہے۔ ہم آدمیوں میں رہنے والے یہاں آٹھ دن تنہائی میں گذرے بھلا گھر کے لوگ کیا کہتے ہوں گے۔ ہم کو تو جہاں سے لائے ہو وہیں پہونچا دو۔ اب ہمارا دِل گھبرا گیا۔ کہا کہ بہت اچھا آنکھیں بند فرمائیے۔ پھر جو آنکھیں کھولتے ہیں تو وہی وقت ہے۔ وہی دن۔ وہی تاریخ۔ وہی اپنا گھر۔ حیران ہوئے

کہ الٰہی یہ آٹھ دن کہاں سے آئے جو ہم نے باغ میں گذارے۔ غرض بھائی انوار الحسن زُمرۂ ابدال میں سے تھے اور اسی قسم کے لوگ قطب الاقطاب و خضرِ وقت ہوا کرتے ہیں

بابِ دوم

ذکر ولادت شریف و حال پرورش و تحصیل و تکمیل علم و کیفیت بیعت

بتاریخ ۴ یا ۱۱ یا ۱۸ یا ۲۵ ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۲۱۹ ہجری مطابق ۵۔اگھن سمبت ۱۸۶۱ ہندی۔ ۲۰۔اگھن سمبت ۱۲۶۱ فصلی۔ ۲۴۔اگھن سنہ ۱۲۱۲ بنگلہ۔ ۷۔دسمبر سنہ ۱۸۰۴ء بروز جمعہ وہ بلبل بوستانِ توحید سروِ گلستانِ تفرید۔ شاہبازِ اوجِ حقیقت۔ تاجدارِ کشورِ معرفت شہسوارِ عرصۂ فقر و فنا۔ خضرِ راہِ خدا۔ منزل شناسِ ہر طریق۔ سلطانِ ممالکِ تحقیق۔ مردِ میدانِ ترک و تجرید۔ نغمہ سنجِ قانونِ عشق و توحید آفتاب انوار الٰہی۔ سرچشمۂ فیضانِ نامتناہی۔ یعنی حضرت مرشدی و مولائی قبلۂ عالم و عالمیان کعبہ جان و جانیان سید غوث علی شاہ قلندر قادری مثل آفتاب جہاں تاب جلوہ فرمائے مطلعِ ظہور ہوئے ؎

سرورِ روحانیاں آمد پدید ۔۔۔ جنبشے در جسم و جاں آمد پدید
شد منوّر عرصۂ کون و مکاں ۔۔۔ کوکبِ کون و مکاں آمد پدید
بوستانِ جاں بہار از سر گرفت ۔۔۔ نوبہارِ بوستاں آمد پدید
کاروانِ غیب آمد در شہود ۔۔۔ یوسفے در کارواں آمد پدید
ہست ہر دورِ زماں را صاحبے ۔۔۔ صاحبِ دورِ زماں آمد پدید
کشتیٔ طوفانئے ہست ایں جہاں ۔۔۔ نوحِ کشتیٔ جہاں آمد پدید
علمِ حق میراثِ پیغمبر بود ۔۔۔ وارثِ پیغمبراں آمد پدید
ذاتِ پاکش دودماں را افتخار ۔۔۔ افتخارِ دودماں آمد پدید
از برائے صیدِ مرغانِ مکاں ۔۔۔ شاہبازِ لامکاں آمد پدید

آستانش قبلہ گاہِ قدسیان — قبلہ گاہِ قدسیاں آمد پدید
زد صلائے کُنتُ کنزاً مخفیا — مالکِ گنجِ نہاں آمد پدید
میزبانِ خوانِ حق مردِ خداست — خوانِ حق را میزباں آمد پدید
صورتِ بختِ جواں فضلِ خداست — صاحبِ بختِ جواں آمد پدید
خود ظہور و ظاہر و مظہر یکے ست — از ظہورِ حق ہماں آمد پدید
بوالحسن غوثِ علی سلطانِ جاں — اے حسن[1] سلطانِ جاں آمد پدید

چونکہ والدہ ماجدہ شریفہ حضرت رحمۃ اللہ علیہا کو ایک قسم کا جنون تھا اس لیے جدِ امجد یعنی جناب سید **ظہور الحسن** صاحب نے اُن کا دودھ پلانا مناسب نہ سمجھا فکرِ رضاعت میں سرگرم ہوئے۔ اتفاقاً قرب و جوار میں ایک پنڈت نیک شعار رام سُکھی نام رہتے تھے۔ معلوم ہوا کہ اُن کی بیوی جو نہایت نیک منش اور حمیدہ خصال ہیں دودھ پلا سکتی ہیں۔ آپ نے ان کو طلب فرمایا اور اُن کے دامنِ تمنا کو ثمرِ مراد سے پُر کیا؎

اُٹھو! اے مدّتوں کے سونے والو — تمھارے در پہ یہ دولت کھڑی ہے

زہے قسمت اُس پنڈتانی مائی کی۔ جس کو یہ دولتِ سرمدی نصیب ہوئی۔ سچ ہے "بِن مانگے موتی ملیں مانگے ملے نہ بھیک"، بخوشی و خرمی دودھ پلانا شروع کیا۔ نام آپ کا حضرت جدِ امجد نے **خورشید علی** رکھا تھا۔ اور والدِ بزرگوار نے **ابوالحسن**۔ بڑی والدہ صاحبہ نے **غوث علی** پنڈتانی مائی نے گنگا بشن۔ ہر چند کہ پنڈتانی مائی کے اولادِ دختری بہت تھی۔ مگر اولادِ پسری کی جانب سے یاس ہوگئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت کے قدوم فیض لزوم کی برکت سے بعد مدتِ رضاعت ایک فرزند بختِ بلند عطا فرمایا جس نے حضرت قبلہ کی صحبت سے آخر کو رتبۂ بجیشا[2] ہوم حاصل کیا

---

[1] حسن سے مراد مولانا سید شاہ گل حسن رحمۃ اللہ علیہ نظم مولانا محمد اسمٰعیل کی تصنیف سے ہے جیسا کہ یہ تمام تذکرہ ہے۔

[2] حالتِ جذب و فنا ۱۲۔

تحصیلِ علم

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب ہم چار برس چار مہینے کے ہوئے تو بڑی والدہ صاحبہ نے بسم اللہ پڑھا کر قرآن شریف شروع کرایا۔ اور پنڈت رام سنہی صاحب نے جو پدرِ رضاعی تھے نربکار کا نام لے کر شاستر کا آرنبھ کیا۔ دس برس کی عمر میں قرآن شریف نصف حفظ کر لیا اور نصف ناظرہ پڑھا۔ کتب فارسیہ بھی تا سکندرنامہ بڑی والدہ صاحبہ سے پڑھیں اور سنسکرت سارتھ سدھ چندرکا تک پنڈت جی سے حاصل کی اور عربی کی صرف نحو نانا محمد حیات صاحب سے جو بڑی والدہ صاحبہ کے والد تھے پڑھی۔ بعد چند مدت کے ہمارے والد ماجد نے اپنے پاس دہلی میں بلا لیا۔ یہاں مولوی محمد اسمٰعیل صاحب سے ایک سبق کافیہ کا اور مولوی شاہ اسحٰق صاحب سے اور مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب سے حدیث شریف پڑھی۔ باقی کتابیں مولوی فضلِ امام صاحب خیرآبادی سے پڑھیں۔ یہ مبرور و مغفور ہمارے حال پر نہایت شفقت فرماتے تھے اور اُن کی اہلیہ کو بھی مثل مادرِ شفیقہ کے محبت تھی حتیٰ کہ بغیر ہمارے کھانا تناول نہ فرمایا کرتی تھیں۔ ہم ان کے ساتھ پٹیالہ بھی گئے اور ضروری کتبِ دینیہ اور منطق پڑھتے رہے۔ جب وہ عالمِ قدس کو رحلت فرمائے تو ہم کو نہایت رنج و الم ہوا اُس دن سے کتابیں بالائے طاق رکھ دیں کہ اس شفقت سے نہ کوئی پڑھائے گا نہ ہم پڑھیں گے

ذکرِ بیعت

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہم نے حسبِ دستور اپنے خاندان کے۔ اوّل اپنے والد ماجد سے بیعت کی۔ حضرت والد نے بعد تعلیم و تلقین دیکھا کہ دردِ طلب غالب ہے خود اولیاء اللہ کی خدمتِ بابرکت میں لے جانے لگے اور جہاں جہاں مناسب سمجھا بیعت کرایا۔

شجرۂ نسبی وخلفائی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَللّٰھُمَّ حَرِّقْ قَلْبِیْ بِحُرُمَتِ ابوالحسن خورشید علی عرف سید غوث علی شاہ قلندر قادری بن سید احمد حسن عرف احمد علی بن سید ظہور الحسن عرف ظہور محمد بن سید محمود عرف محمد علی۔ بن سید حامد حسن عرف حامد علی بن سید حمید علی عرف حمید الدین۔ بن سید ابوسعید عرف انوار الحسن بن سید مصلح الدین عرف ناصر حسن میر میراں۔ بن سید مبارک حقانی۔ بن سید محمد عرف محمد غوث اوچی حلبی گیلانی بن سید شمس الدین عرف محمد اعظم بن شاہ سید امیر عرف عبداللہ حسن بن سید ابوالحسن عرف کرم علی۔ بن سید ابوعلی عرف محمد صالح۔ بن سید مسعود عرف نور الدین۔ بن سید ابوالعباس احمد عرف حمید الدین۔ بن صفی الدین عرف سید صوفی۔ بن سید عبدالوہاب عرف سیف الدین۔ بن قطب الاقطاب غوث الاعظم سید عبدالقادر جیلانی۔ بن سید ابوصالح۔ بن سید موسیٰ ثالث بن سید عبداللہ ثالث۔ بن سید محمد زاہد۔ بن سید محمد رومی۔ بن سید داؤد۔ بن سید موسیٰ ثانی۔ بن سید عبداللہ ثانی۔ بن سید موسیٰ۔ بن سید محسن عبداللہ بن حسن مثنیٰ المعروف سید محمد۔ بن شہید جام عشق حضرت امام حسنؓ۔ بن بلبلِ باغ مدینہ زہرائے بتول خاتون جنت حضرت فاطمہؓ بنت محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ فخر انبیاء سرور اصفیا محبوب رب العالمین صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ ۵ بِنَارِ عِشۡقِکَ وَاِزۡدِیَادِ مُحَبَّتِکَ

ایک روز ارشاد ہوا کہ دہلی میں حضرت والد ماجد مجھ کو سید فدا حسین شاہ صاحب رسول شاہی قدس اللہ اسرارہم کی خدمت بابرکت میں لے گئے میں نے ایک روپیہ پیش کیا۔ تو میاں صاحب اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر لائے اور فرمایا یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡھِمۡ فَمَنۡ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنۡکُثُ عَلٰی نَفۡسِہٖ وَمَنۡ اَوۡفٰی بِمَا عٰھَدَ عَلَیۡہِ اللّٰہَ فَسَیُؤۡتِیۡہِ اَجۡرًا عَظِیۡمًا۔ روپیہ اٹھالیا۔ قبلہ گاہی صاحب نے فرمایا کہ بھائی مبارک ہو۔ پھر ایک چھڑا اور کنٹھا کہربائی اور ایک رومال سبز کاہی اپنے مرید میاں توکل حسین شاہ صاحب سے

طلب فرمایا۔ رومال تو اپنے دست مبارک سے میرے سر پر باندھا اور چھڑا اور کنٹھا میرے ہاتھ میں دیا اس خاندانِ عالی شان کا شجرۂ طیّبہ یہ ہے :۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسمِ اللہ بر زبان رانم — شجرۂ سہروردی خوانم
ہاتفِ غیب چوں ندا فرمود — خاکسارانِ ہند از دل بشنود
نحن اقرب الیہِ فی القرآن — غوث[1] ما و علیؑ ماست ہماں
ہست انسان مجمع البحرین — جسم خاکست و جان فدائے حسین[2]
جلوہ گر شد وجودِ ذاتِ لطیف — خود مظفر حسین[3] شاہِ حنیف
صورت انسان معنی اللہ — ظاہر حق رسولِ[4] صلّے اللہ
کرد تنزیہ جلوہ در تشبیہ — نعمت[5] اللہ نفخت روحی فیہ
روحِ خود را نمود بہر شہود — گفت وحدت بنغمۂ داؤد[6]
نحن اقرب بود ز جانِ قریب — بلکہ جان و جہانِ جملہ حبیب[7]
قلبِ انسان بیتِ ربِّ جلیل — ہست قربان جانِ اسمٰعیل[8]
جملہ عالم وجودِ حق دانید — مرتضیٰ[9] جانِ آں ہمہ خوانید
خلق تصویرِ صورتِ خلّاق — خالق اندر شکم بود رزّاق[10]
عشق چوں روح در بشر افتاد — معرفت ذات پاک اللہ داد[11]
مُدرک جزو و کل زمین و زمن — ناطق است او توجہ پیرن[12]

[1] مولانا سید غوث علی شاہ۔ [2] حضرت شاہ فدا حسین المعروف خواجہ نجم الدین ہمدانی۔ [3] حضرت شاہ مظفر حسین معروف بہ مولانا حنیف سر حلقہ خاکساران ہند [4] حضرت سید رسول شاہ الوری۔ [5] حضرت شاہ نعمت اللہ ولی الہامی۔ [6] حضرت شاہ داؤد مصری۔ [7] حضرت شاہ سنجی حبیب اللہ۔ [8] حضرت شاہ اسمٰعیل۔ [9] حضرت سید شاہ مرتضیٰ اللہ۔ [10] حضرت سید شاہ رزاق پاک۔ [11] حضرت شاہ اللہ داد عرف عارف۔ [12] حضرت شاہ پیرن بندگی۔

ہست ذاتے مع الصفات بہ تن — زاں شود دور آسمان منجن[1]
صورت خویش حق عیاں بنمود — شد محمد[2] وجودِ حق مشہود
وحدتِ ذات کثرتِ آفاق — متجلی بجلوۂ اسحاق[3]
ذاتِ واجب بہر صفت موجود — خلق ممکن چو آدم و داؤد[4]
غیرِ حق را کجاست نشو و نمو — جملہ بگذار خویشتن را جو[5]
من عرف نفسہ شود معلوم — ہر کہ خود را شناخت شد مخدوم[6]
جملۂ کائنات قائم ازوست — ایں جہان و جہانیاں ہمہ اوست
خود توئی حضرتِ جلالِ بزرگ — غیرِ تو نیست بے زوال بزرگ
ہر احد احمدِ کبیر بدال — زانکہ در احمدست احد پنہاں
کل شیٔ محیط ذاتِ جلال[7] — ہست مستجمع صفاتِ کمال
ما نفی ایم و تو ہمہ اثبات — رکنِ[8] عالم جمیعِ مخلوقات
مصحفِ ناطقِ بہاؤ[9] الدین — بلکہ لاریب فیہ عینِ یقین
توئی موجود ما ہمہ معدوم — خود توئی خادم و توئی مخدوم
صدرِ انسان ترجمانِ کتاب — شرحِ حرفِ مقطعاتِ شہاب[10]
صورت انسان مرأتِ رحمٰن — رویت اندر ضیا[11] رو عینِ عیاں
اینما انت ثم وجہ[12] الدین — اندرون و بروں مکان و مکین
حسن خلق محمدِ عبد[13] اللہ — لا شدہ عبدہ سر بسر اللہ ہ
ہر احد احمد[14] بلا میم ست — ہر دل اندر ہزار اقلیم ست

---

۱ حضرت شاہ منجن گوشہ نشین ۲ حضرت شاہ محمد گوشہ نشین ۳ حضرت شاہ خواجہ اسحاق مغربی ۴ حضرت شاہ داؤد قریشی ۵ حضرت شاہ اجن قتال سید بخاری ۶ حضرت شاہ احمد کبیر الحسن مخدوم جہانیاں جہاں گرد ۷ حضرت سید جلال بخاری ۸ حضرت شیخ مخدوم رکن الدین ابو الفتح ملتانی۔ ۹ حضرت مخدوم بہاء الحق والدین زکریا ملتانی ۱۰ حضرت شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی ۱۱ حضرت خواجہ ضیاء الدین ابو الجیب سہروردی۔ ۱۲ حضرت شیخ وجیہ الدین سہروردی ۱۳ حضرت خواجہ عبداللہ دینوری ۱۴ حضرت خواجہ احمد اسود دینوری —

ہر دمم شد علو ۱؎ دینوری — بہر تعظیم صورت بشری
امر ربی جنید ۲؎ ارواح ست — یرجع الاصل روح را راح ست
قال انسان سری ۳؎ السقطی — وحدہ لاشریک لہ فقطی
ما عرفناک گفت خود معروف ۴؎ — لا وجود صفات بے موصوف
آئینہ صاف صقیل داؤد ۵؎ — در ہمہ خلق روح خود بنمود
لَیسَ شَیْئٌ سِوَ الحَبِیبِ ۶؎ لَکُمْ — کُلُّ شَیْءٍ حَبِیبٌ بَلْ اَنْتُمْ
حی و قیوم شد علی رضا ۷؎ — زان سبب شد وجہ وارض وسما
علم و توحید موسیٰ ۸؎ کاظم — منکشف براصاغر و اعظم
فیض عرفان جعفر ۹؎ صادق — چوں احادیث مصحف ناطق
گفت حضرت محمد باقر ۱۰؎ — جملہ حق ست اول و آخر
شاہ زین العباد ۱۱؎ خود فرمود — کس دگر نیست احد ست وجود
ما ہمہ مقتدی امام حسین ۱۲؎ — قل ہو اللہ ہست فی الکونین
جملہ اسما صفات ذات تبن — نطق ادراک نیست خلق حسن ۱۳؎
عین حق جملہ جہان علی ۱۴؎ ست — اندرون و برون خفی و جلی ست
ایں حقیقت محمدی ۱۵؎ موجود — ظاہراً عبد باطناً معبود
مَنْ عَرَفَ نَفْسَہ رسید بدوست — ہر کہ خود را شناخت آں ہمہ اوست
یک حقیقت محمدی انسان — شد منزہ مشبہ ہو فی شان
جامہ کہنہ فراق درید — چوں عبائے وصال را پوشید

۱؎ حضرت خواجہ ممتاز علو دینوری ۲؎ خواجہ ابوالقاسم جنید بغدادی۔ ۳؎ خواجہ ابوالحسن سری بری سقطی ۴؎ حضرت خواجہ معروف کرخی ۵؎ خواجہ داؤد طائی ۶؎ حضرت خواجہ حبیب عجمی ۷؎ حضرت امام علی موسیٰ رضا ۸؎ حضرت امام موسیٰ کاظم ۹؎ حضرت امام جعفر صادق ۱۰؎ حضرت امام محمد باقر ۱۱؎ حضرت زین العابدین بن ۱۲؎ حضرت سید الشہدا شہید کربلا حضرت امام حسین۔
۱۳؎ حضرت سید الشہدا حضرت امام حسن ۱۴؎ حضرت اسد اللہ الغالب امیر المومنین علی بن ابی طالب —
۱۵؎ حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم ۱۲۔

اے برادر ہر زماں دل شاد باش ــــ از ہمہ کارِ جہاں آزاد باش

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرتِ والد بزرگوار مجھ کو بابری میں لائے اور حضرت میر اعظم علی شاہ صاحب سے بیعت کرایا۔ دل و جان سے عنایت و محبت فرماتے۔ جہاں میں جاتا آپ بھی ہمراہ جاتے اگر سفر دور دراز کا ارادہ ہوتا تو مدتِ مراجعت کا اقرار لیتے۔ اتفاقاً معاودت میں دیر ہو جاتی تو خود جستجو کے لیے سفر کرتے۔ تا حین حیات یہی معاملہ رہا۔ جب خلافت عطا فرمائی تو اپنی اولاد کو ہمارے ہاتھ پہ بیعت کرایا۔ اس خاندانِ عُلیہ کا شجرۂ طیبہ یہ ہے

شجرۂ قادریہ

پاک آں ذاتِ بے نشانِ احد[1] ــــ کہ بدو ہیچ سلسلہ نہ رسد
لیک اندر طریقۂ ارشاد ــــ دست در دستِ رہنمایاں داد
اشرفُ الانبیاء حبیبِ خدا ــــ اسد اللہ[2] بابِ علمِ ہُدا
ہم حسن[3] ہم حبیب[4] ہم داؤد[5] ــــ باز معروف[6] راہِ حق پیمود
زدہ سری[7] جنید[8] و شبلی[9] دم ــــ عبدِ واحد[10] ابو الفرح[11] پے ہم
بوالحسن[12] بوسعید[13] آمد باز ــــ غوثِ اعظم[14] کشودہ پردۂ راز
عبدِ رزاق[15] شد از و صالح ــــ اقتدائش نمود ابو صالح[16]
از پسِ شاہ احمد[17] اولٰی ــــ کرد دعوت شہابِ دیں[18] بخدا

---

۱ سرورِ ہر دوسرا محبوب کبریا احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ۲ حضرت اسد اللہ الغالب علی مرتضیٰ علیہ السلام ۳ حضرت حسن بصری ۴ حضرت خواجہ حبیب عجمی ۵ حضرت خواجہ داؤد طائی ۶ حضرت خواجہ معروف کرخی ۷ حضرت خواجہ سری سقطی ۸ حضرت ابوالقاسم جنید بغدادی ۹ حضرت ابو بکر شبلی ۱۰ حضرت عبدالواحد یمنی بن شیخ عبدالعزیز یمنی ۱۱ حضرت ابوالفرح طرطوسی ۱۲ حضرت ابوالحسن علی القریشی الہنکاری ۱۳ حضرت ابوسعید مبارک خرمی ۱۴ حضرت سید غوث الاعظم سید عبدالقادر جیلانی ۱۵ حضرت سید عبدالرزاق ۱۶ حضرت خواجہ ابوصالح نقر ۱۷ حضرت سید احمد شاہ اولٰی ۱۸ حضرت سید شہاب الدین ۱۲ ۔

شمس[1] دین ست پس علاء[2] الدین — باز نور[3] محمد ست ببیں
بعد معبود[4] ہست عبد[5] جلال — پس بہاول[6] قلندر خوش حال
بوالمعالی[7] ست رہنمائے یقیں — باز حضرت مقیم[8] محکم دیں
بعد سید[9] امیر بالا پیر — راہ عبد اللطیف[10] بری گیر
شیخ درویش[11] و خان احمد[12] شاہ — باز عبد اللطیف[13] حق آگاہ
مدح[14] شاہ ست و سید اعظم[15] علی — شاہ غوث علی[16] دمولائی
شہ سوار معارک تجرید — تاج دار معارک توحید
بحر عرفاں محیط بے پایاں — برتر از وصف و ماورائے بیاں
اے حسن[ع] کو زباں کہ راز دہد — خبر از بے نشاں کہ باز دہد

ایک روز ارشاد ہوا کہ اس خاندان کی تعلیم و تلقین کے بعد ہم نے میر صاحب قبلہ سے عرض کیا کہ حضرت اب کیا کیا جائے۔ فرمایا کہ میرٹھ میں مولوی حبیب اللہ شاہ صاحب کے پاس جاؤ۔ جو کچھ فرمائیں عمل میں لاؤ۔ اور ایک نامہ بنام شاہ صاحب تحریر فرمایا۔ اس کو لے کر ہم میرٹھ پہونچے اور مولوی نیاز علی صاحب کے ساتھ شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نہایت مربیانہ اور بزرگانہ عنایت فرمائی۔ تین دن روزہ رکھوا کر اتحادی توجہ دی۔ بن بعد داخل سلسلہ فرما کر تعلیم و تلقین شروع کی ایک برس ہم وہیں رہے۔ رات کو بھی شاہ صاحب ہمیں اپنے پاس ٹھہراتے تھے۔ جب سلوک طے ہو گیا تو مولوی صاحب نے

---

[1] حضرت سید شمس الدینؒ [2] حضرت سید علاء الدینؒ شاہ [3] حضرت نور محمدؒ شاہ [4] حضرت شاہ عبد المعبودؒ [5] حضرت سید عبد الجلالؒ صحرائی [6] حضرت سید بہاول شیر قلندرؒ [7] حضرت ابو المعالیؒ [8] حضرت محکم الدینؒ مجردی [9] حضرت شاہ امیرؒ بالا پیر [10] حضرت عبد اللطیفؒ بری [11] حضرت شیخ درویش محمدؒ [12] حضرت شاہ احمد صاحب کبیر تیوری [13] حضرت شیخ عبد اللطیفؒ ثانی کبیر تیوری [14] حضرت مدح شاہؒ منداوری [15] حضرت سید اعظم علی شاہ جاندی [16] حضرت غوث علی شاہ قلندری رضوان اللہ تعالے علیہم اجمعین ۱۲۔

[ع] یہ شجرہ منظوم مولانا محمد اسمٰعیلؒ کی تصنیف ہے۔ مقطع میں نام حضرت مولانا گل حسن رحمۃ اللہ علیہ کا ڈال دیا ہے ۱۲۔

خلافت عطا فرمائی اور اپنی اولاد کو مرید کرایا۔ اس خاندانِ عالیشان کا شجرۂ طیبہ یہ ہے۔

شجرۂ خاندان نقشبندیہ

شرح سازم خاندانِ نقشبندی اجلی — فردِ توحیدِ مجرّد بوالحسن غوثِ علی[۱]
شہ حبیب اللہ[۲] صاحب مظہرِ اسرارِ غیب — بوسعید[۳] احمدی از شاہ عبد اللہ[۴] ولی
مظہرِ حق جانِ جاناں[۵] نائبِ پیغمبراں — سیدی نور محمد[۶] شیخ سیف الدین[۷] سنی
خواجہ معصوم[۸] ست احمد[۹] خواجہ باقی[۱۰] خواجگی[۱۱] — خواجہ[۱۲] درویش و محمد زاہد[۱۳] احرار ولی
خواجہ یعقوب[۱۴] و بہاء الدین[۱۵] دگر میر کلال[۱۶] — خواجہ بابا[۱۷] داں دگر خواجہ[۱۸] علی رامتینی
خواجہ محمود[۱۹] ست دیگر خواجہ عبد الخالق[۲۰] است — خواجہ یوسف[۲۱] باز شیخ فارمداں بوعلی[۲۲]
بوالحسن[۲۳] پس بایزید[۲۴] و جعفر صادق[۲۵] بود — قاسم[۲۶] و سلمان[۲۷] ابوبکر[۲۸] و رسول[۲۹] ہاشمی
یا الٰہی از طفیلِ خاندانِ نقشبند — مبتلا سازی بعشق خود حسن[۳۰] را دائمی

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ۝

مولوی نیاز علی صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ اُس وقت چند مرید حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر تھے۔ بعد توجہ فرمایا کہ کوئی شخص ان کے جسم کو ہاتھ نہ لگائے ورنہ بے ہوش ہوکر گر پڑے گا۔ یہ ظرفِ عالی ان ہی کا ہے کہ تحمّل کیا۔ دوسرا ہوتا تو قلب شق ہو جاتا۔ المختصر اُنیس بزرگوں سے جناب وقبلہ نے بیعت کی ان میں گیارہ مسلمان تھے اور آٹھ ہندو۔

---

۱ حضرت سید ابو الحسن غوث علی شاہ قلندر رحمۃ اللہ علیہ ۲ حضرت حبیب اللہ شاہ صاحب سنبھلی ۳ حضرت ابو سعید احمد سرہندی ۴ حضرت غلام علی شاہ دہلوی ۵ حضرت مرزا جان جاناں صاحب دہلوی ۶ حضرت سید نور محمد صاحب ۷ حضرت سیف الدین صاحب صنامی ۸ حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب ۹ حضرت احمد مجدد الف ثانی صاحب سرہندی ۱۰ حضرت خواجہ باقی باللہ صاحب دہلوی ۱۱ حضرت خواجہ امکنکی صاحب ۱۲ حضرت خواجہ درویش محمد صاحب ۱۳ حضرت محمد زاہد عبید اللہ احرار صاحب ۱۴ حضرت خواجہ یعقوب چرخی ۱۵ حضرت خواجہ بہاء الدین صاحب نقشبند ۱۶ حضرت خواجہ میر کلال صاحب ۱۷ حضرت خواجہ بابا سماسی ۱۸ حضرت خواجہ شیخ علی رامیتنی ۱۹ حضرت خواجہ محمود صاحب ۲۰ حضرت خواجہ عبد الخالق صاحب ۲۱ حضرت خواجہ یوسف ہمدانی ۲۲ حضرت خواجہ بو علی فارمدی ۲۳ حضرت ابو الحسن خرقانی ۲۴ حضرت طیفور شامی بایزید بسطامی ۲۵ حضرت امام جعفر صادق ۲۶ حضرت سید قاسم صاحب ۲۷ حضرت سلمان فارسی ۲۸ حضرت ابو بکر صدیق ۲۹ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ۳۰ اس منظوم شجرہ کے مصنف بھی مولانا اسمٰعیل ہیں اور مقطع میں حسن سے مراد مولانا گل حسن ہیں جو مولانا کے پیر بھائی تھے اور ان کی فرمائش پر یہ کل تذکرہ از اول تا آخر مولانا اسمٰعیل نے تحریر فرمایا تھا ۱۲۔

باب ۳ سوم

درحالاتِ سیاحت مشتمل بر یک صد و دو ارشاد

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہماری عمر آٹھ برس کی تھی کہ جناب دادا صاحب، نانا صاحب، و والد بزرگوار اپنے ہمراہ ہم کو حاجی لعل صاحب کی خدمت میں لے گئے یہ بزرگ مولانا فخرالدین صاحب چشتی نظامی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ جب ہم اُن کی خدمت میں پہونچے تو سروقد تعظیم کے لیے کھڑے ہوگئے اور بڑے تپاک سے اپنے پاس بٹھایا۔ پھر نہایت عجز و انکسار کے ساتھ فرمانے لگے کہ بھائی لڑکے میں بہت روز سے تمھارا منتظر و مشتاق تھا۔ خوب ہوا کہ تم آگئے۔ ہمارے پاس جو تمھاری امانت ہے لے لو۔ اُس وقت محفل خاص تھی دروازہ بند اور قوال خوش الحان غزل گا رہے تھے کہ حضرت کو جوش آیا اور میری طرف متوجہ ہوکر اِلقا کیا۔ میں ایسا بے خود و بے ہوش ہوا کہ تن بدن کی بھی کچھ خبر نہ رہی۔ بلکہ اُس دم عِلم بھی بالکل مفقود تھا۔ نانا صاحب خفا ہونے لگے کہ اس صغیر سن بچہ پر ایسی سخت نظر کیوں ڈالی۔ والد نے عرض کیا کہ حضرت جائے شکر ہے نہ محلِ شکایت۔ یہ بچہ بڑا صاحب نصیب ہے پھر والد مجھ کو گھر اُٹھا لائے۔ آٹھ دن تک وہی حالت رہی۔ نویں دن ہوش آیا اور طبیعت غالب ہوئی۔ اس روز سے جس بزرگ کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا کسی کی توجہ کا اثر نہیں ہوا۔ اور اگر کچھ ہوا بھی تو بے خودی طاری نہ ہوئی۔ اگر آناً فاناً بے خودی بھی ہوئی تو علم نے مطلق جنبش نہیں کی۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ زمانہ طفلی میں ہم کو ایک سنیاسی نے جڑ تاڑی کیپالی[۱] تعلیم کی۔

---

[۱] کیپالی یعنی حبس دم یہ دو قسم ہے ایک چیتن تاڑی اور دوسرے جڑ تاڑی۔ چیتن تاڑی وہ ہے کہ بسبب حبس دم کے روح دماغ میں آجاتی ہے لیکن ہوش و حواس درست رہتے ہیں اور جڑ تاڑی میں ہوش و حواس مفقود ہو جاتے ہیں ۱۲۔

اِس شغل میں حواسِ ظاہری مفقود ہوجاتے ہیں اور روح دماغ میں آجاتی ہے۔ جس خیال میں انسان بیٹھتا ہے اُسی میں رہتا ہے۔ جب ہم کو مشق ہوگئی تو ایک دن خیال آیا کہ دیکھیں دوسرے پر بھی اس کا اثر ہوتا ہے یا نہیں۔ ہم نے اپنے بھائی کو جو والدہ صاحبہ کلاں سے تھے کپالی چڑھائی۔ وہ بالکل بے ہوش ہوکر بشکل مردہ گر پڑے۔ اُتارنا ہم کو آتا نہ تھا۔ نہایت حیرانی دامنگیر ہوئی کہ اب کیا علاج کریں۔ والدہ صاحبہ کلاں کو خبر ہوئی۔ مضطرب ہوکر تشریف لائیں اور فرمایا کہ ایک تو گیا ہے دوسرا بھی چلا۔ لوگ گمان کریں گے اس نے بھائی کو مار ڈالا ہے۔ ایک پیالہ دہی کا لاکر اس کے سامنے گرادیا۔ جو آکر پوچھا اُس سے فرماتیں کہ نہیں معلوم کیا ہوا دہی کھاکر تے کی ہے۔ میں گھبرا کر اُس سنیاسی فقیر کے پاس گیا اور سارا حال بیان کیا۔ انھوں نے بہت ملامت کی اور کہا کہ کیا تم کو اس واسطے یہ عمل سکھایا تھا کہ لوگوں کا تماشا دیکھو۔ ہم نے تو اس لیے سکھایا تھا کہ یادِ الٰہی میں مشغول رہو گے۔ خبردار پھر ایسی حرکت نہ کرنا۔ یہ کہہ کر ہمارے گھر آئے اور بھائی کے سر پر مشکیں چھوڑوائیں۔ جب تیسری مشک کی نوبت پہونچی تو اُٹھ بیٹھے پھر ہم نے بھائی سے بے ہوشی کی کیفیت دریافت کی۔ کہا میں تو زندہ تھا اور تم سب کو پکار پکار کے کہتا تھا کہ میں زندہ ہوں۔ تم گھبراؤ مت۔ میں کنوئیں میں پڑا ہوں۔ مجھ کو نکال لو۔ لیکن تم سنتے نہ تھے اور مجھے کسی طرح کی تکلیف بھی نہ تھی۔ اس دن سے ہم نے توبہ کرلی کہ پھر ایسا کام ہرگز نہ کریں گے۔

ایک روز ارشاد ہوا۔ کہ ہمارے وطن کے چمار کا لڑکا دریا کنارے جاکر کچھ پڑھا کرتا تھا ہم نے دریافت کیا اس نے کہا میاں صاحب میں ایک منتر سِدھ کرتا ہوں۔ ہم نے کہا کہ جس روز تیرا منتر سِدھ ہو ہم کو بھی ساتھ لے چلنا۔ وہ ایک رات کو آیا اور ہم کو ساتھ لے گیا۔ دریا کے کنارے پہونچ کر موہن بھوگ اور چاول وغیرہ پکائے۔ بھینٹ دی۔ پوجا کی۔ اور منتر پڑھ کر فارغ ہو۔ دونوں گھر کو چلے۔ میں نے کہا کہ اب اس کا تماشا تو دکھا۔ اُس نے کنکر پڑھ کر ایک درخت پر مارا نیچے سے اوپر تک آگ لگ اُٹھی اور جل کر خاک سیاہ ہوگیا۔ یہ طرفہ ماجرا دیکھ کر ہم نے کہا کہ اب تو ایک کنکر ہمارے اوپر مار۔ اُس نے اول تو انکار کیا۔ مگر کہنے سننے سے مجبور ہوکر بولا کہ لو ہوشیار ہوجاؤ ہم نے یَا شَیْخ عَبْدُالْقَادِرْ جِیْلَانِیْ

شَیْئًا لِلّٰہِ کہہ کر اپنے گرد حصار کھینچ لیا۔ اس نے کنکر مارا۔ کچھ نہ ہوا۔ دوسرا اور تیسرا مارا کچھ بھی نہ ہوا۔ پھر تو ہم حصار کو توڑ کر باہر نکل آئے کہ یہ بھروسہ اچھا نہیں۔ اُس چمار سے کہا کہ بھلا اب تو کنکر پھینک۔ اُس نے غصہ میں آکر ایک اور کنکر مارا تو وہ کنکر ہمارے سینہ پر آکر ایسا لگا جیسے لٹھ لگتا ہے۔ پھر ہمارے سینے پر سے اُچٹ کر اُس کی پیشانی پر جا لگا۔ وہ اوندھے منہ گرا اور تمام سوراخ ہائے جسم سے خون جاری ہو گیا۔ ہم نے دوڑ کر اُس کے باپ کو اطلاع دی۔ وہ اپنے لڑکے کو اُٹھا کر ہمارے نانا محمد حیات صاحب کی خدمت میں لایا۔ نانا صاحب نے مجھ سے کیفیت دریافت فرمائی۔ میں نے حال مفصل بیان کر دیا۔ آپ نے مجھ کو دو تین طمانچے لگائے اس وقت ہماری عمر کوئی دس بارہ برس کی تھی۔ پھر فرمانے لگے کہ شیخ عبدالقادر کیا تیرے لیے دوربین لگائے بیٹھے ہیں کہ ہر دم تاکتے رہیں گے یا ہر وقت تیرے ساتھ پھریں گے خبردار تم جانو گے جو پھر ایسا کیا۔ اگر یہ مر جاتا تو کیا ہوتا۔ غرض ہم کو مارا پیٹا اور بہت سرزنش کی تب حضرت کا غصہ فرو ہوا۔ پھر سورۂ مُزّمّل دم کر کے اُس کو پانی پلایا اور نہلایا۔ کئی دن کے بعد وہ اچھا ہوا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب ہماری عمر دس بارہ برس کی تھی کافیہ کا سبق پڑھ کر گھر کو آتے تھے۔ راہ میں ایک فقیر ملے۔ سبق وغیرہ کی کیفیت پوچھی۔ پھر فرمایا کہ ہم تم کو ایک آیت بتاتے ہیں۔ گیارہ دن تک پڑھو۔ ہم نے کہا بہت اچھا۔ پھر آیت کریمہ با مُوکّلات بتائی اور کہا کہ رات کے وقت تنہا مکان میں حصار کر کے پڑھنا اور چراغ کی لو کو دیکھتے رہنا ہم نے ایسا ہی کیا۔ اول روز تو کچھ معلوم نہ ہوا۔ دوسرے دن دو شیر جھینگے کی برابر چراغ کی لو پر لڑتے ہوئے نظر آئے۔ تیسرے دن چوہے کی برابر۔ چوتھے روز بلی کی برابر۔ پانچویں دن کُتے کی برابر ہو گئے۔ اُس وقت چراغ گل ہو گیا اور کوٹھری کا دروازہ کھل گیا۔ ہم ڈر کر بھاگے اور بڑی والدہ کی گود میں جا چھپے۔ اس وقت کچھ ہوش نہ رہا اور بخار چڑھ آیا۔ صبح کو فقیر صاحب خفا ہوتے ہوئے آئے کہ تم نے عمل خراب کر دیا۔ نانا صاحب نے فرمایا کہ شاہ جی آپ ناحق ناراض ہوتے ہیں۔ اگر عمل کرانا منظور تھا تو آپ اُس کے پاس بیٹھے ہوتے۔ بھلا یہ عمر اور جلالی عمل۔ اگر آپ ہم کو بتائیں تو دیکھو پورا کرتے ہیں یا نہیں۔ یہ سُن کر فقیر کا غصہ دھیما ہوا۔

اور ہم سے کہا کہ آؤ ہم تم کو ایک چیز بلا محنت دیتے ہیں۔ الگ لے جاکر یہ قطعہ بتایا ؎

اے کریمے کہ از خزانۂ غیب   گبر و ترسا وظیفہ خور داری
دوستاں را کجا کنی محروم   تو کہ با دشمناں نظر داری

اور کہا اس کو سوتے وقت تین بار پڑھ لیا کرو صبح کو ایک روپیہ مل جایا کرے گا۔ ہم نے پڑھا تو صبح کو روپیہ پایا اور والدہ صاحبہ کو دے دیا۔ تیسرے روز انھوں نے دریافت فرمایا کہ تم ہر روز روپیہ کہاں سے لاتے ہو۔ میں نے اصل حال کہہ دیا۔ فرمایا کہ اچھا تم ہم کو بھی اجازت دو ہم نے اجازت دے دی۔ اُن کو بھی ایک روپیہ روز ملنے لگا۔ پھر والدہ نے فرمایا کہ اپنے والد کو بھی اجازت دو۔ والد نے کہا کہ ایسا نہ ہو سب سے اس کی تاثیر جاتی رہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ میں نے والد کو بھی اجازت دے دی۔ اگلے روز کسی کو کچھ نہ ملا۔

جناب دادا صاحب نے بھی یہ تمام قصہ سُنا۔ صبح کو اپنے پاس بُلایا اور فرمایا کہ ہم تو سمجھے تھے تم نے کوئی کمال راہِ فقر کا حاصل کیا ہوگا۔ یہ کیا بڑی بات ہے جو تم نے سیکھی تھی۔ آج رات کو یہ شعر پڑھ کر سونا ؎

کریما بہ بخشائے بر حالِ ما   کہ ہستم اسیرِ کمندِ ہوا

یہ عمل کیا تو پانچ روپیہ روز ملنے لگے۔ تیسرے دن دادا صاحب نے فرمایا کہ اگر تم ہزار آدمیوں کو ہر روز اجازت دوگے تب بھی اس عمل کی یہی تاثیر رہے گی۔ آؤ اب تم کو پچاس روپے روز کا عمل بتائیں۔ عَزَّمْتُ عَلَیْکَ یَا شَمْسَائِیْلُ یَا قُدُّوْسُ یَا رَزَّاقُ یَا بَاسِطُ یَا وَکِیْلُ یَا مَیْمُوْنَۃُ بِسِرِّ یُعْتِرٍ یَا مَعَاشِرَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ الْاَرْحَمِنِ تَحْضُرُوْ بِحَقِّ گَاگَائِیْلُ بِحَقِّ اَسْمَاءِ الْحُسْنٰی وَ بِحَقِّ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ یَا ھَمْ یَا ھَمْ بِحَقِّ نُوْرَائِیْلُ اس عمل کو بھی کیا تو فی الحقیقت ٹھیک پایا۔ پھر دادا صاحب نے فرمایا کہ آیندہ یہ عمل نہ کرنا۔ فقیر کو نانِ جویں بس ہے۔ ہاں اشد ضرورت ہو تو مضائقہ نہیں۔ اگر تم شہنشاہی عمل چاہتے ہو تو ایک عمل ہماری آبائی میراث ہے لیکن فقیری

بغیر رضا و تسلیم کے حاصل نہیں ہوتی ۔ وہ عمل یہ ہے:۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہ یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ یَا ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ یَا کَافِیْ یَا شَافِیْ
یَا ھَادِیْ یَا لَطِیْفُ یَا بَاقِیْ اَجِبْ یَا رُوْقَائِیْلُ اَنْتَ وَخُدَّامُکَ مِنَ الرُّوْحَانِیَّۃِ
السَّمَاوِیَّۃِ وَالْاَرْضِیَّۃِ اَنْتَ یَا مَذْھَبُ سَامِعًا مُطِیْعًا بِحَقِّ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
وَبِحَقِّ مَلِکِ الْغَالِبِ عَلَیْکُمْ اَمْرُہٗ اَبْجَدُ وَبِحَقِّ بِطَطِیْلِ وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ
وَزَھَقَ الْبَاطِلُ ط اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَھُوْقًا ہ اَقْسَمْتُ عَلَیْکُمْ یَا کَرْسَائِیْلُ
سَخِّرْنِیْ قُلُوْبَ جَمِیْعِ بَنِیْ اٰدَمَ وَبَنَاتِ حَوَّا بِحُرْمَتِ سَیِّدِکَ کَھُوْذَفِ وَبُوْشِ
اَنْتَ حُبِّیْ بِالسَّمَآءِ وَ تَحْتَ تَحْضُرُوا تَحْضُرُوا لِمُسَخَّرَاتِ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ یَا قَادِرُ
الْمَلَکُوْتِ وَالْجَبَرُوْتِ وَاللَّاھُوْتِ وَالْھَاھُوْتِ سَخِّرْلِیْ قُلُوْبَ کُلِّ شَیْءٍ
وَبِکُلِّ شَیْءٍ بِقُدْرَتِہٖ وَبِعَظَمَتِہٖ بِحَقِّ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ
الرَّاحِمِیْنَ وَبِحَقِّ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ہ

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب حضرت قبلہ گاہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تبدیلی دہلی کو ہوئی تو مجھ کو بھی وطن سے طلب فرمایا اور مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں سپرد کر دیا۔ ایک لڑکا رسالدار بہادر کا ہمارا ہم عمر و ہم سبق تھا اور چونکہ حضرت والد ماجد اور رسالدار صاحب میں واسطۂ اتحاد تھا اس لیے ہم دونوں میں بھی اُنس ہو گیا۔ ایک دن لڑکے نے پچاس روپے بطورِ قرض مانگے۔ میں نے دے دیے کیونکہ حضرت قبلہ کی تنخواہ میرے پاس رہتی تھی اور اس امر کی اطلاع بھی حضرت کو کر دی۔ فرمایا کہ خوب کیا۔ لیکن اس سے لینا نہیں۔ دو مہینہ بعد وہ روپیہ لایا۔ میں نے انکار کیا۔ اُس نے اپنے والد سے کہا۔ وہ خود دے کر آئے۔ حضرت قبلہ نے فرمایا کہ رسالدار صاحب بچوں کے معاملہ میں آپ کیوں پڑتے ہیں وہ آپس میں بھگت لیں گے۔ میں نے نہ روپیہ دیا نہ آپ سے لوں۔ خیر حسابِ دوستاں در دل سمجھ کر وہ چپ ہو رہے۔ مگر وہ روپیہ بصورت تحائف ادا کیا۔ وہ لڑکا ہمارا یار نہایت حسین و جمیل آدمی تھا۔ یہاں تک کہ اپنے حسن صورت پر آپ فریفتہ ہو گیا۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ آئینہ روبرو ہے اور آٹھ آٹھ آنسو رو رہا ہے۔

میں نے پوچھا کیوں بھائی خیر ہے۔ بولا کیا کہوں مجھ کو اپنی صورت پر آپ پیار آتا ہے۔ اگر دوسرے پر عاشق ہوتا تو بھلا اس کو گلے سے تو لگا سکتا۔ اب خود ہی عاشق خود ہی معشوق۔ کروں تو کیا کروں۔ میں نے کہا کہ یہ تو کچھ بڑی بات نہیں۔ تم آئینہ میں اپنے آپ کو دیکھو اور میری چھاتی سے لگ جاؤ۔ ہنسنے لگا اور کہا کہ بھائی تم کو تو ہر وقت دل لگی ہی سوجھتی ہے۔ تمھاری بلا سے کوئی مرے یا جیے۔ پھر آئینہ پھینک کر کھڑا ہو گیا ع

عاشق و عشق و بُت و بُت گرو عیار یکے ست

ایک روز ارشاد ہوا کہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب سے ہم سبق پڑھتے تھے کہ ایک شخص امیرانہ لباس پہنے ہوئے آیا اور عرض کی کہ میری سرگذشت سننے کے قابل ہے۔ حضرت میری عقل کام نہیں کرتی۔ حیران ہوں کہ کیا کروں اور کہاں جاؤں۔ آپ کی خدمت میں اس لیے آیا ہوں کہ جو ارشاد ہو بجا لاؤں۔ میں لکھنؤ کا باشندہ اور روزگار پیشہ آدمی تھا۔ ایک دفعہ بیکاری کے باعث گھر پر تنگی سے گذرنے لگی۔ ارادہ کیا کہ کہیں باہر نکل کر تلاش معاش کروں۔ سرمایہ کم رہ گیا تھا۔ تھوڑا سا زادِ راہ لے کر اودے پور کو چلا۔ اثنائے راہ میں ریواڑی آئی۔ اُس زمانہ میں وہاں صرف ایک سرائے اور نیچہ آباد تھا۔ اُس سرائے میں چند بھٹیاریاں اور دو ایک کسبیاں رہتی تھیں۔ میں سرائے میں اُترا اور گھوڑا باندھ کر خاموش و متفکّر چارپائی پر جا بیٹھا کیونکہ خرچ پاس نہ تھا۔ اتنے میں ایک کسبی آئی اور کہنے لگی کہ میاں جوان کس فکر میں بیٹھے ہو۔ کھانے دانے کا سامان کیوں نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ ابھی ہارا تھکا آیا ہوں ذرا سستا لوں تو کچھ بندوبست کروں۔ وہ چلی گئی اور ذرا دیر بعد پھر آئی۔ کہا اب کیا دیر ہے۔ میں نے پھر وہی جواب دیا۔ تیسری بار پھر آئی اور بولی کہ یہ کیا بات ہے گھوڑا اٹا پٹا ہے اور تم کو کچھ فکر نہیں — ناچار جو بات تھی میں نے سچ سچ کہہ دی کہ کوڑی گرہ میں نہیں رہی۔ اب گھوڑا یا ہتھیار بیچتا ہوں تو نوکری کیسے کروں گا۔ اور یہ کروں تو خرچ کہاں سے لاؤں۔ وہ چپکی چلی گئی اور دس روپیہ لا کر میرے حوالے کیے کہ لو یہ روپیہ میں نے چرخہ کات کر اپنے کفن دفن کے لیے جمع کیا ہے۔ آپ کو قرضِ حسنہ دیتی ہوں۔ جب تم کو خدا دے ادا کر دینا۔ غرض

میں وہ روپیہ خرچ کرتا ہوا اودے پور پہونچا۔ وہاں جھٹ پٹ نوکری مل گئی اور کچھ ایسا فضل ربی ہوا کہ پانچ ہی برس میں امیر کبیر بن گیا۔ پھر تو حشم خدم ہاتھی گھوڑے سب ٹھاٹھ امیرانہ مہیا تھا۔ گھر سے خط آیا کہ لڑکا جوان ہو گیا بیٹی والے تقاضا کرتے ہیں۔ جلد آکر شادی کا سامان کرو۔ میں راجہ سے رخصت لے کر بڑے ٹھاٹھ سے چلا اور ریواڑی کی طرف کو روانہ ہوا۔ جب اُسی سرائے میں اُترا تو کسبی کا حال دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ مہینہ بھر سے بیمار اور کوئی دم کی مہمان ہے۔ جب اُس کے پاس پہونچا تو میرے سامنے جاں بحق ہو گئی تجہیز و تکفین کی اور اپنے ہاتھ سے اُس کو قبر میں اُتارا اور دفن کر کے چلا آیا۔ جب آدھی رات گذری تو خیال آیا کہ جیب میں پانچ ہزار کی ہنڈی تھی دیکھا تو ندارد۔ بڑی پریشانی ہوئی۔ سوچتے سوچتے ذہن میں گذرا کہ ضرور اُس قبر کے اندر ہنڈی گری۔ پلنگ سے اُٹھ سیدھا قبرستان میں پہونچا اور قبر کھود ڈالی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ نہ وہاں میّت ہے نہ ہنڈی۔ ہاں ایک طرف کو دروازہ سا نظر آتا ہے۔ اس کے اندر چلا گیا۔ نہایت پُرفضا و دلکشا باغ نظر آیا۔ اُس میں ایک مکانِ عالیشان ہے فرش و فروش سے آراستہ اور ایک عورت نہایت حسین و مہ جبین بیٹھی ہے۔ دل میں خیال آیا کہ یہ تو کسی شاہزادی کا مکان ہے۔ ایسا نہ ہو کوئی مجھے روکے ٹوکے۔ جھجک کر قدم پیچھے ہٹایا ہی تھا کہ اُس کے گرد جو پرستار و غلام دست بستہ کھڑے تھے۔ ایک میرے پاس آیا اور بُلا کر لے گیا۔ اب وہ عورت کہتی ہے کہ تم نے مجھ کو پہچانا نہیں۔ میں نے کہا نہیں۔ کہا اجی! میں وہی تو ہوں جس نے تم کو دس روپئے دیے تھے۔ آج اس کی بدولت اللہ تعالےٰ نے یہ عروج مجھ کو عطا فرمایا ہے۔ لو یہ تمھاری ہنڈی بھی موجود ہے جو قبر میں گر پڑی تھی اب دیر نہ کرو چلے جاؤ۔ میں نے کہا کہ ذرا یہاں کی سیر تو کر لوں۔ وہ بولی کہ یہاں کی سیر قیامت تک بھی نہ کر سکو گے اِتنی ہی دیر میں دنیا کے اندر کیا سے کیا ہو گیا ہو گا۔ بس تم جاؤ۔ خیر میں اُس کے کہنے کے موافق چلا آیا۔ شاید کوئی تین گھڑی کا عرصہ لگا ہو گا۔ قبر کے باہر نکل کر دیکھتا ہوں تو زمانہ کا رنگ ہی کچھ اور ہے۔ نہ وہ تکیہ نہ وہ سرائے۔ نہ وہ آدمی نہ وہ بستی۔ سرائے کی جگہ پر ایک شہر آباد ہے۔ پہلا حال جس سے پوچھتا ہوں وہ مجھ کو دیوانہ بتاتا ہے اور کہتا ہے میاں خیر ہے کیسی سرائے اور کون امیر سے

اے ہم نفس نہ پوچھ عبث ہے کہاں سرائے ہم ہیں مسافر اور جہاں کارواں سرائے

آخر ایک آدمی نے کہا کہ چلو میں تم کو ایک بزرگ کے پاس لے چلوں۔ شاید اُن سے کچھ پتہ لگے۔ وہ بڑا معمر آدمی تھا۔ میرا حال سن کر اُس نے بحرِ تفکر میں غوطہ لگایا اور بہت تامل کے بعد کہا کہ ہاں کچھ کچھ مجھ کو یاد ہے میرے پردادا فرمایا کرتے تھے کہ اگلے زمانہ میں یہاں صرف ایک سرائے تھی اور اس میں ایک کسبی آباد تھی۔ ایک امیر آکر ٹھہرا اور اُس کسبی کا گور و کفن گیا۔ مگر آدھی رات کو وہ بھی غائب ہو گیا تھا پھر اُس کا کچھ پتہ نہ لگا۔ ہم راہی رو پیٹ کر چلے گئے۔ اس بات کو کوئی تین سو برس کا عرصہ گذرا ہو گا۔ جب میں نے حال بیان کیا کہ وہ امیر میں ہوں تو لوگ میرے گرد جمع ہو گئے اور حیرت کرنے لگے۔ اب مجھ کو خبط سا ہو گیا ہے۔ نہ گھر ہے نہ در۔ جاؤں تو کہاں جاؤں اور اس ہنڈی کو کیا کروں۔ شاہ صاحب نے کہا کہ بے شک وہاں کی ایک گھڑی یہاں کی ایک صدی ہوتی ہے۔ اب بیت اللہ کو چلے جاؤ۔ اور باقی عمر یادِ الٰہی میں گذار دو۔ چنانچہ اُن کو خرچ دے کر مکۂ معظمہ کو روانہ کر دیا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب ہم پٹیالہ میں مولوی فضل امام صاحب سے پڑھتے تھے تب بھی فقیروں کی تلاش و طلب رہتی تھی اور ہمارا ایک ہم سبق بھی اس مرض میں مبتلا تھا۔ سنا کہ راجہ کے فیل خانہ میں ایک سالک مجذوب رہتے ہیں جعفر شاہ ان کا نام ہے ہم دونوں جس وقت سبق سے فراغت پاتے اُن کی خدمت میں جاتے۔ یوں ہی برس دن گذر گیا۔ ایک دن ہمارے ہم سبق نے ان سے کہا کہ حضرت آج تو سلطان الاذکار کی اجازت دے دیجیے۔ اُس وقت جذب کی حالت تھی۔ تین بار ران پر ہاتھ مارا اور کہا کہ جاؤ اجازت ہے۔ تھوڑی دیر بعد اُس طالب علم کے بدن میں اثر ظاہر ہونے لگا۔ پہلے تو کچھ لرزہ سا محسوس ہوا۔ پھر وہ نفخۂ صور کی طرح بڑھتا گیا۔ تمام جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ہم سے کہا کہ دیکھو مولوی صاحب کو اس بات کی خبر نہ ہونے پائے۔ اثنائے راہ میں ہر بنِ مو سے خون ٹپکنے لگا۔ بہ ہزار دقت اُس کو مکان پر لائے۔ مولوی صاحب کو خبر ہوئی۔ حکیم صاحب کو بلوایا۔ کہا اُس کے قلب پر صدمہ پہونچا ہے اور حرارت شدید ہے۔ قرابہ کے قرابہ گلاب کیوڑے کے پلا دیے مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

ہر رگ وپے سے ایک آواز نکلنے لگی۔ گھنٹہ بھر کے بعد دونوں طرف کی شہ رگیں پھٹ گئیں اور وہ جاں بحق ہو گیا۔ مگر خون اور لرزہ بند نہ ہوا۔ مولوی صاحب نے ہم سے پوچھا کہ اصل ماجرا کیا ہے۔ ہم نے سارا حال کہہ سنایا۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ میاں پہلے سے کیوں نہ کہا۔ خیر اب کیا ہوتا ہے۔ منظورِ خدا یہی تھا۔ مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ غرض نہلا دھلا اور کفن پہنا جنازہ جعفر شاہ کے سامنے لے گئے اور مولوی صاحب نے کہا کہ میاں صاحب یہ کیا کیا۔ بولے میں کیا کروں تمہارے یہ مُنڈے روز آکر مجھ کو ستاتے اور انگلی کرتے تھے آج میری زبان سے بھی ایک بات نکل گئی۔ اب لے جاؤ۔ مولوی صاحب نے کہا کہ حضرت یہ خون بہنا اور بدن کا ہلنا تو بند ہو جائے۔ فرمایا کہ بس صاحب یہ تو قیامت تک یوں ہی رہے گا۔ ایسے شہیدوں کا کہیں خون بند ہوتا ہے۔ آخر لے جا کر دفن کر دیا۔ مولوی صاحب پھر جعفر شاہ صاحب کے پاس آئے اور ہماری طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس لڑکے کو کہیں نہ مار ڈالنا۔ بولے صاحب میں کیا کروں۔ یہ روز آکر چھیڑتے ہیں۔ ان کو منع کر دو۔ گو یہ واقعہ روبرو گذرا اور مولوی صاحب نے بھی منع فرمایا مگر ہم نے بھی اُن کے پاس کا جانا نہ چھوڑا۔ وہ بھی ہمیشہ التفات فرماتے رہے۔

ایک بار حضرت قبلہ غلام علی شاہ صاحب کے ایک خلیفہ آگئے۔ ہم سے پوچھا کہ یہاں کوئی کامل فقیر بھی ہے۔ ہم نے کہا کہ ہاں چلیے۔ ہم ان کو جعفر شاہ صاحب کے پاس لے گئے اور کہا لو حضرت آج ایک اور شکار لایا ہوں فرمایا کہ اچھا بیٹھ جاؤ۔ باتیں ہونے لگیں خلیفہ صاحب بولے کہ حضرت میرے لطائف جاری نہیں ہوتے آپ نے فرمایا کہ نہیں ہوتے۔ یہ کہہ کر اپنے ہاتھ کو چکر دینا شروع کیا۔ اور کہنے لگے "چل بے چل بے"۔ یہ کہنا تھا کہ خلیفہ جی قلب کو پکڑ کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ ہم نے کہا کہ میاں صاحب کہیں ان کو بھی مار ڈالو گے۔ بولے کہ خوب ہوا جو تم نے یاد دلا دیا۔ خیر آیندہ یوں مناسب ہے کہ ہمیشہ چپ چاپ ہمارے سامنے آکر بیٹھ جایا کرو۔ خواہ ہم تمہاری طرف مخاطب ہوں یا نہ ہوں ہم نے کہا کہ ہاں یہی طریقہ تعلیم کا ہے۔ غرض اُن خلیفہ صاحب کو تعلیم فرما کر رخصت کیا۔

لیکن نقشبندیوں کے کام کے تو وہ رہے نہیں۔ جنگل باشی ہو گئے۔
ایک روز ارشاد ہوا کہ جب ہمارے والد ماجد کا رسالہ دہلی سے تبدیل ہو کر لکھنؤ میں پہونچا۔ اُسی دن صبح کے وقت شیخ امان اللہ جن کی عمر ساٹھ ستر برس سے کم نہ ہو گی جنگل میں رفع حاجت کے لیے گئے۔ ایک بوٹی میں سفید پھول دیکھا۔ بیٹھے بیٹھے توڑ لیا اُسی وقت دوسرا نکل آیا اُس کو بھی توڑ لیا۔ غرض سات پھول نکلے اور ساتوں توڑ لیے۔ ان آثار سے تاڑ گئے کہ ہو نہ ہو یہ اکسیر کی بوٹی ہے۔ جب قضائے حاجت کر چکے تو بوٹی کو اکھیڑ معہ پھولوں کے چٹ کر گئے۔ مکان پر آئے تھوڑی دیر گذری تھی کہ جسم سوجنے لگا۔ دوپہر میں دُم سُم ہو گئے۔ انگریز کو خبر پہونچی۔ ڈاکٹر آیا سب قصہ سُنایا۔ اس نے پوچھا کچھ تکلیف تو نہیں معلوم ہوتی۔ کہا کچھ نہیں۔ بلکہ دل کو ایک فرحت سی ہے۔ اُس نے کہا کہ ابھی علاج کی کچھ ضرورت نہیں۔ شام تک دیکھنا چاہیے۔ جب ظہر کا وقت ہوا تو جسم پھٹا اور اس کے اندر سے ایک گابھا سا نکل آیا۔ آدمی دوڑے۔ ڈاکٹر صاحب کو لائے۔ اُس نے اُس گابھے کو روئی کے پہلوں میں رکھوا دیا اور غذا کے لیے مرغ کا شوربا تجویز کیا۔ بعدہٗ ایک جُلاب دیا۔ جس میں سیاہ سُدّے نکلے۔ ہفتہ بھر میں نہایت صاف و سرخ و سفید جسم ہو گیا۔ یہ تماشا دیکھ کر سب آدمی حیران ہو گئے۔ یا تو شیخ امان اللہ ساٹھ برس کے سفید ریش بڈھے تھے۔ یا پندرہ برس کے نوجوان سبزہ آغاز بن گئے۔ سبحان اللہ! ذرا سی بوٹی میں یہ تاثیر؎

کیسی کیسی ہے عناصر میں بھی صورت بازی ۔۔۔ شعبدے لاکھ طرح کے ہیں انھیں چاروں میں
یہ جہاں ہے عجب تماشا گاہ ۔۔۔ ہر تماشا یہاں نیا دیکھا

پھر انگریز نے حکم دیا کہ اُس بوٹی کو تلاش کرو۔ تمام لشکر جستجو کے لیے دوڑ پڑا سارا جنگل چھان ڈالا کسی کو پتہ نہ ملا۔ اس تلاش میں لوگوں کا عجب حال ہوا۔ جہاں کسی بوٹی میں سفید پھول دیکھا توڑ کر کھا گئے۔ ایک شخص کی جو شامت آئی تو ایسی بوٹی کھا گیا کہ اُس کے اثر سے تمام دانت گر پڑے۔
ایک روز ارشاد ہوا کہ جب مولوی فضل امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہو گیا تو ہمارا دل بہت گھبرایا۔ پڑھنا ترک کر کے وطن کو چلے گئے۔ اُس زمانہ میں ہماری عمر اٹھارہ برس

کی تھی۔ حضرت والد نے پھر اپنے پاس دہلی میں بلالیا۔ اُن کی خدمت میں رہنے لگے۔ چند روز کے بعد ایک فقیر صاحب پنجاب سے تشریف لائے اور ایک سوداگر کے مکان پر ٹھہرے۔ ہماری ملاقات بھی اُن سے ہو گئی۔ چھ مہینے بعد فقیر صاحب کا بیٹا پنجاب سے آیا اور کہا کہ ہمشیرہ کی شادی ہے، چلیے وقت روانگی سوداگر نے ایک ٹٹو اور سو روپیہ نقد، ایک عمدہ جوڑا کپڑوں کا اور کچھ زیور ان کی بیٹی کے واسطے دیا۔ فقیر صاحب بہت خوش ہوے۔ سوداگر سے سیر بھر آنولہ سار گندھک منگائی۔ لے کر ہمارے مکان پر آئے اور کہا کہ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ۔ اس سوداگر نے ہمارے ساتھ سلوک کیا ہے۔ ہم بھی اس کا بدل کرنا چاہتے ہیں۔ ہم کو جنگل میں اپنے ساتھ لے گئے اور ایک بوٹی کا عرق گندھک میں ڈال کر پیالہ دھوپ میں رکھ دیا۔ گھنٹہ بھر میں تیل نکل آیا۔ وہ تیل لاکر سوداگر کے حوالہ کیا کہ بوتل میں بند کر کے بحفاظت رکھو۔ تمھارے کام آئے گا۔ پھر فقیر صاحب تو اپنے وطن کو چل دیے۔ سوداگر نے تیل ایک کپی میں بھر کر اُسی حجرہ میں لٹکا دیا جہاں وہ میاں صاحب رہا کرتے تھے۔ سال بھر کے بعد میاں صاحب آئے۔ تیل کی کیفیت پوچھی۔ دیکھا تو تیل کپی کو توڑ کر نکل گیا تھا اور قدرے زمین تر تھی۔ بہت افسوس کیا۔ ہمارے پاس آئے اور شکایت کرنے لگے کہ دیکھو اُس بے وقوف سوداگر نے کیسی بے قدری کی ہے۔ آؤ اس کو کچھ تماشا دکھائیں۔ ہم نے کہا کہ میاں صاحب آپ بدنام ہو جائیں گے اور یہاں سے بھاگنا پڑے گا۔ لیکن انھوں نے نہ سنا۔ آخر دو بڑی بڑی دیگیں منگوائیں اور کہا کہ حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کی گیارھویں کرتا ہوں۔ وہ مٹی کھودی جس پر تیل گرا تھا۔ کچھ پانی میں گھول کر دیگوں پر مل دی اور باقی دریائے جمن میں پھنکوا دی۔ جب دیگوں کے نیچے آگ دی گئی تو ایک سفید خاکستر ہو کر میٹھ گئی اور دوسری خالص کُندن بن گئی۔ وہ خاکستر کہ تمام اکسیرِ اعظم تھی دریا میں ڈال کر بھاگ گئے۔ دیگ والے کو خبر ہوئی۔ اُس نے سرکار میں اپنی دیگ کا دعویٰ پیش کیا۔ انگریز نے سوداگر سے حال پوچھا۔ اس نے تمام قصہ سنایا۔ حاکم نے مدعی سے سوال کیا کہ تمھاری دیگ کاہے کی تھی۔ کہا تانبے کی۔ تب حاکم نے کہا یہ دیگ تو سونے کی ہے۔ پھر تم کیسا دعویٰ کرتے ہو۔ سوداگر کی قسمت سے سونے کی بن گئی۔ اب بجز اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ پُرانی دیگوں کے عوض میں نئی لے لو۔ چنانچہ سوداگر سے نئی دیگیں دلوا دیں۔

بہت سے فقیر اُس دیگ کی خاکستر کا حال سن کر آئے۔ جب معلوم ہوا کہ دریا برد ہو گئی تو اپنا سر پیٹ لیا کہ ہائے ڈیڑھ من اکسیر جاتی رہی۔ بعد اس مقدمہ کے والد نے ہم سے دریافت کیا کہ فقیر صاحب یہ نسخہ کیا تم کو بتا گئے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ہاں وہ تیل تو میرے ہی ہاتھ سے بنوایا تھا۔ ایک اس نسخہ کی اور ایک درودِ مستغاث کی اجازت مجھ کو دی ہے۔ حضرت قبلہ گاہی نے فرمایا کہ خبردار تم ہرگز نہ کرنا متوکل رہنا ورنہ کہیں گرفتار ہو جاؤ گے۔ اُس روز سے ہم کو تو خیال بھی اس بات کا نہیں ہوا۔ ہمیشہ توکّل پر گذران رہی۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب ہمارے والد کا رسالہ لکھنؤ سے تبدیل ہو کر نصیر آباد کی چھاؤنی میں پہونچا تو کرنیل نے بلا کر ان سے کہا کہ سب آدمیوں کو ہوشیار کر دو۔ اس پریٹ پر ایک بڑا موذی سانپ رہتا ہے۔ جس کو کاٹتا ہے کھوپڑی پھٹ جاتی ہے۔ والد نے سب لشکر والوں کو آگاہ کر دیا۔ یہ خبر سُن کر ہمارے چچازاد بھائی میر عباس علی صاحب نے جو سواروں میں نوکر تھے والد سے عرض کیا کہ ارشاد ہو تو اُس سانپ کو پکڑ دوں اور ایک تماشا ایسا دکھاؤں کہ کسی نے تمام عمر نہ دیکھا ہو نہ سنا۔ مگر آپ کرنیل صاحب سے اجازت لے دیں اور جو شے اُن سے طلب کروں وہ مل جائے۔ والد نے کرنیل صاحب سے ان کی درخواست بیان کی۔ کہا کہ بہت اچھا۔ رسالدار اُس موذی کو پکڑ وادو کیونکہ اس نے چار آدمی مارے ہیں۔ میر عباس علی کو بلا کر کہا کہ جو تم مانگو گے ہم دیں گے۔ اور اگر کہو تو اس تماشے میں اور صاحب لوگوں کو بھی بلائیں۔ میر صاحب نے کہا کہ بہت اچھا جس صاحب کو جی چاہے بلا لیجیے اور پانچ من دودھ دو من کھانڈ اور سو کونڈے منگا دیجیے اور اتوار کا دن اس تماشے کے لیے مقرر کیجیے۔ الغرض اتوار کے دن سب سامان موجود ہو گیا۔ پریڈ کے گرد سارا لشکر چار راستے چھوڑ کر کھڑا کیا گیا۔ ایک طرف انگریز بھی جمع ہو گئے۔ کونڈوں میں دودھ اور کھانڈ ڈالی گئی اور اُن کے بیچ میں ایک چوکی نہایت پر تکلف بچھائی گئی اس پر ایک پیالہ چینی کا دودھ سے لبریز ریشمی رومال سے ڈھک کر رکھ دیا۔ اب میر عباس علی صاحب نے چوکی کے پاس کھڑے ہو کر جیب سے بانسری نکالی اور بجانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد سانپوں کی آمد شروع ہوئی۔ ہزارہا قسم کے سانپ جدا جدا ٹولیاں بنائے ہوئے

آئے۔ سر جھکا کر میر صاحب کو سلام کیا اور قرینہ بقرینہ کھڑے ہو گئے۔ سب سے پیچھے ایک سانپ آیا نہایت خوبصورت سنہرا رنگ ڈیڑھ بالشت کا قد ایک بڑے موٹے تازے سانپ پر سوار۔ اس کے چاروں طرف بیس بیس تیس تیس سانپ جلو میں تھے۔ جب قریب آیا تو سب سانپوں نے اُس کو سلام کیا۔ پھر اس سانپ نے سواری سے اتر کر بھائی صاحب کو سلام کیا۔ انھوں نے چوکی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ کود کر جا بیٹھا۔ کرنیل صاحب نے دریافت کیا کہ یہ کون ہے۔ بھائی صاحب نے بتایا کہ یہ سانپوں کا بادشاہ ہے اور کلی ناس اسی کو کہتے ہیں۔ کرنیل صاحب نے کہا کہ اب اس کو دودھ پینے کی اجازت دیجیے۔ بھائی صاحب نے پیالہ سے رومال اُتار کر کہا دودھ پیو۔ سب پینے لگے۔ بادشاہ بھی ناز و انداز سے ایک ایک گھونٹ پیتا اور چاروں طرف سر اُٹھا کر دیکھتا جاتا تھا۔ جب سب سانپ پی چکے اس نے بھی بس کی۔ بھائی صاحب نے ریشمی رومال سے بادشاہ کا منھ صاف کیا اور کہا کہ میں نے آپ کو تکلیف اس لیے دی ہے کہ آپ ہمارے چور کو جو چار آدمی مار چکا ہے گرفتار کر دیں۔ اس نے اردلی کے سانپوں کی طرف دیکھا۔ وہ دوڑے اور ایک سبز رنگ کے سانپ کو پکڑ لائے۔ اس کے آتے ہی پندرہ بیس سانپ ایک گروہ میں سے نکل کر بھائی صاحب کے قدموں پر آگرے گویا کہ وہ اپنے رشتہ دار کی سفارش کرتے ہیں۔ بھائی صاحب نے کہا چلے جاؤ۔ اس بدمعاش کو بے سزا دیے نہ چھوڑیں گے۔ اس کے بعد جیب سے ایک رومال نکالا اور کہا کہ دیکھو آیندہ جو ایسا کام کرے گا یہی سزا پائے گا۔ یہ کہہ کر رومال کی ایک دھجی پھاڑی۔ سانپ بھی اُسی دم سر سے دم تک چر گیا۔ پھر ہر ایک گروہ سانپوں کا سلام کرتا ہوا اپنے اپنے مسکن کو چل دیا۔ کرنیل صاحب اور تمام انگریز اور لشکر کے سپاہی اس عجیب و غریب تماشے کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کرنیل صاحب نے اُس کے صلہ میں بھائی صاحب کو انعام دینا چاہا۔ انھوں نے انکار کیا۔ کرنیل نے یہ تجویز کی کہ ہم لندن کو لکھتے ہیں وہاں سے تم کو اس کا صلہ ملے گا۔ وہ بولے کہ صاحب یہ کون سی بہادری ہے۔ کہیں معرکہ میں میں نے بڑھ کر تلوار چلائی یا کوئی ملک سرکار کو فتح کرا دیا جس کا انعام مجھ کو ملتا ہے۔ میں ہرگز راضی نہیں۔ اس میں تو میری اور بھی ہتک ہے۔ لوگ طعنے دیں گے کہ انگریزی لشکر میں سپیرے نوکر ہیں اور سپاہیوں کو

سائیوں کے کرتب پر انعام ملتا ہے۔ اس بات کو سن کر ہمارے والد اور سب انگریز افسر بہت خوش ہوئے۔ کرنیل صاحب بھی اس وقت تو چپ ہو رہے مگر چار مہینے بعد اُن کو جمعدار کر دیا اور ہمیشہ اُن کی ترقی کا خیال رکھا۔ ایک دن ہم نے بھائی صاحب سے دریافت کیا کہ تمھیں یہ بات کس نے سکھائی۔ کہا کہ ایک بنگالی فقیر ہمارے مکان پر بھیک مانگتا ہوا آیا میں نے کہا کہ میاں صاحب آپ کھانا یہاں کھایا کیجیے اور کہیں بھیک نہ مانگیے۔ وہ راضی ہوگیا اور میرے پاس رہنے لگا۔ چھ مہینے بعد اُس نے جانے کا ارادہ کیا اور مجھے حبس دم اور یہ منتر تعلیم کر گیا۔ اب میں ان دونوں کا عامل ہوں۔ وہ منتر یہ ہے اَرُبَہ جَتّا مُعطلَا ھنِدِی قَطع ضَعْتَا اگرچہ حبس دم میں یہ کامل تھے مگر اتفاق سے ایک دن پریڈ کی مسجد میں حسب عادت دو بجے رات سے چار بجے تک حبس دم کیا اور خشکی کی زیادتی سے اُتار نہ سکے۔ صبح کو تلاش ہوئی دیکھا کہ مسجد میں بے دم پڑے ہیں۔ والد بزرگوار چارپائی پر ڈال کر لے آئے۔ چونکہ ایک زمانہ میں ہم نے بھی حبس دم کیا تھا اور بھائی صاحب کے راز سے آگاہی تھی اس لیے تدبیر کی گئی اور سقّہ کو بلا کر تین مشکیں ان کے سر پر چھڑوائی گئیں بارے اُٹھ بیٹھے اور کہنے لگے کہ بہت ہی اچھا ہوا جو میں نے اپنا راز تم سے کہدیا تھا ورنہ چچا صاحب تو گاڑ داب آتے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہمارے والد کے رسالہ میں ایک نئے کرنیل صاحب بدل کر آئے اُن کے ملازموں سے معلوم ہوا کہ کرنیل صاحب صرف نوکری کے وقت باہر جاتے ہیں۔ ورنہ رات دن اپنے کمرہ میں تنہا اور چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں۔ نصف تنخواہ تو میم کو دیتے ہیں اور نصف خدا کے نام خیرات کر دیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ہمارے والد سے بہت ربط بڑھ گیا۔ ایک دن کہا کہ رسالدار صاحب آپ کی نسبت ذوق و شوق میں بہت بڑھی ہوئی ہے مگر توحید کی بو بھی نہیں۔ یہ بات سن کر والد صاحب ہوشیار ہو گئے۔ کمرہ سے باہر آ کر کہنے لگے کہ بھلا بچہ تیری توحید دیکھنی ہے۔ چونکہ حضرت کی نسبت قوی اور بڑے زور کی تھی تین چار دن میں ایسی غالب آئی کہ کرنیل صاحب پر بھی ذوق و شوق طاری ہو گیا۔ یہاں تک کہ کمرہ میں تنہا بیٹھے رویا کرتے۔ ایک روز والد صاحب نے پوچھا کہ صاحب اب وہ توحید کہاں گئی۔ جواب دیا کہ رسالدار صاحب ہم نہیں جانتے آپ نے کیا کر دیا۔ اب تو ہمارا جی رونے ہی میں لگتا ہے آپ کی نسبت نہایت زبردست ہے،

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب والد کا رسالہ نصیر آباد کی چھاؤنی میں تھا تو ہم اور والد ہمیشہ پنجشنبہ کے دن عصر کے وقت حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر جایا کرتے تھے۔ اُس زمانہ میں ولی عہدِ روس یعنی الگزنڈر اوّل اس زار کا باپ جو بالفعل تخت نشین ہے وہاں کشمیری فقیر کے بھیس میں موجود تھا۔ بہت لوگ اُس کے مرید بھی ہو گئے تھے۔ ہمارے والد بھی کبھی کبھی اس کے پاس تشریف لے جاتے مگر پہلی ہی ملاقات میں فرما دیا تھا کہ یہ شخص نصرانی ہے اور فقیری کا صرف بہروپ بھر رکھا ہے۔ چھ مہینے میں ایسی محبت بڑھی کہ اگر والد ایک ہفتہ میں ایک بار اُس سے نہ ملتے تو آدمی بھیج کر بلاتا۔ اسی عرصہ میں ایک اشتہار صدر سے کمشنر اجمیر کے پاس آیا۔ جس میں لکھا تھا کہ عرصہ دو سال سے ولی عہد روس گھر چھوڑ کر نکلا ہے۔ کہیں پتہ لگے تو اطلاع دو۔ اس کے ساتھ شہزادہ کی تصویر بھی تھی۔ مخبر بھی غضب کے ہوتے ہیں۔ کسی نے پتہ لگا لیا اور کمشنر کو خبر دی کہ شہزادہ فقیری بھیس میں حضرت کی خانقاہ کے اندر موجود ہے۔ کمشنر صاحب اوّل بطور سیر آئے اور اس کشمیری فقیر کو تصویر سے مطابق کیا تو سرِ مو فرق نہ پایا۔ دوسرے دن تمام انگریز معہ رسالہ اور پلٹن کے درگاہ شریف میں آئے اور فقیر کے سامنے ٹوپیاں اُتار کر کھڑے ہو گئے۔ بولا "بابا خیر ہے"۔ انگریزوں نے کہا کہ آپ ولی عہد روس ہیں۔ چھاؤنی میں تشریف لے چلیے۔ پہلے تو انکار کیا۔ لیکن جب تصویر دکھائی تو مان گیا اور ساتھ ہو لیا۔ لشکر نے سلامی اُتاری۔ بڑی تعظیم ہوئی۔ شہر میں روشنی کرائی گئی۔ ملک روس کو خبر گئی کہ شہزادہ مل گیا۔ وہاں سے جہاز لینے کو آ گے۔ اکیس روز بعد اجمیر سے روانہ ہو گیا۔ اس عرصہ میں ایک دن ہمارے والد کو بُلا کر دو تین گھنٹہ تک باتیں کیں اور بہت کہا کہ ہمارے ساتھ چلیے۔ اپنے باپ سے کہہ کر آپ کو بڑا عہدہ دلاؤں گا۔ والد نے کہا کہ بھلا میں اپنے بال بچوں کو چھوڑ کر کہاں جاؤں۔ گذران کے لیے تنخواہ بھی کافی ہے۔ شہزادہ نے کہا۔ اچھا آپ اپنے بال بچوں کو بھی ساتھ لے چلیے خرچ ہمارے ذمہ رہا اور اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو چھ مہینے ہمارے پاس رہا کیجیے اور چھ مہینے اپنے بال بچوں میں اور اس آمد و رفت کا خرچ میں دوں گا۔ تنخواہ آپ کی اس کے علاوہ رہی۔ ہر چند شہزادہ نے سمجھایا مگر والد راضی نہ ہوئے۔ جب شہزادہ اپنے

ملک میں پہونچ گیا تب بھی جرنیل صاحب کو چٹھی لکھی کہ میر احمد علی صاحب رسالدار سے ہمارا اسلام کہدو۔ اگر اب بھی وہ آنا چاہے تو روانہ کردو۔ جرنیل صاحب نے بُلا کر کہا کہ شہزادہ تم پر بہت مہربان ہے۔ تم چلے کیوں نہیں جاتے۔ ہم تو ذرا سا بھی سہارا پاتے تو فوراً چلے جاتے۔ معلوم نہیں تم سے کیوں اس قدر خوش ہے کہ بار بار طلب کرتا ہے۔ ہمارے نزدیک اگر مستقل طور پر نہیں جاتے تو بطور سیر ہی چلے جاؤ۔ رخصت دلا دینا ہمارا کام ہے۔ مگر والد نے جانے کا ارادہ نہیں کیا۔

ایک روز ارشاد ہوا [۱۳] **کہ میاں امیر الدین شاہ صاحب چشتی نظامی صاحب کشف** اور آزادمنش آدمی تھے۔ اُن سے باریؔ میں ملاقات ہوئی تھی۔ نہایت مہربانی سے ملتے رہے۔ ایک دن جذبہ میں آکر بڑے زور و شور کی توجہ ہمیں دی۔ بعد توجہ بولے کہ بل بے تیرا حوصلہ۔ اس وقت اگر ستونِ آہنی بھی ہوتا تو ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ مگر تم کو جنبش نہ ہوئی۔ تم کوئی بلانوش ہو۔ تمھارا پردہ پھٹا ہوا ہے۔ اُس توجہ سے ہمارا قلب آئینہ ہو گیا تھا اور پانچ سو کوس تک کی چیز ہر وقت پیشِ نظر رہتی تھی ؎

دکھلا رہی ہے دل کی صفائی جہاں کی سیر ۔۔۔ کیا آئینہ لگا ہوا اپنے مکاں میں ہے

میاں صاحب نے ایک دوا بھی از قسم کشتہ ہم کو تین دن کھلائی تھی۔ جس کا اثر اٹھارہ برس تک رہا۔ جب عرب میں ہم نے ہیضہ کیا تو وہ اثر جاتا رہا۔

ایک روز ارشاد ہوا [۱۴] کہ جب ہم اوّل بار پانی پت میں آئے تھے تو اُس زمانہ میں جمعیت شاہ کابُل باغ والے زندہ تھے۔ ان کی خدمت میں جانے کا اکثر اتفاق ہوا۔ پہلے روز جو ہم گئے تو وہ بپھرے کردوڑے۔ ہم نے کہا کہ سنو میاں صاحب! نہ کوئی دین کی غرض نہ دنیا کا مقصد۔ ہم تو آپ کو مردِ خدا سمجھ کے چلے آئے ہیں۔ اگر مرضی نہیں تو لو! ہم جاتے ہیں۔ خیر آپ کی زیارت ہو ہی گئی۔ آخر سیدھے ہو گئے۔ پاس بلایا۔ حال پوچھا اور ہر روز آنے کی اجازت دی۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ قاری نجیب اللہ صاحب کے والد مرحوم مٹھائی لے کر پہونچے اور کہا کہ میاں مردان شاہ نے یہ نذر بھیجی ہے اور عرض کیا ہے کہ اگر اجازت ہو تو کل قدمبوسی حاصل کروں۔ جمعیت شاہ بڑے خفا ہوئے۔ شیرینی پھیر دی اور کہا کہ ان کو

کہدیا کہ اپنی کو دیھاند دہیں رکھو۔ ورنہ پتھروں سے سر پھوڑ دوں گا۔ شیرنی کھلانی ہو تو حاجی صاحب کو کھلاؤ۔ یہاں اس کا کچھ کام نہیں۔ غرض کہ شاہ جی بڑے بے لاگ اور تارک آدمی تھے۔ یہ بات بھی مشکل ہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہم پانی پت میں امام بدر الدین رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر گئے تھے۔ کرنال کی سڑک پر دیکھا کہ ایک انگریز بگی میں سوار چلا آتا ہے۔ ہم نے سلام کیا۔ اُس نے بگی تھام دی۔ اور ڈنڈا ہاتھ میں لے، نیچے اُتر پڑا۔ ہم نے کہا، خدا خیر کرے۔ پاس آکر پوچھا کہ تم نے کیوں سلام کیا۔ ہم نے کہا صاحب آپ حاکم ہیں اور ہم محکوم اس لیے رسم تعظیم ادا کی۔ بولا نہیں صاحب، ہم بھی سرکاری رعایا اور تم بھی، سب برابر ہیں۔ ہم نے کہا صاحب ہمارے نزدیک تو تمھاری قوم کا ہر آدمی سرکار ہے۔ پھر اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو کچھ نہ تھا۔ خان ساماں سے مانگا۔ اُس نے جواب دیا کہ دہلی کی منڈی کے سوا اور کچھ نہیں۔ تب بولا کہ اس وقت روپیہ ہمارے پاس نہیں سلام کے بدلے ہم بھی سلام کرتے ہیں۔ سلام، سلام، سلام۔ اُس کے بعد سڑک کے کنارے بیٹھ گیا اور ہم کو بھی بٹھا لیا۔ پوچھا کہ پانی کس کنوئیں کا اچھا ہے۔ ہم نے اونچے کنوئیں کا پتہ دیا۔ وہاں سے پانی منگایا اور کھانا کھانے لگا۔ ہمارے واسطے خان ساماں سے کھانا مانگا۔ ہر چند انکار کیا مگر نہ مانا۔ ناچار ہم بھی کھانے لگے اور حال دریافت کیا تو کہا میرا بڑا بھائی پشاور میں جرنیل ہے اور میں پنیح کی چھاؤنی میں کرنیل ہوں۔ بھائی سخت بیمار تھا اس کو دیکھنے گیا تھا۔ خدا کے فضل سے آرام ہو گیا۔ اب میں اپنی چھاؤنی کو جاتا ہوں۔ ہم نے پوچھا کہ صاحب آپ کے بھائی نے کچھ سلوک بھی کیا۔ بولا، اجی! لاحول ولا قوۃ، آپ نے یہ کیا فرمایا، ہم اس واسطے نہیں گئے تھے۔ تنخواہ تھوڑی سہی مگر ہم ارادہ دینے کا رکھتے ہیں نہ لینے کا، اگر ہم ذرا بھی اس بات کا اشارہ پاتے تو اُس کی صورت سے بیزار ہو جاتے۔

گدا دست اہل کرم دیکھتے ہیں	ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں

پھر ہم سے کہنے لگا کہ ول، پادری صاحب ہمارے ساتھ چلو، ہم بہت آرام سے آپ کو رکھیں گے اور پھر یہیں پہونچا دیں گے اور آپ کے گھر کے لیے خرچ بھیجتے رہیں گے۔ جب

وہ زیادہ درپے ہوا تو ہم نے یہ کہہ کر پیچھا چھڑایا کہ صاحب ہماری والدہ ضعیفہ ہیں اُن کی خدمت اور خبر گیری کے لیے کوئی نہیں۔ ہم کو معاف رکھیے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ سید اعظم علی شاہ قبلہ کے ہمراہ راج پور جانے کا اتفاق ہوا۔ کلو کپتان کے مکان پر ٹھہرے۔ ان کو افیون کی دھت تھی۔ ہر دم پینک میں رہتے اور رات کے بارہ بجے کھانا کھاتے۔ پھر آم چوستے چوستے دو بجے سونا ملتا۔ صبح کی نماز قضا ہو جاتی۔ ہماری طبیعت گھبراتی۔ ناچار ہم نے یہ تدبیر کی کہ جس وقت مؤذن عشا کی اذان دینے کھڑا ہوا تو ہم نے سکھا دیا کہ اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ بھی کہہ دے۔ اُس نے ایسا ہی کیا۔ کپتان صاحب پینک سے چونکے' ارے! میاں جلد کھانا لاؤ آج تو صبح ہی ہو گئی۔ کھانا آگیا جب کھا پی چکے تو ٹن ٹن دس بجے۔ کپتان صاحب بولے! یہ کیا! نو بجے صبح کی اذان کس نے کہہ دی۔ مؤذن بلایا گیا۔ اُس نے کہہ دیا کہ حضور مجھ سے تو مولوی غوث علی صاحب نے فرمایا تھا کہ تو اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ اسی وقت پڑھ دے۔ میں نے اُن کے کہنے کے موافق کیا ہے۔ کپتان صاحب ہماری طرف مخاطب ہوئے۔ ہم نے کہا صاحب بارہ بجے تک بھوک کے مارے آنتیں قل ہو اللہ پڑھتی ہیں۔ پھر دو بجے سوتے ہیں۔ تو صبح کو آنکھ نہیں کھلتی۔ بجز اس بات کے کوئی چارہ نہ دیکھا۔ کپتان صاحب نے اسی وقت اپنے آدمیوں کو بلا کر حکم دیا کہ ان کو آٹھ بجے کھانا کھلا دیا کرو۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہم سونی پت میں میر اعظم علی شاہ صاحب قبلہ کے ہمراہ قلعہ کی مسجد میں رہتے تھے۔ ایک دن فریزر صاحب رزیڈنٹ دہلی تشریف لائے۔ اُس وقت میر صاحب مکان کے اندر تھے۔ ہم سے پوچھا یہ کس کا مکان ہے۔ ہم نے کہا ایک پیرزادہ کا۔ صاحب نے کہا کہ پیرزادے تو ٹھگ ہوتے ہیں۔ ہم نے کہا ہاں صاحب ہوتے ہوں گے یہی گفتگو تھی کہ میر صاحب تشریف لائے۔ صاحب نے پوچھا یہ کون ہیں۔ ہم نے کہا صاحب یہ وہی ٹھگ ہیں جن کا مکان ہے۔ بولے نہیں نہیں یہ تو پادری صاحب ہیں۔ اور ہم کو اشارہ سے منع کیا کہ وہ بات ان سے نہ کہو۔ پھر میر صاحب کا مزاج پوچھا اور پانچ روپئے نذر دیئے۔ دوسرے دن بڑے تکلف سے دعوت کی اور جب تک وہاں

قیام رہا ہر روز میر صاحب کے سلام کو آتے رہے۔ پھر دہلی کی جانب کوچ کیا۔ نہایت خلیق وخوش مزاج انسان تھا ؎

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام　　با مسلماں اللہ اللہ، با برہمن رام رام

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب اوّل مرتبہ ہم پیران کلیر گئے ہیں تو دو وقت کا فاقہ ہوا ہم نے مخدوم صاحب کے مزار پر جاکر کہا حضرت آپ نے تو عمر بھر گولریوں پر گزران کی۔ کیا ہم کو بھوکا ہی ماریئے گا۔ غور سے جو دیکھا تو قبر کو ایک سیاہ سانپ لپٹا پڑا تھا۔ خیر ہم اپنا حال کہہ کر چلے آئے۔ تھوڑی دیر میں ایک خادم کھانا لایا اور عذر و معذرت کرنے لگا کہ میں بھول گیا تھا۔ آپ معاف کریں۔ غرض وہاں سال بھر رہنے کا اتفاق ہوا۔ ایک بار تمام خادمانِ درگاہ، حضرت عبد القدوس گنگوہی رح کے عرس میں چلے گئے تھے۔ وہاں سوائے ہمارے اور کافر شاہ مجذوب کے کوئی نہ تھا۔ وہ عارضۂ اسہال میں مبتلا تھے۔ ایک دن ہم سے کہا کہ اب میرا وقت قریب آگیا ہے۔ میرا بدن اور کپڑے سب ناپاک ہیں۔ کپڑے تو تالاب پر دھولاؤ اور مجھ کو نہلا دو۔ ہم نے کپڑے دھو دیئے اور اُن کو خوب نہلا دیا۔ بعد نماز مغرب چادر تان کر لیٹ گئے اور السلام علیکم کہہ کر جاں بحق ہوئے۔ اُس زمانہ میں مزار کے آس پاس بہت جنگل تھا۔ ہم ان کی لاش کی نگہبانی کرتے رہے۔ جب آدھی رات گذری تو خیال آیا کہ اب لاش کو تنہا چھوڑتے ہیں تو خوف ہے کہ کوئی جانور نہ کھا جائے اور نہیں جاتے تو نماز قضا ہوتی ہے۔ ہم اسی فکر میں تھے کہ وہ مجذوب الا اللہ کہہ کر اُٹھ بیٹھے۔ ہم نے لاحول پڑھی اور اپنا ڈنڈا سنبھالا کہ شاید کوئی بھوت لاش کے اندر حلول کر گیا۔ مارنے کا ارادہ کیا تھا کہ وہ گھبرا کر بولے، میاں غوث علی شاہ خبردار! کوئی جن بھوت نہیں۔ میں تو وہی کافر شاہ ہوں۔ تم جو متردد تھے۔ اس لیے میں سرکار سے دوپہر کی رخصت لے کر آیا ہوں۔ اب تم جاؤ، نماز پڑھو۔ میں دو گھڑی دن چڑھے مروں گا۔ خیر، ہم نے لٹھ رکھ دیا اور اُن سے باتیں شروع کیں۔ اوّل تو ہم نے پوچھا کہ آپ ہیں کون؟ دوسرے یہ کہ آپ کو فیض کہاں سے ہوا؟ تیسرے یہ کہ مرنے کے بعد کیا گذری؟ جواب دیا کہ میں شاہزادہ ہوں، تیموریہ خاندان سے اور فیض باطنی مجھ کو حضرت مخدوم علی احمد صابر

کی روح پُر فتوح سے ہوا ہے۔ اور وہاں کا حال مختلف ہے۔ مجھ پر خیر گذری۔ زیادہ حال گفتنی نہیں۔ تم جب آؤ گے خود معلوم کرلو گے۔ اب جاؤ نماز پڑھو دیر ہوتی ہے۔ مگر اشراق پڑھ کر جلد چلے آنا۔ ہم ٹھیک وقت پر آپہونچے تو بولے کہ لو اب ہم جاتے ہیں۔ تم کفن دفن کا کچھ فکر نہ کرنا۔ مولوی قلندر صاحب جلال آبادی آتے ہیں۔ دو طالب علم بھی ان کے ہمراہ ہیں۔ وہ تمھارے شریک حال ہو جائیں گے۔ دو چادریں اُن کی اور ایک ہماری ان میں لپیٹ کر دفن کر دینا اور میری قبر مخدوم صاحب کے پائنتے میں بنانا۔ پھر بولے کہ اب انگوٹھوں میں سے جان نکل گئی۔ اب ٹخنوں میں آئی۔ اب گھٹنوں میں، اب کمر میں، اب سینہ میں، اب حلق میں، السّلام علیکم۔ اتنا کہہ کر رخصت ہوئے۔ تھوڑی دیر میں مولوی صاحب بھی تشریف لائے اور بموجب وصیت ان کو دفن کر دیا۔ پھر ہم نے تمام حال مولوی صاحب سے بیان کیا۔ بہت دیر تک متحیّر رہے اور کہنے لگے کہ حقیقت میں یہ فقیر اپنے فن کا پورا تھا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہم اور کمبل پوش دِلّی سے پیران کلیر کو چلے۔ اُن دنوں گنگا اشنان کرنے والے بھی ہردوار کو جا رہے تھے۔ اثنائے سفر میں ایک دن میں نے کمبل پوش سے کہا کہ یار بھوک لگی ہے۔ کہیں کھانا کھاویں۔ اس نے کہا کہ اگر تم میرے چیلے بن جاؤ تو میں ابھی حلوا پوری کھلاتا ہوں۔ میں نے کہا اچھا۔ اس نے ہم کو تو اپنا چیلا بنایا اور خود ایک غرقی لنگوٹی باندھ بھبھوت مل سڑک کے کنارے بیٹھ گیا۔ جسیم آدمی داڑھی صفاچٹ۔ خاصہ پرم ہنس معلوم ہونے لگا۔ اتفاقاً ایک بیکانیر کا امیر اس طرف سے گذرا۔ کمبل پوش ہاتھوں سے اشارہ کر کے ایں ایں کرنے لگا۔ ہم سے پوچھا کہ باباجی کیا چاہتے ہیں۔ ہم نے کہہ دیا کہ کھانا مانگتے ہیں، مگر ان کو حلوا پوری مرغوب ہے۔ لیکن اپنے ہاتھ سے نہیں کھاتے۔ اُس نے فوراً تیار کرایا۔ ایک کونڈے میں حلوا اور بہت سی پوریاں نذر کیں۔ وہ پھر ایں ایں کرنے لگا۔ پوچھا کہ کیا کہتا ہے۔ میں نے کہا کھلانے کو کہتا ہے۔ اُس نے کہا کہ خدا جانے کتنی دیر میں کھائے گا۔ ہماری منزل کھوٹی ہوتی ہے۔ مہربانی کر کے تم اس کو کھلا دو۔ اتنا کہہ کر خود تو چل دیا اور ہم

دونوں نے کنوئیں کے کنارے بیٹھ کر حلوا پوری کھایا اَلدُّنیَا نُ وُدٌ لَا یَحصُلُ اِلَّا بِالنُّزُوْرِ کمبل پوش نے کہا کہ بس چیلا ہو تو ایسا ہو کہ گرو کے اشارہ کو انتہا تک پہونچا دے۔

ایک روز ارشاد[۱] ہوا کہ پیران کلیر میں ایک خادم کے گھر ہماری روٹی پکتی تھی اس کی عورت کے سر پر آلہ بخش بھوت آچڑھا۔ وہ خادم روتا پیٹتا ہمارے پاس آیا اور ہم کو لے گیا۔ ہم نے آلہ بخش سے کہا کیوں صاحب جہاں ہماری روٹی پکتی ہے وہیں تم بھی آئے۔ کوئی اور جگہ نہ تھی۔ بولا خیر جب تک آپ رہیں گے میں اس عورت کے سر پر نہ آؤں گا۔ پھر ہم نے پوچھا کہ بھلا ہمارے سر پر کیوں نہیں آتے۔ جواب دیا کہ میں مغضوب الٰہی ہوں جس پر غضب ہوتا ہے اسی کے سر پر آتا ہوں۔ آپ مقبول ہیں بھلا مقبولوں کے پاس میرا کیا کام۔ پھر ہم نے کہا کہ یہ عورت بے چاری تو بدصورت ہے کبھی انگریزنوں کے پاس نہیں جاتے۔ جو نہایت خوبصورت ہوتی ہیں۔ کہا ان کا اقبال درست ہے۔ ہم نے کہا کہ خیر یہ باتیں تو ہولیں، اب یہ بتاؤ کہ حضرت بندگی شیخ داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے تم کو کیا تعلیم کیا تھا۔ وہ ہم کو بھی تعلیم کردو۔ اس بات کے سنتے ہی رونے لگا اور کہا کہ میاں صاحب ان کا ذکر نہ کیجیے کہ بن آئی مرنا پڑتا ہے۔ جب ہم وہاں سے بابری میں چلے آئے تو وہ خادم دوڑا آیا کہ صاحب الٰہ بخش پھر آنے لگا۔ میر صاحب قبلہ اُس کے لیے کچھ لکھنے لگے میں نے منع کیا کہ حضرت آپ کچھ نہ لکھیں۔ ہمارا اقرار یہی تھا اور اس کو بھی ہر قسم کے عمل آتے ہیں۔ وہ زبردست ہے آپ کے عمل سے نہیں جائے گا۔ البتہ عجز و انکسار سے چلا جائے تو کچھ عجب نہیں۔ یہ بات سُن کر میر صاحب خاموش ہو رہے۔

ایک روز ارشاد[۲] ہوا کہ جب ہم دوبارہ پیران کلیر میں گئے تو وہاں ایک بزرگ میاں غلام فرید صاحب جو بابا فرید شکر گنج کی اولاد میں سے تھے مع چند مریدوں کے تشریف لائے۔ اُن کے ہر ایک مرید کو ایک ایک خدمت سپرد تھی۔ اتفاق سے جس مُرید کو گھوڑے کی گھاس لانے کا کام سپرد تھا اُس کو بخار اس شدت سے آیا کہ بے چارہ گھاس نہ لا سکا۔ اس پر پیرجی کا غضب نازل ہوا۔ فرمایا جا! ہم نے تجھے مردود کیا اور چودہ خانوادہ سے باہر نکال دیا۔ یہ سن کر اس بے چارہ کا دم نکل گیا۔ بہت رویا پیٹا، توبہ استغفار کی،

مگر پیر جی نے ایک نہ مانی۔ آخر وہ روتا ہوا ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا کہ حضرت آج بڑا غضب ہوا، میرا کہیں ٹھکانا نہیں رہا، دونوں جہان سے راندہ گیا۔ ہم نے کہا کہ ابھی اس جہان میں تو موجود معلوم ہوتا ہے، بات تو کہہ۔ اُس نے رو رو کر اپنا تمام قصہ بیان کیا۔ ہم نے کہا ارے بے وقوف روتا کیوں ہے۔ تیرے پیر جی کو صرف چودہ خاندان یاد تھے ہم کو چھتیس یاد ہیں۔ آ تجھ کو پندرھویں خانوادے میں بھرتی کرلیں۔ تو گھبرا مت۔ لیکن تو جا اور اپنے پیر جی سے پہلے یہ بات دریافت کر کہ حضرت جب آپ نے مجھ کو چودہ خانوادوں میں داخل کیا تھا تو میں کہاں کا بادشاہ یا وزیر یا ولیِ کامل ہو گیا تھا۔ اب جو آپ نے نکال دیا تو میرے پاس سے کیا چھن گیا۔ میں تو جیسا جب تھا ویسا ہی اب ہوں۔ البتہ آپ کے نکالنے سے ایک فائدہ ہوا کہ گھاس کے بوجھ سے سبک دوش ہو گیا۔ اگر تجھ سے پوچھیں کہ یہ بات تجھ کو کہاں سے سوجھی تو کہنا کہ پندرھویں خانوادے میں داخل ہو گیا ہوں۔ یہ اس کی بسم اللہ ہے۔ غرض اُس نے جا کر اسی طرح سے بیان کیا۔ یہ سن کر اُن کے مریدوں کے کان کھڑے ہوئے اور پیر جی سے کہنے لگے کہ حضرت یہ خاندان تو بہت ہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اوّل تو گھوڑے کی گھاس سے چھوٹا، دوسرے ہم سے ایک خاندان آگے بڑھ گیا۔ اگر آپ کو آگے کے خاندان میں دسترس ہوتی، تو ہم بھی پندرھویں خاندان میں داخل ہو جاتے۔ پھر تو پیر جی کے چھکے چھٹے اور گھبرا کر بولے کہ یہ کہیں میاں غوث علی شاہ کے پاس تو نہیں جا پہونچا۔ یہ سارا فساد ان کا ہی معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ اور کسی کو یہ باتیں کیا سوجھتیں۔ الحاصل وہ ہمارے پاس دوڑے آئے اور گلہ کرنے لگے کہ واہ صاحب تم نے ہمارے سارے مرید فنٹ کر دیے۔ میں نے کہا کہ میاں صاحب! ذرا غور تو کرو، وہ بے چارے گھر بار جورو بچے چھوڑ کر آپ کے پاس خدا کا نام سیکھنے آئے ہیں یا گھوڑے کی گھاس کھودنے۔ اگر تم کو نام خدا آتا ہو تو بتا کر رخصت کرو، ورنہ جواب صاف دے دو۔ وہ بے چارے تو تمھاری خدمت گذاری کریں اور تم کسی طرح اُن پر شفقت نہ کرو۔ یہ کیا آدمیت ہے کہ جس بات کے لیے وہ مُرید ہوئے اُس کی تو آپ کو ہوا بھی نہیں لگی۔ بقول شخصے "پیر خود درماندہ شفاعت کراکند"۔

پیرے کہ کامرانی و تن پروری کند — از خویشتن گم ست کرا رہبری کند

آپ یہ تو فرمائیں کہ سوائے بزرگوں کی اولاد میں ہونے کے کچھ آپ گرہ کا کمال بھی رکھتے ہیں۔ مصرع

میراثِ پدر خواہی علم پدر آموز

شعر

ولا تا بزرگی نیاری بدست — بجائے بزرگاں نباید نشست

اور تماشا یہ ہے کہ اس بے ہنری پر اس قدر ناز، ذرا شرم کرو اور خدا سے ڈرو، میری یہ تقریر سن کر پیر جی بہت گھبرائے اور منت کرنے لگے کہ خدا کے واسطے ایسی تدبیر کرو کہ میرے مُرید برگشتہ نہ ہو جائیں، ورنہ مجھ کو بڑی تکلیف ہوگی۔ خیر میں نے پیر جی کے سب مریدوں کو جمع کر کے سمجھا دیا اور اُن کے حوالہ کیا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ پیر جی غلام فرید صاحب کو ایک علت یہ بھی تھی کہ پیران کلیر میں جو نیا فقیر آتا جھٹ اُس کے مُرید ہو جاتے اور جو کوئی طالب آتا اُس کے مُرید کرنے کا ڈھب لگاتے۔ اتفاق سے ایک پیر جی آئے ہوئے تھے اور میاں غلام فرید صاحب حسب عادت اُن سے بیعت ہو رہے تھے۔ اسی اثنا میں پیر جی غلام فرید کا ایک مُرید مرغ اور چاول اور شکر لے کر حاضر ہوا۔ وہ نئے پیر جی اس کی طرف بغور دیکھنے لگے۔ ہم نے کہا کہ صاحب اس مال پر نگاہ نہ ڈالیے۔ یہ پہلے خاوند کی اولاد ہے۔ آئندہ جو فتوحات ہوں گی اس میں آپ کا بھی حق ہوگا۔ اس بات پر دونوں صاحب ہنس پڑے اور بولے کہ میاں صاحب چپ ہو رہیے۔ کہیں ہماری پیری مریدی میں کھنڈت نہ پڑ جائے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب ہم پیران کلیر میں مقیم تھے تو ایک خاں صاحب تشریف لائے۔ کمر باندھے، تلوار لگائے، نہ سلام، نہ دعا۔ اوّل یہی سوال کیا کہ غوث علی شاہ کون ہے۔ میں نے کہا فرمائیے۔ بولے آپ کو کیمیا آتی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ ہاں آتی ہے۔ کہا کہ ہم کو بتا دو۔ میں نے کہا نہیں بتاتے۔ بولے کیوں۔ میں نے کہا کہ ہماری خوشی۔ پھر مجھ کو خیال آیا کہ یہ پٹھان ایک جاہل سپاہی اور ہتھیار بند ہے۔ ایسا نہ ہو کہ جل کر چوٹ کر بیٹھے۔ میں نے کہا کہ خاں صاحب آپ کمر کھولیں۔ آرام فرمائیں۔ بھلا ایسی چیز زبردستی یا راہ چلتے کوئی بتاتا ہے۔ آپ ٹھہریں تو سہی

دیکھا جائے گا۔ غرض خاں صاحب نے کمر کھول دی اور ہمارے پاس قیام کیا۔ اُن دنوں ہماری غذا یہ تھی کہ روکھی سوکھی نانِ جویں یا بنوار کا ساگ جو اُس جنگل میں خود رَو ہوتا تھا۔ شام کو یہی کھانا ہم نے اُن کے سامنے رکھا۔ خیر خاں صاحب نے بہ مجبوری کھانا شروع کیا۔ مگر لقمہ حلق سے اترنا دشوار تھا۔ ہم نے پوچھا کیوں صاحب خیر ہے؟ اچھی طرح کھائیے۔ بولے صاحب یہ ناگوار غذا تو نگلی نہیں جاتی۔ ہم نے کہا واہ آپ تو کیمیا کے طالب ہیں، بس یہی تو کیمیا کے مزے ہیں۔ اگر سیکھ لو گے تو ایسی ہی چکھوتیاں تم کو نصیب ہوں گی۔ بہت چپ ہوئے اور ولولہ سرد ہو گیا۔ ہم نے کہا خاں صاحب ذرا خیال تو کرو اگر ہم کو یہ صنعت یاد ہوتی تو کیوں لنگر کی روٹی اور یہ ترۂ بے نمک کھاتے۔ کہا کہ مجھ کو تو میاں امیر الدین شاہ صاحب نے پتہ دیا تھا کہ آپ کو کیمیا آتی ہے۔ ہم نے کہا کہ میاں اصل بات تو یہ ہے نہ اُن کو آتی ہے نہ ہم کو۔ اپنا پیچھا چھڑانے کے لیے انھوں نے یہ حیلہ کیا اور تم کو ٹال دیا۔ اور جس طرح تم طلب کرتے ہو اس طریقہ سے تو کوئی جاننے والا بھی نہیں بتائے گا۔ بڑی خدمت و اطاعت سے یہ بات حاصل ہوتی ہے۔ تم ایسا کرو کہ سری نگر کے پہاڑ پر ایک ہندو بابا جی رہتے ہیں۔ اُن کے پاس چلے جاؤ اور کچھ مدت اُن کی خدمت میں رہو۔ شاید تمھارے حال پر رحم کھا کر کچھ بتا دیں۔ خدا خدا کر کے اس پٹھان کو ہم نے ٹالا۔ اگلے روز میاں امیر الدین شاہ صاحب بھی تشریف لائے۔ میں نے کہا کہ حضرت یہ کیا بلا میرے پیچھے لگا دی تھی۔ بولے میاں وہ تو ایسا ہمارے سر ہوا کہ کسی طور سے مانتا ہی نہ تھا۔ بمجبوری تمھارے پاس بھیج دیا تھا کہ تم کسی نہ کسی ڈھنگ سے اُس کو سمجھا دو گے اور ہم تم دونوں اس بلائے ناگہانی سے چھٹ جائیں گے۔ ع

پائے کج را موزہ می بالیست کج

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہم بابری[۲۴] سے ہردوار کو چلے کہ کنبھ کا اشنان اور برہم گاتری کا پاٹ کریں۔ اس لیے کہ ہمارے رضاعی باپ پنڈت رام سنہی جی نے وطن سے چلتے وقت برہم گاتری تعلیم فرما کر کہہ دیا تھا کہ ہردوار میں گنگا کے کنارے اس کا جاپ کر لینا۔ جب کنکھل[۱] میں پہونچے تو وہاں دو پرم ہنس یعنی مجذوب دیکھے۔ کسی بے رحم ظالم نے اُن کی رانوں پر

---

[۱] نام مقام ۱۲۔

دہکتے ہوئے انگارے رکھ دیے تھے۔ ایک کی تو ران جل گئی تھی اور دوسرے کی ران پر کچھ اثر نہ تھا۔ ہم نے جھٹ پٹ انگارے الگ کیے اور اُن کو ڈولی میں سوار کرا کے جوالاپور کے تھانہ میں لائے۔ تھانہ دار سے ہماری ملاقات تھی۔ اُس نے جلے ہوئے کی مرہم پٹی کرائی۔ (یہاں حضرت قبلہ نے فرمایا کہ ان دونوں میں سے اعلیٰ درجہ میں کون تھا؟ حاضرین میں سے ایک نے جواب دیا کہ جس کی ران نہیں جلی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں جس کی ران نہیں جلی تھی وہ ابھی جسم کی حفاظت پر قادر تھا۔ لیکن دوسرے کا اِستغراق اعلیٰ درجہ کا تھا کہ تن بدن کا بھی ہوش باقی نہ رہا تھا۔ اگر اس کے استغراقِ کامل کو بزرگانِ اسلام سے نسبت دیں تو لوگ بُرا مانیں کہ اَلْحَقُّ مُرٌّ، مگر انصاف یہ ہے کہ ایسا استغراق کروڑوں میں سے کسی ایک کو ہوتا ہے۔ ورنہ ہر ایک سزاوار اس مقام کا نہیں)، ؎

اَسرارِ محبّت را ہر دِل نہ بود قابل ۔۔۔ دُر نیست بہر دریا زر نیست بہر کانے

مگر واہ رے یکسوئی۔ نہ ہم خدمت کرنے والوں سے خوش اور نہ انگارہ رکھنے والے سے ناراض۔ جس حالت میں تھے اُسی میں رہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب ہم جوالاپور سے چل کر ہردوار میں پہونچے تو سرون ناتھ جی سے ملاقات ہوئی۔ نہایت خاطر و مدارات کی۔ اپنے مکان پر ٹھہرایا۔ دونوں وقت عمدہ کھانا کھلایا۔ جب پربھی[۱] کا وقت آیا، تو ہم دھوتی باندھ قشقہ لگا کمنڈل ہاتھ میں لے، ہر کی پیڑی پر جا موجود ہوئے۔ ایک ہندو نے پوچھا تم کون ہو ہم نے کہا برہمن۔ پوچھا کون برہمن۔ ہم نے کہا کہ قنوجیے۔ بولا تمھاری چوٹی کیوں نہیں۔ ہم نے کہا جب سے سنیاس متالی ہے چوٹی کٹوا دی۔ مگر بابری کے ایک برہمن نے عین اشنان[۲] کے وقت پہچان لیا اور دانتوں کے تلے اُنگلی دے کر چپ رہ گیا۔ ہم نہا کر باہر نکلے تو وہ برہمن ہم کو علیحدہ لے گیا اور کہا کہ میاں صاحب یہاں اور وہاں کچھ فرق ہے جو آپ اشنان کرنے آئے۔ اگر کوئی اَور پہچان لیتا تو بڑی خرابی ہوتی۔ خدا تو سب جگہ ایک ہے۔ یہ بھی ایک تماشا ہے کہ ہر ایک فرقہ کا مذہب جدا ہے۔ ایک دوسرے کو جھٹلاتا ہے اور اپنے آپ کو سچا بتاتا ہے۔ اگر حقیقت کی راہ سے دیکھو تو مراد دونوں کی

---

[۱] یعنی وقت نجات ۱۲ [۲] یعنی غسل ۱۲۔

ایک ہے ؎

پڑا بت خانہ میں ہو یا طوافِ کعبہ کرتا ہو   یہاں گیا اور وہاں گیا ہے کہیں ہو، تیرا جویا ہو

اور یہ مثال بیان کی کہ چار مسافر رفیق سفر تھے۔ مگر زبانیں چاروں کی مختلف تھیں۔ انگور خریدنے کا ارادہ کیا۔ ہر ایک نے اپنی اپنی زبان میں مطلب بیان کیا۔ چونکہ ایک کی بات کو دوسرا سمجھتا نہ تھا، باہم لڑنے لگے۔ اتفاق سے ایک مردِ ہمہ داں بھی آنکلا۔ اُس نے ایک کا مطلب دوسرے کو سمجھا دیا۔ تب شرمندہ ہوئے کہ یہ کیسی بیہودہ جنگ ہے، مقصد تو سب کا انگور ہے ؎

تا سلیمانِ امینِ معنوی   در نیاید بر نخیزد ایں دوئی

جب وہ برہمن سمجھا چکے تو ہم نے کہا کہ صاحب یہ اشنان ہم نے اپنے رضاعی باپ پنڈت رام سنہی جی کی طرف سے کیا ہے کیونکہ حج کا ثواب تو اُن کو پہونچ نہیں سکتا۔ پھر ہم نے برم گاتری کا پاٹ شروع کیا۔ برم گاتری یہ ہے۔ اُوم بھُور بھُوَہ سوَہ تت سَوِی تُر وَرِنیَم بھرگو دِوَسیَ دِھی مھی دِھیُو یُو نَہ پَرچُودِیَات اُوم۔ معنی لغوی اور شرح گاتری کی یہ ہے اُوم اللہ یہ اسم افضل اسماء الٰہی میں سے ہے۔ یعنی اسم ذات۔ بھُور آسمانِ اوّل۔ یعنی اپنے تابعین کو سب درد و غم سے نجات دے کر سرورِ دائمی میں رکھتا ہے۔ بھُوَہ آسمان دوم۔ جو تمام مخلوق میں جلوہ گر ہو کر سب کو اپنی اپنی راہ پر رکھتا ہے۔ سوَہ آسمان سوم۔ یعنی ہے۔ تت یعنی اوس۔ سَوِی تُر پیدا کنندہ یعنی جو خالق اور عزت کا دینے والا ہے۔ وَرِنیَم یعنی جو بہت ماننے کے لایق ہے۔ بھرگو روشنی۔ جو پاک شکل ہے۔ دِوَسیَ روشن۔ یعنی جو سب جانوں کا روشن کرنے والا اور آرام کا دینے والا ہے۔ دِھی مھی ہم خیال کرتے ہیں یعنی ہم لوگ ہمیشہ اپنے خلوصِ عقیدت سے یقین کر کے مان لیں۔ دِھیُو یعنی حواسِ خمسہ اور دل و عقل۔ یُو یعنے جو۔ نَہ یعنی ہماری۔ پَرچُودِیَات رجوع کرے۔ یعنی مہربانی سے سب بُرے کاموں سے الگ کر کے ہمیشہ اپنی طرف رکھے۔ اُوم۔ اللہ ترجمہ اللہ تعالیٰ جو کل مخلوقات میں جلوہ گر ہے اور پرستش کے قابل ہے اُس پیدا کنندہ کا نور سب جانوں میں جلوہ گر ہے ہم فرماں بردار

خلوص عقیدت سے یقین کرتے ہیں کہ جو ہمارے حواسِ خمسہ اور دل وعقل ہیں اُن کو اپنی طرف رجوع کرے۔ اللہ۔ جس روز ہم پاٹ کر چکے تو آخر شب میں یہ خواب دیکھا کہ عین دریائے گنگ میں ایک طرف خاتمِ رُسل ہادیٔ سُبل جنابِ سرورِ کائنات خلاصۂ موجودات فخرِ خاندانِ آدم رحمتِ عالم باعثِ ایجادِ ارض و سما پیشوائے لشکرِ انبیا احمدِ مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم مع صحابۂ کرام تشریف لائے اور ایک مجلس آراستہ و پیراستہ ہوئی دوسری طرف مہاراج سری کرشن جی مع اپنے رفیقوں کے رونق افروز ہوے۔ اور ایک سبھا جم گئی۔ کرشن جی نے آنحضرتؐ سے عرض کیا کہ آپ ان کو سمجھائیے یہ کیا کرتے ہیں۔ حضرتؐ نے کہا کہ مہاراج تم ہی سمجھاؤ۔ پھر مہاراج نے مجھ کو بلایا اور کہا کہ سنو! برخوردار! تمھارے ہاں کیا کچھ نہیں۔ جو دوسری طرف ڈھونڈھتے ہو۔ کیا تم نے دوئی سمجھی ہے۔ یہاں اور وہاں سب ایک بات ہے۔ البتہ پنتھ جُدا جُدا ہیں ؎

کفر و اسلام در رہش پویاں وحدہٗ لاشریک لہٗ گویاں

انسان اپنی حد میں خوب رہتا ہے اور بڑھ کر چلتا ہے تو مطعون ہوتا ہے ؎

پار کہیں تو پار ہے اور وار کہیں تو وار پکڑ کنارہ بیٹھ رہ، یہیں وار یہیں پار

چند روز اور رہنے کا اتفاق ہوا۔ ایک دن سردن ناتھ سے اُن کی سرگذشت پوچھی۔ کہنے لگے کہ میں ایک جاٹ کا لڑکا ہوں۔ خود بخود ایک روز یہ سوجھی کہ کسی گروکا شِشیہ بنوں۔ اسی دُھن میں گھر سے نکل مُلکِ دکن کی راہ لی۔ چلتے چلتے حیدرآباد پہونچا۔ وہاں ایک بڑے بوڑھے مہاتما پائے۔ دستوں کی بیماری میں مبتلا، روپیہ بہت اسباب بے شمار، مال بے انتہا، چیلے بھی کثیر، مگر کوئی اُن کے پاس تک نہ آتا۔ اپنے اپنے عیش و آرام میں سب مصروف تھے جانشین بھی اُن کی خبر نہیں لیتا تھا۔ گروجی بے چارے اکیلے پڑے رہتے۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔ خیر جو ہو سو ہو، آؤ انھیں کے چیلے بن جاؤ "مرگِ انبوہ جشنے دارد"۔ یہ سوچ کر اُن کے پاس گیا۔ اور اپنا حال عرض کیا۔ فرمایا کہ بھائی کیوں مصیبت میں پڑتا ہے۔ میرا وقت آخر ہے۔ جب کچھ کام نہ ہو تو نام گنانے سے کیا فائدہ۔ میں نے کہا کہ مہاراج میرا یہی کام ہے کہ اس وقت آپ کی

لے محفل ۱۲ ؎ مرید ۱۲۔

خدمت گزاری کروں۔ بارے قسمت اچھی تھی۔ مجھ کو چیلہ کرلیا اور میں نے دل و جان سے اُن کی خدمت شروع کردی۔ جب وقت قریب آیا تو مجھ کو پاس بلاکر اسماء ستّہ تعلیم فرمائے اور ارشاد کیا کہ ہردوار میں جاکر گنگا کے کنارے ان کا پاٹ کرلینا۔ پھر تاثیر دیکھنا۔ وہ اسماء ستّہ جن کو ذکر شش ضربی بھی کہتے ہیں یہ ہیں کَلِیۡمُ هِرِیۡمُ شِرِیۡمُ اُوۡمُ سُوۡهُوۡ سِتِّیۡمُ اور اس طرح بھی تلفظ کرتے ہیں کلینگ ھرینگ شرینگ اونگ سونگ ستانگ لیکن اوّل صحیح ہیں۔ یہ اسماء ستّہ شاستر کے حروفِ مقطعات ہیں۔ ان کے معانی کوئی نہیں جانتا۔ بعد اس تلقین و وصیت کے گروجی جاں بحق ہوئے۔ چیلوں نے باہم مال تقسیم کیا۔ میرا حصّہ مجھ کو دیا۔ میں ہیں ہن کرکے ہردوار کو چلتا ہوا۔ یہاں پہونچ کر پاٹ کیا۔ اُس دن سے ایک عالم مسخّر ہوگیا۔ کسی چیز کی پروا نہ رہی۔ اس کے بعد سرون ناتھ نے کہا کہ فقیری تو مجھ کو ملی نہیں۔ ہاں، امیری موجود ہے۔ اگر آپ کو خواہش ہو تو اُن اسماء کی اجازت ہے۔ جب جی چاہے پاٹ کرلینا۔ یہ گدڑی جو آپ دیکھتے ہیں، اُنھیں گروجی کی دی ہوئی ہے۔ وہ گدڑی ایک رات ہم کو بھی اوڑھنے کو دی تھی۔ فی الحقیقت اُس میں عجیب تاثیر دیکھی۔ الحاصل ہم وہاں سے رخصت ہوئے اور آگے کو چل دیے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہردوار سے آگے ہم ایک منزل گئے تھے کہ ایک مسلمان فقیر سے جو نہایت عابد و زاہد تھے ملاقات ہوئی۔ بہت تپاک سے پیش آئے اور اپنے پاس ٹھہرایا۔ ان کے ہاں گائے بکریاں بہت تھیں ہمیشہ دودھ چاول کھایا کرتے تھے۔ یہی غذا ہم کو بھی دی۔ ایک دو روز تو کھائی لیکن یہاں تو زبان کو نمک مرچ کی چاٹ لگی ہوئی تھی۔ وہ خورش پسند نہ آئی۔ ایک دن ہم جنگل میں چلے گئے اور جنگلی مرغیوں کے انڈے لائے۔ کچھ ثابت کچھ چلے پکائے۔ آپ بھی کھائے اور فقیر صاحب کو بھی کھلائے۔ پھر تو ان کو بھی مزہ پڑ گیا۔ روز جاتے اور انڈے ڈھونڈھ کر لاتے۔ سچ ہے اَلصُّحۡبَتُ مُؤَثِّرٌ دنیادار کی صحبت نے فقیر کو بھی چٹورپن سکھادیا۔ خیر تو یہ ہوئی کہ ہم نے اُن کو مرغ پکڑکر نہیں کھلایا ورنہ جنگلی مرغوں کا نام و نشان بھی نہ رہتا۔ ایک دن میں نے کہا کہ میاں صاحب آپ عابد زاہد متقی پرہیزگار آدمی ہیں آپ کا قیام تو شہر میں زیبا تھا تاکہ

جمعہ و جماعت کا ثواب حاصل کرتے، خلقت آپ سے فیض پاتی، آپ اُن سے فائدہ اُٹھاتے طرفین حور و قصور کے مستحق ہوتے اور یہ ہُو کا مقام تو عارفوں کا ہے سو آپ کو اُس کی ہوا بھی نہیں لگی۔ ہم تو کچھ اور ہی سمجھ کر آئے تھے۔ پھر وہ فقیر صاحب ہم کو اپنے مرشد کے پاس لے گئے جو پہاڑ پر رہتے تھے۔ اُن سے ملاقات ہوئی البتہ وہ خوب آدمی تھے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب ہم دہرہ دون کو گئے وہاں ایک ہندو فقیر کی خبر سُن کر پہاڑ پر پہونچے۔ اُن کی ملاقات سے طبیعت بہت خوش ہوئی۔ جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ چار پانچ روز رہنے کا اتفاق ہوا۔ ایک روز تنہائی میں ہم گئے۔ اُس وقت باباجی رامائن[1] گیتا لکھ رہے تھے۔ ہم نے کہا نمو نارائن[2] بولے اجی نمو نارائن پر لاحول بھیجو، السلام علیکم کہو۔ یہ کلام سن کر ہم چونکے۔ فرمانے لگے میں سید ہوں اور میرا نام محمد حسین ہے۔ پہلے تو شاہ عبدالعزیز صاحب سے تحصیل علم کی۔ پھر وید اور شاستر کا شوق دامنگیر ہوا۔ بنارس جاکر یہ بھی پڑھا۔ خاندان قادریہ میں مرید ہوں۔ اب جوگ لے کر یہاں آرہا ہوں۔ چیلے کام کرتے ہیں۔ میں یادِ خدا میں مشغول ہوں۔ ہم نے دریافت کیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی فقیری میں آپ نے کیا فرق دیکھا۔ کہا کہ فقیری کی بات تو دونوں طرف یکساں ہے صرف الفاظ و اصطلاحات جدا ہیں۔

ہندیاں را اصطلاح ہند مدح | سندیاں را اصطلاح سند مدح

نہ من بر آں گل عارض غزل سرایم و بس | کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزار آنند

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہم دہرہ دون کے پہاڑ کی سیر کرتے ہوئے سری نگر میں پہونچے۔ ایک پہاڑ پر باباجی رہتے تھے۔ اُن سے ملاقات ہوئی۔ بڑے خلق و مدارات سے پیش آئے۔ دیکھتے ہی بولے کہ ایسی صورت تو بعد مدت دیکھنے میں آئی ہے۔ ہم کو ایک جدا مکان دیا چارپائی منگائی۔ ہر چند ہم نے انکار کیا کہ آپ زمین پر سوتے ہیں ہم بھی اسی طور بسرام کریں گے۔ ہرگز نہ مانا اور اصرار کیا کہ نہیں تم کو چارپائی ضرور چاہیے۔ چند روز میں بے تکلفی ہو گئی۔ ایک دن ان کے کسی چیلہ کو پدم ناگ نے جو ہاتھ بھر کا اور نہایت زہریلا ہوتا ہے کاٹ لیا۔ دوسرے چیلہ نے سانپ کو پتھر کے کونڈے سے ڈھانک دیا اور خود

---

[1] نام کتاب ۱۲ [2] یعنی نارائن کو سلام کرتا ہوں ۱۲۔

آکر گرو جی کو خبر دی ۔ فرمایا کہ جلدی بھبوت لا (یعنی اکسیر اعظم) اتنے میں ایسا زہر چڑھا کہ چیلہ کا منھ بند ہوگیا اور گردن کا منکا ڈھل گیا۔ کہا کہ جس طرح ہو سکے اُس کے حلق سے بھبوت اُتار دو ۔ خیر بڑی مشکل سے ایک خشخاش کی برابر راکھ سینک سے اس کو کھلادی ۔ حلق سے اُسکا اترنا تھا کہ چیلہ جھرجھری لے کر سیدھا ہوگیا اور چیلوں کو حکم دیا کہ اب اُس کو بٹھاؤ۔ تھوڑی دیر میں اُس نے بھوک کی فریاد کی ۔ تو دو سیر گھی اُس کو پلوادیا۔ اور پھر ٹہلانا شروع کیا اور جب خواہش ہوئی گھی پلادیا کچھ دیر بعد اس کو خون کا دست آیا ۔ پھر گھی پلاکر ٹہلایا، تو کچھ لہو کا دست آیا اس کے بعد غذا ئی آیا اور بھلا چنگا ہوگیا ۔ اب گرو جی نے کہا کہ اس سانپ کو لاؤ، چیلے پکڑ لائے ۔ ایک سینک سے اس کے منھ میں بھی وہی بھبوت ڈال دی اسی دم اینٹھ کر رہ گیا اور ذرا دیر میں پانی پانی ہو کر بہہ گیا اور وہ خاک پانی پر تیرنے لگی ۔ باباجی نے کہا کہ دیکھیے اس کا زہر تو اس کے لیے اکسیر ہے مگر انسان کے لیے قاتل ہے اور انسان کی اکسیر اس کے حق میں زہر ہلاہل ہے ؎

کیمیائے زہر ماران شقی　　　برخلاف کیمیائے متّقی

اور یہ حوصلہ اللہ تعالےٰ نے انسان ہی کو دیا ہے کہ اکسیر کو ہضم کرتا ہے ورنہ اور حیوانات کے حق میں تو اکسیر زہر کا حکم رکھتی ہے ؎

آں یکے را مدح در حقِ تو ذم　　　آں یکے را شہد در حق تو سم

اس کے بعد باباجی نے کہا کہ آؤ تم کو ایک اور تماشا دکھائیں ۔ ایک کڑھائی دودھ کی بھری ہوئی منگائی اور اُس میں سرکہ اور نمک ڈال کر دودھ کو پھاڑ دیا۔ مجھ سے بولے کہ بھلا اب کوئی شے اس کو درست کرسکتی ہے ۔ میں نے کہا کہ نہیں ۔ پھر وہی خاک چاول بھر اس میں ڈال کر لکڑی سے ہلانا شروع کیا۔ فوراً دودھ اصلی حالت پر آگیا ۔ پھر کتنا ہی سرکہ اور نمک اُس پر ڈالا کچھ اثر نہ ہوا ۔ جیسا تھا ویسا ہی رہا ۔ باباجی نے چیلوں کو حکم دیا کہ گڑھا کھود کر اس دودھ کو دبا دو ۔ ہم نے کہا صاحب ان چیلوں کو آپ کیوں نہیں پلا دیتے ۔ فرمایا کہ یہ پئیں گے تو کامی[۱] ہو جائیں گے ۔ پھر ہم سے براہِ عنایت فرمایا کہ اگر تم کھاؤ تو ہم

---

[۱] یعنے شہوتی ۱۲۔

کھلا دیں۔ سات پشت تک اس کی تاثیر رہے گی۔ میں نے کہا بہت اچھا مگر اس کا اُتار بھی بتا دیجیے۔ ورنہ پانچ سیر مُرغّن کھانا ہر روز کہاں سے لائیں گے۔ فرمانے لگے میاں خدا مالک ہے۔ ہم نے کہا سبحان اللہ! دَوا کھلانے کے تو آپ مالک ہیں اور کھانا کھلانے کے لیے خُدا مالک۔ میں ایسی دوا سے باز آیا۔ یہ سن کر چُپ ہو رہے۔ اُن باباجی کی عمر چار سو برس کی تھی۔ ستّر برس میں کایا پلٹ کرتے تھے۔ اس طرح کہ چھ مہینے تک ایک کوٹھری میں بیٹھ کر جہاں ہوا کا گذر نہ ہو ایک دوا کھاتے تھے۔ پہلا جسم پھٹ کر اُس کے اندر سے بارہ برس کی عُمر کا ایک جسم نکل آتا تھا۔ جن دنوں میں ہم گئے تھے وہ دَوا تیّار ہو رہی تھی۔ یہ باباجی اکسیر کے کھلانے میں بڑے اُستاد تھے۔ چند روز کے بعد **میر اعظم علی** صاحب قبلہ ہمیں تلاش کرتے کرتے وہاں جا پہونچے۔ اُن کو دیکھ کر باباجی نے پوچھا کہ یہ صاحب کون ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ ہمارے پتا ہیں۔ سُن کر بولے کہ صورت شباہت سے تو یہ بات ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔ تب میں نے کہا کہ ہمارے مُرشد اور گرو ہیں۔ کہا کہ ہاں اس کا مضائقہ نہیں۔ وقتِ رُخصت باباجی نے میر صاحب قبلہ کو ستر روپیہ اور ایک بیل اکسیر کی دی۔ وہاں سے بابری کو چلے راہ میں میر صاحب نے فرمایا کہ اکسیر کی بیل کو پھینک دو۔ میں نے عرض کیا کہ آپ عیال دار ہیں بال بچّوں کے کام آئے گی۔ فرمایا کہ نہیں اس کو دیکھ کر خراب ہو جائیں گے تب ہم نے وہ بیل پھینک دی۔

اکسیر پہ مُجھ سے اتنا نہ ناز کرنا   بہتر ہے کیمیا سے دِل کا گداز کرنا

ایک روز ارشاد ہوا[۲۹] کہ بابری میں ہم کو ایک برہمن نے یہ منتر بتایا تھا نہایت پُر تاثیر ہے:۔

دھاننگ	دھوپنگ	منو	بھوننگ	پنچ اندریان	ہون
دھیان جو ہے	دھوپ ہے	دل	راجہ	حواس خمسہ	

ناس ننگ	بھچھمہ	جاپ	سینتوک	پوجا	پوجو	دیوم
فنا ہوں	تحمل	پرستش ہے	قناعت	پوجا	پوجا اس وقت	ذات

نرنجننگ	اُڈمان	منڈپ	نرمان دیونگ	جپو نت
بخت کو	خاکساری	سائبان	عجز سے خدا کو	پوجنے والا

جُوگی جہاں بھرم نہ بھونک بِولین پُوجَا مَن پشپ

جہاں امید نہ خوف محو ہونا عبادت میں دل پھول

ڈھوپناک ست ست بھاکھنت دیوُدتی اُو دُھوتنک

خوشبودار سچ سچ بیان کرتا ہے پوچھنے والافقیر اودہو

ترجمہ یعنی خدا کے ساتھ ایسا دھیان لگاؤ کہ سلطانِ دل کی خواہش اور حواس خمسہ جو اس کے خادم ہیں دھوپ[1] کی طرح جل جائیں۔ خدا کی عبادت تحمل و قناعت سے عجز کا سائبان لگا کے عبادت کنندہ بغیر امید و خوف کے عبادت کرے۔ بلکہ محو ہو جائے۔ دل خوشبودار پھول کی طرح کِھل جائے گا۔ سچ سچ کہتا ہے پوچھنے والا اودہو

ایک روز ارشاد ہوا[۳۰] کہ جب ہم بابری میں تھے، تو مولانا روم کی مثنوی کا شوق پیدا ہوا۔ سُنا کہ مولوی قلندر صاحب جلال آبادی خوب جانتے ہیں۔ اُن کی خدمت میں جاکر کتاب شروع کی۔ جب دوسرے دفتر میں یہ شعر آیا ؎

قال را بگذار و مرد حال شو پیش مرد کاملے پامال شو

ہم نے عرض کیا کہ حضرت یہ تو قال ہی قال ہے کچھ حال کی حقیقت و ماہیت فرمائیے۔ بولے کہ بھائی یہ تو ہم بھی نہیں جانتے۔ بس اُس روز سے ہم نے کتاب بالائے طاق رکھدی۔ مولوی صاحب ایک تعویذ چند بار ہر روز لکھا کرتے تھے۔ میں نے اُس کی تاثیر پوچھی، فرمایا کہ اس میں حب و بغض و دست غیب و فتوحات و تسخیر خلائق ہے۔ چنانچہ ایک تعویذ لکھا اور فرمایا کہ یہ دستِ غیب کی نیت سے لکھتا ہوں مجھ کو دیا۔ اور کہا کہ اس کو جانماز کے تلے رکھ دو۔ پھر کچھ پڑھا اور فرمایا کہ اب جانماز اٹھا کر دیکھو۔ دیکھا تو پانچ روپیہ رکھے تھے۔ غرض اُنھوں نے ہر قسم کی تاثیر کا تجربہ دکھایا۔ فی الحقیقت نہایت مجرب تعویذ تھا۔ فرمایا کہ تم کو بھی اس کی اجازت ہے۔ اس ترکیب سے کر لینا۔ بترتیب چار عناصر اس کے چار چلے ہوتے ہیں۔ وہ تعویذ

---

[1] نام دوائے خوشبودار ۱۲۔

یہ ہے:۔

۷۸۶

۳۳۴	۳۳۹	۳۳۶
۳۳۵	۳۳۳	۳۳۱
۳۳۰	۳۳۷	۳۳۲
سادصا	سبرصا	ابرصا

مولوی قلندر صاحب سے ہم رخصت ہو کر پیران کلیر کے عرس میں پہونچے۔

ایک روز ارشاد ہوا که ایک زمانہ میں حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ کے مزارِ متبرکہ کی زیارت کو ہم گئے۔ پیران کلیر میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ جب عُرس شروع ہوا تو اطراف و جوانب سے حضرات صوفیہ کا ورود ہونے لگا۔ خوش اعتقادوں کے ہجوم اور آہنگ و سرود کی دھوم، اربابِ شوق کی مستی و اصحاب ذوق کی بالا دستی سے ہنگامۂ بزم گرم ہوا۔ میں بھی عین وجد و حالت کی گرما گرمی میں اِس مجلس کے اندر پہونچا۔ دیکھا کہ تین شخص رنگین لباس بادۂ شوق سے سرمست ہیں اور اصاغر و اکابر خاموش مطربانِ خوش آہنگ کسی سوختہ دل کا یہ شعر گاتے ہیں ؎

یہ شکایت ہے ہمیں اُس ساقیٔ گلفام سے دورِ ساغر میں ہمیں محروم رکھا جام سے

اِن میں سے ایک فریاد خواں کا ہاتھ میں نے پکڑ لیا اور پوچھا کہ آپ نے اس شعر سے کیا کیفیت اَخذ کی اور تحقیق معانی سے کیا اثر آپ کے دل پر مُترتب ہوا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ ہم جو گوہر اشک پروتے ہیں سو اللہ کو روتے ہیں۔ میں نے کہا کہ حضرت کیا آپ کے دلِ مُردہ کی طرح حَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ بھی دامِ اجل میں گرفتار ہو گیا۔ جس کے ماتم میں آپ نوحہ گری کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہوا ہو تو مقامِ تہنیت ہے نہ جائے تعزیت کیونکہ اس نے تمھارے بزرگوں کو مارا اور تمھارے فکر میں ہے ؎

بھَلَا ھُوَا اَگُرمُکھِیْن کَھَا یُوْ بِھُنْ بِھُنْ سِےْ تُوْچھُوْٹےْ جِیْ

شعر

بھلا ہوا اگر میرے سر سے ٹلی بلائے جیسے تھے ویسے بھئے اب کچھ کہا نہ جائے

یہ بات سن کر چُپ چاپ ایک گوشۂ مجلس میں جا بیٹھے نہیں معلوم کبیدہ خاطری سے گردن جھکائی یا خدا سے جی لگا بیٹھے پھر میں نے دوسرے نالہ کش سے وہی سوال کیا، جو پہلے سے کیا تھا وہ بولے حضرت کیسی غزل اور کہاں کا شعر نہ ہم سمجھتے ہیں نہ اس کو سنتے ہیں۔یہاں تو الاپ اور لَے بھلی معلوم ہوتی ہے ڈھولک کی تھاپ پر سر دُھنتے ہیں میں نے کہا کہ بہت درست ہے

کسانے کہ ایزد پرستی کنند   برآوازِ دولاب مستی کنند

پھر تیسرے صاحبِ ذوق سے بھی یہی سوال کیا۔انھوں نے فرمایا کہ حضرت شعر کا مطلب یہ ہے کہ جب حضرت خاتم الانبیا علیہ التحیۃ والثنا شب معراج کو مدارج ومقامات طے کرتے ہوے پردۂ وحدت تک پہونچے تو آواز آئی کہ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللہِ وَبَرَکَاتُہٗ پس اِس ساغر کو حضرت رسالت پناہ نے دو بخش فرمایا ایک حصہ تو خود نوش کیا اور دوسرا حصہ بندگانِ صالح کو عنایت کیا یعنی فرمایا کہ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللہِ الصَّالِحِیْنَ حسرت تو یہ ہے کہ بندگانِ صالح کو تو اُن کی صالحیت کافی تھی وہاں ہم جیسے تشنہ لبانِ بادیۂ معصیت کو یاد کیوں نہیں فرمایا ع

کہ مستحقِ کرامت گناہگاراں اند

میں نے عرض کیا کہ حضرت خیر الورا نے تو گناہگاروں کو صالحین سے بھی پہلے دورِ ساغر میں کمالِ شفقت کے ساتھ شریک فرمایا ہے چنانچہ عَلَیْنَا میں ضمیر جمع اس پر شاہد ہے۔ صالحین کو بعدِ عطف جدا یاد کیا اور عاصیوں کو اپنے ساتھ رکھا بھلا اس سے زیادہ اور کیا عنایت ہو سکتی ہے۔یہ بات سُن کر اُن کا جوش وخروش دھیما ہو گیا۔اور خاموش ہو کر ایک جانب بیٹھ گئے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک بار قلندر صاحب کے چلہ میں ہم جاکر ٹھہرے جو بوڑیہ کے قریب ہے۔**شاہ امیر الدین** صاحب بھی وہاں تشریف لائے۔فرمانے لگے کہ میاں جنگل میں رہ کر تم کھاؤ گے کیا۔ہم نے کہا کہ صاحب جو خدا کھلائے۔کچھ دیر بعد ایک شخص آیا اور چاول گھی مرغی وغیرہ لایا ہم نے اُس سے کہا کہ بھائی اگر تو

قلندر صاحب کی نذر لایا ہے تو پانی پت یا کرنال کو لے جا اور اگر زندہ قلندر کے واسطے لایا ہے تو ہمارے سامنے رکھ۔ اُس نے کہا صاحب میں تو آپ کے واسطے لایا ہوں۔ خیر، اُس کا پلاؤ پکایا گیا۔ پھر تو ہمیشہ یہی کیفیت رہی۔ چھ مہینے تک ہم وہاں ٹھہرے ہر روز کچھ نہ کچھ آتا رہا۔ اور باجو کیمیا گر جو ہمارا دوست تھا وہ بھی اکثر وہاں آیا کرتا۔ اُس کا دستور تھا کہ جب آتا تو مٹھائی وغیرہ ضرور لاتا۔ ایک روز ہم نے باجو سے سوال کیا کہ یہ فن تم کو کس طرح حاصل ہوا۔ اُس نے جواب دیا کہ میری آٹھ یا نو برس کی عمر تھی کہ والدین کا انتقال ہو گیا۔ جو نقد و جنس تھا وہ ہمارے چچا نے منگوا لیا۔ میں اُن کی گائے بھینس چراتا اور روٹی کھاتا۔ چچی مجھ کو بہت مارتی اور تنگ کرتی تاکہ میں نکل جاؤں اور میرا مال و اسباب بے کھٹکے اُن کے پاس رہے۔ چنانچہ ایک دن مجھ کو بڑی بے دردی سے مارا۔ میں بھینس لے کر جنگل کو چلا اور راہ میں بیٹھ کر رونے لگا۔ اتنے میں ایک گرو اور دو چیلے اُن کے، میری طرف کو آئے۔ مجھ کو روتا دیکھ کر ٹھٹکے۔ اور حال پوچھا۔ میں نے اپنا تمام قصہ بیان کیا۔ فرمایا کہ آ، ہمارے ساتھ چل۔ سب گائے بھینس چھوڑ۔ اُن کے ہمراہ ہو لیا۔ چند روز کے بعد گرو جی کی اُلفت و محبّت کے سبب سے وہ چیلے بھی میرے دشمنِ جانی ہو گئے۔ ایک دن گرو جی تو باہر گئے تھے۔ چیلوں نے اکیلا پا کر مجھ کو خوب پیٹا۔ میں رو رہا تھا کہ گرو جی آن پہونچے۔ پوچھا اب کیوں روتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ صاحب وہاں تو چچی دشمن تھی۔ یہاں آپ کے دونوں چیلے میری جان کے لاگو ہو گئے۔ مجھ کو رخصت فرمایئے۔ کہیں اور رہی زندگی کے دن کاٹوں گا۔ یہ بات سُن کر بولے کہ خیر اب تو ارنڈ ہی کا درخت لگائیں گے۔ سورۂ والضحیٰ سے مجھ کو قرآن شریف پڑھانا شروع کیا۔ جب یہ سورتیں حفظ ہو گئیں تو نماز کے ارکان و احکام سکھائے۔ نماز بھی بخوبی یاد ہو گئی تو ایک رات کو فرمایا کہ آج دو رکعت نماز اِس ترکیب سے پڑھ کر سو رہنا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت خضر علیہ السلام تشریف لائے اور مجھ کو تمام قسم کی ترکیبیں چاندی بنانے کی تعلیم کیں۔ علی الصباح یہ خواب گرو جی سے عرض کیا۔ فرمایا کہ اچھا ان ترکیبوں کی

آزمائش کر۔ شام تک سب ترکیبوں کا امتحان کرتا رہا۔ جو کی سو پوری اُتری۔ میرے دل کو یقین ہوگیا۔ دوسری شب پھر اُن کے فرمانے کے موافق وہی دوگانہ پڑھ کر سویا تو حضرت خضر نے سونا بنانے کی ترکیبیں ارشاد فرمائیں۔ دن میں اُن کی بھی آزمائش کی تو سب درست۔ تیسری رات پھر وہی عمل کیا تو جواہرات کی صنعت تعلیم فرمائی۔ چوتھے روز گرو جی نے رخصت کر دیا اور وہ چیلے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے میں چلا تو آیا لیکن تین دن تک یہ حال رہا کہ نہ کھانے کو جی چاہے نہ نیند آئے۔ پھر گرو کے پاس گیا اور یہ کیفیت عرض کی۔ فرمایا کہ جا تو کھلائے گا تو کیا مگر خود کھایا کر۔ اُس دن سے میں خوب کھانے پینے لگا۔ پھر ہم نے باجو سے پوچھا کہ بھلا تم نے بھی کسی کو یہ ترکیب سکھائی۔ کہا کہ ہاں ایک شخص کو تو میں نے زبردستی سکھائی اور ایک نے زبردستی مجھ سے سیکھ لی۔ جس کو میں نے سکھائی تھی اُس کا حال یوں ہے کہ ہم دو شخص کیمیاگر ہم سفر تھے۔ ایک گاؤں میں پہونچے۔ وہاں کا چودھری نہایت نیک بخت و مخیّر آدمی تھا۔ چوپال میں ہم دونوں جا اُترے۔ وہ آیا اور ایک چھوٹی سی لڑکی اُس کے ساتھ تھی جس کے کانوں میں سونے کے بالے تھے۔ ہمارا حال پوچھا اور کہا کہ جب تک جی چاہے آپ ٹھہریں کھانا ہمارے گھر سے آیا کرے گا اتفاقاً اُس روز گھر میں کچھ نہ تھا۔ اس مردِ کریم نے چھوٹی لڑکی کا بالا اُتار کر گروی رکھا اور ہم کو تین دن تک طرح طرح کا کھانا کھلایا۔ چوتھے روز ہم رخصت ہوئے اور ایک بیل اکسیر کی اُس کے حوالہ کی اور اپنے روبرو اُس کی تاثیر دکھادی اُس نے بیل تو پھینک دی اور لاٹھی لے کر ہمارے پیچھے دوڑا کہ میں نے تمھاری خدمت للہ کی تھی نہ اس طمع کے لیے۔ غرض ہم نے بمشکل تمام اُس سے پیچھا چھڑایا جب دور نکل گئے تو ہم دونوں کو یہ خیال آیا کہ دیکھو یہ شخص دنیادار ہو کر اس طرح تواضع سے پیش آیا بڑے شرم کی بات ہے کہ ایسے آدمی کو کیمیا سکھا کر نہ جائیں ہم پھر واپس آئے اور اُسی چوپال میں قیام کیا۔ چودھری نے کہا کیوں کیا پھر مار کھانے کا ارادہ ہے ہم نے کہا کہ صاحب اب کوئی بات ایسی نہ ہوگی۔ صرف تین روز ہم اور ٹھہرا چاہتے ہیں۔ بولا کہ بسر و چشم تمھاری خدمت کروں گا لیکن حرفِ طمع زبان پر لاؤ گے تو جان سے مار ڈالوں گا

میں نے کہا کہ بھائی طمع کی بات جانے دو ایک نماز تم کو بتائیں تو پڑھو گے یا نہیں۔ کہا کہ ہاں اس کا مضائقہ نہیں۔ میں نے وہی دوگانہ خضری بتایا اور کہا کہ اس کو تین روز تک پڑھنا۔ یہ کہہ کر ہم تو چلدیے۔ سال بھر کے بعد جو ہم واپس آئے تو لوگوں سے معلوم ہوا کہ وہ چودھری دیوانہ ہوگیا اور گاؤں درگاؤں بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ بہت جستجو کے بعد ملا تو ہم کو دیکھتے ہی لٹھ لے کر دوڑا اور کہا کہ خدا تم کو غارت کرے۔ تم نے مجھ کو خراب کر دیا۔ گھر بار بال بچے سب چھوٹ گئے۔ روٹی ٹکڑے کا بھی ٹھکانا نہ رہا۔ یہ کہہ کر رونے لگا اور کہا کہ خدا دشمن کو بھی اس مصیبت میں نہ ڈالے نہ دنیا رہی نہ دین۔ تمام جہان اپنی جان کا دشمن معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا شخص جس نے زبردستی سیکھا اُس کی کیفیت یہ ہے کہ ضلع سہارنپور کے ایک گاؤں میں ہم مقیم تھے۔ وہاں ایک جولاہے نے ہماری بڑی خدمت کی۔ یہاں تک کہ اپنا تمام مال و اسباب بیچ کر ہم کو کھلا دیا۔ جب وہ بالکل قلاش ہوگیا تو اُس نے ایک روز کیا کام کیا کہ قد آدم گڑھا گھر کے اندر کھودا اور اس پر ایک بوریہ بچھایا، بوریہ پر سفید چادر بچھادی اور اپنی بیوی کو سمجھادیا کہ خالی دیگچیوں میں چمچا ہلاتی رہنا تاکہ معلوم ہو کہ کھانا کوئی قسم کا پک رہا ہے۔ پھر ہم کو بُلا کر لے گیا کہ چلیے آپ کی دعوت ہے۔ ہم کو تو چاٹ لگی ہوئی تھی۔ جھٹ چلے گئے۔ پہلے تو ہم اور وہ ایک چارپائی پر بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور وہ اپنی بیوی کو تاکید کرتا رہا کہ جلدی پلاؤ زردہ پکا کر لاؤ۔ وہاں کیا خاک دھرا تھا یوں ہی جھوٹ موٹ دیگچی کھڑکا دیتی تھی۔ اسی انتظار میں آدھی رات ہوگئی۔ اُس وقت کہا کہ آؤ کھانا تیار ہے۔ ہم بخوشی اُٹھے اور سفید چادر پر قدم رکھا کہ اب تر نوالے کھائیں گے اس پر بیٹھنا تھا کہ دھم سے گڑھے کے اندر!!! میں تو گرا اور وہ دونوں میاں بیوی لٹھ لے میرے سر پر آ چڑھے اور دھڑا دھڑ مارنے لگے اور بولے کہ آج اسی گڑھے میں تم کو مار کر دبادیں گے ناچار اس کو ایک نسخہ چاندی کا بتانا پڑا۔ اُس نے دو چار دفعہ اُسی دم آزمالیا۔ تب بمشکل میری جان بچی اور اس نے رہائی دی۔ پھر پاؤں پر گر پڑا اور قصور معاف کرایا۔ اُس دن سے میں نے توبہ کی کہ پھر کسی کی دعوت نہ کھاؤں گا۔

بدوزد طمع دیدۂ ہوشمند   درآرد طمع مرغ و ماہی بہ بند

ایک روز باجو نے ہم سے دریافت کیا کہ میاں صاحب سیکڑوں آدمی میرے پیچھے پھرتے ہیں اور کیمیا کے طالب ہیں ہر ایک کا یہی سوال ہے کہ کوئی نسخہ بتا دو۔ مگر باوجود بے تکلفی اور محبت و ملاقات کے آپ نے کبھی اس امر کی خواہش نہ کی۔ اس کا کیا سبب ہے، ہم نے کہا کہ یہ تو بتاؤ کہ جو لوگ تم سے پوچھتے ہیں کیا اُن کو تم نے بتا دیا۔ کہا کہ نہیں ہم نے کہا پھر ہمیں کیا ضرورت ہے کہ تم سے خواہش کریں اور اس ملاقات میں بھی خلل ڈالیں۔ رہا فائدہ کیمیا کا سو ہم کو یوں ہی حاصل ہے کہ تم روزمرہ ملائی اور مٹھائی وغیرہ لے آتے ہو اور ہم کھا لیتے ہیں۔ اس سے زیادہ مزا کیمیا کا ہم کو درکار نہیں۔ ایک روز باجو نے بیان کیا کہ میں پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ہوئے ایک پیر جی کی خدمت میں گیا کہ حضرت مجھے مرید کر لیجیے۔ اُنھوں نے غریب و شکستہ حال دیکھ کر مجھ کو دھتکار دیا۔ اُس وقت پیر جی پھُونسی کی دھت میں مصروف تھے اور پھونک پھانک کر رہے تھے۔ میں نے اُن کی ادویات لے کر اور کچھ اپنے پاس سے ملا کر جھٹ پٹ چاندی بنا کر دکھا دی۔ پھر تو پیر جی لَٹّو ہو گئے۔ بڑی خاطر و مدارات کی اور کہا کہ تجھ کو ہم دل و جان سے مُرید کریں گے بشرطیکہ کیمیا سکھا دے۔ میں نے کہا کہ بہت اچھا تین من گُوہ بندروں کا جمع کرائیے۔ پیر جی نے مُریدوں کو حکم دیا کہ چند روز میں گوہ جمع ہو گیا۔ میں نے کہا کہ اس کو گھڑوں میں بند کر کے آگ دیدیجیے تاکہ اس کا تیل نکل آئے۔ ترکیب بتا کر میں تو چل دیا اور پیر جی نے گُوہ کو آگ دی۔ مارے بدبو کے تمام بستی کے لوگ چلا اُٹھے اور پیر جی کے گھر پر ایک شور وغل مچا دیا کہ خدا کے لیے پیر جی کیوں تمام بستی کا دم ناک میں کیا۔ یہ کیا بلا آپ نے جلائی ہے غرض پیر جی نہایت خفیف ہوئے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب ہم میرٹھ میں مقیم تھے تو کپڑے بالکل پھٹ گئے۔ گرہ میں کوڑی نہ تھی۔ مجبوراً لڑکے پڑھانے شروع کیے ؎

از توکّل در سبب کاہل مشو رمزِ الکاسب حبیب اللہ شنو
گر توکّل می کنی در کار کن کسب کن پس تکیہ بر جبار کن

جب نئے کپڑوں کے لائق دام آ گئے۔ تو پڑھانا ترک کر دیا اُسی زمانہ میں مولوی حبیب اللہ شاہ صاحب

کی خدمت میں رہے ۔ فی الواقع حضرت کی اصلاحی توجہ نہایت عمدہ تھی ۔ ہماری طبیعت کو بہت درستی اور اصلاح حاصل ہوئی اور تمام سلوک نقشبندیہ شاہ صاحب قبلہ سے طے کیا ۔ جب سیر لطائف و دوائر و انوار کی ہو چکی تو حضرت نے فرمایا کہ لو سید صاحب تعلیم ختم ہوئی ۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کی توجہ سے لطائف و دوائر کا خوب تماشا دیکھا ۔ مگر گستاخی معاف ہو خدا کا پتا نہ کسی دائرہ میں لگا نہ کسی لطیفہ میں ۔ یہ سب بھان متی کا سوانگ معلوم ہوتا ہے ۔ اُس وقت تو یہ بات اُن کو بہت ناپسند ہوئی ۔ مگر رات کو خود غور و فکر جو کیا تو بات سمجھ میں آگئی ۔ چونکہ نہایت منصف اور دانا آدمی تھے صبح کو فرمانے لگے کہ سید تم سچ کہتے ہو ۔ ہم نے جو غور و انصاف کیا تو درحقیقت خدائے بیچون و بیچگون کسی دائرہ اور لطیفہ میں مقید نہیں ۔ آفریں صد آفریں تم نے یہ بات سمجھائی ۔ صدہا طالب ہمارے پاس آئے مگر کسی نے اس سوجھ بوجھ کی گفتگو نہیں کی ۔ آؤ دہلی چل کر حضرت شاہ ابوسعیدؒ صاحب سے یہ بات عرض کریں ۔ چنانچہ شاہ صاحب مجھ کو دہلی لے گئے اول تو ابوسعیدؒ صاحب نے بڑے زور و شور کی توجہ دی ۔ لوگوں کو خیال تھا کہ دیکھیے کیا حالت ہوتی ہے مگر ہم تو جیسے تھے ویسے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے ۔ بعد اس کے مولانا حبیب اللہ شاہؒ صاحب نے وہ تقریر عرض کی ۔ شاہ ابوسعیدؒ صاحب نے فرمایا کہ یہ سوال تمہارا تو نہیں معلوم ہوتا ۔ میاں صاحب نے میری طرف اشارہ کیا ۔ اُس وقت جناب شاہ صاحب نے نہایت ہی انصاف کی بات فرمائی اور بہت ہی معقول جواب دیا کہ سنو صاحبزادہ جو کچھ ہم کو بزرگوں سے پہونچا تھا وہ تم کو پہونچا دیا ۔ اب اگر تمہارا حوصلہ فراخ اور طلب غالب ہے تو اور جگہ تلاش کرو ؎

متاعِ نیک ہر دُکان کہ باشد

من فدائے آنکہ او در ہر رباط ۔۔۔ خویش را واصل نہ داند بر بساط

ہر کہ صاحب ہمت آمد مرد شد ۔۔۔ ہم چو خورشید از بلندی فرد شد

پھر ہم دہلی سے چل دیے ۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جناب مولوی حبیب اللہ شاہؒ کے ایما کی مُوافق

مرزا غفور بیگ صاحب کی زیارت کے لیے ہم میرٹھ سے خورجہ کو روانہ ہوئے۔ اوّل ہی منزل پر موضع کھرکھودہ میں ایک لڑکا ملا۔ ہماری صورت دیکھ کر بولا کہ آپ کے پاس پانچ روپیہ اور ایک آنہ ہے۔ ہم نے کہا کیوں! اگر تم کو درکار ہو نذر ہے۔ بولا' نہیں میں تو یوں ہی کہتا تھا۔ راستہ میں ہم نے اُس سے پوچھا کہ سچ بتا تو کون ہے اور تجھ کو کیا عمل آتا ہے۔ اُس نے کہا کہ مجھ کو یہ تو خبر نہیں کہ میرا باپ کون تھا بچپن میں ٹھگ مجھ کو لے گئے تھے۔ اُن ہی لوگوں میں پرورش پائی اور ایک منتر بھی اُن سے سیکھا جس کی بدولت میرے سب کام نکلتے ہیں۔ میں آپ کو بھی اس منتر کی اجازت دیتا ہوں۔ منتر یہ ہے اُوْاُوْاُمْرَ ھَا اُمْرَھِیْ اَھلاَ اَھلاَ کَھلاَ کَھلاَ کَھلاَ کَھلاَ کَی کِھیجَا کَرْ سَاگَھَا یُوھَا ھَلْسَا یَا بَلَبْ یَا بَلَبْ یَا بَلَبْ۔ اگر کوئی امیر مل گیا تو آپ کو اس کا تماشا دکھاؤں گا۔ غرض جب ہم دونوں مرزا صاحب کی خدمت میں پہنچے اور چند روز رہے تو ایک دن اُس لڑکے کے سامنے ہم نے مرزا صاحب کی تعریف بیان کی۔ کہنے لگا کہ آپ کہیں تو تماشا دکھاؤں۔ ہم نے کہا اچھا۔ اُس نے تین کنکریوں پر یہ منتر پڑھا اور باری باری سے مرزا صاحب پر پھینکیں۔ تیسری کنکری کھاتے ہی چپکے سے گھر میں چلے گئے اور سب نقد و زیور اُس کے سامنے لا رکھا اور کہا کہ لے جاؤ۔ ہم نے وہ زیور وغیرہ اُس لڑکے سے لے لیا اور اُن کے گھر میں بجنسہٖ پہونچا دیا۔ مائی صاحبہ نے فرمایا تم نے دیکھا کہ آج مرزا صاحب نے یہ کیا خلافِ عادت کام کیا۔ اُس وقت ہم نے یوں بات بنا دی کہ حضرت ایک شخص نے امتحان کیا تھا کہ جیسے پہلے زمانہ میں حضرت ابوبکر صدّیق نے اپنا تمام مال و اسباب خدا کی راہ میں دے دیا تھا اب بھی کوئی ایسا ہے یا نہیں۔ اس واسطے مرزا صاحب نے یہ چیزیں لے جا کر ان کو دے دی تھیں۔ خیر یہ بات تو رفت و گذشت ہوئی۔ مگر تین روز تک مرزا صاحب پر منتر کا اثر رہا۔ چوتھے دن ہوش میں آئے تو فرمانے لگے کہ خدا جانے کیا اسرار تھا۔ تین دن سے ظلمات کا ابر دل پر چھا گیا تھا اور سب فیض و برکات یک قلم بند تھے۔ ہم کو نہایت تعجب ہوا کہ ایسے بڑے مشائخ پر منتر نے یہ تاثیر کی۔ وہاں ایک مجذوب بھی رہتا تھا۔ ہم نے اُس لڑکے سے کہا کہ بھلا آؤ اس پر تو

آزماؤ۔ اُس لڑکے نے جواب دیا کہ صاحب یہاں دال نہیں گلتی اُس کی رگ و پے میں ایک ایسی تاثیر سما رہی ہے کہ دوسرے کی گنجایش نہیں۔ مگر ہمارے اصرار سے وہ آمادہ ہوگیا۔ اِدھر اُس نے کنکری اُٹھائی اُدھر مجذوب نے سر اُبھارا اور للکارا کہ بچّہ کیا ہم کو بھی مرزا سمجھا ہے۔ لڑکا بولا دیکھیے میں نہ کہتا تھا کہ صاحب یہ ہوشیار ہے' اس پر کچھ اثر نہیں ہونے کا۔ ہم نے پھر کہا کہ بھلے مانس آزما تو سہی۔ خیر اُس نے تینوں کنکریاں ماریں لیکن مجذوب پر کچھ اثر نہ ہوا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ میرٹھ کی سرائے میں ہم قریب ایک مہینے کے ٹھہرے ایک اور فقیر بھی ہمارا رفیق تھا۔ وہ بنیے کی دُکان سے جنس قرض لاکر کھایا کرتا تھا۔ ایک دن چپکے سے چل دیا۔ بنیا ہمارے پاس آیا کہ اپنے ساتھی کا قرضہ دلوائیے۔ ہم نے کہا کہ بھائی ہم تجھ سے جنس نہیں لائے، لانے والے کی ضمانت نہیں کی، ہم سے کیوں دعویٰ کرتا ہے۔ جس کو دیا ہے اُس سے لے۔ جب وہ مایوس ہوکر چلا تو ہم نے کہا کہ ہم سے کچھ واسطہ نہیں لیکن تیرا روپیہ ادا کرکے جائیں گے۔ بتا کیا چاہیے۔ اُس نے اٹھارہ روپیہ بتائے۔ ہم نے دوسرے دن سورۂ یٰسین کا عمل شروع کیا۔ تیسرے دن لالہ بانکے رائے رئیس کا آدمی چونتیس روپیہ لے کر ہمارے پاس آیا اور کہا کہ لالہ صاحب نے کہا ہے کہ آپ کس جھگڑے میں پڑے ہیں۔ غرض ہم نے اُسی وقت اٹھارہ روپیہ بنیے کو دے دیئے۔ اتّفاق سے وہ فقیر ایک بار رُڑکی میں مل گیا ہم نے کہا کہ تم کو ایسا زیبا نہ تھا۔ وہ روپیہ دیتے لگا مگر ہم نے لیا نہیں۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ میرٹھ میں حافظ جلال الدین صاحب گیارھویں کیا کرتے تھے ایک بار ہم پانچ آدمیوں کی دعوت کی جب فاتحہ شروع کی تو گھنٹہ بھر تک بزرگوں کے نام پڑھتے رہے۔ بروحِ پاک فُلاں فُلاں۔ آخر ہم نے تھک کر اُن سے عرض کیا کہ حضرت سب کے شمار تو ہوگئے۔ ان پانچ صورتوں کے نام بھی پکار دیجیے جو اصل کھانے والے ہیں۔ بزرگوں کو تو ثواب جب پہونچے گا، جب ان پانچوں کا شکم سیر ہوگا۔ اس بات پر بعض لوگ تو ہنس پڑے اور بعض ناراض ہوئے لیکن عبارت فاتحہ جلد ختم ہوگئی۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک بزرگ نے ہم کو بتایا کہ گیارہ سو دفعہ یَا حَیُّ یَا قَیُّومُ پڑھ کر مراقب ہو جایا کرو۔ لیکن یہ بات کسی کے روبرو بیان نہ کرنا۔ ہم نے پڑھنا شروع کیا جب مراقب ہوئے تو دیکھا کہ ایک جسم مماثل ہمارے جسم سے جدا ہو کر سامنے کھڑا ہوا۔ یہ ماجرا دیکھ کر ہم کو حیرت ہوئی۔ اتفاقاً ایک روز حضرت **حبیب اللہ** شاہ نے دریافت فرمایا کہ تم کچھ پڑھتے ہو۔ ہم نے سب حال بیان کر دیا۔ اُس روز سے وہ بات جاتی رہی۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ شہر میرٹھ میں میاں **روشن شاہ** کوٹلے کی مسجد میں رہتے تھے اُن کے پاس ایک بزرگ تشریف لائے۔ جب رات کو سب نماز پڑھ کر چلے گئے اور مسجد میں کوئی نہ رہا دروازہ بند ہو گیا اُس وقت روشن **شاہ** سے وہ بزرگ بولے کہ بتاؤ کیا کھاؤ گے۔ جواب دیا کہ حضرت اب تو بازار بند ہو گیا، دُکاندار بھی اٹھ گئے۔ اب کھانا کہاں۔ فرمایا تم اس بات کی فکر مت کرو۔ خیر شاہ صاحب نے ایک کھانے کا نام لیا۔ اُسی وقت غیب سے کھانا آ گیا۔ دونوں نے خوب کھایا۔ پھر وہ بزرگ کمبل تان کر لیٹ رہے۔ تھوڑی دیر بعد شاہ جی نے اُن کو ٹٹولا تو خالی کمبل پایا۔ صبح کے قریب دیکھا تو کمبل میں موجود ہیں۔ کئی دن یہی کیفیت دیکھی۔ ایک دن میاں **روشن شاہ** کے ساتھ وہ بزرگ گذری کے بازار سے گذرے تو کوئی شخص گا رہا تھا۔ آواز سنتے ہی دھم سے کنوئیں کے اندر جا پڑے جو مسجد کے سامنے ہے۔ تھوڑی دیر بعد جست کر کے باہر آ گئے۔ نہ بدن بھیگا نہ کپڑے تر ہوئے۔ جب راز افشا ہو گیا تو سردھنہ کو چل دیئے اُن کے جاتے ہی میاں **روشن شاہ** کے دل میں ایک ولولہ پیدا ہوا کہ ایسے کامل بزرگ سے ہم نے کچھ فیض و فائدہ حاصل نہ کیا۔ یہ بھی اُن کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ وہ بزرگ سردھنہ میں یہ بات کہہ کر چل دیئے کہ ایک شخص اس نام کا میرٹھ سے ہم کو پوچھتا ہوا آئے گا اُس سے کہہ دینا کہ بڑوتی کو گئے۔ یہ خبر پا کر شاہ جی بھی بڑوتی پہونچے۔ وہاں پتہ لگا کہ کرنال کو گئے۔ یہ بھی کرنال پہونچے۔ وہاں پہونچ کر ملاقات ہوئی۔ شاہ صاحب نے عرض کیا کہ ہم کو کچھ تعلیم و تلقین فرمائیے۔ یہ بات سُن کر بولے اگر خدا کو منظور ہوتا کہ تم کو کچھ فائدہ ہم سے پہونچے تو ہم پہلے ہی تعلیم کر دیتے۔ اب تم شاہ آباد کی طرف

فلاں بزرگ کی خدمت میں چلے جاؤ۔ وہ تم کو تعلیم کریں گے۔ شاہ صاحب مایوس ہو کر چلے آئے ؎

این سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ایک روز ارشاد ہوا[۲۹]۔ کہ موضع منڈاور میں ہم پہونچے تو سنا کہ یہاں ایک سید صاحب شیعہ تھے۔ مرتے دم اُنھوں نے یہ وصیت کی تھی کہ ہماری دونوں لڑکیوں کی شادی نہ کی جائے۔ جب حضرت امام مہدیٔ آخر الزماں کا ظہور ہو تو یہ دونوں اُن کے نکاح میں دی جائیں۔ ہم نے سید صاحب کی بیوی سے کہا کہ امام مہدی علیہ السّلام تو شریعت محمّدی کے تابع ہوں گے۔ اور اُس شریعت میں دو بہنوں کا جمع کرنا جائز نہیں پس مناسب ہے کہ ان میں سے ایک کی شادی کر دو اور ایک امام صاحب کی نذر کے لیے رہنے دو۔ چنانچہ ایک کی شادی ہو گئی۔ اُس کے بعد ہم نے کہا کہ اب اِس غریب کو بھی کیوں بٹھا رکھا ہے۔ خدا جانے امام علیہ السلام کے ظہور تک اس کی عمر وفا کرے یا نہ کرے۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ اس کی بھی شادی کر دو اور اس کی اولاد سے امام صاحب کے زمانہ میں جو لڑکی موجود ہو وہ امام صاحب کی نذر کی جائے تاکہ وصیت بھی پوری ہو جائے۔ غرض اُس کی بھی شادی ہو گئی۔

ایک روز ارشاد ہوا[۳۰] کہ موضع منڈاور میں ہم وہاں کے صاحب سجّادہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ چونکہ اکثر بزرگوں کی عادت میں داخل ہے کہ اپنے مریدوں سے ہر قسم کا کام لیتے ہیں، میاں صاحب نے بھی اپنے مریدوں کو ہلوں میں جوت رکھا تھا۔ ایک روز جب مُرید ہل جوت کر آئے تو آپ نے فرمایا کہ ارے رات کو کچھ اللہ اللہ بھی کر لیا کرو۔ تو مرید کیا کہتے ہیں کہ اب آئی ہم بدنصیبوں کی کمبختی۔ دن کو تو ہل جوتیں اور رات کو اللہ اللہ کریں، بس اب ہم کیونکر جییں گے۔ کس شامت نفس میں گرفتار ہو گئے، باز آئے ایسی پیری مریدی سے۔ یہ بات سُن کر ہم تو ہنسنے لگے اور پیر جی چُپ رہ گئے۔ کچھ جواب نہ دیا۔ فی الحقیقت مریدوں سے کام لینا بہت بُرا ہے، اور خصوصاً طالبِ خدا سے اگرچہ بعض اولیا اللہ نے بھی بعض طالبانِ خدا سے بہت سخت کام لیے ہیں۔ لیکن اُس میں

کچھ مصلحت تھی اور آخر اُن کو اپنے مطلوب سے ملادیا۔ خرابی تو یہ ہے کہ اکثر پیرزادہ صاحب سوائے بزرگیٔ خاندان کے اپنی گرہ کا تو کچھ رکھتے نہیں اور مُریدوں کی خوب خبر لیتے ہیں۔ اگر کوئی مُرید راسخ الاعتقاد اپنی محبت سے پیر کا کچھ کام کردے تو اُس کو اختیار ہے لیکن بدلہ دینا اس کو بھی لازم ہے ھَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۝

ایک روز ارشاد ہوا ۔ کہ جب ہم گرت پور میں گئے تو دیکھا کہ صبح دم آ کر سجادہ نشین صاحب نے حضرت **احمد شاہ** کے مزار کا طواف وسجدہ کیا ہم نے کہا کہ صاحب طواف وسجدہ تو یہاں اُدا ہوا، اگر حضرت غوث الاعظم کے مزار پر آپ ہوں تو وہاں کیا کیجیے گا اور حضرت رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے کیا باقی رکھا اور خدا سے تو کچھ مطلب ہی نہیں جس کے لیے کچھ ادب وتعظیم درکار ہو۔ وہ خفا ہوگئے اور بولے کہ میاں طالب علم حجتی ہوتے ہیں اسی واسطے ان کو فیض نہیں ہوتا۔ ہم نے کہا کہ صاحب ایسے فیض کو ہمارا اسلام ہے کہ جس کے لیے خدا کو چھوڑ کر دوسرے کے سامنے سر جھکائیں اور توحید سے نکل کر شرک میں مبتلا ہوں۔

ایک روز ارشاد ہوا ۔ کہ ہم نے ایک گاؤں میں ایک بزرگ کو دیکھا کہ فقیری کے علاوہ ان میں دو کمال اور بھی تھے۔ ایک تو کیمیا گری دوسرے عمل۔ چنانچہ ایک زمیندار ان کے پاس آیا اور بیان کیا کہ میری گائے گم ہوگئی ہے۔ اُس بزرگ نے ایک تعویذ لکھا اور جس طرف گائے کا نشان دیا تھا اُس طرف کو تعویذ کا رُخ کیا۔ تھوڑی دیر میں دیکھا کہ گائے اُس طرف سے دوڑی چلی آتی ہے۔ میاں صاحب نے یہ کیفیت دیکھ کر تعویذ کا رُخ اپنی طرف کرلیا۔ وہ گائے اُلٹی پھر گئی۔ فرمایا اگر کہو تو اسی طرح دوڑا دوڑا کر اس کو ہلاک کردوں۔ پھر تعویذ سامنے کیا، گائے چلی آئی۔ ایک دن میاں صاحب ہماری بڑی تعریف وتوصیف فرمانے لگے۔ ہم نے کہا کہ آج کیا بات ہے کہ چھ مہینے بعد آپنے ہماری صفت وثنا بیان کی۔ آخر ہماری آپ کی ملاقات تو پہلے سے ہے، کبھی آپ نے تعریف نہیں کی۔ بولے کہ آج مدح وثنا کی وجہ یہ ہے کہ تم چھ مہینے سے یہاں ہو اور خوب جانتے ہو کہ میں کیمیا گر ہوں لیکن تم نے کبھی اس کی خواہش نہ رغبت ظاہر نہیں کی۔ ہم نے کہا کہ صاحب

اگر خواہش کی جاتی تو آپ بتا دیتے؟ بولے کہ سچ تو یوں ہے کہ میں نہ بتاتا۔ ہم نے کہا کہ ہمارے استغنا کی وجہ یہ ہے کہ ہم تنِ تنہا، دمِ نقد، نہ جورو نہ بچے، جہاں جاتے ہیں خدائے کریم اپنی عنایت سے دو روٹیاں پہونچا دیتا ہے۔ بھلا ہم کو کیا حاجت کیمیا کی ہے اور جس چیز کی حاجت نہ ہو اُس کی طلب لاحاصل۔ اور جب ہم جانتے ہیں کہ آپ نہ بتائیں گے تو پھر ایسی بات کا پوچھنا فضول اور محض نادانی ہے۔

ایک روز ارشاد ہوا۔ کہ مُراد آباد میں ہم رشیدی میاں کی زیارت کے لیے گئے۔ دیکھا کہ تالاب میں غُسل کر کے چلے آتے ہیں اور پیٹھ ایسی چمکتی ہے جیسے سُلفٹ کی ڈھال۔ اُسی وقت یہ مصرع ہمارے ذہن میں گذرا ع

کہ آبِ چشمۂ حیوان درونِ تاریکی ست

رشیدی میاں نے حالِ ضمیر دریافت کر کے فوراً یہ شعر پڑھا ؎

کالے گورے پہ کچھ نہیں موقوف دل کے لگنے کے ڈھنگ اور ہی ہیں

میں نے کہا سبحان اللہ ؎

کب لباسِ دنیوی میں چھپتے ہیں روشن ضمیر جامۂ فانوس میں بھی شعلہ عُریاں ہی رہا

تو بجالِ خویشتن می باش شاد تا بیابی در جہاں جانِ مراد

آں زجاجی کو ندارد نورِ جاں بول قارورہ ست قندیلش مخواں

نورِ مصباح است داد ذوالجلال صنعتِ خلق است آں شیشہ سفال

چونکہ آتش ہست خود جز آں بود آدمی آن ست کو را جاں بود

آدمی دید است باقی پوست است دید آن ست آنکہ دیدِ دوست است

چونکہ دیدِ دوست نبود کور بہ دوست کو باقی نہ باشد دور بہ

ایں نہ مردان اند ایںہا صورت اند مردۂ نان اند و کشتہ شہوت اند

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۵

ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک بار شہر بریلی میں گذر ہوا۔ وہاں **شاہ نیاز احمد** صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی۔ نہایت اخلاق سے پیش آئے۔ بہمہ صفت موصوف

تھے ۔ ہم چند روز وہاں ٹھہرے ۔ ایک دن میاں صاحب فرمانے لگے کہ تم ہمہ اوست کیوں نہیں کہتے ۔ ہم نے عرض کیا کہ حضرت جو کہتے ہیں وہ قالی اور خالی ہیں اور جو حالی ہیں وہ کہتے نہیں ؎

این مدعیان در طلبش بے خبر آنند کاں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

دوسرے یہ کہ ہم ٹھہرے طالب ۔ اگر ہمہ اوست کہیں تو طلب کس کی کریں ۔ مولانا صاحب تو چپ ہو رہے مگر اُن کے خلیفہ صاحب بولے کہ ہمارے حُجرے میں آؤ تم کو توجہ دیں گے ۔ ہم نے کہا کہ بسم اللہ ، وہ حجرہ میں جاکر توجہ دینے بیٹھے ۔ ہم نے کہا کہ صاحب اس وقت تو آپ بالکل مولانا نیاز احمد صاحب معلوم ہوتے ہیں ۔ خلیفہ صاحب نے کہا جی استغفراللہ ذرہ کو آفتاب سے کیا نسبت ہے ۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک ۔ ہم نے کہا سبحان اللہ ! خُدا بننے کو تو آپ تیار ہیں مگر نیاز احمد نہیں بن سکتے ۔ بس رکھیے اپنی توجہ ایسے شخص کی توجہ کس کام کی جو کبھی تو خُدا بن بیٹھے اور کبھی بندہ کا بھی بندہ ۔ غرض چند روز بعد ہم وہاں سے چل دیے ۔

ایک روز ارشاد ہوا[۴۵] کہ ہم بریلی سے کاکوری کو چلے گئے ۔ سُنا تھا کہ وہاں کے جنگل میں ایک درویش رہتے ہیں ، جن کو وحوش و طیور سے محبت اور انسانوں سے نفرت ہے ، نہ اپنی کہتے ہیں نہ دوسرے کی سنتے ہیں ۔ رات دن گریہ و زاری سے کام ہے ۔ بڑی تلاش کے بعد وہ ملے ۔ رفتہ رفتہ باہم محبت ہوگئی ۔ ہم نے حال دریافت کیا تو کہنے لگے کہ میں ہندوستان سے بہ ارادۂ حج چلا ۔ بمبئی سے جہاز پر سوار ہوا ۔ قضارا جہاز تباہی میں آکر پاش پاش ہوگیا ۔ ایک تختہ کے سہارے میں تیسرے دن ایک پہاڑ کے قریب کنارے سے جا لگا ۔ خدا خدا کرکے تختہ سے اُترا ۔ پہاڑ پر چڑھ گیا ۔ بہت فاصلہ پر ایک دیوار نظر آئی ۔ قریب جاکر دیکھا تو اُس میں کوئی دروازہ نہ تھا مگر ایک بلند درخت دیوار کے قریب تھا ۔ اُس پر چڑھا اور دیوار پر سے اندر گیا ۔ وہاں کی کیفیت کیا بیان کروں ۔ ایک باغ دل کشا دیکھا جس کا مثل نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سُنا ۔ روشیں مُصفا ، نہریں جاری ، رنگ برنگ کے طائر چہچہاتے اور قسم قسم کے میوے درختوں پر

لگے ہوئے ہیں۔لیکن انسان کا کہیں پتہ نہیں میں حیرت میں رہ گیا کہ بارِ خدایہ کیا مقام ہے۔غرض کچھ میوے کھاپی کر ایک بارہ دری میں سو رہا۔عصر کے وقت آنکھ کھلی باغ کی سیر کرنے لگا۔شام کے وقت اس خیال سے کہ مبادا یہ باغ جنّات کا ہو ایک گوشہ میں جا چھپا۔وہاں سے دیکھا کہ آسمان سے ایک گروہ سواروں کا اُترا اور چمن میں ایک تخت اور فرش تکلّف بچھایا گیا۔ خدمتگار قرینہ بقرینہ کھڑے ہوگئے اور دو صاحب نہایت حسین اُس تخت پر آکر بیٹھے۔ کھانا تقسیم ہونا شروع ہوا۔میں دور سے یہ سب کیفیت دیکھ رہا تھا کہ دونوں سرداروں میں سے ایک نے فرمایا کہ فلاں ابنِ فلاں ہمارے ہاں آج مہمان ہے۔اُس کو بھی کھانا پہونچاؤ۔میں یہ بات سُن کر متحیّر ہوا اور دل میں کہنے لگا کہ الٰہی یہ کون بزرگ ہیں۔ تھوڑی دیر میں ایک شخص میرے پاس کھانا لایا۔میں نے کہا تم کون ہو اور یہ بزرگ کون ہیں۔میرا جی چاہتا ہے کہ اُن کی قدم بوسی حاصل کروں۔اُس نے کہا کہ میں بے اجازت کچھ جواب نہیں دے سکتا۔تم کھانا تو کھاؤ میں اجازت طلب کر کے آتا ہوں۔میں ہنوز کھا ہی رہا تھا کہ وہ شخص یہ مژدہ لایا کہ لو تمھاری درخواست منظور ہوئی۔ چلو قدم بوسی حاصل کرو۔ہم لوگ شہید ہیں اور یہ باغ ہمارے رہنے کا مقام ہے اور یہ دونوں شہزادہ امام حسنؓ و امام حسینؓ ہیں۔پھر تو میں خوشی کے مارے جامہ میں نہ سمایا جھٹ پٹ جاکر قدم بوس ہوا اور اپنا سارا حال عرض کیا۔حُکم ہوا کہ اچھا تم اس باغ میں رہو جب حج کا وقت آئے گا۔تم کو بیت اللہ پہونچا دیں گے۔خاطر جمع رکھو۔بعد اس کے مجلس برخاست ہوئی میں بارہ دری میں جاکر سو رہا۔ اُس دن سے مجھ کو دونوں وقت امامینؓ ہمامین کی زیارت نصیب ہوتی۔اچھے سے اچھا کھانا ملتا۔نو مہینہ بعد حج کا زمانہ آگیا۔میں نے عرض کیا کہ بعد حج حضور اسی جگہ مجھ کو پھر بلالیں۔فرمایا کہ اچھا۔اور ایک شخص کی طرف اشارہ کیا کہ اس کو پہونچا دو۔اُس نے کہا کہ آنکھیں بند کردو۔میں نے بند کرلیں۔پھر کہا کھول دو میں نے کھول دیں۔دیکھا کہ بیت اللہ شریف میں کھڑا ہوں۔میں نے حج کیا۔پھر مدینہ منوّرہ کی زیارت کو گیا اور وہاں سے مکّہ معظمہ میں واپس چلا آیا۔اب مجھ کو ہر وقت یہ خیال رہنے لگا کہ حضرت نے وعدہ فرمالیا تھا اب تک بُلایا نہیں۔آخر ایک دن اِسی

غم والم میں آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ میں اُسی باغ کے اندر ہوں۔ بہت خوش ہوا سجدۂ شکر بجالایا۔ پھر وہی زیارت اور وہی کھانا نصیب ہوا۔ اسی طرح عیش و خوشی کے ساتھ چار مہینہ گذر گئے۔ ایک دن میری جو شامت آئی تو عرض کیا کہ حضرت گھر جانے کو جی چاہتا ہے۔ مگر اُس وقت یہ کہنا بھول گیا کہ مجھ کو پھر بلا لیجیے گا۔ ایک شخص کو اشارہ ہوا کہ اچھا اس کو پہونچا دو۔ اُس نے آنکھ بند کرا کے مجھ کو گھر پہونچا دیا۔ دو چار دن تو کچھ خیال نہ آیا مگر پھر جو وہاں کی یاد نے زور مارا تو مجھ کو جنون ہو گیا۔ اب تک اُسی فراق میں مُبتلا ہوں جب ہم نے یہ دو ہاتھ کی لمبی داستان سُنی تو کہا کہ لاحول و لاقوۃ الا باللہ۔ میاں ہم تو سمجھے تھے کہ تو یادِ خدا میں روتا ہے۔ تیرا رونا، جھینکنا تو کچھ اور ہی نکلا۔ اور وہ بھی نصیب نہ ہوا۔ جا اپنی قسمت کو رویا کر۔ ہم وہاں سے لکھنؤ چلے گئے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ لکھنؤ میں مولوی عبدالرحمٰن صاحب موحد سے ملاقات ہوئی ان کی عادت تھی کہ جب کوئی آتا تو فرماتے آؤ معبود اور جاتا تو کہتے جاؤ معبود۔ ہم سے بھی حسب عادت یہی کلام کیا۔ ہم نے کہا کہ حضرت معبود معبود تو ہماری سمجھ میں آگیا۔ لیکن آؤ جاؤ کے معنی کچھ نہ کھلے۔ مولوی صاحب نے کچھ جواب نہ دیا۔ لیکن سر اُٹھا کر بہت دیر تک ہماری طرف کو دیکھتے رہے۔ خیر ہم تھوڑی دیر کے بعد چلے آئے پھر نہ گئے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب ہم بنارس میں پہونچے تو ایک بزرگ کے پاس ٹھہرے جو ہمارے ہم نام تھے۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ خاندانِ نقشبندیہ میں مولوی حبیب اللہ شاہ صاحب کے مرید ہیں۔ ہم نے کہا کہ صاحب آپ صرف ہم نام ہی نہیں بلکہ ہمارے پیر بھائی بھی ہیں۔ پھر تو بہت محبت ہو گئی۔ ایک دن کہنے لگے کہ یہاں ایک مندر ہے جس میں ہر صبح کو گانا ہوتا ہے۔ کل وہاں چلو۔ چنانچہ بعد نمازِ صبح ہم دونوں گئے دیکھا کہ ایک پنڈت جوان عمر تخت پر بیٹھا ہوا بڑے زور شور سے توحید بیان کر رہا ہے۔ جب وہ بیان کر چکا تو صبح کی راگنی میں آرتی شروع کی۔ ہمارے پیر بھائی سید غوث علی شاہ حُسینی تو اُس کو سُن کر گر ہی پڑے۔ مگر ہم نے ضبط کیا اور ایک ستون پکڑ لیا۔ تاہم بدن پر ایک لرزہ سا طاری تھا۔ آرتی ختم ہوئی تو ہمارے پیر بھائی ہوش میں آئے

اور مکان کو چلے۔ آٹھ روز تک ہماری وہی حالت رہی۔ نویں دن فرو ہوئی۔ اس کے بعد پھر کبھی ہم راگ سُننے کو نہیں گئے۔ ایک دن سید غوث علی شاہ نے فرمایا کہ آج گنگا پر چلو وہاں ایک چیلہ کو سنّیاس ملے گا۔ ہم دونوں پہونچے، دیکھا کہ ایک پنڈت چیلہ کو تعلیم دیا چاہتا ہے۔ ہمارے پیر بھائی جھٹ سر کھول کر پنڈت کے سامنے جا بیٹھے۔ اور کہا کہ پنڈت جی پہلے ہم کو مونڈیے۔ یہ سن کر پنڈت رونے لگا اور نہایت انصاف کی بات اُس نے کہی کہ میاں صاحب جو بات تم چاہتے ہو اِس کی ہم کو ہوا بھی نہیں لگی۔ خیال کرو، اگر ہم اس قابل ہوتے تو ٹکے ٹکے پر کیوں مارے مارے پھرتے۔ یہ مرتبہ اگلے لوگوں ہی کا تھا کہ ادھر اُسترہ سر پہ رکھا ادھر حال وارد ہوا۔ ہم لوگ تو صرف اُن کی لکیر پیٹتے ہیں ؎

خیالِ زلفِ بتاں میں نصیرؔ پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

جناب وقبلہ نے پھر یہ فرمایا کہ البتہ ہردوار کے مقام پر ہم نے یہی معاملہ دیکھا جو اُس پنڈت نے کہا تھا یعنی ایک سنّیاسی اپنے چیلہ کو سنّیاس دینا چاہتا تھا کہ ایک مُسلمان فقیر سر کھول کر آگے آ بیٹھا۔ سنّیاسی نے جوش میں آکر حجّام کو اشارہ کیا کہ اچھا پہلے اسی کو مونڈو۔ چنانچہ حجّام نے اپنا کام شروع کیا اور گرو نے یوں تعلیم شروع کی۔ نہ پاپی نہ پُنی نہ سُرگی نہ نرگی نہ برہمی نہ بشنی الخ اس تعلیم کے بعد اُس شخص پر ایسی زور شور کی حالت طاری ہوئی کہ وہ پرم ہنس ہوگیا یعنی مجذوب۔ پھر چیلہ کی باری آئی۔ اُس پر بھی حالت تو ہوئی مگر وہ بات نہ ہوئی جو اُس جوش وخروش میں فقیر کو حاصل ہوگئی تھی۔ ع

ہے اپنا اپنا مقدر جُدا نصیب جُدا

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہم بنارس سے علاقہ نیپال کو چلے گئے۔ اتّفاق سے وہاں ایک انگریزی رسالہ خیمہ زن تھا۔ بعض آدمی ہماری جان پہچان نکلے۔ اُن کے پاس ٹھہر گئے ایک دن عصر کے وقت ہم اور چند سوار جنگل کی سیر کو گئے۔ دیکھا کہ گھیا کدو کے کھیت پر ایک لڑکی حفاظت کے لیے بیٹھی ہے ایک سپاہی نے کدو توڑ لیا اور کہا پیسہ صبح کو پہونچا دوں گا۔ یہ تو چلے آئے۔ تھوڑی دیر بعد اُس لڑکی کا باپ آیا تو اُس نے کہا کہ سپاہی زبردستی کدو توڑ کے لے گئے۔ یہاں سپاہیوں نے ڈیرہ پر آکر کدو پکایا اور چار آدمیوں نے

کھایا۔ ہم سے بھی بہت اصرار کیا لیکن ہم نے نہ چکھا۔ صبح کو وہ چاروں سپاہی روتے ہوئے ہمارے پاس آئے اور کہا کہ ہمارے خصیتین غائب ہوگئے۔ آپ ہی خوب رہے جو کدو نہ کھایا۔ اب کیا علاج کریں۔ ہم نے کہا کہ اُسی کھیت پر چلو۔ قضیۂ زمین برسر زمین وہاں پہونچے تو دیکھا کہ ایک بوڑھا خرّانٹ بڑی مونچھوں والا بیٹھا ہے۔ ہم نے اُس سے تمام حال بیان کیا اور روپیہ دیا۔ وہ بولا کہ صاحب اس لڑکی نے تو یوں بیان کیا تھا کہ زبردستی توڑے گئے۔ یہ قصور اس جانہار کا ہے۔ یہ کہہ کر اُس کو خوب پیٹا۔ پھر اُس سپاہی سے جس نے کدو توڑا تھا کہا کہ خیر تم بھی کیا یاد کروگے۔ جاؤ ایک بڑا اور ایک چھوٹا رہے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ باقی سپاہی اچھے ہوگئے اُس کے بعد بڈھے سے ہماری دوستی ہوگئی۔ روزمرہ اُس کے پاس جاتے طرح طرح کی چیزیں کھلاتا اور نہایت خاطرداری سے پیش آتا۔ ایک روز کہنے لگا کہ ایک منتر نہایت مجرب و پرتاثیر میرے عمل میں ہے۔ آپ کو اس کی اجازت دیتا ہوں۔ جو ارادہ کروگے خدا پورا کرے گا۔ وہ منتر یہ ہے:۔ کَرُ کَرُ کَرُ کَرُ کَرُ کَرُ کَرُ کَرُ بادَرْآئِی مِیرِی بَھگَتْ مِیرِی گُرُوکِی سکَتْ پُھر مَنْتَرْ اِیشُرِی باچَا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہم نیپال سے آتے تھے۔ اثناء راہ میں ایک انگریز کا خیمہ دیکھا۔ بہت سے آدمی اور تین ہاتھی اُس کے ساتھ تھے۔ چونکہ ظہر کا وقت ہوگیا تھا ہم نے وضو کے لیے صاحب کے خانساماں سے پانی مانگا۔ اُس نے اوّل حال پوچھا پھر مُصر ہوا کہ آج یہیں ٹھہرو میں گیارھویں کروں گا۔ خیر ہم ٹھہر گئے۔ دوسرے دن بھی اُس نے نہ آنے دیا۔ خانساماں سے معلوم ہوا کہ یہ صاحب شیر کا شکار کھیلنے آیا ہے۔ ہم نے کہا کہ بھلا ہم کو بھی سیر دکھا سکتے ہو۔ اُس نے جاکر صاحب سے اجازت چاہی کہ ہمارے ایک بزرگ آگئے ہیں اور وہ شیر کا شکار دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُس نے اجازت دی کہ اچھا ایک ہاتھی پر ان کو سوار کرکے لے چلنا تیسرے دن خبرداروں نے خبر دی کہ فلاں جگہ شیر نے گارہ کیا ہے۔ فوراً انگریز سوار ہوا اور اُس کے پیچھے ایک ہاتھی پر ہم چلے۔ جس وقت جنگل میں پہونچے۔ آنار چھوڑے گئے۔ شیر غرّا کر

اُٹھا اور سیدھا ہاتھی پر لپکا اور جست کر کے ایسا طمانچہ مارا کہ ہاتھی بیٹھ گیا اور ہودہ بھی گر پڑا۔ معًا انگریز سنبھلا اور بندوق جوڑ کر ایسی گولی لگائی کہ شیر وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ شکار کے بعد خیموں میں آئے۔ صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ جب بے تکلفی ہو گئی تو ایک روز کہنے لگے کہ ہم نے فلاں درود میں بڑی تاثیر دیکھی۔ جس کام کے لیے پڑھا وہی ہُوا ہم نے اُس کا چلّہ بھی کیا ہے اور وِرد رکھتے ہیں۔ ہم نے کہا کہ صاحب پھر آپ مُسلمان کیوں نہیں ہو جاتے۔ جواب دیا کہ خالقِ برحق نے سب اشیاء میں تاثیر رکھی ہے۔ یہ بھی ایک اثر ہے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ آپ کے محمدؐ صاحب بہت بڑے عقل مند آدمی تھے اور اُن کے اصحابؓ بھی بڑے دانش مند اور شجاع تھے۔ پھر ہم نے پوچھا کہ آپ حضرت عیسٰی علیہ السلام کو بھی مانتے ہیں۔ بولا کہ سُنو صاحب اگر ہمارے پاس دو کمپو ہوں تو ہم ہی عیسٰی ہے اور ہم ہی موسٰی۔ اُس کے اس کلام سے ہم سمجھ گئے کہ ضرور یہ شخص دہریہ ہے۔ مگر بہت خلیق آدمی تھا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ نیپال کی طرف سے واپس ہو کر ہم علی گڈھ میں پہونچے۔ وہاں ایک درویش **محمد شاہ** رہتے تھے۔ اُن کے مکان پر گئے تو اُن کے مُریدوں نے بیان کیا کہ صاحب آج کل اُن پر حالت طاری ہے منھ کالا کیے ہوئے گدھے پر سوار ہیں۔ جوتیوں کا ہار گلے میں پڑا ہے پیچھے پیچھے لڑکوں کا غول یہ شور مچاتا جاتا ہے:۔ "بھڑوا ہے بے بھڑوا ہے"!! ہم نے جب یہ حال سُنا تو کپڑے وہیں رکھے اور دل میں یہ خیال کر کے اُن کی تلاش کو نکلے کہ اگر کامل ہیں تو بچھو کی طرح ڈنک مار کر تڑپا دیں گے

نین چھپائے نا چھپیں پٹ گھونگھٹ کی اوٹ چتر نار اور سور ما کریں لاکھ میں چوٹ

اور اگر یہ بات ہنسی کی ہے تو ہم اُن کو سیدھا بنا لائیں گے۔ آخر بازار میں مل گئے۔ ہم نے اُن کے گدھے کا کان پکڑ لیا اور لڑکوں سے کہا ذرا چُپ رہو۔ میاں صاحب سے دو باتیں کر لینے دو۔ لڑکے خاموش ہو گئے۔ ہم نے کہا کہ آپ کس کے بھڑوے ہیں؟۔ اگر خدا کے ہو تو اُس سے ملاؤ۔ اگر رسُول کے ہو تو رسُول سے۔ اور اگر رنڈی کے بھڑوے ہو تو اُس کے پاس لے چلو۔ اس وقت پانچ روپئے بھی ہماری جیب میں ہیں۔ اور اگر ان تینوں میں سے کسی کے بھی بھڑوے نہیں تو کیوں یہ بیہودہ سانگ بھرا ہے۔ گدھے

سے اُترو اور اپنے گھر چلو۔ آخر اُن کو کچھ بن نہ آئی۔ گدھے سے اُتر کر کہنے لگے کہ اچھا گھر چلو ہم تم کو توجہ دیں گے۔ ہم نے کہا بس صاحب! دیکھ لی آپ کی توجہ۔ یہ کھیل تو ہم بھی مدتوں کھیل چکے ہیں۔ خیر پھر مکان پر گئے ہاتھ منہ دھویا کھانا کھایا توجہ بھی دی ۔ اثناء گفتگو میں ہم نے پھر کہہ دیا کہ حضرت یہ بات آپ کو زیبا نہ تھی۔ بھڑوا تو بھڑانے والے کو کہتے ہیں۔ خدا کا بھڑوا بننا مردانِ خدا کا کام ہے۔ ہر ایک کا یہ حوصلہ نہیں۔ چند روز وہاں ٹھہر کر ہم آگرہ کو چلے گئے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہم نے آگرہ میں پہونچ کر شاہ ابو البرکات صاحب کی زیارت کی۔ بہت مہربانی سے پیش آئے۔ اپنے پاس ٹھہرایا اور اکثر توجہ بھی دی۔ لیکن سوائے قلب کی گرمی کے ہم کو تو کچھ محسوس ہوا نہیں۔ ایک روز اتفاقاً ایک بیل موٹا تازہ سامنے سے گذرا پکھال اُس پر لدی ہوئی تھی۔ شاہ صاحب سے کہا کہ بھلا اس کی طرف تو توجہ فرمائیے۔ اُنھوں نے ایک نظر دیکھا تھا کہ اُس بیل کا قلب پھٹ گیا اور رونگٹے رونگٹے سے خون ٹپکنے لگا۔ تھوڑی دیر میں مرگیا اور چمار اُٹھا کر لے گئے۔ اُس کا گوشت ایسا خوشبودار نکلا کہ چماروں نے دور دور تحفہ میں بھیجا۔ ایک دن ہم شاہ صاحب کے ہمراہ شہر کے باہر سیر کو گئے۔ دور سے ایک گروہ بانوا فقیروں کا نظر پڑا شاہ صاحب نے بڑی حقارت سے دیکھا اور فرمایا لاحول ولاقوۃ یہ بھی کوئی فقیری ہے۔ یہ لوگ فقیر تو کیا مگر ننگِ فقرا ضرور ہیں۔ اتنے میں ایک فقیر اُس گروہ میں سے آگے بڑھ کر ہماری طرف کو متوجہ ہوا۔ اس کا قریب آنا تھا کہ شاہ صاحب کی نسبتیں سلب ہوگئیں۔ پھر اُس نے قریب آکر شاہ صاحب سے کہا کہ صاحبزادہ آپ نے یہ بھی پڑھا ہے ؎

خاکسارانِ جہاں را بہ حقارت منگر توچہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

یہ بیل نہ باشد۔ پھر میری طرف اشارہ کرکے اُن سے کہا کہ آپ نے اس کو توجہ نہ دی جو آپ کو بھی کھا جاتا۔ بس بیل ہی مارنا جانتے ہو۔ اور فرمایا کہ صاحب زادہ کیا کریں ہم مسافر ہیں ورنہ چند روز آپ کی خدمت میں رہ کر آدمی بن جاتے۔ یہ باتیں کہہ کر وہ تو چل دیے اور میں نے شاہ صاحب سے کہا کہ آپ نے فقیر کا رنگ دیکھا۔ یہ آپ پر طعن کر گیا ہے کہ

چند روز ہماری صحبت میں رہو تو آدمی بن جاؤ۔ مناسب ہے کہ ان کی خدمت میں چلیں۔ چنانچہ بعد عصر ہم دونوں گئے اور شاہ صاحب نے عرض کیا کہ حضرت میں آپ کی خدمت میں رہنا چاہتا ہوں تو جواب دیا کہ ؎

آں قدح بشکست وآں ساقی نہ ماند

صاحب زادہ آپ میری بکواس پر کچھ خیال نہ فرمائیں۔ آپ کامل ہیں اور ایسے ہیں، ایسے ہیں۔ غرض بہت سی تعریفیں کر کے رخصت کر دیا۔ اس فقیر کی عمر کوئی بائیس پچیس برس کی ہوگی۔ نماز بھی پڑھتا تھا اور اپنے گروہ سے الگ ایک طرف بستر جمائے آنکھیں بند کیے چپ بیٹھا رہتا تھا۔ غرض بہت کامل آدمی تھا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ آگرہ سے ہم گوالیار میں پہنچے اور لنگڑے حضرت کی زیارت کو گئے۔ یہ بزرگ مولوی حبیب اللہ شاہ رام پوری کے شیخ تھے اور شاہ ابوالبرکات کے مرید۔ بہت خاطر و مدارات سے پیش آئے۔ حال دریافت کیا۔ ہم نے اپنی سرگذشت سنا دی۔ پھر ان کو کچھ جوش جو آیا تو ہماری طرف متوجہ ہو کر الا اللہ کی ضربیں لگانے لگے۔ خیر اثر تو کیا ہونا تھا مگر کسی قدر گرمی ہمارے مزاج میں آگئی۔ ہم نے کہا کہ حضرت قصور معاف ہو تو کچھ عرض کریں۔ کہا کہ فرمائیے۔ میں نے کہا کہ پربھتا جی ایک صاحب کمال گرو تھے۔ انھوں نے پیرانہ سالی میں ایک نوجوان لڑکی سے شادی کی۔ لوگوں نے منع بھی کیا مگر وہ کب مانتے تھے۔ ع

مرد چوں پیر شود حرص جواں می گردد

جب شغل معہود کا وقت آیا تو پربھتا جی بے چارے شیخ فانی سے کیا ہو سکتا تھا۔ ع

تراکہ دست بہ لرزد گہر چہ دانی سفت

ناچار ہاتھ سے تھپ تھپ کرنے لگے۔ وہ بھولی بھالی سدھوٹ الھڑ البیلی سمجھی کہ مرد و عورت میں یہی معاملہ ہوتا ہوگا۔ چند روز کے بعد پربھتا جی نے گنگا کے اشنان کا ارادہ کیا اور اپنا خاص چیلہ چھمنا جو نوجوان تھا گھر کی حفاظت کے لیے چھوڑا۔ وہ گھر کے اندر آنے جانے لگا۔ دونوں طرف جذباتِ شوق نے زور کیا اور جو ہونا تھا ہو گیا۔

یہ نئی ترکیب اور مردانہ طریقہ دیکھ کر وہ عورت بولی کہ تمھارے گرد کو تو یہ ڈھب یاد نہ تھا۔ اُس نے جواب دیا کہ وہ بھڑوا کیا جانے یہ مردوں کا کام ہے۔ جب گروجی اشنان کرکے واپس آئے اور رات کو وہی تھپ تھپ شروع کی تو وہ بولی کہ مہاراج اب تھپ تھپیوں سے کام نہیں چلتا۔ کچھ زور رکھتے ہو تو مردی دکھاؤ۔ گروجی فوراً تاڑ گئے کہ یہ چھمنا حرام زادے کی شرارت ہے۔ اُس نے ہمارا کام خراب کر دیا اور اس بھولی انجان کو غضب کی چاٹ لگا دی۔ فوراً یہ شعر حسب حال کہا ؎

پربھتا جی گنگ سدھارے چھمنا نے گھر آتی پکڑ بیٹھے برم ڈنڈی اب بتاوے تھپ تھپی

سو حضرت سلامت کوئی کام مردوں کا اگر یاد ہو تو مضائقہ نہیں۔ ورنہ اِن تھپ تھپیوں سے تو یہاں کام چلتا نہیں۔ اور یہ کچھ پہلوانی اور بہادری کی بات نہیں ہے کہ کوئی شخص بے خبر چلا جاتا ہے پیچھے سے جا کر دھکا دے دیا۔ ہم تو آپ کو فقیر سمجھ کر زیارت کرنے آئے تھے۔ آپ زور آزمائی کرنے لگے۔ یہ بات سُن کر لنگڑے صاحب بہت خفا ہوئے اور بولے کہ میاں اگر ہم کچھ نہیں تو ہمارے بڑے تو تھے۔ میں نے کہا کہ سبحان اللہ! وہ آپ ہی کے بڑے تھے۔ کیا آپ نے اوروں کو ڈوم ڈھاڑی یا دُھنا جُلاہا فرض کیا ہے؟۔ اس گفتگو کے بعد ہم بستر اباندھ چل دیے اور دوسری جگہ جا ٹھہرے۔ پھر وہ منانے بھی آئے، عذر و معذرت بھی کی لیکن ہم نہیں گئے ع

گر در ت قبلہ شود سجدہ بہ آں سو نہ کنم

۳۳ **ایک روز** ارشاد ہوا کہ جب اکبر آباد سے پھرتے پھراتے ہم گوالیار پہونچے تو وہاں ایک لوہارسے بھی صاحب سلامت ہو گئی۔ ایک دن وہ کہنے لگا کہ مجھ کو ایک عزیمت یاد ہے۔ نہایت عجیب و غریب ہے اس میں ہزارہا طرح کی تاثیریں ہیں۔ جس مقصد کے لیے پڑھو فوراً پورا ہوتا ہے گویا اسم اعظم کا خواص رکھتی ہے۔ جس مُردہ سے چاہو ملاقات ہو سکتی ہے آنکھ سے دیکھ لو۔ باتیں کرلو۔ میں بہ خوشی تمام اُس کی اجازت آپ کو دیتا ہوں۔ ہم نے تجربہ کیا تو فی الواقع ایسا ہی پایا۔ وہ عزیمت یہ ہے:۔

اَقْسَمْتُ عَلَیْکُمْ یَارُ دُقَائِیْلُ یَا اَحْمَرُ یَا مِیْکَائِیْلُ یَا مُوْھُبْنُ الْحَارِثِ

یَا عِزْرَائِیْلُ وَمُذْہَبُ وَیَا اِسْرَافِیْلُ وَبَرْقَانُ الْیَہُوْدِ وَیَا رُوْیَائِیْلُ وَیَا مَہُوْرِشُ
وَیَا غِشَائِیْلُ وَالْاَبْیَضُ وَیَا دَرْدَائِیْلُ یَا مَیْمُوْنُ وَیَا اَیُّہَا الْاَرْوَاحُ الْعُلْوِیَّۃُ
وَالسِّفْلِیَّۃُ اُحْضُرُوْنِیْ فِیْ قَضَاءِ حَاجَتِیْ اَلْعَجَلُ الْعَجَلُ الْعَجَلُ یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ یَا مَلِكُ
یَا نُوْرُ یَا بَاسِطُ یَا جَوَّادُ یَا عَزِیْزُ یَا جَبَّارُ یَا مُتَکَبِّرُ یَا قَہَّارُ یَا سَرِیْعُ یَا قَرِیْبُ
یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ یَا وَدُوْدُ یَا رَءُوْفُ یَا عَلَّامَ الْغُیُوْبِ یَا عَلَّامَ الْخَفِیَّاتِ
یَا بَاسِطُ یَا جَوَّادُ یَا قَاہِرُ یَا قَادِرُ عَزَّمْتُ عَلَیْکُمْ یَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ
وَالْاَرْوَاحِ وَیَا صَاحِبَ السِّحْرِ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ
صُدُوْرِ النَّاسِ مِنْ جُنُوْدِ اِبْلِیْسَ یَا کُنُوْزَ الْمُلْكِ یَا مِیْمُ یَا مِیْمُ یَا نُوْرُ
یَا نُوْرُ بِحَقِّ مَیْمُوْنَ حَبَشِیْ وَمَیْمُوْنَ اَعْمٰی وَجَمِیْعُ الْکُتُبِ الَّتِیْ اُنْزِلَتْ عَلٰی جَمِیْعِ
الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَبِحَقِّ سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ ۝ وَامْتَازُوا الْیَوْمَ
اَیُّہَا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ وَبِحَقِّ طٰہٰ وَیٰسٓ وَبِحَقِّ کٓھٰیٰعٓصٓ وَبِحَقِّ حٰمٓ عٓسٓقٓ وَبِحَقِّ قُلْ اُوْحِیَ
اِلَیَّ اَنَّہُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا یَّہْدِیْ اِلَی الرُّشْدِ
فَاٰمَنَّا بِہٖ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَا اَحَدًا ۝ وَبِحَقِّ یَا اَیُّہَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ اللَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا
وَبِحَقِّ قُلْ ہُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۝ وَبِحَقِّ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ وَبِحَقِّ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ
رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ وَبِحَقِّ یَا اَیُّہَا الْاَرْوَاحُ الْعَلْوِیَّۃُ یَہُوْدِ یَا اَدْسُلْیَا یَا نَسُوْرُ
بِحَقِّ مَیْمُوْنِ ابْنِ الْمَیْمُوْنِ الَّذِیْ اَقْوٰی وَبِحَقِّ مَیْمُوْنَ زَنْگِیْ وَمَیْمُوْنَ نُوْبِیْ
صَاحِبِ الْاَعْوَانِ الْہِنْدِیْ اَجِرْ مِنَ الْجِنِّ الشَّجَرِ وَالْاَشْجَارِ اُخْرُجُوْا مِنَ
الْکِنِّ وَالْاَکْنَانِ وَمِنَ الرُّکْنِ وَالْاَرْکَانِ اُخْرُجُوْا مِنْ کُلِّ مَکَانٍ وَبِحَقِّ خَاتَمِ
سُلَیْمَانَ ابْنِ دَاوٗدَ عَلَیْہِمَا السَّلَامُ وَبِحَقِّ اٰصِفِ بْنِ بَرْخِیَا سَالَارِ دِیْوَانِ وَبِحَقِّ
قَیْطُوْسِ سِبْطِ الْجِنِّ وَالشَّیَاطِیْنِ وَبِحَقِّ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ
وَسَلَّمَ یَا قَوْ قَلْ قَوْ فَلَانِ یَا ہَرْقَلَانِ یَا عَجُوْزُ اُمِّ الصِّبْیَانِ خُذْ ہٰذَا
بِاَشَدِّ الْاَرْخِ وَبِحَقِّ تَوْرِیْتِ مُوْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ وَاِنْجِیْلِ عِیْسٰی عَلَیْہِ
السَّلَامُ وَزَبُوْرِ دَاوٗدَ عَلَیْہِ السَّلَامُ وَفُرْقَانِ مُحَمَّدٍ مُّصْطَفٰی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

وَبِحَقِّ وَالسِّفْلِيَّةِ اَحْضِرُوْنِيْ فِيْ قَضَاءِ حَاجَتِيْ وَامُدُّوْنِيْ فِيْ وَقْتِيْ هٰذَا بِحَقِّ سُلْطَانِ الْاَنْبِيَاءِ وَسَيِّدِ الْمَشَايِخِ وَشَيْخِ الْكُلِّ شَيْخِ عَبْدِ الْقَادِرِ جِيْلَانِيْ رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اَلْعَجَلُ اَلْعَجَلُ اَلْعَجَلُ اَلسَّاعَةُ اَلسَّاعَةُ اَلسَّاعَةُ اَلْوَحَا اَلْوَحَا اَلْوَحَا وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ ۝

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہم گوالیار سے روانہ ہو کر چلتے چلتے ایک گانوں میں پہونچے۔ وہاں تیلی کے سوا کوئی گھر مسلمان کا نہ تھا۔ بہ مشکل اُس نے ٹھہرایا۔ لیکن اُس کے گھر میں بیلوں کے بند ھنے کے سبب بدبو تھی۔ ہماری طبیعت گھبرائی۔ اُس کے گھر کے سامنے اِملی کا درخت تھا۔ گرد اس کے چبوترہ تھا۔ وہاں جا کر لیٹے اُس نے کہا کہ صاحب! یہاں چوکیدار دق کرے گا۔ ہم نے کہا تو کہہ دینا کہ ہمارے رشتہ دار ہیں۔ لیکن اس بات سے ہمارے دل پر ایک رنج پیدا ہوا۔ اتنے میں آنکھ لگ گئی کہ والدہ صاحبہ کو خواب میں دیکھا کہ فرماتی ہیں: بیٹا کیوں گھبراتا ہے سفر کی مصیبت پر صبر کرنا چاہیے۔ اِدھر تو میری آنکھ کھلی اور اُدھر چوکیدار نے آواز دی کہ تمھارے گھر مسافر کون ہے۔ تیلی نے وہی جواب دیا۔ جو ہم نے کہا تھا۔ چوکیدار نے ہمارے پاس آکر بات چیت کی تو تیلیوں کو دھمکایا کہ تمھارا منھ اور یہ رشتہ دار۔ ان میں تو دِلّی کی بُو باس ہے۔ ہم نے کہہ دیا کہ میاں ہمارے کہنے کے موافق تیلی نے یہ جواب دیا ہے۔ وہ چوکیدار ہم کو اپنے گھر لے گیا۔ اُسی وقت کھچڑی پکا کر کھلائی۔ سب سامانِ آرام مہیا کر دیا۔ صبح کو معلوم ہوا کہ وہ در اصل دہلی کا باشندہ تھا۔ تین دن تک ہم کو ٹھہرایا اور نماز تہجد کی ترکیب پوچھی۔ ہم نے تین طرح سے بتائی۔ چوتھے دن وہاں سے راج گڈھ کو روانہ ہوے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ اس گانوں سے چل کر ہم راج گڈھ کو روانہ ہوئے۔ جنگل میں راہ بھول گئے اور ایک ندی کے کنارے بھٹکتے ہوے پھر ایکے وہاں یہ تماشا دیکھا کہ ایک موٹی تازی گاے کی تھوتھنی مگرمچھ نے پکڑ رکھی ہے۔ اور دونوں میں کشتی ہو رہی ہے۔ اتنے میں شیر جنگل سے نکل کر پانی پینے کو آیا جھٹ گاے کا پچھا پکڑ لیا۔ اُس بیچاری کا تو کام تمام ہو گیا۔ اب اُن دونوں میں زور آزمائی ہونے لگی۔

آخر دونوں تھک گئے اور گائے کو کسی نے نہ چھوڑا۔ پھر شیر نے ذرا دم لے کر ایک جست لگائی اور مگر کی کمر پر جا سوار ہوا۔ اور پنجہ جا کر اُس کو مع گائے کے اُٹھا کر ایسا پھینکا کہ کنارے سے دس گز دور جا پڑے۔ اور مگر کو مارے طمانچوں کے ہلاک کر دیا۔ اور جدھر سے آیا تھا غُرّاتا ہوا اُسی طرف کو چلا گیا۔

مرغکے اندر شکارِ کرم بود گربہ آمد ناگہاں او را ربود

ہم نے دور بیٹھ کر یہ تماشا دیکھا۔ جب شیر چلا گیا تو وضو کر کے ظہر کی نماز پڑھی اور بہ مشکل راج گڈھ پہونچے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ راج گڈھ میں پہونچ کر میاں پیارے شاہ کے مکان پر ہم گئے۔ دیکھا کہ ایک شخص ڈاڑھی منڈے بیٹھے ہیں۔ شراب کی بوتلیں آگے رکھی ہیں۔ چار پانچ لُچّے غنڈے مخمور نشہ میں چور۔ اُن کے گرد بیٹھے ہیں۔ ہم نے میاں پیارے شاہ کو دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ یہ گُل مُچھّوں والے وہی ہیں۔ قہرِ درویش برجانِ درویش اُن کے پاس ٹھہرے۔ ایک دن وہ مُلّے باہم گفتگو کرتے لگے کہ حضرت سُلیمان پیغمبر تو حضرت ابو بکر صدّیق کے مرید تھے۔ ہم نے کہا کہ سبحان اللہ! تاریخ دانی آپ لوگوں پر ختم ہے۔ حضرت سلمانؓ فارسی کو سلیمانؑ پیغمبر بنایا۔ وہ بولے کہ میاں تم کیا جانو جو ہم کہتے ہیں یہ ہی ٹھیک ہے۔ اس میں گفتگو بڑھ گئی۔ ہم خفا ہو کر وہاں سے چلے آئے۔ یہ بات راجہ رام سنگھ نے سُنی جو بعد میں نواب عبدالواسع خاں مشہور ہوئے اُس نے ہم کو اپنے پاس بلایا۔ اُس وقت تک راجہ نے اِسلام ظاہر نہیں کیا تھا۔ تین چار دن تک ہم اُن کے پاس ٹھہرے۔ پیارے شاہ فقیری کے کوچے سے تو محض نابلد تھا لیکن ایک عمل ایسا جانتا تھا کہ راجہ کو جنّات بہ صورت حسین دکھاتا اور کہتا کہ یہ فرشتہ ہیں اِسی عمل نے اُن کو کامل بنا دیا تھا۔ وہاں سے ہم بہرائچ کو روانہ ہوئے کوئی دو گھڑی دن چڑھے ایک گاؤں میں پہونچے اور ایک تکیہ میں جو بستی کے قریب تھا قیام کیا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب ہم راج گڈھ سے چل کر ایک گاؤں کے تکیہ میں ٹھہرے تو دیکھا کہ ایک لڑکا سات برس کا سُرخ آنکھیں۔ بالکل گُم صُم مخموروں کی طرح

عالمِ سکوت میں بیٹھا ہے۔ ہم کو دیکھ کر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور چپکے سے جھونپڑے میں جا کر دو مٹھی بھونے چنے کی لایا اور ہمارے سامنے رکھ دیے۔ اتنے میں اُس کا باپ آگیا۔ ہمارے واسطے کھانا لانے کا اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے کھانا لایا۔ اُس کے باپ سے حال دریافت کیا تو کہا کہ صاحب میں سقہ ہوں۔ ہمارے چار گھروں میں یہ ایک لڑکا ہے۔ اِس کا عجیب حال ہے۔ دو دو مہینہ میں کھانا کھاتا ہے۔ مگر طاقت کم نہیں ہوتی۔ ہر وقت سکتہ کے عالم میں رہتا ہے۔ اشاروں سے کام لیتا ہے۔ کبھی ایسی ہی ضرورت آپڑتی ہے تو بات چیت کرتا ہے۔ سونا قسم ہے۔ رات دن جاگتا ہی رہتا ہے۔ یہ تکیہ اس کا مقام ہے۔ آدمی طرح طرح کے گمان کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ آسیب زدہ ہے۔ کوئی کہتا ہے سِڑی ہو گیا ہے۔ غرض کچھ بھید اس کا نہیں کھُلتا۔ دوسرے دن ہم چھاؤنی مو ؤ کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں ہمارے والد بزرگوار کا رسالہ تھا چھ مہینہ تک اُن کی خدمت میں رہے۔ وہاں سے واپس ہوئے تو پھر اُسی گاؤں میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ دیکھا کہ تکیہ اُجاڑ پڑا ہے۔ اُس لڑکے کا پتہ نہیں۔ گاؤں میں جا کر اُس کے باپ سے ملے۔ اُس نے بیان کیا کہ اس لڑکے نے رمضان شریف سے ایک مہینہ پہلے کھانا پینا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ دو مہینہ کا ایک روزہ رکھا۔ عید کی صبح کو میں نے کہا کہ میاں آج تو نہا دھو کر کپڑے بدل لو اور عید گاہ میں چل کر نماز پڑھو۔ کہا کہ بہت اچھا ہم سب کُنبے کے آدمی جمع ہو کر عید گاہ کو چلے۔ وہ لڑکا آگے آگے ہو لیا تھوڑی دور چل کر اُس نے رُخ بدلا اور جنگل کا راستہ لیا۔ اُس وقت کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ اُس سے کہے کہ اِدھر نہیں اُدھر چلو۔ آخر سب آدمی تنگ ہو کر عید گاہ کو چلے گئے۔ میں تنہا اُس کے پیچھے رہ گیا، دِل نے گوارا نہ کیا کہ اُس کو چھوڑ کر چلا آؤں۔ چلتے چلتے ایک ایسے بیابانِ لق و دق میں گذرا جو پہلے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ اور عجیب تماشا یہ نظر آیا کہ ہر قسم کے صحرائی جانور سامنے آتے اور اس کو سلام کر کے چلے جاتے۔ پہر بھر کے بعد ایک بہت بڑا درخت برگد کا ملا۔ اُس کے نیچے میرا لڑکا بیٹھ گیا۔ میں بھی ایک طرف بیٹھ گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک پیر مرد سفید ریش بزرگ صورت کچھ کباب اور مٹھائی اور پیالہ دودھ میرے واسطے لائے۔ جب میں کھا چکا تو رخصت

ہو گئے۔ جب پندرہ دن اسی وتیرہ سے گذرے تو میں نے اُس بُزرگ سے کہا کہ حضرت اس لڑکے کو آپ کیوں نہیں کھلاتے۔ فرمایا کہ ان کو ظاہری کھانے کا حکم نہیں۔ طعام خاص سرکار سے ملتا ہے۔ پندرہ دن تک میں نے یہی کیفیت دیکھی کہ وہ لڑکا بحرِ سکوت میں غوطہ لگائے بیٹھا ہے۔ چرندے درندے ہمارے گرد جمع ہیں۔ مگر کوئی کسی سے بولتا نہیں۔ آخر ناچار ہو کر میں نے کہا کہ بیٹا اب میں کیا کروں۔ یہ بات سُن کر وہ رویا اور بولا کہ بابا میں بھی مجبور ہوں مجھ کو خدا تعالےٰ نے صرف اپنے کام کے لیے پیدا کیا ہے نہ کسی اور کام کے لیے۔ تم بھی مجھ کو خُدا کے سپرد کر دو اور اپنے گھر کو چلے جاؤ۔

برنگِ آسیا سنگ ست حالِ جسمِ زارِ من — بہ دستِ دیگرے افتادہ ام ناچار میگردم
عنانِ اختیارِ خویشتن دارم بدستِ او — برفتارے کہ خواہد بر ہماں رفتار میگردم
رشتۂ در گردنم افگندہ دوست — می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

میں نے کہا کہ پھر گھر کیوں کر پہونچوں۔ راہ تو مجھے یاد نہیں۔ کہا کہ اُس پیر مرد سے تم پوچھ لینا۔ صبح کو وہ آئے تو راہ دریافت کی۔ فرمایا کہ تم سیدھے اس طرف کو چلے جاؤ گھر پہونچ جاؤ گے۔ اگر کوئی درندہ ملے تو اُس سے کہہ دینا کہ میں بھیکو کا باپ ہوں۔ اس کے بعد میں چل پڑا۔ جو جانور راہ میں ملتا میں بڈھے کی ہدایت کے موافق کہہ دیتا کہ میں بھیکو کا باپ ہوں سلام کر کے جانور چلا جاتا۔ شب کو جہاں ٹھہرتا جانور میرے گرد پہرہ دیتے اور ہر روز وہی پیر مرد کھانا پہونچاتے۔ اسی طور سے چلتے چلتے چار مہینہ بعد گھر آکر پہونچا۔ اب مجھ کو رونے کے سوا کچھ کام نہیں۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ مقام کوٹ پتلی پہونچ کر سُنا کہ یہاں ایک بہت بڑے بزرگ مجذوب ہیں میاں **کلّن شاہ** ہم نے بھی اُن کے پاس بستر اجا لگایا۔ اُن دنوں میں راجہ صاحب نے اُن کے واسطے ایک بنگلہ پھونس کا نہایت عمدہ تیار کرایا تھا۔ اُس میں جا کر بیٹھے تو خادموں سے پوچھا کہ یہ کس کا مکان ہے۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت آپ کا ہے۔ ایک مشعل بنا کر اُس میں آگ لگا دی۔ جل کر خاکستر ہو گیا۔ راجہ نے دوبارہ تیار کرا دیا۔ پھر وہی سوال کیا اور چپکے سے آگ لگا دی۔ ع

آئی موج فقیر کی دیا جھونپڑا پھونک

جب تیسری دفعہ تیار ہوا تو ہم نے اُن لوگوں کو سمجھا دیا کہ تم یہ الفاظ مت کہو۔ بلکہ یوں کہہ دو کہ سرکاری مکان ہے۔ اسی طرح خادموں نے اُن سے کہہ دیا تو چُپ ہو گئے اور اُس کے اندر رہنے لگے۔ چند روز کے بعد کنور صاحب یعنی راجہ کا لڑکا اُن کی زیارت کو آیا۔ کچھ اشرفیاں، کچھ قیمتی تھان اور مٹھائی وغیرہ لایا۔ اُس کی صورت دیکھتے ہی شاہ صاحب بھاگ گئے۔ ہم سب اُن کے پیچھے ہوئے کہ پکڑ لائیں۔ ایک خادم جل کر بولا کہ ارے تجھے خدا کی مار نہ آپ کھائے نہ ہمیں کھانے دے۔ یہ بات سُن کر دوسرا بولا کہ خدا کی مار اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ بدن میں لنگوٹی نہیں سر پر ٹوپی نہیں۔ اوپر دھوپ نیچے گرم ریتا۔ اور کیا خدا لاٹھی لے کر مارنے آیا کرتا ہے۔ بڑی مُشکل سے اُن کو پکڑا ایک خادم کو ہم نے آگے دوڑا دیا کہ کنور صاحب کو کہیں چھپا دو۔ ورنہ صورت دیکھ کر پھر بھاگیں گے۔ ہم نے شاہ صاحب سے کہا کہ چلیے حقہ تو پی لیجیے۔ بولے ہاں! خوب یاد دلایا۔ چلو، چلو، غرض بہلا پھسلا کر بنگلے تک لائے۔ چار آدمیوں نے مل کر خوب مضبوط پکڑ لیا۔ پھر کنور صاحب کو بُلایا۔ دیکھتے ہی گھبرائے ہم نے پکڑ لیا۔ پھر اُنھوں نے بہت زور کیا کہ بھاگ جائیں لیکن ہم نے نہ چھوڑا اور زبردستی میاں صاحب کا ہاتھ پکڑ اُس کے سر پر رکھ دیا اور خادم بولے کہ مرادیں پوری پوری۔ کنور صاحب خوش ہو کر چلے گئے اور وہ نذرانہ خادموں نے لے لیا۔ اُس کے بعد میاں صاحب کو چھوڑ دیا کہ اب جہاں آپ کا جی چاہے، تشریف لے جائیے۔ پھر نہ بھاگے چپکے بیٹھے رہے۔ حجامت کے وقت بھی اُن کی عجب کیفیت ہوتی۔ دو انگشت حجامت حجّام نے بنائی ہے اور اُٹھ کر بھاگ گئے۔ غرض آٹھ دن میں دو دو چار چار انگشت کر کے پوری ہوتی تھی۔ ایک دن اُن سے دریافت کیا کہ حضرت آپ کا نام کیا ہے۔ فرمایا "تکو کمہار"۔ ہم نے پوچھا۔ قوم۔ کہا۔ گوڑ۔ پھر عمر پوچھی تو کہا پونے دو برس بلکہ کچھ کم۔ ایک بات تو ہم اُسی وقت سمجھ گئے تھے کہ گوڑ سے مراد سید ہے دوسری بات پونے دو برس بعد کھلی یعنی جب انتقال ہوا تو معلوم ہوا کہ ہم نے عمر گذشتہ پوچھی تھی اُنھوں نے باقی ماندہ بتائی تھی۔ مگر تیسری بات آج تک نہیں کھلی کہ "تکو کمہار" سے کیا مراد تھی۔ ایک دن ہم نے حضرت سے دریافت کیا کہ ہمارے لیے

کیا کہتے ہو۔ جواب دیا کہ بروے لگایا کرو۔ ہم نے پوچھا کہ لگیں گے بھی یا نہیں۔ فرمایا ہاں خوب لگیں گے۔ سو اب معلوم ہوا کہ اُس سے مراد وہی پیری مُریدی تھی۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب ہم کوٹ پتلی سے چلے تو راستہ میں ایک مندر ملا۔ وہاں ایک سادھو نہایت دل آویز الحان سے بھجن گا رہا تھا۔ ہم بھی اُس کے پاس جا بیٹھے۔ بھجن سنتے رہے۔ پھر اُن سے باتیں ہونے لگیں، یہاں تک کہ نماز کا وقت آیا۔ ہم نے مُصلّے بچھا کر نماز پڑھ لی۔ بعد نماز وہ سادھو جی مخاطب ہوئے کہ میاں صاحب آپ کی طبیعت میں تو بڑی آزادی معلوم ہوتی ہے، پھر یہ علّت کیوں لگا رکھی ہے۔ ہم نے کہا کہ باباجی علّت سے تو نہ تم خالی نہ ہم خالی۔ تم کو اس پتھر کے پوجنے کی علّت لگی ہوئی ہے ہم کو نماز کی۔ تم گھنٹا بجاتے ہو، ہم تسبیح ہلاتے ہیں ؎

رسائی نیست تا سر منزلِ او کفر و ایماں را ۔۔۔ کہ دیر و کعبہ سنگ رہ بود گبر و مسلماں را

دلا مائل نہ ہو دیر و حرم کا ۔۔۔ یہاں دونوں جگہ پتھر پڑے ہیں

بس بے قید ہے تو خدا کی ذات ورنہ سب اپنی اپنی قید میں مبتلا ہیں ؎

مے خوارہ بہ مے خوش ست و خوں خوارہ بخوں ۔۔۔ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ ۵

ایک روز ارشاد ہوا کہ اثنائے سفر میں ایک جگہ ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔ اُس کا حال دریافت کیا، تو کہنے لگا کہ میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے مزار کا جاروب کش ہوں۔ چھ مہینے میں ایک ہفتہ کی رخصت ملتی ہے۔ ہفتہ بھر گھر میں گذار کر آٹھویں دن حضرت کے آستانہ پر پہونچ جاتا ہوں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عرصہ بیس برس کا ہوا کہ اپنے گھر سے بہ ارادۂ زیارتِ حرمین شریفین زادہما اللہ شرفاً روانہ ہوا۔ جابجا کی زیارت کرتا ہُوا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مزار متبرکہ پر پہونچا۔ دل مانوس ہوگیا۔ وہاں جنگل کی فضا خوش معلوم ہوئی۔ جاروب کشی اختیار کی۔ سات آٹھ برس کے بعد ایک فقیر میرے وطن کا وہاں آ نکلا۔ اور پیام دیا کہ تمھاری بیوی نے کہہ دیا تھا اگر کہیں مل جائے تو کہہ دینا کہ تمھارے بچّوں کی شادی کا وقت آگیا اور خرچ کو کوڑی نہیں جس طرح ہو سکے آجاؤ۔ اُس وقت سے مجھ کو فکر لاحق ہوئی کہ میرے پاس زادِ راہ نہیں

اور سفر دور دراز جاؤں تو کس طرح جاؤں ۔ اسی خیال میں سوگیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خواب میں ارشاد فرمایا کہ فلاں مقام پر پتھر تلے پانچ سو ریال رکھے ہیں اُن کو لو اور گھر چلے جاؤ۔ لیکن بچّوں کی شادی کر کے جلد واپس چلے آنا۔ ہم تمھارے منتظر رہیں گے۔ جب بیدار ہوا تو اس خواب کو صرف خیال سمجھا۔ دوسرے دن پھر یہی معاملہ دیکھا اور ارشاد ہوا کہ اُس مقام پر جا اور دیکھ تو سہی جھوٹ ہے یا سچ ہے۔ جاکر دیکھا تو فی الحقیقت پانچ سو ریال پائے تیسری شب ارشاد ہوا کہ کل ضرور چلے جاؤ اور جلد واپس آؤ۔ وہاں سے چل کر مدینۂ منورہ میں آیا وہاں کچھ مدّت قیام کا ارادہ کیا۔ خواب میں جناب سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد کیا کہ یہاں سے جلد چلے جاؤ کیونکہ حضرت موسٰیؑ تمھارے منتظر ہیں۔ وہاں سے روانہ ہوا۔ گھر پہونچا شادی اطفال سے فراغت پائی۔ پھر واپس آنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ ایک رات دیکھا کہ حضرت موسٰیؑ علیہ السلام فرماتے ہیں کیا تو نہیں آتا ۔ میں نے عرض کیا کہ پیدل چلنا تو دشوار و ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ فرمایا کہ اچھا۔ جب بیدار ہوا تو دیکھا کہ حضرت کے آستانہ پر موجود ہوں۔ اُس روز سے میرا یہ حال ہے کہ چھ مہینے کے بعد عرض کر کے سو رہتا ہوں اور صبح کو اپنے گھر بیدار ہوتا ہوں۔ آٹھویں روز جس طور سے کہ آیا تھا پھر یہیں پہنچ جاتا ہوں۔ میرے حال پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نہایت مہربانی ہے۔ جب چاہتا ہوں گفتگو کر لیتا ہوں۔ ایک روز میں نے عرض کیا تھا کہ حضرت مجھ کو کچھ تعلیم فرمائیے ارشاد ہوا تو متحمّل نہ ہوگا۔ مگر ہاں بعد انتقال کے تم کو کچھ دیں گے ۔ اب میں اپنے گھر آیا ہوا ہوں۔ چار دن تو گذر چکے تین اور باقی ہیں ۔ پھر اُسی آستانہ پر جاؤں گا۔ نہایت خوشی میں زندگی بسر ہوتی ہے اگر کچھ خرچ درکار ہوتا ہے تو حضرت سے عرض کر دیتا ہوں، دوسرے دن مل جاتا ہے ۔ غرض جا بجا سیر کرتے ہوئے ہم بابری میں پہونچے ۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب میر اعظم علی شاہ صاحب کا انتقال ہوگیا تو نہایت رنج و غم ہوا دل میں وحشت پیدا ہوئی ۔ بابری سے چل نکلے اور سیر و سیاحت اختیار کی ۔ اوّل قادر گنج میں میاں ریتا شاہ صاحب کے پاس پہونچے ۔ گنگا کے کنارے جھونپڑی میں رہتے تھے ۔ خادموں سے معلوم ہوا کہ میاں صاحب اُپلے چُننے گئے ہیں ۔ ہم نے جنگل کا راستہ لیا۔

اور دور سے دیکھا کہ اُپلے چُن رہے ہیں۔ میں بھی ایک جھولی بنا کر اُپلے چُنتے چُنتے اُن کے پاس جا پہونچا اور سلام کیا ؎

یار جس سے خوش رہے مجھ کو وہ آئین چاہیے اس سوا طالبِ دنیا کا ہوں نے دین چاہیے

شاہ صاحب نے دیکھ کر فرمایا کہ خوب ہوا تم آ گئے۔ ہم بھی منتظر تھے، کیونکہ اب ہمارا وقت قریب ہے۔ پھر ہم دونوں اپنا اپنا بوجھ لے کر جھونپڑیوں میں گئے۔ چند روز اُن کے پاس رہے ایک بار آدھی رات کو شاہ صاحب نے فرمایا کہ میاں دِلّی والے سید ایک گھڑا لے جاؤ اور عین گنگا جی کی دھار میں سے بھر کر لاؤ۔ ہم نے فکر کی کہ آدھی رات ادھر اور آدھی رات اُدھر جنگل کا مقام، برسات کا موسم، دریا چڑھا ہوا ہے۔ ایسے نازک وقت میں یہ کیا ارشاد ہوا۔ خیر چار و ناچار ہم گھڑا لے کر چلے۔ کنارے پر پہونچے، دیکھا کہ دریا چڑھاؤ پر ہے۔ اور نہایت زور و شور سے موجیں مار رہا ہے۔ پہلے تو اندیشہ ہوا پھر ہم نے خدا کا نام لے کر قدم بڑھایا ع

دل افگندیم بِسۡمِ اللهِ مَجۡرٖىهَا وَمُرۡسٰىهَا

اُس وقت عجب تماشا دیکھا کہ یا تو وہ طغیانی اور جوش و خروش تھا یا اتنا بھی پانی نہ تھا کہ گھڑا ڈبو کر بھر لیں، یہاں تک کہ منجدھار کو ڈھونڈھتے ہوئے ہم دوسرے کنارے پر جا نکلے طُرفہ یہ ہے کہ وہاں خود میاں ریتیا شاہ بھی کھڑے تھے۔ بولے کہ میاں دِلّی والے سید ابھی گھڑا بھرا نہیں۔ ہم نے عرض کیا کہ حضرت آپ نے تو بیچ دھار کا حکم دیا تھا۔ سو دھار کا کہیں پتہ نہیں بلکہ گھڑا ابھی نہیں ڈوبتا۔ فرمایا کہ خیر ہاتھوں سے بھر لو یہ کہہ کر خود بھی بھرنے لگے۔ جب گھڑا بھر گیا تو ہم نے اُٹھا کندھے پر رکھا۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے ساتھ ساتھ چلے۔ مکان قریب آیا تو شاہ صاحب نے کہا کہ ہم پیشاب کر لیں تم آگے چلو۔ ہم جھونپڑیوں کے پاس پہونچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ خود بدولت اندر بیٹھے ہوئے بالکوں سے کہتے ہیں کہ دلّی والے سید نے بڑی دیر لگائی، جاؤ دیکھو تو کہاں ہیں۔ کہیں راہ بھول کر اور طرف نہ چلے گئے ہوں۔ ہم جا ہی پہونچے تھے کہ بالکے نے کہا صاحب وہ آئے۔ ہم کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ تماشا کیسا ہے۔ خیر گھڑا رکھ دیا اور بالکے سے پوچھا کہ بھلا شاہ جی اس وقت باہر بھی گئے تھے؟۔

اُس نے کہا کہ جس وقت سے آپ گھڑا لے کر گئے ہیں، یہیں اندر بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ کی صفت وثنا بیان کر رہے ہیں۔ باہر تو نکلے بھی نہیں۔ خیر ہم چپ ہو رہے۔ جب بالکے اُٹھ گئے تو خود ہی فرمانے لگے کہ ایسے شعبدے تو ہم تم کو بہت دکھادیں گے لیکن یاد رہے کہ فقیری اس کو نہیں کہتے۔ یہ تو ایک بھان متی کا سانگ ہے۔ الحاصل ہم کو نہایت خوشی کے ساتھ رُخصت کیا اور کہا کہ اب ہماری عمر میں صرف دس دن باقی ہیں۔ تم جاؤ اور بھی دو شخص تمھارے منتظر ہیں۔ ایک تو چراغ علی شاہ سنبھل[ل] میں دوسرے واجد علی شاہ زبیدہ[ل] میں۔ اب کمر باندھو، میاں چراغ علی سے جا کر ملو۔ پھر حج کو جاؤ، اچھا رخصت، خدا کے سپرد۔ اُس وقت تک ہمارا ارادہ حج کا نہ تھا کیونکہ فرض تو تھا نہیں مگر اُن کے فرمانے سے عزمِ مصمم ہو گیا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہم قادر گنج سے چل کر سنبھل میں پہونچے۔ میاں چراغ علی شاہ صاحب سے ملاقات ہوئی بہت خاطر و تواضع سے پیش آئے اپنے پاس ہی ٹھہرایا۔ فرمایا کہ ہم کو تمھارا بہت انتظار تھا۔ اچھا ہوا کہ آگئے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ ٹھیک دوپہر کے وقت گرمی کے مارے تین چمار اُن کے تکیہ میں سایہ اور پانی دیکھ کر آگئے۔ شاہ صاحب نے تین دفعہ اُن سے پوچھا بھائی تم آگئے۔ وہ بولے ہاں حضور ہم آگئے۔ تھوڑی دیر بعد جب کہ چمار ستا لیے اور چلنے لگے تو آپ نے فرمایا کہ اب کہاں جاتے ہو۔ یہاں سے جانے نہ پاؤ گے ؎

قدغن ہے کہ اس کو میں کوئی آنے نہ پائے — گر بے خبر آجائے تو پھر جانے نہ پائے

یہ فرما کر اُن کی طرف ایک نگاہ کی، وہ غائب ہو گئے۔ پھر اُن کا پتہ نہ ملا۔ تین مہینے کے بعد ہم وہاں سے میرٹھ پہونچے۔ لالہ بانکے رائے کے مکان پر اُترے۔ چندے قیام کر کے ارادہ حج کا مصمّم ہوا۔ جب چلنے لگے تو لالہ بانکے رائے صاحب نے دس بارہ جوڑے کپڑوں کے اور پچاس روپیہ نقد نذر کیے۔ ہم نے اس نقد اور جنس میں سے صرف پانچ روپئے اُٹھا لیے اور اُن میں سے بھی شہر سے باہر نکلتے نکلتے ہمارے پاس فقط پانچ ٹکے

[ل] ایک قصبہ ہے ضلع بریلی میں ۱۲ [ل] ایک مقام ہے ملک عرب علاقہ یمن میں جہاں حضرت خواجہ اویس قرنی کا مزار ہے ۱۲۔

رہ گئے مولوی نیاز علی صاحب اور بہت لوگ شہر سے باہر دور تک پہونچانے کو آئے۔ غرض اُن سے رخصت ہو کر دوسرے روز دہلی میں آگئے میاں فدا حسین شاہ صاحب کی خدمت میں رہے اور ارادہ سفر حج کا ظاہر کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ مبارک کرے۔ جب مدینۂ منورہ میں پہونچو تو اس خاکسار کی طرف سے حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جناب میں بعد آداب و نیاز کے یہ رباعی عرض کر دینا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت یاد رہا تو عرض کر دوں گا۔ فرمایا کہ اچھا۔ جب مدینۂ منورہ میں پہونچے تو یہ بات بالکل یاد نہ تھی۔ خواب میں دیکھا کہ شاہ فدا حسین صاحب فرماتے ہیں کہ اب وہ رُباعی عرض کر دو۔ آنکھ کھلی تو ہم اُسی دم روضۂ مبارک پر گئے اور پیام پہونچایا۔

ایک روز ارشاد[۶۳] **ہوا** کہ ہم ریواڑی کو جاتے تھے۔ اثناء راہ میں ایک پنڈت جی مِل گئے وہ بھی کسی گاؤں کو جاتے تھے جو وہاں سے دو ایک کوس تھا۔ دونوں ہمراہ ہو کر چلے۔ پنڈت جی نے کہا کہ لاؤ تمھارا ہاتھ دیکھوں۔ پہلے تو ہم نے اپنا ہاتھ اُن کو دکھایا۔ پھر میں نے اُن کا ہاتھ دیکھا اور ہم نے کہا کہ تم کسی پر عاشق ہو۔ اتنی بات سن کر وہ تو ہمارے سر ہو گئے کہ میاں صاحب مرض پہچانا تو اس کا علاج بھی ضرور چاہیے۔ ہم نے کہا کہ خیر ایک شاخِ درخت لاؤ، وہ لایا، کچھ پڑھ کر اُس پر دم کیا اور کہہ دیا کہ اب تم بِتّا توڑ بھاگے چلے جاؤ اور معشوقہ کے صحن خانہ میں اس لکڑی کو ڈال دو پھر دیکھنا کہ کیسی تمھاری حلقہ بگوش ہو جاتی ہے۔ مگر یہ شرط ہے کہ اثناء راہ میں اگر گوز آئے تو اس شاخ کو الگ رکھ دینا ورنہ اثر جاتا رہے گا۔ اس بے چارہ نے ہمارے کہنے کے موافق عمل کیا۔ مگر قسمت سے مجبور تھا، جب گاؤں کے پاس پہونچا ٹھوکر کھا کر ایسا منھ کے بل گرا کہ بے اختیار گوز نکل گیا۔ وہ پھر دوڑا ہوا ہمارے پاس آیا اور نہایت منّت و زاری کی۔ ہم نے پھر وہ شاخ پڑھ کر دیدی۔ غرض تین چار دفعہ یہی معاملہ پیش آیا کہ گانوں کے پاس پہونچا اور باد شکم کا جھونکا آیا ؎

قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند ۔۔۔ دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

آخر ہم تو چلتے چلتے آگے نکل گئے نہیں معلوم اس پر کیا گذری۔

ایک روز ارشاد[۶۴] **ہوا** کہ جب ہم بہ ارادہ حج چلے تو ٹونک کے راستہ میں ایک ہندو فقیر

چار چیلوں سمیت ہمارے ہم طریق ہو گئے۔ کہنے لگے کہ رات کو ہمارے ساتھ ٹھہرنا۔ چنانچہ ہم سب ایک دھرم سالہ میں جا اُترے۔ اُنھوں نے چیلوں سے پوچھا، کیا کھاؤ گے؟ سب نے اپنی اپنی رغبت کے موافق کہہ دیا، وہی کھانا موجود ہو گیا۔ پھر ہم سے پوچھا ہم نے کہا صاحب جو آپ کھائیں۔ کہا کہ میں تو مونگ کی دال اور چپاتی کھایا کرتا ہوں۔ غرض جب اُن کا کھانا تیار ہُوا تو ہم نے بھی وہی کھایا۔ بات چیت شروع ہوئی تو ایک اُنس پیدا ہو گیا۔ کچھ توجہ کا ذکر آیا میں نے استدعا کی۔ کہنے لگے کہ تین روز ہمارے پاس رہو چوتھے روز ہم توجہ دیں گے۔ خیر ہم ٹھہر گئے۔ اُنھوں نے تین روز تک ہم کو برت[1] رکھوایا۔ پھر توجہ دی واقع میں بڑے زبردست آدمی تھے۔ ہم بہت لوگوں سے ملے اور توجہ لی مگر یہ تاثیر کسی کی توجہ میں نہ دیکھی۔ ان کی توجہ سے ہمارا قلب گلاب کے پھول کی طرح کھل گیا اور قائم ہو گیا تھا۔ ایک دن انتقالِ روح کے باب میں گفتگو آئی کہا کہ ہاں ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہو سکتی ہے۔ کیا تم یہ تماشا دیکھو گے؟ میں نے کہا ضرور۔ کہا اچھا، ایک جانور مردہ لاؤ۔ اگلے دن ہم ایک مُردہ طوطا لائے۔ رات کے وقت وہ دیوار سے تکیہ لگا کر بیٹھ گئے اور طوطے کو سامنے رکھ لیا۔ چراغ گُل کر دیا۔ سسکی لے کر دم کھینچا کھٹ سے ایک آواز آئی اور بجلی سی چمکی طوطے میں جان آگئی۔ ہم نے اُس کو پکڑ لیا اور باتیں کرنی شروع کیں۔ وہ بول تو نہ سکتا تھا مگر اشاروں سے باتیں کرتا تھا۔ پھر ہم نے کہا کہ اچھا اب اپنے جسم میں آجائیے تماشا دیکھ لیا۔ غرض وہ بدستورِ سابق اُسی چمک دمک سے اپنے جسم میں آگئے۔ ہم نے کہا کہ یہ بات ہم کو بھی سکھا دیجیے۔ کہا اچھا پندرہ دن میں سکھا دیں گے۔ مگر روٹی کی ممانعت کر دی اور دودھ چاول کھانے کی اجازت دی۔ اور کپالی چڑھائی بتائی۔ یہ دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو چیتن تاڑی جس میں حبسِ دم کرتے ہیں مگر ہوش و حواس قائم رہتے ہیں۔ دوسرے جڑ تاڑی جس میں حبسِ دم کے بعد ہوش و حواس بھی قائم نہیں رہتے۔ اس سے پہلے

---

[1] برت یعنی روزہ ۱۲۔

ناتی دھوتی[1] اور کنجل[3] کریا کرائی۔ غرض پندرہ دن میں اپنا قول پورا کر دیا۔ ہم نے چند روز کرکے یہ عمل چھوڑ دیا کیونکہ ایک بکھیڑا تھا۔ چونکہ کپالی چڑھانا ہم کو لڑکپن سے یاد تھا۔ اس واسطے پندرہ دن میں یہ عمل پورا ہو گیا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب ہم جودھپور کے علاقہ میں پہونچے تو ایک ہندو فقیر دیکھا جو بارہ برس تک رات دن کھڑا رہا تھا۔ اُس کے پاؤں بھی ورم کر گئے تھے۔ بارہ برس کے بعد بیٹھنا چاہا تو بیٹھا نہ گیا چھ مہینے تک ٹانگوں کی مالش کرائی تب رگ پٹھے کھلے۔ ایک مدت کے بعد وہ فقیر پھر ملا، بھیک مانگتا ہوا، جھولی گلے میں، ہم کو دیکھ کر رونے لگا۔ ہم نے پوچھا کہ خیر ہے! روئے کیوں؟ بولا، کیا کہوں ایک عورت کر لی ہے، جب وہ حال تھا اب یہ صورت ہو گئی۔ پھر اپنے گھر لے گیا دیکھا تو ایک کھترانی موجود ہے، وہ بھی رونے لگی۔ ہم نے کہا کہ تم دونوں کیوں غم و رنج کرتے ہو، جہاں سے وہ حالت تھی وہیں سے یہ حالت ہے۔ اُس سے کیا بنا اور اس سے کیا بگڑا ؎

وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ   ان نینن کا یہی پریکھ

زمن سر ز حکمت بدر می برم   کہ حکمت چنیں می رود بر سرم

ابتدا میں اُس شخص کا یہ حال تھا کہ تمام امیر و غریب اُس کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور راجہ تو غلام تھا۔ جس وقت یہ شخص بارہ برس کے بعد بیٹھا تھا تو راجہ نے ہزارہا فقرا کو جمع کرکے اس خوشی میں بہت کچھ دان کیا تھا اور چند روز تک برابر جشن قائم رکھا تھا۔

---

[1] نیتی وہ فعل ہے کہ ایک دھجی ریشم سفید کی بتی بنا کر موم لپیٹتے ہیں اور اس سے ناک کے ہر دو سوراخ کو صاف کرتے ہیں یعنی دھجی کو ناک کے ہر ایک سوراخ میں سے چند بار کھینچ کر منھ سے نکالتے ہیں تاکہ سوراخ بینی صاف ہو جائیں اور آمد و رفت سانس میں کسی طرح کی دقت نہ ہووے اور دونوں سوراخ برابر جاری رہیں ۱۲ [2] دہوتی وہ فعل ہے کہ بعد ناتی کے ۱۶ اگز لمبی پٹی سفید ریشمی لے کر اُس کے ایک گوشہ میں ڈورا لمبا باندھ کے اُس پٹی کو نگل جاتے ہیں اور ڈورا باہر رہتا ہے یا دو بالشت پٹی کو باقی رکھتے ہیں پھر وہ پٹی قلب کے گرد جمع ہو جاتی ہے پھر اُس کو باہر کھینچ لیتے ہیں اور پانی سے صاف کرکے پھر نگلتے ہیں اور نکالتے ہیں تاکہ قلب کی چربی و کدورت دور ہو جائے اور راہ کو صاف کر دے کہ سانس رُکنے نہ پائے ۱۲ [3] بعد نیتی دہوتی کے کنجل کریا کرتے ہیں کنجل ہاتھی کریا فعل یعنی فعل ہاتھی کا جیسے ہاتھی پانی پی کر پھر پانی نکالا کرتا ہے اسی طرح پانی پی کر نکالتے ہیں اور قلب صاف ہوتے ہیں ان تین فعل میں بجز دودھ کے کچھ نہیں کھاتے جب ان تین عملوں میں مشاق ہو جاتا ہے اُس وقت تعلیم حبس دم و انتقال روح کرتے ہیں ۱۲ منہ

بعد میں ایک عورت کے ساتھ شادی کرنے سے راجہ کا سب اعتقاد جاتا رہا، شہر بدر کرادیا۔ دنیادار کا اعتقاد ایسا ہی ہوتا ہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ حج اوّل کے سفر میں بھوپال جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں سنا کہ سید العالم صاحب بڑے کامل فقیر ہیں اُن سے بھی ملے۔ انھوں نے تعلیم کا دعویٰ کیا۔ مگر کچھ اس کا ظہور نہ دیکھا گیا۔ ہم سے اور سید وزیر علی صاحب سے پہلے پہل اُن کے مکان پر ملاقات ہوئی تھی۔ چند روز تال بھوپال کے کنارے ایک پہاڑی پر رہے۔ ایک دن سکندر بیگم والیۂ بھوپال یہ سن کر کہ کوئی فقیر نواحِ شہر میں وارد ہے ملاقات کو آئیں۔ چند خواص وارکین بھی ہم رکاب تھے خود گھوڑے پر سوار ہمارے قریب آکر یہ شعر پڑھا ؎

کیوں شہر چھوڑ عابد غارِ جبل میں بیٹھا جس کو تو ڈھونڈھتا ہے تیری بغل میں بیٹھا

اور فرمایا کہ شاید آپ کا ارادہ بیت اللہ کا ہے۔ ہم نے کہا کہ ہاں ہے تو سہی۔ اتنے میں دوسری بیگم صاحبہ جو اُن کی نذیر تھیں یوں گویا ہوئیں :۔ ؎

عابد و معبود دونوں پاس ہیں غافل تیرے کیوں کرے پھر تو ارادہ طوفِ بیت اللہ کا

میں نے دیکھا کہ یہ تو سر پر ہی چڑھی جاتی ہیں، اب سکوت مصلحت نہیں۔ ناچار تیغ زبان کو خاموشی کے نیام سے کھینچ کر ایک ضرب اس شعر کی لگائی ؎

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکر خارا

یہ سُن کر بیگم صاحبہ بولیں کہ لو یہ تو شہری معلوم ہوتے ہیں، مگر چھوٹ گئے ہیں۔ ہم نے کہا کہ "آپ سے" بیگم صاحبہ لوٹ گئیں اور گھوڑے سے اُتر پڑیں اور کہا کہ ہمارا قصور معاف ہو، معلوم ہوا کہ آپ سب طرح درست اور پورے ہیں۔ ہم نے کہا کہ آپ آزمائش و پیمائش کرلیں اگر کمی بیشی ہو تو قصور از من است۔ پھر تو بھڑک گئیں اور کہنے لگیں کہ میاں صاحب کیا یہاں بولنا ہی خطا ہے۔ ہم نے کہا اس میں شک کیا ہے۔ آپ نے نہیں سُنا مَنْ سَکَتَ سَلِمَ وَمَنْ سَلِمَ نَجَا۔

دو چیز تیرۂ عقل ست دم فرو بستن بوقت گفتن و گفتن بوقت خاموشی

یہاں سب طرح کا سامان موجود ہے۔ دیکھ لو دکھا لو، پرکھ لو، پرکھا لو، سودا نقد ہے، اس ہاتھ دو، اس ہاتھ لو۔ بیگم صاحبہ بولیں بے شک میاں صاحب ہمارا دیان کھولنا غضب ہوا۔

اب ہماری تمھاری صلح ہے۔ ہم نے کہا بہت اچھا۔

اگر صلح خواہی نہ خواہیم جنگ   وگر جنگ جوئی نہ دارم درنگ

غرض عذرِ تقصیر کے بعد نذر پیش کی اور کہا کہ آپ شہر میں تشریف لے چلیں تو ہم کو ہر وقت آپ کی زیارت نصیب ہو، اور آپ کو ہر طرح کا آرام ملے۔ ہم نے کہا کہ بیگم صاحبہ ہم کو تو یہی بڑا آرام ہے کہ آپ اپنا رام نہ بنائیں اور یہیں آرام کرنے دیں۔ مسکرا کر چپ ہو گئیں اور رخصت ہوئیں۔ اس کے بعد وزیر علی صاحب نے اکسیر سے خرچ تیار کیا۔ دو ہندو فقیر جو وہاں رہتے تھے، یہ بات دیکھ کر سر ہو گئے۔ ہم نے سید وزیر علی سے کہا کہ تم نے یہ کیا کام کیا، کہیں گرفتار تو نہیں کراؤ گے۔ اُس سارے بکھیڑے کو ہم نے تالاب میں ڈلوا دیا۔ وہ ہندو سر پیٹنے لگے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہمارے ایک دوست تھے عبدالصمد خاں، بھوپال میں ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ اُنھوں نے دو حکایتیں عجیب و غریب بیان کیں:۔

حکایت اوّل یہ کہ میں ایک مولوی صاحب سے پڑھا کرتا تھا۔ قضاراً اُن کا انتقال ہو گیا۔ سخت رنج والم ہوا کہ ایسے اُستادِ شفیق اب کہاں ملیں گے۔ جب اُن کو غسل دیا، کفن پہنایا، تو میں خوشبو لینے اُن کے حُجرے میں آیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ مولوی صاحب اندر موجود ہیں۔ میں نے متعجب ہو کر پوچھا کہ حضرت جنازہ تو باہر رکھا ہے اور آپ یہاں۔ فرمایا کہ میاں تمھارا غم واندوہ گوارہ نہ ہوا۔ اب خاطر جمع رکھو۔ انشاء اللہ ہر روز ملاقات ہوا کرے گی مگر افشائے راز نہ کرنا۔ چلو اب جنازہ کی نماز پڑھو، مگر ہم اور لوگوں کی نظر سے غائب رہیں گے چنانچہ جب تک دفن کیا وہ ہمارے ساتھ رہے۔ قبرستان سے پھرے تب بھی ہمراہ تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ مولوی صاحب آپ تو یہاں ہیں بھلا قبر میں منکر نکیر کو جواب کون دے گا فرمایا کہ میاں یہ بات نہ پوچھو اور گفتگو کرو۔ دو گھڑی بعد سلام علیک کر کے تشریف لے گئے۔ من بعد ہر روز صبح کے وقت قدم رنجہ فرماتے رہے۔ چند روز اسی طرح گذرے۔ ایک رات میں نے حجرہ کی موری میں پیشاب کر دیا۔ صبح کو مولوی صاحب ناک چڑھائے آئے اور کہا کہ آج تمھارے حجرہ میں بدبو ہے۔ شاید تم نے یہیں پیشاب کیا ہے۔ میں نے عرض کیا

کہ فی الواقع یہ قصور مجھ سے ہوا ہے۔ اُس وقت فرمایا کہ یہاں تم اور عالم میں ہم اور عالم میں بھلا ہماری تمھاری ملاقات کیا، بھائی اَب ہم نہیں آئیں گے۔ ہر چند میں نے عذر و معذرت کی لیکن پھر کبھی نہیں آئے۔

حکایت دوم یہ بیان کی کہ ایک دفعہ میں اور میرا بھائی دونوں مُلکِ دکن کے اندر ایک راجہ کے سواروں میں بھرتی ہو گئے۔ چند روز کے بعد وہ راجہ تو مر گیا اُس کے دو بیٹوں نے ریاست و سپاہ باہم تقسیم کر لی۔ اتفاق سے دونوں رئیسوں میں مُجادلہ اور مقاتلہ واقع ہوا۔ ہم دونوں بھائی بھی لڑائی میں سخت زخمی ہوئے۔ رات کو میدان جنگ میں پڑے تھے اور کوئی ہمارے حال کا پرساں نہ تھا۔ آدھی رات کے وقت پیاس کا نہ حد غلبہ ہوا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک برہمن قشقہ لگائے، کمنڈل ہاتھ میں اور دس پندرہ آدمی ساتھ کورے گھڑے سر پر دھرے زخمیوں کو پانی پلاتے چلے آتے ہیں۔ مجھ کو ہندوؤں کے کھانے پینے سے ہمیشہ پرہیز رہا۔ اس لیے انکار کر دیا۔ مصر جی چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد پھر آئے کہ خاں صاحب کیوں پیاسے مرتے ہو پی بھی لو۔ میں نے کہا پہلے کبھی ہندو کے ہاتھ سے پانی نہیں پیا تو اب مرتے وقت کیا پییں۔ بولے کہ خاں صاحب تم بڑے ضِدّی ہو کیا اسی کا نام مسلمانی ہے۔ لو، پانی پیو۔ میں تمھارے بھائی کو بھی پلا آیا ہوں۔ ابھی تمھاری عمر بہت ہے۔ یہ بات سُن کر میرے کان کھڑے ہوئے کہ یہ میرے بھائی سے کیا واقف اور عُمر کی اس کو کیا خبر۔ میں نے کہا کہ صاحب خیر پانی تو پی لوں گا۔ لیکن یہ تو بتائیے کہ آپ کون ہیں۔ فرمایا کہ میں خضر ہوں اور یہ لوگ جن کے سر پر پانی کے گھڑے ہیں ابدال ہیں۔ ہم کو حکم ہوا ہے کہ ابھی ان زخمیوں کی عُمر زیادہ ہے انھیں پانی پلاؤ۔ میں نے کہا کہ حضرت آپ نے یہ بھیس کیوں بدلا ہے۔ بولے میاں چُپ رہو مہاراج کہو، مہاراج۔ بہت سے ہندو اس میدان میں پڑے ہیں، جن کو مسلمانوں کے پانی سے انکار ہے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ دوسری ملاقات کا وعدہ کریں تو پانی پیتا ہوں۔ فرمایا اچھا لیکن تم پہچانو گے نہیں۔ خیر میں نے پانی پیا، کچھ قوت آئی، وہاں سے اُٹھ کر مکان پر آیا۔ پھر نوکری چھوڑ چھاڑ کے اپنے وطن کی راہ لی۔ یہاں آکر مسجد کی امامت اختیار کی اور لڑکے پڑھانے لگا۔ کوئی پندرہ برس کے بعد ایک روز ایک سپاہی شکستہ حال

جس کی تلوار کا میان بھی ٹوٹا پھوٹا سا تھا، مسجد میں آیا۔
سپاہی: "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ"۔
میں نے جواب دیا: "وَعَلَیْکُمُ السَّلَامُ" آپ کیسے تشریف لائے؟۔
سپاہی: "بہت دنوں سے تمہاری ملاقات کو جی چاہتا تھا، آج سرکاری کام ادھر کا نکل آیا۔ ہم نے کہا کہ چلو خاں صاحب سے بھی ملتے چلیں"۔

میں نے سوچا کہ ہماری ان کی ملاقات تو ہے نہیں۔ شاید روٹی کے لیے یہ باتیں بناتا ہے۔ ہم نے روٹی منگا کر اُن کو کھلا دی۔

سپاہی۔ جب کھا پی کر چلنے لگے تو فرمایا: "لو خاں صاحب ہم جاتے ہیں پندرہ سولہ برس ہوئے کہ تم سے ملاقات ہوئی تھی اور ہم نے اقرار کیا تھا کہ ایک دفعہ پھر ملیں گے۔ لو ہم نے اپنا اقرار پورا کیا۔ کل کو یہ کہتا کہ ہم سے وعدہ خلافی کی۔ ہم روٹی کھانے نہیں آئے تھے۔ فقط تمہاری ملاقات مقصود تھی"۔

میں اس فکر میں تھا کہ یہ کیا کہتے ہیں۔

اتنے میں وہ سلام علیک کر کے مسجد کے دروازے سے باہر نکل گئے۔ اُس وقت مجھے یکایک یاد آیا کہ اوہو! یہ تو خضرؑ تھے۔ میں دوڑا اور ہر گلی کوچہ میں دریافت کیا کہ کسی نے اس شکل وصورت کا آدمی دیکھا ہے۔ مگر کچھ پتہ نہ لگا۔ ناچار کفِ افسوس مل کر رہ گیا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ بہ مقام بھوپال ایک ہندو فقیر تھے، بابا سیتل داس۔ ہم نے سنا کہ وہ توجہ دیا کرتے ہیں۔ ہم بھی اُن کے پاس گئے اور درخواست کی۔ کہا کہ تین دن تک فاقہ کرو، نہ اَن کھاؤ نہ پانی پیو۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ تیسرے دن باباجی نے توجہ کی تو تمام جسم مثلِ آئینہ ہو گیا۔ اندرونی اور بیرونی رگ وریشہ سب عیاں تھے اور ایک شعلۂ نورانی زمین سے آسمان تک منور معلوم ہوتا تھا۔ ہم نے عرض کیا کہ باباجی ہم کو مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ کے معنی سمجھا دو۔ اس توجہ سے تو یہ بات حاصل ہوتی نہیں۔ ہم تو دیدِ جان چاہتے ہیں۔ نہ دیدِ جسم وجہان۔ غیر کو دیکھا تو کیا دیکھا، اصل دیکھنا تو اپنا ہی دیکھنا ہے ؎

...ِ و مغز ست و باقی پوست ست　　　دید آں باشد کہ دیدِ دوست ست

...ٗ یہ تو مشکل ہے۔ ہم نے کہا کہ یہ مشکل ہے تو ہمارا بھی سلام ہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ مقام بھوپال میں قاری عبید اللہ عرف قاری لالہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ہم نے اُن کو قرآن شریف سُنانا شروع کیا۔ فرمایا کہ آپ کے لیے تو سیدھا سادہ پڑھ لینا کافی ہے۔ قرأت کے جھگڑے میں مت پڑو۔ ان کے ارشاد سے ہمارا خیال بھی پلٹ گیا۔ ایک دن قاری صاحب سے ہم نے پوچھا کہ آپ کو کبھی کوئی قاری بھی ملا۔ فرمانے لگے کہ ہاں ایک دفعہ ... کو جاتا تھا۔ راہ میں ایک گاؤں کے اندر ٹھہرا اور حسبِ عادت پوچھا کہ یہاں کوئی قاری بھی ہے۔ لوگوں نے کہا کہ قاری تو جانتے نہیں مگر ایک اندھے حافظ یہاں رہتے ہیں، لڑکے پڑھایا کرتے ہیں۔ جب اُن کے پاس گیا تو دیکھا کہ لڑکے باہر بیٹھے ہیں اور حافظ جی حجرہ کے اندر۔ ایک ایک لڑکا جاتا ہے اور سبق پڑھ کر چلا آتا ہے۔ جو لڑکا اندر جانے کو تھا میں نے اُس کی معرفت اپنی اطلاع کرائی تو حافظ جی نے اندر بُلا لیا۔ مزاج پوچھا۔ میں نے کلام مجید کے سُننے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ فرمایا کہ پہلے آپ پڑھیں۔ خیر میں نے ایک رکوع پڑھا تو اندھے نے کان کھڑے کیے اور کہا کیا تم قاری لالہ ہو؟ میں نے کہا کہ آپ نے کیونکر پہچانا۔ اُس نے کہا کہ آج سارے ہندوستان میں اس شدّ و مد سے پڑھنے والا سوائے قاری لالہ کے اور کوئی نہیں ہے۔ اس کے بعد حافظ جی نے پڑھنا شروع کیا۔ ہنوز اعوذ پڑھی تھی کہ ایک برتن جو اُن کے پاس رکھا تھا اُس کا سرپوش ہلا اور رکوع شروع کرتے ہی وہ سرپوش گز بھر اونچا ادھر جا ٹھہرا۔ جب حافظ جی پڑھ چکے تو وہ بھی اپنی جگہ پر آگیا۔ مجھ کو بڑی حیرت ہوئی۔ اُنھوں نے خاموشی کا سبب پوچھا۔ تو میں نے یہ ماجرا بیان کیا۔ فرمایا کہ تمھیں قال میں یدِطولیٰ ہے مجھ کو حال میں۔ اور میں تمام کلام مجید کا عامل ہوں۔ آج شام کو اور بھی تماشا دکھاؤں گا۔ غرض ظہر کے وقت مجھ کو جنگل میں لے گئے۔ وہاں ایک کنواں تھا۔ کہا کہ آؤ وضو کر کے نماز پڑھ لیں۔ میں نے کہا بہت اچھا۔ میں

رہٹ کھینچتا ہوں، آپ وضو کریں۔ کہا اس کی کچھ ضرورت نہیں۔ تم سورۂ یٰس کنوے کے کنارے پر کھڑے ہوکر پڑھو۔ میں نے پڑھنا شروع کیا اور پانی نے جوش مارا۔ آخر بڑھتے بڑھتے کنارے پر آگیا۔ ہم نے وضو کرکے نماز پڑھی۔ پھر سیر کرتے ہوئے دوسرے کنوئیں پر پہونچے۔ حافظ جی بولے پیاس لگی ہے، تم سورۂ الرحمٰن پڑھ کر انگلی پر دَم کرو اور تین بار رہٹ کی طرف اشارہ کرکے چکّر دے دو۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ رہٹ خود بخود چلنے لگا۔ جب پانی پی کر چل دیے تو کھیت والا ہمارے پیچھے دوڑا آیا کہ حضرت یہ کیا کر چلے۔ رہٹ تو تھمتا ہی نہیں۔ میرا کھیت ڈوبا جاتا ہے۔ حافظ جی نے کہا جاؤ اُسی طور سے پڑھ کر انگلی پر دَم کرکے اُلٹے تین چکّر دے دو۔ اوّل تو میں نے زور کیا اور یُوں ہی روکنا چاہا۔ بھلا میری تو کیا ہستی تھی وہ ایسے زور سے چلتا تھا کہ ہاتھی سے بھی نہ رُکتا۔ آخر وہی عمل کیا فوراً بند ہوگیا۔ حافظ جی نے وَالضُّحٰی سے وَالنَّاس تک مجھ کو بھی اجازت دی تھی۔ اور جو اُنھوں نے فرمایا تھا وقتِ امتحان وہی اثر پایا۔ قاری صاحب نے ہم کو بھی اُن تاثیرات کا مشاہدہ کرایا۔ ارادہ تھا کہ بعدِ حج نابینا حافظ کے پاس جاکر رہیں گے۔ مگر جب بیت اللہ شریف سے واپس آئے تو اُن کا انتقال ہوگیا تھا کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّكَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ ؕ

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب ہم نے بھوپال سے آگے کا عزم کیا تو میاں وزیر علی سے پوچھا کہو کچھ خرچ بھی ہے۔ بولے گیارہ ٹکے موجود ہیں۔ ہم نے کہا کہ خرچ تو بہت ہے۔ اب کیا دیر ہے، چلو۔ آدھی رات کے وقت ہم دونوں چل نکلے۔ جب اندور میں پہونچے تو کچھ پاس نہ تھا۔ بمجبوری رسالہ کی مسجد میں قیام کیا۔ وہاں کا مُلّا نہایت نیک بخت آدمی تھا۔ اُس نے دس بارہ روز ٹھہرایا بوقت روانگی پانچ روپیہ پیش کیے۔ ہم نے سید وزیر علی کی طرف اشارہ کیا۔ اُنھوں نے انکار کیا، تو ہم نے سمجھایا کہ میاں صاحب دعوتِ خدا کو کیوں رد کرتے ہو۔ آپ بھیک نہیں مانگتے مزدوری اور تجارت نہیں کرتے۔ اس فقیری جامہ میں تو اسی طور سے ملے گا۔

بارے مان گئے اور روپئے لے لیے۔ وہاں سے روانہ ہو کر چانڈور پہونچے۔ ایک دن رہنے کا اتّفاق ہوا۔ سیّد وزیر علی صاحب نے کمرِ ہمّت باندھی اور کتابت و طبابت کے ذریعہ سے نو روپئے جمع کیے۔ تب وہاں سے آگے کو چلے۔ ایک منزل میں سخت بارش ہوئی۔ ہم دونوں کمبل تان کر بیٹھ گئے۔ تاہم کپڑے بہت بھیگ گئے۔ سردی نے غلبہ کیا۔ سامنے ایک مُردہ ہندو کا جل رہا تھا۔ وہاں خوب آگ تاپی اور کپڑے سُکھائے۔ لیکن کپڑوں میں اُس کی بدبو بس گئی۔ دماغ پریشان ہونے لگا۔ جب ذرا ابر کھُلا تو ہم نے غسل کیا اور کپڑے دھوئے۔ تب ذرا طبیعت درست ہوئی۔ غرض چلتے چلتے بمبئی میں پہونچے اور مولوی عبد الحکیم صاحب کی مسجد میں قیام کیا۔ مُلّائے مسجد سے تکرار ہو گئی تھی۔ دوسری مسجد میں جا ٹھہرے۔ لیکن مولوی صاحب موصوف نے یہ بات سُن کر طلب کیا اور نہایت اخلاق سے پیش آئے۔ اپنے پاس ٹھہرایا یہاں تک کہ چند روز کے بعد اپنے گھر لے جا کر ہم کو کھانا کھِلانے لگے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ بمبئی میں ہم اور سیّد وزیر علی صاحب حکیم عبد اللہ شاہ کی ملاقات کو گئے۔ وہاں بہت سے فقیر ہر قسم کے جمع تھے۔ ہم تو سفید پوش تھے، کسی نے کچھ نہ کہا۔ لیکن سیّد صاحب کا رنگین لباس تھا اُن سے گفتگو ہونے لگی۔ ایک شخص نے پوچھا کہ آپ کے پیر کون ہیں۔ جواب دیا روٹی۔ کہا طریقہ۔ جواب دیا روٹی۔ غرض جو سوال کیا یہی جواب دیا۔ ایک شخص بولا بابا بُزرگوں نے روٹی ترک بھی تو کردی ہے جیسے حضرت شیخ فرید الدین شکر گنج نے کیا تھا۔ ہم نے چُپکے سے کہہ دیا کہ بیل پکّے تو کوّے کے باپ کا کیا۔ پدرم سلطان بود ترا چہ۔ یہ بات سُن کر وہ لوگ کہنے لگے ارے میاں! یہ تو کوئی وہابی سے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک بولا صاحب اپنا شجرہ تو سُناؤ۔ سیّد وزیر علی نے ایک خط جیب سے نکال اُن کے سامنے رکھ دیا کہ یاروں کے پاس تو یہ شجرہ ہے، پڑھ لو۔ آپس میں وہ لوگ کہنے لگے ارے میاں! کس سے گفتگو کرتے ہو، یہ تو مسخرے معلوم ہوتے ہیں۔ ہم نے جانا تھا فقیر ہوں گے۔ پھر حکیم عبد اللہ شاہ سے ملاقات ہوئی۔ وہ بڑے خلیق اور حاذق طبیب تھے۔ پیری مریدی بھی کرتے تھے۔

بیت اللہ شریف سے واپس آکر بھی اُن کے مکان پر ہم نے قیام کیا تھا۔
ایک روز ارشاد ہوا کہ جب ہم بمبئی سے جہاز پر سوار ہوئے تو اُس کے مُعلّم سے ہم نے پوچھا کہ میاں تم کو کبھی کوئی مردِ خدا بھی ملا ہے۔ اُس نے کہا کہ ہاں دو مرد ملے ہیں ایک تو اُس زمانہ میں تشریف لائے تھے جب میں خورد سال تھا، اور میرا باپ معلّم تھا۔ اور دوسرے اب ملے ہیں۔ ہم نے کہا کہ بھائی اُن کو تم نے کیونکر پہچانا تھا۔ کہا کہ جس وقت ہمارا جہاز حاجیوں کو لے کر چلا تو ایک فقیر ڈبوسہ سے نکل کر میرے والد کے پاس آبیٹھا اور کہنے لگا کہ اس میں تو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ بھلا منزلِ مقصود پر کب پہونچیں گے۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ سوا مہینہ میں۔ اُس نے کہا یہ تو بڑی مشکل ہوئی ہمارا جی متلاتا ہے۔ پہلے سے یہ حال معلوم ہوتا تو کبھی سوار نہ ہوتے۔ والد نے کہا صاحب میں مجبور ہوں اگر آپ کچھ ہمّت رکھتے ہوں تو زور لگائیے تاکہ جہاز ساحلِ جدّہ پر جالگے۔ فقیر نے کہا اچھا یہ تو بتاؤ، پہلے کون سا بندر آتا ہے کہا عدن۔ پوچھا پھر؟۔ جواب دیا مخہ۔ کہا اور۔ جواب دیا حُدیدہ۔ بولا اور۔ کہا جدّہ۔ تب فقیر نے فرمایا کہ بس لنگر ڈال دو۔ اور خود اُٹھ کر ڈبوسہ کے اندر چلے گئے۔ میرے والد نے دریا کی طرف نگاہ کی تو کنارہ پر چراغ روشن نظر آئے۔ اور جدہ کے آثار معلوم ہوے۔ نہایت حیرت ہوئی کہ الٰہی یہ کیا معاملہ ہے۔ پندرہ دن تک تو بمبئی سے چل کر کنارہ کا پتہ بھی نہیں لگتا۔ ایک خلاصی کو حکم دیا کہ جلد ہوڑے پر سوار ہو کر جا اور کنارہ کی خبر لا۔ وہ دیکھ کر واپس آیا اور کہا کہ صاحب بندرِ جدّہ آگیا۔ والد نے جہاز کو لنگر کیا اور فقیر کو ڈھونڈھا تو کہیں پتہ نہ لگا۔ اللہ اکبر بڑا زبردست بزرگ تھا، مگر افسوس ہے پھر اُس کی زیارت نہ ہوئی۔ ہم نے کہا دوسرا کہاں ہے۔ بولا کہ میرے پاس بیٹھا ہے۔ ہم نے کہا کہ تم نے کیونکر جانا۔ کہا کہ مجھ کو ہزارہا آدمیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا اور بہت سے فقراو کی زیارت کی، مگر کسی نے یہ سوال نہ کیا، اور مردِ خدا کا حال نہ پوچھا۔ آپ کے سوال سے میں جان گیا، کیونکہ مرد کو مرد پوچھتا ہے ؎

اولیا را می شناسد اولیا — دزد را ہم دزد داند بے ریا
غیر جنسیت نمی داند کسے — می شناسد جنس خود را ہر یکے

اَلْجِنْسُ یَمِیْلُ اِلَی الْجِنْسِ

ایک روز ارشاد ہوا کہ بیت اللہ شریف میں ہم پہونچے تو حسن علی زمزمی کے حجرے میں ٹھہرے بعد چندے مولوی محمد یعقوب صاحب اور مولانا شاہ اسحٰق صاحب سے ملاقات ہوئی اور اتنا ربط بڑھا کہ روزمرہ کی آمد و رفت ہو گئی۔ ایک دن ہم نے مولوی محمد یعقوب صاحب سے دریافت کیا کہ ذاتِ باری کا ظہور کیا عرب و ہندوستان میں کچھ جُدا جُدا ہے۔ کہا نہیں۔ پھر ہم نے پوچھا کہ ہردوار اور بیت اللہ شریف میں کیا فرق ہے۔ فرمایا کچھ نہیں۔ اس کے بعد ہم نے کہا کہ پھر آپ ہندوستان سے کیوں بھاگے فرمایا کہ بھائی ہم محمدی بھی تو ہیں۔ یہ گفتگو ہماری مولانا شاہ اسحٰق صاحب بھی پردے کی آڑ میں بیٹھے سُن رہے تھے۔ اور ہم کو کچھ خبر نہ تھی۔ بعد ازاں مولوی محمد یعقوب صاحب سے ہم نے درخواست کی کہ حِصنِ حصین کی ہم کو اجازت دیدیجیے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ بڑے بھائی صاحب سے لو۔ دوسرے دن شاہ صاحب سے عرض کیا گیا۔ بڑے خفا ہوے۔ تم کو اجازت نہیں دیں گے، کل تم دونوں کیا بک رہے تھے۔ خیر ہم نے توبہ استغفار کی اور عفوِ قصور کرایا۔ پھر شاہ صاحب نے ہم کو حِصنِ حصین پڑھائی اور اجازت دی جب اجازت مل گئی تو ہم نے عرض کیا کہ حضرت سچ سچ فرمایئے کہ ہم دونوں جو گفتگو کر رہے تھے کیا وہ خلافِ واقع تھی۔ تامل کیا اور فرمایا کہ ہاں سچ تو وہی ہے جو تم کہتے تھے مگر بھائی ہم محمدیوں کو ایسی بات زبان سے نکالنا زیبا نہیں، کیونکہ ان باتوں سے حضرت رسولِ خدا خفا ہوتے ہیں۔ ہم نے کہا کہ خُدا؟ فرمایا کہ بس رہنے دو، آگے گفتگو نہ کرو، آدمی خراب ہو جاتا ہے۔ اُس وقت ہم نے کہا کہ الحمد للہ آپ بھی ہمارے شریک نکلے۔ بس ہم کو اتنا ہی معلوم کرنا باقی تھا۔ اس بات پر ہنسے اور فرمانے لگے کہ بھائی ہم کو شرع شریف کا پاس و لحاظ رکھنا ضرور رہے۔ پھر ہم نے

مولوی محمد یعقوب صاحب سے پوچھا کہ یہاں آپ نے کوئی فقیر بھی دیکھا۔ کہا کہ ہاں ایک نو وارد شہر کے باہر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ بڑے کامل ہیں۔ کل اُن کے پاس چلیں گے۔ دوسرے دن گئے تو بہت آدمیت سے پیش آئے۔ مولوی صاحب نے اُن سے توجّہ کی درخواست کی۔ بولے کہ ابھی تم اس قابل نہیں۔ اگر چھ مہینہ تک آتے رہو تو شاید توجّہ کے قابل ہو جاؤ۔ ہم نے عرض کیا کہ صاحب آپ کی توجّہ میں ایسی کیا بات ہے۔ کہا کہ مولوی صاحب کی تو کیا ہستی ہے۔ پتھر بھی پاش پاش ہو جاتا ہے۔ ہم نے کہا کہ توجّہ تو بہت قسموں کی دیکھی، لیکن پتّھر توڑ کبھی نہیں دیکھی۔ ہم تین چار آدمی پہاڑ پر گئے اور ایک بھاری پتّھر لُڑھکا لائے اور اُن بزرگ کے سامنے رکھ دیا۔ ایک نگاہ ڈالی تو فوراً پتّھر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ ہم متحیّر ہو گئے کہ اللہ اکبر بڑے زور کی نگاہ ہے اُن کا طریقہ پوچھا تو کہا شیطانیہ۔ ہم سمجھے کہ مقرّر یہ ملامتیہ ہیں۔ اُس دن سے ہم روز مرّہ جانے لگے رفتہ رفتہ بے تکلّفی ہو گئی۔ ایک دن اُن کا نام پوچھا تو بے ساختہ کہہ اُٹھے کہ محمّد۔ ہم نے کہا کہ سبحان اللہ! آپ کا نام تو ابلیس ہونا چاہیے تھا۔ وہ ہنس پڑے اور کہنے لگے کہ لوگ مجھ کو بہت تنگ کرتے ہیں۔ اس لیے یہ بہروپ بھرا ہے۔ اس میں بہت اَمن ہے۔ میرا نام محمد ہے اور خاندان قادریہ ہے۔ اس وقت جو صاحب بغداد میں سجادہ نشین ہیں۔ سید محمود صاحب رزّاقی۔ انھیں سے مجھ کو بیعت ہے۔ میرا وطن بھی بغداد ہے۔ اور پیشہ تجارت۔ مُلک مُلک کی سیر کی ہندوستان کے بڑے بڑے شہر بھی دیکھ آیا ہوں۔ اب کی بار حج کے لیے یہاں چلا آیا۔ ہم نے کہا کہ صاحب یہ سب کچھ سہی لیکن یہ تو فرمائیے کہ آپ کو تَطْهِيرُ الْقَلْبِ عَنْ مَا سِوَى اللّٰهِ بھی حاصل ہوئی یا نہیں۔ آدمی سچّے تھے۔ کہنے لگے کہ میاں اس کی تو ہوا بھی نہیں لگی۔ ہم نے کہا بس صاحب توجّہ پتّھر توڑ ہوئی تو کیا اور نہ ہوئی تو کیا ؎

قوی شُدیم چہ شُد ناتواں شُدیم چہ شُد ... چنیں شدیم چہ شد یا چناں شدیم چہ شد
بہیچ گونہ دریں گلستاں قرارے نیست ... تو گر بہار شُدی ما خزاں شُدیم چہ شد

من بعد مکہ معظمہ سے مدینۂ منوّرہ کو گئے۔ وہاں ایک خواجہ سرائے سے مل ملا کر

شب کو مسجد نبوی میں رہنے کی اجازت لی۔ سید وزیر علی صاحب تو واپس ہندوستان کو روانہ ہوئے اور ہم چھ مہینے کے بعد پھر مکہ معظمہ میں واپس آئے۔ کچھ عرصہ کے بعد ہمارے پاس خرچ ہو چکا۔ حطیم میں میزاب رحمت کے تلے ہم اس فکر میں بیٹھے تھے کہ ایک ترک نہایت حسین امیرانہ لباس پہنے ہوئے ہمارے پاس آیا۔ پانچ ریال دیئے اور کہا کہ خاطر جمع رکھو آیندہ تم کو کبھی خرچ کی تنگی نہ ہوگی اور اگر کبھی تمھارا جی گھبرائے یا کسی چیز کی ضرورت ہو تو فلاں جگہ ترک سواروں کے رسالہ میں ہمارے پاس چلے آنا۔ جب ہم ہندوستان میں اپنے مکان پر آئے اور والدہ صاحبہ کی زیارت ہوئی تو اُن سے معلوم ہوا کہ وہ بھائی انوار الحسن تھے جو ایامِ طفلی میں ابدال ہو کر غائب ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے یہ بات والدہ سے جا کر کہی تھی۔ ہاں یہ بات خوب یاد ہے کہ اُس دن کے بعد پھر کبھی تنگی خرچ کی نہیں ہوئی۔ ایک دن بام کعبہ کی مرمت ہو رہی تھی۔ ہم بھی مزدوروں میں شامل ہو گئے اور چونہ کی ٹوکری سر پر رکھ اوپر پہونچے اور دوگانہ ادا کیا۔ دوسرے دن یہ حال مولوی **محمد یعقوب** صاحب سے بیان کیا۔ وہ بولے ارے میاں کعبہ کی چھت پر تو شیطان نماز پڑھا کرتا ہے۔ ہم نے کہا الحمد للہ یہ منزل بھی طے ہوئی اور ایک عقدہ حل ہوا کہ شیطان بھی نماز پڑھتا ہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ بیت اللہ شریف میں ہمارے والد ماجد کا ایک مُرید شبِ برات کے دن تھوڑا سا حلوا پکا کر لایا اور کہا کہ بزرگوں کی فاتحہ دے دیجیے۔ ہم نے کہا کہ بھلے مانس دیکھ تو کیسی مصیبت اُٹھا کر ہم تم یہاں پہونچے ہیں۔ بھلا اس ذرا سے حلوے کے لیے کیوں بزرگوں کو تکلیف دیتا ہے۔ اتنی دور دراز مسافت، بیچ میں سمندر حائل۔ اور بالفرض وہ آ بھی گئے تو اتنے سے حلوے میں کیا بھلا ہو گا۔ کیا تم اُن کو آپس میں لڑانا چاہتے ہو۔ ہنس کر کہنے لگا میاں صاحب آپ کو تو ہمیشہ ہنسی کی بات سوجھتی ہے۔ اپنے بزرگوں سے بھی نہیں چوکتے۔ خیر ہم نے فاتحہ پڑھ کر حلوا تقسیم کر دیا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہم بیت اللہ شریف سے روانہ ہو کر عدن میں پہونچے۔ شیخ عیدروس صاحب کی زیارت کی۔ پھر یہاں سے چار دن کی مسافت طے کر کے **زبید میں**

آئے۔ حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار شریف دیکھا۔ وہاں ایک جُبّہ شریف حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا موجود ہے اور یہ وہ جبّہ ہے جو حضرت عمرؓ و حضرت علی رضی اللہ عنہما نے بموجب وصیت حضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اویسؒ قرنی کو لاکر پہنایا تھا۔ ایک روز جُبّہ شریف کی زیارت بھی ہم کو نصیب ہوئی۔ ہر چند لوگ منع بھی کرتے رہے لیکن دل نہ رہ سکا۔ مارے شوق کے جُبّۂ مبارک کو ہم نے اپنے سر پر رکھ لیا۔ جُبّہ کا سایہ تو درکنار اُس وقت ہمارا سایہ بھی ندارد ہو گیا تھا۔ سبحان اللہ! اب تک یہ معجزہ موجود ہے۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلَيْهِ ٥

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہم زُبید میں پہونچے تو واجد علی شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوے۔ وہ بہت مہربانی سے پیش آئے۔ اپنے پاس ٹھہرایا اُن کی صحبت کی تاثیر سے ہمارا یہ حال ہو جاتا تھا جیسے کوئی بیداری میں خواب دیکھتا ہو، اور تمام کائنات ہیچ معلوم ہوتی تھی۔ اُن پر نسبتِ استغراق نہایت غالب تھی۔ ایک دن میاں صاحب نے ہم کو بھی توجہ دی تھی۔ اُس توجہ کی بدولت اُس دن نمازِ ظہر قضا ہو گئی تھی۔ ہم نے بہت بزرگوں سے توجہ لی مگر ایسا حال کسی کی توجہ میں نہیں ہوا۔ یہ بزرگ بھی اپنی حالت میں بڑے کامل اور زبردست تھے۔ ایک روز میاں صاحب نے ہم سے پوچھا کہ تمہارا اصل مقصد اور دلی مطلب کیا ہے۔ ہم نے کہا کہ حضرت توحید تنزیہی۔ فرمایا کہ اس میں تو بجز حیرانی و سرگردانی کے اور کچھ نہیں۔ ہم نے عرض کیا کہ خیر ہر چہ بادا باد ہم تو اسی کے طالب ہیں ؎

گرم دیکھتے ہیں ملاقات بد و نیک سے ہم ... تیرے ملنے کے لیے ملتے ہیں ہر ایک سے ہم

ایک روز ہم جنگل کی طرف گئے ایک بدوی سے دریافت کیا بر مجنون فاین یعنی مجنوں کا جنگل کدھر ہے؟ جواب دیا یَا شَیْخُ اَنَا مَجْنُوْنٌ اَوْ اَنْتَ مَجْنُوْنٌ مَا هُوَ مَجْنُوْنٌ یعنی میں دیوانہ ہوں یا تو کون مجنون؟ تب خیال آیا کہ یہ سمجھا نہیں۔ ہم نے

بجائے مجنوں کے قیس کہا اُس نے جواب دیا نعم تعالیٰ ھِنَا یعنی آؤ میں بتا دوں۔
ہم کو لے گیا اور وہ جگہ دکھائی اُس وقت ہم کو یہ شعر یاد آیا ؎

قیس کا ماتم کروں میں یا کروں فرہاد کا — دونوں یاد آئے مجھے کوہ و بیاباں دیکھ کر

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہم زُبید سے ملک خوارج کی طرف چلے ایک شیعی میر جعفر علی بھی ہمارے ساتھ ہو لیے۔ ہم نے کہا کہ یہاں سُنّی و شیعہ کا دھرم نہیں آؤ تقیہ کرلیں۔ آخر وہ بھی تو چھ راگ اور چھتیس راگنیوں سے باہر نہ ہوں گے۔ جس طرح وضو نماز اُن کی ہوگی اُسی طرح ہم بھی کریں گے۔ چلتے چلتے ایک قریہ میں پہونچے۔ مسجد میں جا اُترے۔ اتّفاق سے وہاں کا امام ایک ہندوستانی تھا۔ اُس نے بڑی خاطر و مدارات کی۔ تین دن اپنے پاس مہمان رکھا اور بہت خوش ہُوا کہ ایک مدت کے بعد اپنے ملک والوں کی صورت نظر آئی ہے۔ ہم سے پوچھا کہ کچھ لکھے پڑھے بھی ہو۔ ہم نے کہا صاحب بچپن میں پاؤ سیپارہ پڑھا تھا سو وہ بھی بھول گئے۔ اب تو دو چار سورتیں یاد ہیں وہی نماز میں پڑھ لیتے ہیں۔ پھر خود بخود اپنی داستان چھیڑی کہ میں مولوی محبوب علی کا شاگرد ہوں۔ تحصیل علم کر کے لکھنؤ گیا۔ شیعہ مذہب پسند آیا۔ اُس کو اختیار کرلیا۔ یہاں آکر خارجی مذہب کے اصول ٹھیک معلوم ہوئے اُس کو اختیار کیا۔ ہم نے کہا اگر لندن جاؤ تو کیا کرو؟ چُپ ہو رہا۔ تیسرے دن ہم کو رخصت کرنے گاؤں سے باہر آیا اور کہنے لگا "سُنو صاحب! مسقط تک یہ ہی بہروپ بھرے رہنا۔ آگے کچھ کھٹکا نہیں۔ ہم نے کہا بہروپ کیسا؟ بولا کیا میں جانتا نہیں، تم سُنّی ہو اور یہ شیعہ اور دونوں صاحب علم بھی ہو۔ یہ کہہ کر وہ تو واپس پھر گیا۔ ہم آگے بڑھے۔ راہ میں ایک ندی آئی اس کے دونوں کناروں پر آم کے درخت کھڑے تھے۔ اُس وقت ہم کو ہندوستان یاد آگیا۔ ندی میں خوب نہائے۔ چھوٹی چھوٹی مچھلیوں نے بدن کھُجلایا، خارش ہو رہی تھی۔ بہت بھلا معلوم ہوا۔ خُدا کی قدرت دوسرے دن خارش جاتی رہی۔ الغرض بعد طے منازل ہم مسقط میں پہونچے۔ یہاں ہم کو دَوْلہ یعنی حاکم شہر نے بُلا کر پوچھا کہ تمھارا مذہب کیا ہے۔ ہم نے کہا اہلِ سُنّت و جماعت۔ کہا کہ سُنّیوں کی مسجد میں جاؤ۔ میر صاحب نے

شیعہ تھا یا اُن کو کہا کہ امام باڑہ میں ٹھہرو۔ پھر ہم دونوں سے کہا کہ تین روز تک سرکار سے کھانا ملے گا چوتھے روز اپنی فکر کر لینا۔ ہم نے کہا کہ صاحب ہم فکر نہیں کیا کرتے، ہمارا رزاق خود ہماری فکر رکھتا ہے۔ اُس نے ایک ایک آدمی بھی ساتھ کر دیا تاکہ جگہ پر پہونچادے۔ مسقط سے چل کر بغداد شریف میں آئے۔ چندے قیام کیا۔ پھر کربلا ہوتے ہوئے نجفِ اشرف میں پہونچے۔ مزارِ پُرانوارِ حضرت علیٰ مرتضیٰ کرّم اللہ وجہہ کی زیارت کی۔ پھر کوفہ میں آئے بڑھیا کا تنور بھی دیکھا جہاں سے طوفانِ نوح شروع ہوا تھا۔ اُس تنور میں ایسا تعفّن تھا کہ دماغ پھٹا جاتا تھا۔ اُس کی گہرائی بھی بہت ہی تھی۔ ہم نے ایک ڈوری میں پتھر باندھ کر لٹکایا، چار ڈوریاں باندھیں مگر تہ کا پتہ نہ ملا۔ اتنے میں ایک بدّو آگیا۔ خفا ہو کر بولا کہ ہندی تم کیا کرتے ہو۔ اگر ایسی لاکھوں رسّیاں باندھتے چلے جاؤ گے، تب بھی اس کی تھاہ نہ پاؤ گے۔ پھر وہاں سے چل کر واپس کربلائے مُعلّٰے میں پہونچے۔ سب بزرگوں کے مزاراتِ متبرکہ کی زیارت کی۔ حضرت امام حسین علیہ السّلام کا مزارِ شریف دُہرا ہے۔ ایک تہ خانے میں، دوسرا اُس کے اوپر ہے اور وہی زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔ تہ خانے میں جانے کی عام اجازت نہیں۔ ہم کو ترک اپنے ساتھ لے گیا۔ شمع کافوری روشن تھی۔ خوشبو سے دماغ معطّر ہوا جاتا تھا۔ ہم نے وہاں کے سوا کسی مزار پر شمع کافوری روشن نہیں دیکھی۔ اس وقت تک ایک خیمہ بھی اُس مقام پر نصب ہے۔ جہاں حضرت امام حسین علیہ السّلام نے اہل بیت کے لیے خیمہ قائم کیا تھا۔ اس جگہ نہایت حسرت و بیکسی برستی ہے۔ کیسا ہی سنگدل کیوں نہ ہو وہاں دل موم ہی ہو جاتا ہے اور خود بخود جی بھر آتا ہے۔ طبیعت میں بے قراری پیدا ہوتی ہے۔ اور وہاں ایک عجیب بات یہ دیکھی کہ مسجد ایک اور امام کئی۔ یعنی ایک مسجد میں کئی امام اور ہر ایک امام کے سامنے ایک لڑکا مقابل بیٹھا ہوا اللہ اکبر تکبیر کے وقت کہتا رہتا ہے۔ ہم نے اُن شیعوں سے دریافت کیا تو کہنے لگے کہ کسی کو کسی امام پر اعتقاد ہے کسی کو کسی پر۔ اسی واسطے ایک امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ جس کو جس پر اعتقاد ہے وہ اُس کے پیچھے نماز پڑھتا ہے۔ اس لیے بہت امام ہو جاتے ہیں۔ اور امام کی یہ شرط ہے کہ

معصوم ہو۔ بغیر بچّوں کے معصوم ہونا غیر ممکن ہے اور بچّوں پر نماز فرض نہیں۔ اس لیے امام کے سامنے بیٹھ کر تکبیر کہتا ہے۔ وہاں سے رخصت ہو کر پھر بغداد شریف میں آئے اور چار مہینے تک رہے۔ ایک دن اُس مقام کی بھی زیارت کی جہاں منصور حلّاج کو سولی دے کر جلایا تھا۔ اُس وقت ہم نے یہ دو شعر پڑھے ؎

بعد از فنا بھی لے نہ گئی کوئے یار میں ۔۔۔ کیا بار تھا صبا میری مشتِ غبار میں

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں ۔۔۔ مُشتِ غبار لے کے صبا نے اُڑا دیا

ایک دن حضرت معروفؒ کرخی کی زیارت کو گئے۔ گورِ غریباں میں آسودہ ہیں۔ مزار خام مگر مرجعِ انام ہے۔ سُنّی شیعہ سب اُن کی زیارت کو آتے تھے۔ بقول سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ ؎

شنیدم کہ در کرخ تربت بسے ست ۔۔۔ بجز گورِ معروف معروف نیست

چند روز کے بعد ہمارے وہی ہم نام جن سے بنارس میں ملاقات ہوئی تھی مل گئے۔ ایک روز ہم نے سُنا کہ ہندوستان کے تین چار جولاہے سجّادہ نشین صاحب کو ایک ایک ریال دے کر حُسنی بن گئے اور نسب نامہ بھی حاصل کر لیا ہے۔ حسبِ اتّفاق ایک دن ہم اور ہمارے ہم نام اور میاں سید علی شاہ صاحب سجّادہ نشین ایک دسترخوان پر کھانا کھا رہے تھے۔ اُس وقت میاں غوث علی شاہ کو جو کہ سیدِ حُسینی تھے ہم نے چھیڑا کہ میر صاحب آپ بھی ایک ریال حضرت کو نذر کر کے اولاد میں شامل ہو جائیے۔ پھر خوب بن آئے گی۔ اس بات پر وہ بہت خفا ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم میں کچھ کسر ہے یا تم سے کچھ کم ہیں۔ اگر تمھارے ہاں ایک امام ہے تو ہمارے خاندان میں گیارہ امام ہیں۔ باقی رہا فقر کا معاملہ وہ قبضۂ قدرت میں ہے۔ ملے یا نہ ملے، اس کی تلاش میں تشنہ لب پھرنا ہمارا کام ہے ؎

کامِ ما گر تر نہ شد از آبِ مقصد عیب نیست ۔۔۔ زانکہ اولادِ حُسینم تشنگی میراثِ ماست

یہ بات سُن کر سجّادہ نشین صاحب نے فرمایا کہ تم کو کیوں رشک آیا۔ ہم نے کہا صاحب رشک تو نہیں۔ مگر شک ضرور پیدا ہو گیا کہ کہیں ہمارے بزرگ بھی دُھنیے جولاہے ہی نہ ہوں۔ یہاں نام لکھوا کر سید بن گئے ہوں۔ ہم کو تو آج سے اپنی سادات میں کلام ہو گیا۔ میاں صاحب

نے فرمایا کہ یہاں شاہ عبدالرزاق صاحب اور عبدالوہاب صاحب کی اولاد کا کچھ ذکر نہیں۔ یہ دونوں صاحب زادے تو حضرت کی زندگی ہی میں تشریف لے گئے تھے۔ ہمارے اصلی اور نقلی دفتر میں ان بزرگوں کا نام ہی نہیں۔ پھر ان کی اولاد کا کیا ذکر۔ یہاں تو صرف غریب شاہ عبدالعزیز[1] صاحب کی اولاد ہے اور اسی خاندان میں ہم سب کو شامل کر لیتے ہیں کیونکہ مرید بھی بمنزلہ اولاد کے ہوتا ہے۔ اور اس قسم کے لوگوں کا دفتر جدا بنا ہوا ہے۔ بعد چندے ہم بصرہ کو روانہ ہوئے سجادہ نشین صاحب[2] نے ہم کو ایک ناخدا کے نام خط دیا اور کہا کہ وہ تم کو جہاز پر سوار کرا کے بمبئی پہونچا دے گا۔ ہم نے بصرہ پہونچ کر اُس ناخدا کو خط دیا۔ اوّل اُس نے سر پر رکھ کر رقص کیا اور کہا کہ زہے قسمت۔ پھر ہم کو بہت عمدہ مکان میں ٹھہرایا اور کہا کہ ابھی جہاز کی روانگی میں پندرہ دن کا عرصہ ہے آپ گھبرایئے نہیں، شہر کی خوب سیر کیجیے۔ ہم نے کہا کہ اتنا خرچ نہیں کہ قیام کریں۔ کہا کہ خرچ کی فکر نہ کیجیے جو درکار ہو یہاں موجود ہے۔ پھر ہم نے شہر کی خوب سیر کی۔ نہایت ویران اور کنگال شہر ہے۔ حضرت حسن بصری اور حضرت زبیر و حضرت طلحہ رضی اللہ عنہم کے مزارات بزرگ

---

[1] سید علی صاحب سجادہ نشین سے پہلے حضرت سید محمود صاحب رزاقی یعنی شاہ عبدالرزاق صاحب کی اولاد میں سے صاحب سجادہ تھے اور قدیم سے اسی خاندان میں سجادگی رہی ہے۔ جب بیماری ہیضہ میں سید محمود صاحب کی اولاد اور خود بھی انتقال فرما گئے فقط ایک دختر سعیدہ پس ماندہ چھوڑی اور اس بات کی خبر سلطان روم کو پہونچی تو حکم دیا کہ جس کی شادی اس دختر سے ہوگی وہ مستحق سجادگی ہوگا۔ سید علی صاحب نے جو شاہ عبدالعزیز صاحب کی اولاد میں سے تھے اگرچہ اُن کی پہلی بیوی بھی صاحب اولاد تھی اور نیز رزاقیوں میں سے بھی بغداد میں کوئی باقی نہ رہا تھا اس لئے تبرکاً تبرکاً شادی کر لی اور صاحب سجادہ ہو گئے ورنہ محال تھا۔ سید محمود صاحب کامل فقیر تھے چنانچہ اُن کے حالات بغداد شریف میں علم من الشمس ہیں۔ وہ ملا یتہ فقیر محمد نامی جو مکہ معظمہ میں ملا تھا وہ سید محمود صاحب کا مرید تھا۔ اس لڑکی سے ایک فرزند یعنی سید عبدالرحمٰن صاحب پیدا ہوئے۔ سید علی صاحب نے تیس سال سجادگی کی تھی ان کے بعد سید سلیمان صاحب جو سید علی صاحب کی پہلی بیوی سے تھے اور سید عبدالرحمٰن صاحب سے بڑے۔ اس لئے سید سلیمان صاحب مستحق سجادگی سمجھے گئے۔ ان کے بعد سید عبدالرحمٰن صاحب مستحق ہیں ۱۲۔

[2] جس وقت مولانا گل حسن بغداد شریف پہونچے ہیں تو سید سلیمان صاحب سجادہ نشین تھے ۱۲۔

کہہ اُٹھے اجی! لاحول ولاقوۃ!! اس میں لطفِ زبان کہاں۔ ایک تک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے۔ اُس وقت تک مرزا نوشہ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں۔ جب چلے گئے تو حال معلوم ہوا۔ بہت افسوس کیا اور کہا کہ ظالموں پہلے سے کیوں نہ کہا۔ دوسرے دن مرزا نوشہ ہمارے پاس آئے۔ یہ قصہ سُنایا اور کہا کہ حضرت یہ امر مجھ سے نادانستگی میں ہوگیا۔ آئیے آج اُن کے مکان پر چلیں اور کل کی مکافات کر آئیں۔ ہم اُن کے ہمراہ ہولیے اور میاں سرور کی فرودگاہ پر پہونچے۔ مزاج پُرسی کے بعد مرزا صاحب نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا اور ہماری طرف مخاطب ہوکر بولے کہ جناب مولوی صاحب رات میں نے فسانہ عجائب کو جو بغور دیکھا تو اُس کی خوبی عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں، نہایت ہی فصیح و بلیغ عبارت ہے میرے قیاس میں تو ایسی عُمدہ نثر نہ پہلے ہوئی نہ آگے ہوگی۔ اور کیونکر ہو اس کا مُصنّف اپنا جواب نہیں رکھتا۔ غرض اِس قسم کی بہت سی باتیں بنائیں اپنی خاکساری اور اُن کی تعریف کرکے میاں سرور کو نہایت مسرور کیا۔ دوسرے دن اُن کی دعوت کی اور ہم کو بھی بُلایا۔ اُس وقت بھی میاں سرور کی بہت تعریف کی۔ مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دِل آزاری بڑا گناہ ہے۔ اور درحقیقت یہ خیال بہت درست تھا اَلْمُؤْمِنُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ یَدِہٖ وَلِسَانِہٖ ؎

مباش در پئے آزار و ہرچہ خواہی کُن — کہ در طریقت ما غیر ازیں گناہے نیست

ایک دن ہم نے مرزا غالب سے پوچھا کہ تم کو کسی سے محبت بھی ہے۔ کہا کہ ہاں! حضرت علی مرتضیٰ سے۔ پھر ہم سے پوچھا کہ آپ کو۔ ہم نے کہا کہ واہ صاحب! آپ تو مُغل بچہ ہو کر علی مرتضیٰ کی محبت کا دم بھریں اور ہم اُن کی اولاد کہلائیں اور محبت نہ رکھیں۔ کیا یہ بات آپ کے قیاس میں آسکتی ہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب ہم دہلی کی زینت المساجد میں تھے تو وہاں ایک شخص میاں غلام فرید نام نہایت بھولے آدمی رہتے تھے۔ مگر پیری مریدی کا اُن کو بڑا شوق تھا ایک دن کمبل پوش سے کہنے لگے کہ او کمبل پوش! تو کسی کا مرید بھی ہے؟ وہ بولا کہ اے پیر! بھلا مجھ کو کون مرید کرتا ہے۔ میاں غلام فرید نے کہا کہ آ! میں تجھ کو مُرید کروں۔ میں نے کہا

کہ میاں صاحب آپ کیا کرتے ہیں۔ اس کے دم میں نہ آجانا، یہ سارے جہاں کا چھٹا ہوا غنڈا ہے۔ مُلک مُلک پھرا ہے۔ مفت زبان جانتا ہے۔ ہم تم جیسوں کو تو بازار میں کھڑا ہو کر بیچ ڈالے۔ بھلا تم کس کے فریب میں آگئے۔ اس کے جواب میں میاں غلام فرید کیا کہتے ہیں کہ نہیں جی، اس کو اعتقاد آگیا ہے۔ کمبل پوش بولا، ہاں پیر! مجھے تو بہت ہی اعتقاد ہے۔ میری ایسی کہاں قسمت جو تم مُرید کر لو۔ میاں غلام فرید نے جھٹ ایک روپیہ کی شیرینی اپنے پاس سے منگائی۔ شیرینی کو دیکھ کر کمبل پوش بولا کہ پیر جی میں بہت بھوکا ہوں میاں صاحب نے کہا کہ اچھا اس میں سے خوب کھا۔ جب وہ شیرینی چٹ کر چکا تو میاں غلام فرید نے کہا کہ آ اب تجھ کو تعلیم کروں۔ اُس وقت کمبل پوش کو جوش آیا اور رگِ ہاشمی نے حرکت کی۔ چہرہ سُرخ ہو گیا اور کہا کہ سُن بے تیری ایسی تیسی کروں تو تیلی او تیرا پیر بڑھئی۔ ہماری شان میں اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ اے مسخرے تو ہم کو کیا تعلیم کرے گا۔ ذکر، شغل، مُراقبہ، قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ۔ یہ ہم سے پوچھ۔ تو کیا جانے مشائخی کو۔ میں نے میاں غلام فرید سے کہا کہ کیوں صاحب ہم نہ کہتے تھے۔ بولے کہ یہ مردود ہو گیا ہے۔ دوسرے روز کمبل پوش پھر آئے اور اُن سے قصور معاف کرایا اور کہا کہ پیر تم تو ہمارے پیر ہو ہی گئے۔ ایک روز میاں غلام فرید فجر کے وقت اللہ اللہ کرتے کرتے شجرہ پڑھنے لگے۔ تو کمبل پوش بولا لاحول ولا قوۃ۔ مردِ آدمی اللہ کا نام لیتے لیتے یہ کیا بکنے لگا کہ لارنس صاحب نہ بکھنے والے۔ الگربنڈر کے الگزنڈر دیکھنے والے ٹمکلف کے اور وہ دیکھنے والے لونی اکٹر کے۔ استغفر اللہ! پھر میاں غلام فرید آخر دعا میں کہنے لگے "یا بھیک بھیک بھیک"، تو کمبل پوش نے کہا اب احمق مانگے بھی نہ ملے گی۔ خدا کو چھوڑ کر بھیک کا نام لیتا ہے۔ مگر وہ بھی ایسا پختہ آدمی تھا کہ ایک نہ سُنی۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب ہم دہلی کی زینت المساجد میں ٹھہرے ہوئے تھے ہمارے دوست کمبل پوش نے جو شاہ باقی باللہ صاحب میں رہتے تھے، ہماری دعوت کی۔ مغرب کے بعد ہم کو لے کر چلے چاندنی چوک میں پہونچ کر ایک طوائف کے کوٹھے پر ہم کو بٹھا دیا۔ اور آپ چمپت ہو گئے۔ پہلے تو ہم نے خیال کیا کہ شاید کھانا

اسی جگہ پکوایا ہوگا، مگر پھر معلوم ہوا کہ یوں ہی بٹھا کر چل دیا ہے۔ ہم بہت گھبرائے کہ بھلا ایسی جگہ کم بخت کیوں لایا۔ دو گھڑی کے بعد ہنستا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ میاں صاحب میں آپ کی بھڑک مٹانے کو یہاں بٹھا گیا تھا۔ بعدہٗ اپنے قیام گاہ پر لے گیا اور کھانا کھلایا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب ہم کو زینت المساجد میں چھ مہینے گذر گئے تو ایک دن حسبِ اتفاق شہزادہ مرزا منگو آئے اور کہنے لگے کہ حضرت حج کو چلیے گا۔ ہم نے کہا کہ میاں ایک بار تو دھرم دھکّے کھا آئے، اب اگر کوئی اسی مقام سے سوار کر کے لے چلے اور وہیں لا کر اُتار دے تو خیر مضائقہ نہیں۔ دوسرے دن اُنھوں نے سچ مچ گاڑی لا کر کھڑی کر دی اور کہا کہ سوار ہو جائیے۔ پہلے تو ہم حیران رہ گئے کہ کل کی بات ہم تو ہنسی سمجھے تھے۔ خیر اُسی دم سوار ہوئے اور منزل بمنزل لُدھیانہ پہونچے۔ وہاں سُنا کہ محکم الدین شاہ بڑے کامل فقیر ہیں۔ ہم اُن کے مکان پر گئے بہت اخلاق سے پیش آئے۔ ہم نے پوچھا کہ حضرت کا اسم شریف۔ بولے، خدا۔ ہم نے کہا سبحان اللہ! ہم تو آپ کو آسمان پر تلاش کرتے تھے، آپ زمین ہی پر نکلے۔ پھر ہمارا نام پوچھا۔ ہم نے کہا، صاحب! آپ خدا کیسے ہیں کہ مخلوق کا نام بھی نہیں جانتے۔ ذرا تامّل کیا اور سوچ کر بولے کہ تم غوث علی ہو اور تمھارے والد کا نام احمد حسن اور دادا کا نام ظہور الحسن ہے۔ ہم نے کہا کہ بس معلوم ہو گیا آپ رمّالی خدا ہیں، جب تک زائچہ نہیں کھینچتے کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ اتنے میں ایک شخص مُرید ہونے کو آیا۔ بعدِ بیعت اُس سے کہا کہ پڑھ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحکم الدّین رَسُوْلُ اللّٰه۔ ہم نے کہا بس صاحب رسول تو مدینہ والے ہی کو رہنے دو، وہاں آپ کی دال نہیں گلے گی۔ خدا ہی بنے رہیے۔ آپ سے پہلے بھی اور بہت سے خدا بن چکے ہیں۔ فرعون، نمرود، شدّاد وغیرہ۔ غرض تین دن وہاں ٹھہرے اور لاہور و ملتان ہوتے ہوئے کراچی بندر میں پہونچے۔ وہاں سے جہاز پر چڑھے اور بغداد شریف میں جا اُترے۔ پھر کربلائے معلّٰی اور نجف اشرف کی زیارت کر کے مکّۂ معظمہ میں پہونچے اور بعدِ حج روضۂ منوّرہ کی زیارت کو گئے۔ پھر مکّہ میں واپس آئے۔ مولوی محمد یعقوب صاحب سے ملاقات ہوئی۔ فرمانے لگے میاں تم تو ابھی گئے تھے پھر چلے آئے۔

ہم نے کہا کہ صاحب گناہِ عظیم ہوا معاف فرمایئے انشاء اللہ پھر ایسا قصور نہ ہوگا۔ ہنس پڑے کہ میاں تم تو ہر بات میں قائل کر دیتے ہو۔ اچھا ہندوستان کا حال بیان کرو۔ جو کچھ ہم کو معلوم تھا کہہ سُنایا۔ غرض مکہ سے روانہ ہو کر بمبئی اور بمبئی سے چن کر دتی میں آپہونچے۔ اور جس جگہ سے سوار ہوے تھے وہیں پھر آ اُترے۔ ہمارے حج بھی ایسے تھے جیسے بچوں کی نماز۔ یعنی نہ اُن پر نماز فرض نہ ہم پر حج فرض۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب ہم دوبارہ بہ ارادۂ زیارتِ حرمین شریفین زادہما اللہ شرفاً و تعظیماً جہاز پر سوار ہوے تو ایک عجیب تماشا دیکھا کہ تین شکستہ حال آدمی فی سبیل اللہ جہاز پر سوار تھے۔ ملازمانِ جہاز اُن کے ساتھ کج خُلقی سے پیش آتے۔ جب نصف مسافت طے ہو چکی تو ناخدا نے اُن باخدا لوگوں پر چوری کی تہمت لگائی اور بڑی لعنت و ملامت کی۔ وہ تینوں دریا میں کود پڑے ؎

دریں دریائے بے پایاں دریں بحرِ رواں فرسا دِل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مُرساہا

ایک تو پانی میں غرق ہو گیا اور دو سطحِ آب پر اس طرح چلتے تھے، جیسے کوئی خشکی پر چلتا ہو۔ جہاں تک نگاہ نے کام کیا اہلِ جہاز ان کو دیکھتے رہے۔ پھر نظر سے غائب ہو گئے۔ جب ہم بیت اللہ میں پہونچے تو اُن تینوں سے ملاقات ہوئی۔ ہم نے پہونچنے کی کیفیت پوچھی تو جواب دیا ع

تراکشتی آورد ما را خدا ے

مدینۂ منورہ تک ہمارا اُن کا ساتھ رہا۔ ہم مدینۂ منورہ سے منزل بمنزل دہلی آئے۔ بعد چند روز کے پھر سیر و سیاحت کا شوق ہوا، جا بجا کی سیر کرتے ہوے چولی مہیسر پہونچے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہم چولی مہیسر میں پہونچے تو شام ہو گئی۔ موضع شاہجہاں پور وہاں سے دو کوس رہ گیا تھا۔ ایک آدمی راستہ میں ہمارے ساتھ ہو لیا تھا۔ اُس نے کہا کہ یہاں نربدا ندی کے کنارے ایک باباجی کا مکان ہے، چلو اس میں رات بسر کریں گے۔ باباجی سے اجازت چاہی تو اُنھوں نے کہا کہ ہم تو کسی کو ٹھہرنے نہیں دیتے۔ ہم نے کہا خیر نہ سہی۔ ہم باہر آئے اور پیپل کے پیڑ تلے بستر لگا دیا۔ ع

درویش ہر کجا کہ شب آمد سرائے اوست

ساتھی سے ہم نے کہا کہ اوّل آدھی رات کا پہرہ تو دے، پچھلی آدھی رات میں ہم جاگتے رہیں گے، کیونکہ یہ دریا کا کنارا ہے شاید کوئی موذی درندہ چوٹ کر بیٹھے ہم تو نماز عشاء پڑھ کر سو گئے، اور وہ ساتھی جاگتا تھا کہ باباجی نے اپنے مکان کا پھاٹک کھولا اور ہم کو دیکھ کر آواز دی کہ کون۔ میری آنکھ کھل گئی۔ جواب دیا کہ وہی مسافر جن کو تم نے ٹھہرنے نہیں دیا۔ بولے کہ چلے آؤ۔ ہم اندر گئے تو دیکھا کہ نہایت وسیع مکان ہے۔ چاروں طرف پختہ حجرے بنے ہوئے، نماز کے لیے چبوترہ، نہانے کو غسل خانہ، حمّام، جائے ضرور، سب موقع بموقع موجود ہیں۔ ایک حجرہ میں ہم کو بٹھا دیا۔ کھانا لائے تو میں نے کہا کہ ہم دونوں آدمی مسلمان ہیں ساتھ کھانا کھالیں گے۔ اس بات کو منظور نہیں کیا اور کہا کہ نہیں صاحب تم الگ کھاؤ، اُن کو دوسرے حجرہ میں الگ کھلائیں گے۔ طرح طرح کے کھانے ہمارے روبرو چُن دیے۔ کئی قسم کے چاول اور کئی طرح کی دالیں اور چند وضع کی ترکاریاں اور روٹی وغیرہ اتنی چیزیں تھیں کہ ہماری عقل دنگ ہوگئی کہ اتنے عرصہ میں اس اکیلے آدمی نے کس طرح تیار کیے ہوں گے۔ بعد کھانا کھلانے کے بولے کہ ہمارے انکار سے تم نے بُرا مانا ہوگا۔ لیکن بات یہ تھی کہ میں اس وقت تم کو بُلا لیتا تو خاطر و مدارات کرتا یا کھانا پکاتا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم آج ہمارے مہمان ہوگے اس لیے سب سامان مہیا کر لیا، تب تم کو اندر بلایا پھر ہم کو حجرے بھی جدا جدا رہنے کو دیے۔ ایک جگہ نہ سونے دیا کہ فقیر تنہا بہتر ہے۔ صبح کو اُٹھ کر ہم نے چلنے کے واسطے کمر باندھی، تو باباجی بولے، واہ صاحب! واہ! ؎

دل لیتے ہی جو عاشق بے تاب کا چلے　　تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے

میاں صاحب ابھی کہاں جاتے ہو، کوئی روز ٹھہرو۔ غرض بیس دن تک ٹھہرایا اور دونوں وقت اُسی انداز سے کھانا کھلاتے رہے۔ ہم کو اس بات کی بڑی حیرت تھی کہ وہاں کسی کو پانی بھرتے دیکھا، نہ روٹی پکاتے، نہ دھواں اُٹھتا دیکھا، نہ کبھی کسی کو جھاڑو دیتے دیکھا اور نہ پاخانہ صاف کرتے پایا۔ لیکن سب مکان نہایت پاک وصاف رہتے

تھے۔ صورت بھی بابا جی کی ایسی پاکیزہ اور خوش منظر تھی کہ ہم نے اپنی عمر میں ایسا خوبصورت آدمی نہیں دیکھا۔ رخساروں کی چمک دمک ایسی تھی کہ داڑھی کی سیاہی کا عکس اس طرح پڑتا تھا جیسے آئینہ میں۔ یاد بود بھی بابا جی کی نہایت عمدہ تھی اور ہر دم مشغول رہتے تھے۔ عشاء کے وقت سے بیٹھتے تو صبح کر دیتے تھے۔ اور جیسے بطون میں کامل تھے ایسے ہی حکمت وصنعت میں بھی لاجواب تھے۔ چنانچہ ایک دن دو جذامی آئے، ایک ہندو تھا ایک مسلمان۔ صورت دیکھتے ہی اُس ہندو سے کہا کہ تمھارے گرو نے کچھ جاپ بتایا تھا۔ تم نے جاپ میں استری سے بھوگ کیا۔ اس واسطے خون جگر کھا گیا۔ اُس نے اس قصور کا اقرار کیا۔ فرمایا کہ اپنے گرو کے پاس چلے جاؤ، وہی اس کی تدبیر کریں گے۔ مسلمان سے کہا ٹھہرو تم کو دوا دیں گے۔ دوسرے دن دریائے نربدا کے اندر گلے گلے پانی میں اُس کو کھڑا کیا اور ایک چاول بھر دوا کھلا دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ چلایا کہ پیاس کے مارے مرا جاتا ہوں۔ کہا خبردار پانی پیے گا تو فوراً مر جائے گا۔ پہر بھر کے فاصلہ سے اُس کو ندی کے اندر ہی گھی پلاتے رہے۔ باہر نکلا تو اس کا بدن کندن کی طرح دمکنے لگا تھا۔ پھر اُس کو رخصت کر دیا۔ ہم بیس روز تک اُن کے پاس رہے، لیکن کچھ بھید نہ کھلا کہ وہ شخص فرشتہ تھا یا خضر یا جن۔ صورت سے تو نہ ہندو ثابت ہوتا تھا نہ مسلمان۔ ایک روز ہم سے کہنے لگا کہ میاں صاحب تم کہاں جاؤ گے، ہمارے ہی پاس رہ جاؤ، مگر شرط یہ ہے کہ اگر ہم مر جائیں تو ہماری ٹانگ میں رسّی باندھ کر نربدا میں لے جا کر ڈال دینا۔ اور اگر تم مر گئے تو ہم شاہ جہاں پور سے آدمی بلا کر تمھاری تجہیز وتکفین کرا دیں گے۔ ہم نے کہا سنو بابا جی! ہم رہتے تو اپنے گھر رہتے، وہاں نہیں تو مکّہ میں ٹھہرتے، مدینہ میں قیام کرتے یا بغداد میں رہتے۔ جب کسی جگہ نہ ٹھہرے تو یہاں پابند ہو کر کب رہ سکتے ہیں۔ غرض ہم نے چلنے کا قصد کر ہی دیا تب بابا جی نے مایوس ہو کر فرمایا کہ خیر "مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ" خدا حافظ۔ ہم دونوں وہاں سے سرونج کو روانہ ہوئے۔

ایک روز ارشاد[۸۶] ہوا کہ دہلی سے جب ہم چلے اور امصار ودیار کی سیر

کرتے ہوئے مقامِ سرونج علاقۂ ٹونک میں پہونچے تو وہاں میر وزیر علی صاحب سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ مقامِ سرونج میں دو نوجوان آدمیوں نے ہم سے درخواست کی کہ نامِ خدا بتادو۔ ہم نے بتا تو دیا لیکن یہ ہم کو معلوم نہ تھا کہ نتیجہ اور اثر کیا ہوگا۔ ایک تو چھ مہینے کے بعد تپِ دق میں مرگیا۔ اس بے چارہ کی نئی شادی ہوئی تھی۔ اور دوسرا زندہ رہا مگر کچھ دیوانہ سا ہوگیا۔ وہاں سے میر وزیر علی کو ہمراہ لے کر ہم کالپی میں پہونچے، جہاں میر صاحب کا گھر ہے۔ اُن کی نسبت ماموں کے گھر ہو چکی تھی مگر شادی نہیں کرتے تھے، ہم نے زبردستی ان کی شادی کرائی۔ پھر وہاں سے بہ جانب لکھنؤ روانہ ہوئے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ شمس آباد کے قریب جنگل میں ایک فقیر احمد شاہ صاحب تھے ان کی شہرت سن کر ہم بھی گئے۔ دیکھا کہ ایک نہایت کہنہ اور بہت بڑی مسجد بادشاہی وقتوں کی ہے، اُسی میں وہ رہتے ہیں۔ ہم کو دیکھ کر نہایت ترش روئی سے پیش آئے اور بولے کہ صاحب! یہاں نہ ٹھہرو آدھی رات کے بعد یہاں شیر لگتا ہے، ایسا نہ ہو کہ تم کو پھاڑ ڈالے۔ ہم نے کہا کہ خیر جو ہو سو ہو۔ آج تو یہیں قیام کریں گے ؎

ہم کو خدا پہ چھوڑ دو پھر خدا جو ہو سو ہو

وہ تو اپنے حجرہ کا دروازہ بند کرکے سو رہے۔ ہم نے نمازِ عشا پڑھی۔ پھر دو روٹیاں جو ہمارے پاس تھیں کھا کر پانی پیا۔ اب سونے کا ارادہ ہوا۔ ہم نے خیال کیا کہ یہ جنگل کا مقام ہے، شاید شیر لگتا ہو، مناسب یہ ہے کہ مسجد کی چھت پر سوئیں۔ اوپر چڑھے تو دیکھا کہ ایک کالا سانپ نہایت لمبا اور موٹا پڑا ہوا ہے۔ ہم نے سوچا کہ یہاں تو شیر موجود ہے اور نیچے صرف احتمال۔ پھر نیچے اُترے۔ خیر نیند تو نہ آئی مگر ہم وضو کرکے تمام رات چبوترہ پر بیٹھے رہے۔ صبح کی نماز پڑھی۔ میاں صاحب بھی نکلے اور پوچھا کہ شیر آیا تھا یا نہیں۔ ہم نے کہا کہ صاحب یا تو آپ شیر ہیں یا ہم شیر ہیں اور تو کوئی نظر آیا نہیں۔ تھوڑی دیر بعد بستی سے ایک شخص اپنے بچّے کو لے کر آیا دم کرایا اور تعویذ لکھا کر لے گیا۔ جب کھانے کا وقت ہوا تو وہی شخص کچھ روٹیاں اور چھاچھ لے کر آیا۔ ہم نے میاں صاحب کی تواضع کی، انھوں نے انکار کیا اور کہا کہ آپ کھائیں۔ ہم نے کہا کہ پہلے آپ اولش

فرمائیں تب ہم بھی کھالیں گے۔ غرض اُن کو بھی ہم نے ساتھ کھلایا۔ اُن کے پاس بہت لوگ تعویذ گنڈے والے آیا کرتے تھے اور اس ذریعہ سے بہت سارا روپیہ جمع کر لیا تھا اسی واسطے کسی مسافر کو اپنے پاس ٹھہرنے نہیں دیتے تھے۔ ہم سے کہنے لگے کہ میرا ارادہ اس مسجد کی تعمیر کا ہے۔ ہم نے کہا کہ میاں صاحب جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔ تم اپنی مسجد کو درست کرو۔ مگر اُن کے خیال میں یہ بات نہ آئی۔ ہم تو وہاں سے چلدیئے۔ پھر سُنا کہ اُن کا انتقال ہو گیا اور کئی مٹکے روپیہ اشرفیوں کے نکلے۔ کچھ روپیہ تو سرکار نے اُن کے مزار پر لگا دیا اور باقی اپنے خزانہ میں داخل کیا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب ہم قنوج میں پہونچے تو شہر کے باہر ایک تکیہ میں جا اُترے وہاں کوئی فقیر نظر نہ آیا۔ خیال کیا کہ شاید کہیں گیا ہوگا تھوڑی دیر بعد ایک بڑھیا آکر جھاڑو دینے لگی ہم نے پوچھا کہ یہاں کا فقیر کہاں ہے۔ وہ بولی کچھ نہ پوچھو! ایک عجیب معاملہ ہے۔ ہم نے کہا کچھ تو بیان کر۔ بولی کہ دس برس سے میرا بیٹا گم تھا۔ بہت خاک چھانی، تعویذ گنڈے عمل ٹوٹکے سب کیے کچھ نہ ہوا۔ ناچار ہو کر اس تکیہ کے فقیر پاس آئی اور حصولِ مُراد کے لیے یہاں کی جاروب کشی اختیار کی۔ ایک عرصہ تک اُس نے منھ نہ لگایا۔ آخر ایک دن میرا مطلب پوچھا، تو میں نے اپنی داستان سنائی۔ فرمایا کہ میں تو اس لائق نہیں لیکن ایک مردِ کامل ہیجڑوں کے طائفہ میں ڈھولک بجایا کرتا ہے۔ فُلاں محلہ میں جا اور اُس سے عرضِ حال کر۔ ہر چند انکار کرے، ایک نہ مانیو اور اُس کے دروازے پر ڈھئی دے کر بیٹھ جائیو۔ لیکن خبردار میرا نام زنہار نہ لینا۔ میں گئی اور جو کچھ سکھا دیا تھا وہی کیا۔ کہنے لگے تجھ کو کسی نے بہکا دیا ہے۔ ناچ راگ کی کوئی بات ہو تو مجھ سے پوچھ لے۔ میں تو ہیجڑہ ہوں۔ مگر میں نے ایک نہ سنی اور ڈھئی دے کر بیٹھ گئی۔ آخر کار وعدہ کیا کہ اچھا تیرا کام ہو جائے گا مگر پہلے یہ بتا کہ تجھ کو میرا پتہ کس نے دیا۔ غرض باؤلی ہوتی ہے ناچار اُس فقیر کا نام لینا پڑا۔ فرمایا خیر اُس کم بخت نے ہم کو بھی خراب کیا اور آپ بھی برباد ہوا۔ ہم تو سمجھے تھے کہ کسی لائق ہو گیا ہے، اب اُس کو بھی ہیجڑوں میں شامل کریں گے، مگر افسوس کہ خام نکلا۔ اس کے بعد میرے سر پر ہاتھ رکھا اور فرمایا اطرافِ عالم میں نظر کر اور

دیکھ میرا لڑکا کہاں ہے۔ دیکھتے دیکھتے معلوم ہوا کہ میرا لڑکا ایک قافلہ میں گھوڑے کی باگ پکڑے چلا جاتا ہے۔ میں خوشی کے مارے چلا اٹھی کہ یہ رہا میرا لڑکا۔ فرمایا کہ اس کا ہاتھ خوب مضبوط پکڑ لے۔ میں نے ہاتھ پکڑا اور انھوں نے اپنا ہاتھ اُٹھا لیا۔ دیکھتی کیا ہوں کہ لڑکا مع گھوڑے کے میرے پاس موجود ہے، مگر فقیر صاحب ندارد ہیں۔ لڑکے کو ساتھ لے ہنسی خوشی اپنے گھر آئی۔ پھر جی میں آیا کہ تکیہ ء اس فقیر کی شکرگزاری کروں۔ یہاں آکر دیکھا تو اُس کو بھی نہ پایا۔ ابھی چار دن اس معاملہ کو گذرے ہیں۔ دونوں صاحبوں کا پتہ نہیں۔ خدا جانے کہاں گئے۔ اب میں اُس فقیر کی یاد میں ہر روز اس تکیہ کی جاروب کشی کرتی ہوں اور پانی بھر کے رکھتی ہوں تاکہ مسافر آرام پائیں۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ قنوج کے جنگل میں ایک مزار حضرت سید شریف زندنی کے نام سے مشہور ہے۔ نہایت پُرفضا اور گنجان درختوں کے بیچ میں ہے خوف کے مارے رات کے وقت وہاں کوئی نہیں رہتا۔ ہم وہاں گئے تو مجاور نے کہا کہ صاحب یہاں حضرت کسی کو رہنے نہیں دیتے۔ ہم نے کہا کہ اچھا ہم حضرت سے دریافت کرلیں گے۔ دوسرے دن مجاور آیا کہ فرمائیے کیا حکم ہوا؟ ہم نے کہا کہ ہم کو تو حضرت نے اپنے پاس رہنے کی اجازت دے دی۔ دل میں ہم نے سوچا کہ کیسے بے وقوف لوگ ہیں۔ جنگل اور درختوں کی گنجانی کی وجہ سے رہتے ہوئے خوف معلوم ہوتا ہے اور مشہور یہ کردیا کہ حضرت کا حکم نہیں۔ مجاور نے جاکر لوگوں میں شہرت کردی کہ ایک فقیر آئے ہیں اور رات کو بھی مزار پر رہتے ہیں۔ حضرت نے اجازت رہنے کی دی ہے۔ پھر تو تمام زن و مرد قنوج کے اُمنڈ پڑے۔ رہنا دشوار کردیا۔ آخر ہم تین چار روز بعد وہاں سے چل دیے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ لکھنؤ میں سید وزیر علی صاحب بھی ہمارے ساتھ تھے۔ وہاں مولوی سلامت اللہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اگرچہ مولوی صاحب اس زمانہ میں بہت مُسن تھے لیکن حُسنِ صورت میں ایسے ہی بے نظیر تھے جیسے حُسنِ سیرت میں۔ ایک دن میاں وزیر علی الگ بیٹھے کہہ رہے تھے کہ تمام عمر میں بوڑھے معشوق ہم نے یہی دیکھے ہیں۔ مولوی صاحب کے کان میں اس بات کی بھنک پہونچ گئی۔ فرمایا کون صاحب

ہیں: ذرا ہم بھی تو اپنے عاشق کی صورت دیکھیں۔ اتنا کہتے ہی میاں وزیر علی بھاگ گئے، مگر مولوی صاحب پہچان گئے اور کہا کہ شاید میاں وزیر علی ہوں گے۔ پھر ہماری طرف خطاب کیا کہ صاحب تمھارے مزاج میں تو بڑی صلاحیت معلوم ہوتی ہے۔ شریعت اور طریقت کے سب اعمال کرتے ہو لیکن سید وزیر علی سے آپ کا میل جول کیونکر ہوا۔ یہ تو بڑے رند مشرب معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی باتیں کچھ اور ہی قسم کی ہیں۔ پھر مولوی صاحب کچھ سمجھ گئے اور کہنے لگے کہ یہ تو تمھاری ہی صحبت کا اثر ہے۔ شاید ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور ہیں اور کھانے کے اور۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ مولوی سلامت اللہ صاحب شجاعت وجواں مردی میں بھی یگانۂ زمانہ تھے۔ چنانچہ نقل ہے کہ نواب لکھنؤ نے ایک روز برسر دربار یہ بات کہی کہ سُنّی لوگ بڑے بہادر ہوتے ہیں۔ ہم نشین بولے کہ قبلۂ عالم یہ سب کہنے کی باتیں ہیں، اگر مقابلہ ہو تو حال کھُل جائے۔ نواب نے کہا اچھا دیکھا جائے گا۔ اتفاق سے عیدِ رمضان آئی۔ نواب نے مولوی سلامت اللہ صاحب کو پیام بھیجا کہ صبح کو آپ تشریف لاکر نماز پڑھائیں۔ مولوی صاحب کو اندیشہ ہوا کہ خُدا خیر کرے، دیکھیے کیا معاملہ پیش آئے۔ اپنا تمام اسباب اور کتابیں طالب علموں کو تقسیم کر دیں اور کہا بھائی اگر صحیح وسلامت آئے تو واپس کر لیں گے، ورنہ تمھارا مال ہے۔ عید کی صبح کو کپڑے بدل، خوشبو لگا، تیر کمان، ڈھال، تلوار، پستول، قرابین، پانچوں ہتھیار سج کر گھوڑے پر سوار ہوئے اور نماز کے وقت نواب صاحب کے امام باڑے میں جا اُترے۔ نواب نے نماز پڑھانے کا اشارہ کیا بے تکلف کھڑے ہو گئے۔ نماز پڑھائی اور بعدِ نماز دلیرانہ ومردانہ خطبہ کی قراءت شروع کردی۔ جب خُطبۂ ثانیہ کی نوبت آئی تو صحابۂ کرام کے نام نہایت شد ومد کے ساتھ مکرر پڑھے اور بڑی دھوم دھام سے خطبہ تمام کیا۔ نواب صاحب نے ایک ہزار روپیہ نقد اور خلعت ودستار نذر کی۔ مولوی صاحب نے وہ سب سامان نقد وجنس مجتہد صاحب کے سامنے رکھ دیا اور کہا کہ یہ سب آپ کا حق ہے۔ میں نے نواب صاحب کے حکم کے بموجب نماز پڑھادی، لیکن میں غاصب نہیں ہوں، جو کسی کا حق لے لوں۔ ہر چند نواب صاحب

نے اصرار کیا مگر مولوی صاحب نے نہ مانا اور خالی ہاتھ رخصت ہوئے۔ نواب صاحب نے اپنی پینس سواری کو دی اور دس سوار ساتھ کر دیے کہ باعزاز و اکرام پہونچا دو۔ جب مولوی صاحب چلے آئے تو نواب صاحب نے مصاحبین و امرا کو چھیڑا کہ دیکھو سنی کیسے بہادر ہوتے ہیں۔ ایک پیر مرد، جریدہ کس کر دفعتہ تمھارے دشمنوں کا نام بر سر منبر کھڑا ہو کر پڑھ گیا۔ وہ تنہا اور تم ہزاروں، کسی سے کچھ بھی نہ ہو سکا۔ دیکھو بہادر ایسے ہوتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ شجاعت کی کہ جو کچھ ہم نے دیا اس کی مطلق طمع نہ کی۔ سب نقد و جنس قبلہ و کعبہ کے سامنے پھینک کر چلا گیا۔ پھر تو مصاحب و حواشی شیخی بگھارنے لگے کہ پیر و مرشد یہ حضور کا پاس و لحاظ تھا ورنہ ہم یوں کرتے، یوں کرتے۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ بس رہو بھی اگر تم مرد ہوتے اور کچھ کر گزرتے تو بھلا میں تمھارا کیا کر سکتا تھا۔ غرض سب شرمندہ ہو کر خاموش ہو گئے۔

ایک روز ارشاد[۹۲] ہوا کہ قبلہ گاہی صاحب کا رسالہ ماہِ محرم میں لکھنؤ پہونچا اور پڑاؤ میں خیمہ زن ہوا۔ ہمارے چار سپاہی شہر کی سیر کو گئے۔ حضرت عباسؑ کی حاضری کا دن تھا وہ سپاہی ایک امام باڑہ میں جا پہونچے۔ ہر قسم کا کھانا رکھا ہوا تھا۔ اوّل تو مرثیہ ہوا۔ بعد میں، صحابۂ کرام کی شان میں کچھ بکنے لگے۔ چاروں یاروں نے پیٹیاں نکالیں۔ تمام شیعہ بھاگ گئے۔ امام باڑہ خالی ہو گیا۔ وہ سپاہی سب کھانا اٹھا کے چل دیے۔ اب مارے خوف کے کوئی شخص ان کے نزدیک نہیں آتا۔ دور دور سے پتھر مارتے ہیں۔ جب یہ حملہ کرتے تو سب بھاگ جاتے۔ آخر کار لڑتے جھگڑتے، چلے آتے تھے کہ رسالہ میں خبر پہونچی۔ چند سوار دوڑے، سب کو مار کر بھگا دیا اور دس آدمی گرفتار کر کے لائے۔ انگریز کو خبر ہوئی بہت خوش ہوا اور کہا کہ رسالدار صاحب یہ کھانا ہمارے سامنے تقسیم کر دو، اور ہم کو بھی تبرک دو۔ ہمارے سپاہیوں نے خوب بہادری کی ہم بہت خوش ہوئے۔ یہ قابلِ انعام ہیں۔ اتنے میں نواب صاحب کے چوب دار پہونچے اور رقعہ دیا کہ ہمارے مجرم تمھارے رسالہ میں ہیں، بھیج دو۔ صاحب نے ان ہی کے دس آدمی مقید حوالہ کیے کہ یہ مجرم ہیں لے جاؤ۔ غرض کسی سے کچھ بھی نہ ہو سکا۔

ایک روز ارشاد[۹۳] ہوا کہ ہم لکھنؤ کی ایک مسجد میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اتفاقاً ایک امیر سیر کو جاتا تھا۔ دیکھا تو سامنے سے سلیمن صاحب انگریز آتا ہے۔ اس خیال سے کہ انگریز کو سلام کرنا پڑے گا۔ وہ امیر جھٹ مسجد میں چلا آیا، جہاں ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ سلیمن صاحب اس بات کو تاڑ گیا۔ وہ بھی پیچھے پیچھے مسجد میں آپہونچا اور جھک کر اُس امیر کو سلام کیا اور کہا کہ دیکھو سلام کرنے سے کیا میری توقیر گھٹ گئی، یا آپ کا دین کچھ بڑھ گیا۔ آپ نے کیوں منھ چھپایا۔ کیا ہم خدا کے بندے نہیں ہیں۔ وہ امیر بہت شرمندہ ہوا۔ اُس کے بعد سلیمن صاحب ہماری طرف کو آیا تو ہم نے اُٹھ کر سلام کیا۔ اُس نے پھر امیر سے کہا کہ یہ مسافر کیا سلام کرنے سے کافر ہو گیا۔ پھر میری طرف متوجہ ہوا اور پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ میں نے کہا کہ صاحب یہ تو مجھ کو بھی خبر نہیں کہ میں کون ہوں ؎

کچھ نہیں کھلتا مجھے میں کون ہوں　　　صورتِ حیرت ہوں یا شکلِ جنوں

پھر پوچھا کہ آپ کی قوم کیا ہے؟ میں نے کہا کہ صاحب جو آدمؑ کی قوم ہے۔ کہا آدم کی کیا قوم ہے میں نے کہا کہ مجھ کو نہیں معلوم یہ آدم سے پوچھیے۔ پھر کہا آپ کہاں سے آئے؟۔ میں نے کہا کہ جہاں سے سب آئے۔ وہ بہت حیران ہوا اور بولا کہ صاحب جو بات ہم پوچھتے ہیں اُس کا اُلٹا ہی جواب دیتے ہو۔ پھر تو اُن کو اُلفت ہو گئی کبھی کبھی ہمارے پاس آنے لگے۔ ایک روز بڑے تکلف سے دعوت کی۔ غرض فقیر کو چاہیے کہ ہر رنگ کا تماشا دیکھے اور کسی کو برا نہ جانے، کیونکہ ذاتِ باری ہر جگہ یکساں ہے ؎

خدا ہر شے کے اندر یوں نہاں ہے　　　کہ جوں بو گُل کی گُل کے درمیاں ہے

ایک روز ارشاد[۹۴] ہوا کہ لکھنؤ میں ایک امیر زادہ شیعہ ہمارے پاس آیا کرتا تھا۔ اتفاق سے اُس کی تاریخ نکاح قرار پائی۔ برات کے وقت خود آیا اور بہ اصرارِ تمام ایک ہاتھی پر سوار کر کے ہم کو بھی لے گیا اور حسبِ وعدہ ہم کو علیحدہ مکان میں اُتارا۔ کوئی آدھی رات گذری ہو گی کہ نوشہ کا باپ بزمِ عقد میں شریک ہونے کے لیے ہم کو لے گیا۔ صیغہ شروع ہونے کو تھا کہ ایک دایہ سرِ محفل آکر کہنے لگی کہ اس نیک بخت پارسا لڑکی کو پانچ مہینہ کا حمل بھی ہے، مگر حرام کا نہیں، بلکہ مُتاعِ شرعی کا ہے۔ یہ بات سُن کر دولھا چونکا اور بے باکانہ کہہ اُٹھا کہ

میں نکاح نہیں کرتا۔ ہر چند لوگوں نے سمجھایا، ایک نہ مانی۔ اُس کے باپ نے ہم سے کہا کہ صاحب یہ آپ کا معتقد بہت ہے۔ کچھ آپ ہی اُس کو سمجھائیے، ہمارا تو کہنا مانتا نہیں۔ ناچار ہم نے پاس جا کر کہا کہ صاحب زادہ! وجہِ انکار کیا ہے؟۔ بولا کہ حضرت یہ بچپن کی چاٹ لگی ہوئی ہے، آیندہ کب چھوٹے گی۔ ہم نے کہا کہ میاں جب تمھارے مذہب میں یہ امر جائز و درست ہے، تو بُرا کیوں سمجھتے ہو۔ کہا کہ صاحب ایسے مذہب کو بھی میرا اسلام ہے۔ اُس کے باپ نے کہا، ہیں! کیا تو سُنّی ہو گیا؟۔ بولا کہ ہاں، پہلے تو نہ تھا مگر اب بے شک ہو گیا۔ یہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ محفل درہم برہم ہو گئی۔ ہم بھی اپنے مکان کو چلے آئے۔ صبح کو وہ امیر زادہ آیا کہ حضرت مجھ کو مُرید کر لیجیے۔ ہم نے کہا کہ بھائی ہم ہیں قادری اور تم کو اُن سے عداوت ہے۔ پھر بات کیونکر بنے گی؟۔ ع

اُس کی رسوائی ہے ماں جس سے تجھے بیر ہے

جواب دیا حضرت گذشتہ سے توبہ اور آیندہ کو اُن کا غلام ہوں۔ جب اُس نے بہت اصرار کیا تو مجبوراً ہم نے بیعت کر لیا۔ زمانۂ غدر تک تو اُس کے خط آتے رہے، پھر کچھ حال نہ معلوم ہوا۔ خدا جانے زندہ بھی ہے یا نہیں۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ لکھنؤ سے ہم اپنے وطن کو روانہ ہوئے۔ جب ننھیال کے گانوں نورپور میں پہونچے تو مسجد میں جا اُترے۔ عصر کے وقت ہمارے ماموں صاحب چری کا بار سر پر رکھے مسجد کے سامنے سے گذرے۔ ایک شخص نے مسجد میں سے پکار کر کہا کہ ہمارے میر صاحب بڑے بھاگوان ہیں، جب باہر سے تشریف لاتے ہیں تو بھرے پُرے آتے ہیں۔ آپ ہنستے ہوئے چلے گئے۔ پھر نماز کے واسطے مسجد میں تشریف لائے۔ میاں جی نے کہہ دیا کہ میر صاحب آج ایک مسافر بھی آگیا ہے۔ بعد نمازِ مغرب ہم کو اپنے گھر لے جا کر بٹھایا اور خود کسی کام کے لیے باہر گئے۔ گھر میں صرف نانی صاحبہ بُخار کی شدّت میں پڑی کراہتی تھیں۔ وقتِ فرصت کو غنیمت سمجھ کر ہم اُن کے پانوں دبانے لگے۔ فرمایا کون!۔ عرض کیا کہ مسافر ہوں اور رشتہ آپ کا نواسا۔ خفا ہو کر بولیں کہ تو میرا نواسا کیوں ہوتا۔ خدا جانے کون ہے کون نہیں۔ میرے پانوں کو ہاتھ مت لگا۔

اتنے میں ماموں صاحب آگئے۔ پوچھا کیا ہے۔ نانی صاحبہ نے فرمایا کہ یہ نامحرم مسافر کہتا ہے کہ میں تمھارا نواسا ہوں اور پانوں دباتے کو آبیٹھا ماموں صاحب نے کہا کہ خیر نواسا بھی نواسوں کے برابر تو ضرور ہے۔ اگر پانوں دباتا ہے تو کیا مضائقہ ہے، لیکن انھوں نے نہ مانا۔ کھانا کھا کر ہم مسجد میں آئے۔ سویرے اُٹھ کر گھر کو روانہ ہوئے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب ننہیال کے گانوں سے چل کر وطن تک پہونچے تو محلہ کی مسجد میں جا ٹھہرے۔ مسجد کے مُلّا نے ہمارے گھر خبر کی کہ آج ایک مسافر نو وارد مسجد میں آگیا ہے۔ شام کے وقت ہمارا چھوٹا بھائی حیدر حسن جس کی عمر بارہ برس کی تھی، ہمارے لیے کھانا لایا۔ ہم نے اُس کا اور باپ دادا کا نام اور قوم پوچھی سب باتوں کا جواب ٹھیک دیا۔ برتن واپس لے کر گھر گیا اور والدہ صاحبہ سے ساری باتیں بیان کیں۔ وہ سُن کر چُپ ہو رہیں۔ ایک روز ہم نے حجّام کو بُلایا اور حجامت بنوائی۔ ہمارے سر میں ایک نشان تھا بشکل چلیپا، وہ دیکھ کر بولا کہ حضرت اگر قصور معاف ہو تو کچھ عرض کروں۔ ہم نے کہا کہ اچھا کہو، بولا کہ یہ نشان جو آپ کے سر پر ہے، میرے ہاتھ کا ہے۔ اب یہ نہیں معلوم کہ آپ وہی ہیں یا کوئی اور ہم نے حال پوچھا تو اُس نے ہمارا قصّہ ہو بہو سُنایا کہ سید احمد علی صاحب کا ایک لڑکا تھا غوث حسن نام اُس کے سر میں نے ایسا شگاف دیا تھا۔ مدت ہوئی کہ وہ گم ہوگیا۔ آج تک پتہ نہیں۔ ہم نے اُس کو لطائف الحیل سے ٹال دیا۔ بھائی حیدر حسن ہمارے واسطے روز کھانا لاتا اور ہم اُس سے کچھ نہ کچھ ہنسی کی بات کہہ دیتے۔ ایک دن ہم نے کہا کہ آؤ بھائی ہمارے ساتھ کھالو۔ اُس نے بُرا مانا، والدہ سے جا کہا کہ یہ مسافر مجھ کو روز چھیڑتا ہے اور دیکھتا رہتا ہے۔ آج سے روٹی دینے نہیں جاؤں گا۔ اتفاق سے اُس دن مُلّا کی کہیں دعوت تھی، مغرب کی اذان ہم کو دینی پڑی۔ والدہ صاحبہ نے آواز پہچان لی۔ شام کو جب حیدر حسن کھانا لایا تو یہ پیام دیا کہ کل صبح کو آپ کی دعوت ہے۔ مکان پر چل کے کھانا۔ ہم نے دل میں کہا خدا خیر کرے، کہیں بڑی بی نے پہچان تو نہیں لیا۔ صبح کو ہم بُلائے گئے، پردا ہوا صحن میں بیٹھے۔ والدہ صاحبہ نے پہلے تو پس پردہ ہم کو خوب دیکھا بھالا۔ پھر باہر نکل، ہمارے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور

فرمایا کہ ماروں تھپڑ۔ ہم نے کہا ہیں ہیں! امائی صاحبہ میرا کیا گناہ ہے، گھر میں بُلا کر غریب مسافر کو مارتی ہو۔ فرمایا خوب، ابھی انکار ہی کیے جاتا ہے۔ ہم نے تجھ کو کھلایا، پلایا، پالا، پرورش کیا، ہماری گود میں ہوش سنبھالا، چھوٹے سے بڑا ہوا، ہم تجھ کو نہ پہچانیں گے۔ اب چوبیس برس بعد آیا تو چوروں کی طرح مسافر بن کر مسجد میں ٹھہرا۔ اُس وقت ہم سے کیا بھول ہوئی کہ بے ساختہ زبان سے نکل گیا کہ میں غوث نہیں ہوں۔ یہ بات منھ سے نکلی تھی کہ اُنھوں نے ہنس کر فرمایا کہ ہاں تو غوث نہیں تو اُس کا نام کیسے معلوم ہوا اس کے بعد ہم نے قدم بوسی کی اُنھوں نے ہم کو چھاتی سے لگایا اور زار زار رونے لگیں۔ اتنے میں دوسری والدہ صاحبہ بھی خفا ہوتی آئیں کہ ارے بے مروّت، بے وفا، تو ہم سب کو بھول گیا۔ چوبیس برس میں ایک دفعہ بھی اپنی خبر نہ بھیجی۔ بڑی والدہ نے فرمایا کہ کیا اُس نے کہیں شادی کر لی تھی یا کہیں کا بادشاہ بن گیا تھا، جو بھول گیا۔ بے چارہ قسمت کا مارا نصیبوں کی گردش سے دربدر پھرتا رہا یہی غنیمت سمجھو کہ آنکلا اور ہم کو اپنی صورت دکھا دی۔ اگر نہ آتا تو ہم اس کا کیا کر لیتے۔ المختصر ہم نے مِنّت و سماجت کر کے سب کو راضی کیا اور چوبیس روپئے جو ہمارے پاس تھے سب کے سامنے رکھ دیے۔ حیدر حسن سے ہم نے کہا کہ لو اب تو ہم تمھارے بھائی ہیں، آؤ مِل لو، وہ رونے لگا۔ ہم نے پیار کیا۔ اُس کا عجیب حال تھا۔ جہاں ہم کو دیکھتا رو دیتا۔ ہم نے بہت پوچھا کہا میں نہیں جانتا کیا بات ہے۔ آپ کو دیکھ کر بے اختیار میرا جی بھر آتا ہے۔ ہمارے آنے کی خبر سن کر نانی صاحبہ بھی تشریف لائیں۔ میں نے کہا اُس وقت آپ نے پانوں دبوائے نہیں تھے۔ اب میں بھی آپ سے نہیں ملتا۔ فرمایا کہ تو بڑا دغاباز اور فریبی ہے۔ کیوں نہیں کہا تھا کہ میں غوث ہوں۔ پھر میں نے قدم بوسی کی اُنھوں نے بہت پیار کیا۔ چند روز کے بعد ایک دن والدہ صاحبہ فرمانے لگیں کہ بھائی غوث گیا بیت اللہ شریف میں تم کو خرچ کی تکلیف ہوئی تھی اور کسی ترک نے تم کو پانچ ریال دے کر کہا تھا کہ خاطر جمع رکھو آئندہ کبھی تکلیف نہ ہوگی میں نے اقرار کیا تو فرمایا کہ وہ تیرا بھائی انوار الحسن تھا اُس نے جس وقت تم کو پانچ ریال دیے تھے اُسی وقت آکر مجھ سے یہ حال کہا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ تو غوث سے ملا کیوں نہیں

اُس نے کہا کہ اگر بلتا تو وہ میرا پیچھا نہ چھوڑتا۔ محبت جوش کرتی، طرفین کے لیے خرابی پڑتی چند روز کے بعد سب گھر والے ہمارے سر ہوئے کہ تمھاری منسوبہ اب تک بیٹھی ہوئی ہے اور کسی سے نکاح نہیں کرتی۔ بہتر ہے کہ اب تم شادی کرلو۔ یہ مضمون سُن کر ہم بہت گھبرائے آخر بڑی مشکل سے اُس نیک بخت کی شادی بھائی سید الحسن کے ساتھ کرادی، کیونکہ اُن کی بیوی کا انتقال ہوگیا تھا۔ پھر ایک دن والدہ صاحبہ نے کہا کہ تیرے حصّہ کی جائداد موجود ہے مناسب ہے کہ سید الحسن اپنے حقیقی بھائی کے نام لکھ دے۔ میں نے عرض کیا کہ اِن سے کیا خصوصیت ہے۔ مجھ کو تو سب بھائی برابر ہیں، چنانچہ سب کو برابر تقسیم کردی۔

ایک[1] روز ارشاد[۹۶] ہوا کہ جب ہم گھر سے چل کر بنارس میں پہونچے، تو وہاں ہمارے بھائی فیض الحسن تھانہ دار تھے اُن سے مل کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ بھائی نے ہر چند اصرار کیا کہ مکان پر ٹھہرو مگر ہم کو سوائے مسجد کے آرام کہاں تھا۔ گنگا کے کنارے ایک مسجد تھی اُس میں قیام کیا۔ ایک طرف گھاٹ دوسری جانب شارع عام۔ بھائی صاحب بھی روزمرہ وہاں تشریف لاتے کھانا بھی وہی بھیجتے تھے۔ ایک دن بعد نمازِ عصر دیوارِ مسجد پر بیٹھے ہم سیر دیکھتے تھے کہ یکایک ایک نازنینِ مہ جبین، غارت گرِ دنیا و دین، چودہ پندرہ برس کا سن وسال، قیامت کی چال ڈھال، قوم سے برہمن کشمیری، ہم جولیوں کے گروہ میں آفتابِ عالم تاب کی طرح نظر کو خیرہ کرتی ہوئی دکھائی دی۔ اُس وقت یہ سراپا کسی شاعر کا یاد آگیا ؎

چار[2] چتر بگ چار کھگ چار پھول پھل چار
کیشو پورن پرتاب بن ملے نہ ایسی نار

کَنوَلُ سِیں چَرَنُ گَرُ آنگُری کَسُنبُہ رَنگُ چَنپا کِی بَرَنُ تَنُ چُوھِی کِیُ دِیُن ھِیُنَ

گل نیلوفر پاؤں ہاتھ انگشت کسنبہ چنبیلی نام گل خوشبودار

---

[1] مولانا گل حسنؒ نے ایک روز سوال کیا تھا کہ حضرت کبھی آپ کو عشق بھی ہوا ہے اُس کے جواب میں یہ ارشاد فرمایا گیا تھا ۱۲۔

[2] یعنے جس عورت میں چار چوپایہ اور چار پرند اور چار پھول اور چار پھل کے وصف ہوں ایسی عورت کو اے کیشو خدا ملادے تو ملے۔ کیشو نام ہے شاعر کا اور وہ سولہ[۱۶] وصف اگلے چوپائے یعنی رباعی میں بیان کرتا ہے ۱۲۔

ایری نارگی سروج سری پھل بنبہ سی ادھر دنت دارم بجین ھاین

انار کے مانند لب دانت کدوری ناریل

کیرکی سی ناک سو کپو دکی سی گنٹہ کھنچن کیسی چپلاا اور کوکلا کی بین ھین

نام طائر خوش الحان آواز چلبلاہٹ ممولا گردن کبوتر ناک طوطا

کت گجواجرکی سوکت مرلک راجکی سوا ھوکی سو کھونا ھٹ اور مرگ ھوکی نین ھین

ہرن چشم گھوڑا تازی چیتا کمر ہاتھی رفتار

کاشمیر کی پیدائش ہندستان کی زیبائش کاشمیر کی نرگس شہلا ہندوستان کا ناز و ادا

امی ھلاھل مد بھری سیت شام رتنار

سرخی چشم سیاہی چشم سفیدی چشم مخمور زہر آب حیات

جیت مرت جھک جھک پرت جی جتوت اک بار

ایک دفعہ جو صورت مست ہوگیا مرگیا جی گیا

کوپہ تج اوپہ چلی اچون امی ھار

واسطے آب حیات ناگن ادہر چھوڑ کر سوراخ ناف

مرو ادی بیسر لکھو جو دیکی مانجھ پہاڑ

دو پہاڑ درمیان سمٹے خیال کیا نتھ مور

نوٹ :۔ اُس وقت حضرت کا حال بالکل ایسا ہوگیا تھا جیسا کہ ایک فقیہ کا قصّہ کسی نے نظم کیا ہے :۔ نظم

بود فقیہے بہ بنارس مقیم	باولِ آسودہ ز اُمید و بیم
مردِ خرد پرور و فرزانہ کار	در ہمہ فرزانگی آموزگار
صُحبتِ مردانِ خرد پیشہ داشت	پاک دل و پاکیِ اندیشہ داشت
راست بکیش و بکنش ہم درست	ہم بدم و ہم بقدم گرم و چُست
نقد ورع آنچہ کہ در بار داشت	بستہ بشا غولۂ دستار داشت
غمزہ بجانش پئے بازی نخاست	طُرّہ پئے دست درازی نخاست
دل بہ صنم خانہ نیازے نبرد	در خمِ ابروئے نمازے نبرد

بت بسوئے سجدہ اشارت نہ کرد — مُغ بچہ تعلیم طہارت نہ کرد
مختصر آں مایۂ فرہنگ و فر — بود زعشق نہ فن او بے خبر
داشت درین منزلِ بیم و امید — خاطرِ فارغ زسیاہ و سفید
رُستہ زنیرنگی لیل و نہار — شاد ہمی بُرد بسر روزگار
یک سحر از در صنم بے حجاب — چوں زگریبانِ سحر آفتاب
دلبرے ہندوئے مسلماں فریب — بُردہ بزلف از دلِ ایماں شکیب
ناز در آں نرگسِ جادو سرشت — خفتہ چو روح القدس اندر بہشت
نیم نگاہے کہ بہ درویش کرد — سینہ خراشید و جگر ریش کرد
غمزہ برآں ریش خراشے فزود — لب نمک آورد بر آں ریش سود
ناوکِ مژگاں سرِ پیکاں کُشاد — خونِ تمنا ز رگِ جاں کُشاد

نظر کے دو چار ہوتے ہی ہوش و حواس جاتے رہے ؎
نَین[لہ] چھپائے نا چھپیں پٹ گھونگھٹ کی اوٹ
چتر نار اور سورما کریں لاکھ میں چوٹ

مگر ابھی اتنی عقل باقی تھی کہ ہم نے مسجد کے مُلّا سے کہہ دیا کہ ہمارے بھائی آئیں یا کھانا بھجوائیں تو تم کہہ دینا کہ وہ چلہ میں بیٹھے ہیں اور سب سامان مجھ کو دے دیا ہے۔ جس وقت ضرورت ہوگی میں کھانا تیار کر کے کھلاؤں گا۔ اب کچھ ضرورت وہاں سے کھانا بھیجنے کی نہیں ہے۔ مُلّا کو یہ بات سمجھا کر ہم نے حجرہ کا دروازہ بند کیا اور اُس پری رو کا تصوّر باندھا۔ اِس عرصہ میں نماز روزہ کھانا پینا سب بالائے طاق تھا۔ آٹھویں دن وہ تصوّر مجسّم ہو کر سامنے آ کھڑا ہوا۔ اُسی دن وہ دل رُبا اپنے شوہر کے ساتھ تھالی میں شیرینی رکھے مسجد کے اندر آ موجود ہوئی ؎

لہ خوبصورت آنکھیں گھونگھٹ کی اوٹ میں پوشیدہ نہیں ہو سکتیں خوبصورت عورت اور بہادر مرد لاکھوں میں چوٹ کر جاتے ہیں ۱۲ منہ۔

شب کہ بودم با ہزاراں کوہ درد — سر بزانوئے غمش بنشستہ فرد
جاں بلب از حسرتِ گفتارِ او — دل پُر از نومیدئے دیدارِ او
آں قیامت قامتِ پیماں شکن — آفتِ دوراں بلائے مرد و زن
فتنۂ دوران و آشوبِ جہاں — خانہ سوزے چوں منِ بے خانماں
از درم ناگہ درآمد بے حجاب — لب گزاں از رُخ برافگندہ نقاب
کاکُلِ مشکیں، بدوش انداختہ — وز نگاہے کارِ عالم ساختہ
گُفت اے شیدا دلِ محزونِ من — وے بلاکش عاشقِ مفتونِ من
کَیفَ حَالُ القَلبِ فِی نَارِ الفِرَاقِ — گفتمش وَاللّٰہِ حَالِی لَایُطَاقِ

اُس نے حُجرہ کی زنجیر کھڑکائی اِدھر دل نے گواہی دی کہ وہ مطلوب آپہونچا۔ ہم نے کُنڈی کھول دی۔ وہ دونوں اندر آئے۔ دیکھا تو اُس کا شوہر بھی حسن و جمال میں بے مثال تھا۔ ہم نے پوچھا تم دونوں کس لیے آئے ہو۔ کہا کہ ہم کو اولاد کی تمنا ہے۔ خیر ہم سمجھ گئے کہ یہ سب فساد حضرتِ عشق کا ہے، ورنہ ابھی تو ان کے دن خود سیر و تماشے کے ہیں، کیسی اولاد اور کس کی تمنا۔ اُس عورت نے ہماری طرف ٹکٹکی باندھ دی۔ اُس کے شوہر سے ہم نے کہا ذرا تم باہر جاکر زنجیر لگالو۔ ہم کو اس سے ایک پردہ کی بات پوچھنی ہے۔ وہ غریب دروازہ بند کرکے باہر ہوگیا۔ اُس زمانہ میں ہماری عمر پینتالیس سال کی تھی۔ ہم نے دل سے کہا کہ بولو، حضرت! اب کیا ارادہ ہے۔ اگر اس کو جورو بنانا چاہتے ہو تو میاں بیوی دونوں راضی ہیں، مگر اب وہ عمر جوانی کہاں۔ اور اگر بہن بنانا چاہتے ہو تو اپنی ماں بہن کو کیوں چھوڑا جس کے لیے آٹھ دن سے یہ بے تابی اور بے قراری تھی وہ موجود ہے، کہو کیا کہتا ہے۔ دل نے جواب دیا کہ یہ بھی ایک کھیل کھیلنا تھا سو کھیل چکے، بس اب کوئی خواہش باقی نہیں۔ اس کے بعد ہم نے اُس سے دو ایک باتیں پوچھ کر اُس کے خاوند کو بُلالیا اور ایک تعویذ لکھ کر اُن کے حوالہ کیا اور کہا کہ جاؤ خدا حافظ۔ اُن کے جانے کے بعد خیال آیا کہ یہ عشق ضرور کچھ نہ کچھ رنگ لائے گا اور طرفِ ثانی کو بھی ستائے گا، یہاں سے چل دینا بہتر ہے۔ یہ سوچ کر ہم

آدھی رات کو چل دیے اور وہاں سے بیس کوس پر جا کر دم لیا۔ دوسرے دن وہ نیک بخت بھی شوہر کو ہمراہ لے ایکہ میں بیٹھ عصر کے وقت اُسی مقام پر آ پہونچی۔ بال پریشان طبیعت اُداس چہرہ پژمردہ دل افسردہ، پاس آ کر لگی زار و قطار رونے[1] اُس وقت ہم کو یہ شعر یاد آیا ؎

لَٹ لِپٹی لِٹاپٹ اَٹ پَٹ بولت بَین — کچھو پیا سے کھٹ پٹ بھئی جو ٹپ ٹپ ٹپکت نَین

اور بار بار کہنا شروع کیا کہ آپ بنارس تشریف لے چلیں۔ جب دونوں نے بہت اصرار کیا تو کہنا پڑا کہ ہم یہاں ایک کام کے لیے آئے ہیں، وہ ہو جائے گا تو دو چار دن میں خود چلے آئیں گے۔ غرض تسلّی و تشفّی دے کر اُن کو اُدھر روانہ کیا اور ہم نے ایکہ کرایہ کر لکھنؤ کی راہ لی۔ نہیں معلوم اس پر کیا گذری۔ اثنائے راہ میں شاہ کرڑا کا مزار آیا۔ اُس کی زیارت کو گئے۔ چونکہ پنجشنبہ کا دن تھا اُس وقت ایک طوائف مجرا کرتی اور یہ غزل گاتی تھی ؎

یارا بغمزہ کشت و قضا را بہانہ ساخت — خود سوئے ما ندید و حیا را بہانہ ساخت

ناگہاں ایک فقیر لنگوٹی بند لاٹھی ہاتھ میں لیے محفل میں آ کودا اور یہ پڑھ کر ناچنے لگا ؎

آنکس کہ خاکِ مارا گِل کرد و خانہ ساخت — خود درمیاں درآمد و ما را بہانہ ساخت

اُس وقت اہل محفل پر ایک عجیب حالت طاری ہو گئی۔ کسی کو کسی کی خبر نہ رہی۔ دو چار چکّر مار کر چل دیا۔ معلوم نہ ہوا کہ کہاں سے آیا اور کدھر گیا۔ کوئی اُس کو پہچانتا بھی نہ تھا۔ وہاں سے چل کر ہم لکھنؤ پہونچے اور چندے قیام کر کے سنبھل کا ارادہ کیا۔ جہاں ہمارے پیر و مرشد حضرت مولانا **حبیب اللہ** شاہ صاحب نقشبندیہ کا مزار ہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہم کو یہ خبر نہ تھی کہ حضرت مولانا حبیب اللہ شاہ صاحب نے بوقتِ انتقال اصحاب و احباب سے فرمایا تھا کہ غوث علی نام ایک ہمارا بڑا رفیق و دوست ہے اگرچہ آوارہ گرد آدمی ہے لیکن کبھی ادھر آ نکلے تو بہت خاطر و مدارات کرنا۔ جب کہ منزل بہ منزل سیر کرتے ہوئے ہم سنبھل میں پہونچے تو کسی نے پہچانا نہیں،

---

[1] سارے بال بکھرے ہوئے دوپٹا اُلجھا ہوا۔ گفتگو رنجش آمیز۔ یہ کیوں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یار سے بگڑ گئی اس لیے آنسو بہا رہے ہیں ۱۲۔

مگر ایک دن غلام حسین نام ایک شخص نے ہمارا نام دریافت کیا ہم نے بتا دیا۔ بولا کہ آپ حضرت حبیب اللہ شاہ صاحب کے مرید ہیں، کہا کہ ہاں۔ جب یہ بات اُس کو معلوم ہوگئی تو سارے شہر میں کہہ پھرا کہ حضرت کے بڑے خلیفہ آگئے ہیں جن کی نسبت حضرت نے وصیت فرمائی تھی۔ پھر تو بہت لوگ شہر کے آنے جانے لگے اور خاطر تواضع شروع ہوئی۔ چند روز بعد وہاں کے اکثر کہ ومہ ادنیٰ اور اعلیٰ مجتمع ہو کر آئے اور کہا کہ حضرت پگڑی باندھ لیجیے ہم نے اُن سب سے کہا کہ میاں صاحب قبلہ نے ہماری نسبت کیا الفاظ فرمائے تھے۔ آیا مُرید یا رفیق؟۔ بولے کہ ہاں رفیق کے لفظ سے یاد فرمایا تھا، لیکن آپ کو تو مُریدی کا اقرار ہے۔ ہم نے کہا تم کو کیا خبر شاید ہم نے روٹیوں کے لیے یہ بات بنائی ہو۔ اور سنو صاحبو، آپ لوگ دنیا دار ہیں یا فقیر۔ سب نے جواب دیا کہ دنیا دار۔ پھر ہم نے پوچھا کہ ہماری نسبت کیا خیال کرتے ہو، دنیا دار یا فقیر؟۔ بولے کہ ہم تو آپ کو فقیر سمجھتے ہیں۔ ہم نے کہا کہ تعجب کی بات ہے کہ ہم فقیر ہو کر دنیا داروں کے ہاتھ سے پگڑی باندھیں۔ البتہ اگر میاں صاحب قبلہ اپنے دستِ مبارک سے ہمارے سر پر جوتیاں بھی رکھ دیتے تو ہم کو تاجِ سلطنت تھا۔ پس آپ سب صاحب مجھ کو معاف فرمائیں اور اس قسم کا تذکرہ درمیان میں نہ لائیں۔ غرض وہ لوگ اپنی پگڑی بغل میں داب کر چل دیے اور پھر کبھی ایسا ارادہ نہ کیا۔

ایک مرتبہ ارشاد ہوا کہ سنبھل میں چھ مہینے رہنے کا اتفاق ہُوا۔ وہاں اکثر آدمیوں سے ملاقات ہوگئی۔ ایک دن ہمارے پیر بھائی غلام محی الدین کی والدہ نے ہم کو بُلا کر یہ بات کہی کہ تمھارے بھائی کی شادی کو نو برس ہوئے مگر اولاد نہیں ہوتی۔ کچھ اس کی تدبیر کرنی چاہیے۔ ہم نے کہا کہ بہت اچھا انشاء اللہ کچھ فکر کی جائے گی۔ چھ مہینہ بعد ہم وہاں سے چل دیے اور موضع تگری میں پہونچے جو گڈھ مکتیسر کے مقابل گنگا کے کنارے واقع ہے۔ یہاں غلام محی الدین گھاٹ پہ ملازم تھے اِن کے پاس ہم بھی ٹھہر گئے۔ اُس زمانہ میں برسات کا موسم اور دریا میں طغیانی تھی۔ اس لیے رات دن میں صرف ایک کھیوہ لگتا تھا۔ حُسن اتفاق سے ایک جوگن وارد ہوئی۔ کشتی روانہ ہو چکی تھی

ناچار اُس کو ٹھہرنا پڑا۔ چونکہ نہایت حسین وطرح دار و نوجوان تھی لوگ اُس کو دیکھنے لگے۔ ہمارے پیر بھائی نے بھی دیکھا تو وہ بولی کیوں صاحب آپ کس برتے پر دیکھتے ہیں۔ کیا تمھاری شادی ہوگئی ہے۔ جواب دیا کہ ہاں ہوگئی۔ جوگن نے کہا بھلا وہ غریب تمھاری جان کو کیا روتی ہوگی۔ یہ سُن کر وہ سرد ہوگئے اور شرمندہ ہوکر آنکھیں نیچی کرلیں۔ ہم تاڑ گئے کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ ہم نے جوگن سے کہا کہ مائی صاحب آج ہمارے پاس ٹھہر جاؤ کہا کہ بہت اچھا۔ ایک جھونپڑی اُس کے واسطے خالی کرادی۔ پھر ہم نے بھائی صاحب سے پوچھا کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ کہا کہ جوگن سچ کہتی ہے۔ میں نامرد ہوں۔ جب شادی کی تیاری ہوتی تھی تو میں نے غل مچایا اور صاف صاف کہہ دیا تھا مگر والدہ اور خالہ نے جن کے گھر میری شادی ہوئی نہ مانا اور عقد کردیا۔ شب زفاف کو میں اپنی بیوی کے سامنے دست بستہ کھڑا ہوگیا اور کہا کہ میں کسی قابل نہیں تیری اور میری ماں نے یہ ظلم کیا، اب شرم تیرے ہاتھ ہے۔ اُس نیک بخت نے جواب دیا کہ خیر جو تقدیر کا لکھا تھا پیش آیا، اب کیوں عزت خراب کی صبح اُٹھ کر دونوں نہالیا کریں گے۔

جنکؒ سُتا جسرتؑ بہو رام چند رنؑ لین
سو ہار چایا ششٹ کا کرم ریکھ دکھ دین
لاکھ سیان پٹ کوڑ بد کرد یکھو سب کوئی
ان ہونی ہونی نہیں ہونی ہو سو ہوئی

مگر دیکھنا کوئی اس راز سے آگاہ نہ ہونے پائے ورنہ تمام زمانہ میں رُسوائی ہوگی۔ واہ رے عورت! اللہ تعالےٰ نے کیا سمجھ اور حوصلہ دیا تھا کہ نو برس تک پردہ فاش نہ ہونے دیا۔ **شعر**

ؒ سیتا جو راجہ جنک کی بیٹی تھی راجہ جسرت کی بہو اور راجہ رام چندر جی کی بیوی تھی اور گرو باششٹ جی نے نکاح پڑھا پھیرے دلوائے اور یہ چاروں لوگ ظاہر و باطن کا کمال بھی رکھتے تھے لیکن خط تقدیر کو کوئی بھی مٹا نہ سکا۔ یعنی سیتا جی کو یہ بدنامی راون سے جو ہونے والی تھی ہو کے رہی کسی سے نہ مٹ سکی اور اس نے دُکھ اور رنج دیا ۱۲ منہ ؑ اگر کوئی لاکھ عقلمندی و ہوشیاری کرو فریب کرے لیکن نہ ہونے والی چیز کبھی نہیں ہوتی اور ہونے والی رکتی نہیں ہوکر ہی رہتی ہے اُسکا کوئی روکنے والا نہیں ۱۲ منہ

نہ ہر زن زن ست و نہ ہر مرد مرد　　　خدا پنج انگشت یک ساں نہ کرد

یہ ماجرا سُن کر ہم جوگن کے پاس گئے اور کہا کہ مائی صاحبہ کچھ اس مرض کا علاج بھی ہے جس کو تم نے ایک نظر میں تشخیص کر لیا۔ اُس نے چٹکی بجا کر کہا کہ اتنی دیر میں علاج ہو سکتا ہے لیکن سامان مہیا کرنے کو ایک مہینہ چاہیے ہم نے کہا کہ مہربانی کر کے آپ بھی ایک مہینہ تشریف رکھیں۔ کہا کہ خیر کیا مضائقہ ہے۔ آپ کی خاطر عزیز ہے۔ پہلے تو یہ میاں صاحب ایک مہینہ کی رخصت لیں۔ پھر ایک سیر گھی ایک سیر روغن کنجد ایک کڑھائی اور ایک چارپائی اونچے پایوں کی جس میں بجائے بان کے ڈنڈے لگے ہوں تیار کرائیے اور قدرت الٰہی کا تماشا دیکھیے۔ جب اُس کے کہنے کے موافق سب سامان مہیا ہو گیا تو اُس نے کڑھائی چولھے پر رکھ گھی اور تیل ایک ہی دفعہ ڈال دیا۔ اور اُس کے اوپر چارپائی بچھا دی۔ پھر غلام محی الدین کو ایک ذرا سی دوا کھلائی جس سے بے ہوشی طاری ہو گئی۔ اُس وقت اُن کو چارپائی پہ لٹا دیا اور کڑھائی کے نیچے دھیمی آنچ شروع کی۔ جب کہ اُس کی بھاپ ریڑھ کی ہڈی کو لگی تو فوراً چھینکیں آنے لگیں۔ اور غسٹے کے غسٹے ناک سے نکلنے لگے اور قوت شہوانی کو ہیجان ہوا۔ تھوڑی دیر میں آنکھیں کھول دیں۔ جوگن نے فرمایا دیکھو اب ان کی آنکھوں میں اور ہی رس ہے۔ فی الواقع اُس وقت مخمور و متوالوں کی طرح سُرخ آنکھیں تھیں۔ پھر تو وہ بے قرار ہو کر پکارے کہ اب طاقتِ ضبط نہیں رہی۔ آخر کار جوگن نے ایک ترکیب بتائی اور کہا کہ ایک مہینے تک اسی ترکیب کو کرتے رہنا۔ مہینہ بھر کے بعد گھر کے آدمیوں کو بُلا لیا اور خوشی و خرمی سے رہنے لگے۔ ایک روز جوگن نے ہم سے کہا کہ آپ بھی یہ دوا کھا لیں۔ ہم نے کہا کہ بہت اچھا بشرطے کہ تم بھی ہمارے ساتھ رہو۔ کیوں کہ اس کے اُتار چڑھاؤ سے تم خوب واقف ہو۔ ہنس کر چُپ ہو گئی۔ یہ عورت بڑی خوش مذاق اور بااخلاق تھی جو شغل اس کو کسی کامل گرو سے پہونچا تھا ہر دم اُس میں مشغول رہتی۔ دن بھر سب سے بات چیت کرتی۔ جب رات کا وقت آتا تو اپنی جھونپڑی کا دروازہ بند کر کے صبح تک تنہا

بیٹھ کر گذار دیتی تھی۔ ایک روز اُس نے بیان کیا کہ میری شادی بھی ہوگئی تھی۔ قضاء الٰہی سے میرا شوہر ہیضہ کر کے مرگیا۔ نہایت حسین و خلیق آدمی تھا۔ اگر آپ دیکھتے تو بہت خوش ہوتے۔ میں اُسی کے بیراگ میں جوگن کا بھیس بھر کر دیس بہ دیس پھرتی ہوں۔ چندے جنون کا زور رہا مگر اب کمی ہوگئی ہے ؎

دیوانہ وار در کمرِ کوہ گشتہ ام بے اختیار سر بہ بیاباں نہادہ ام

ہم نے کہا کہ تم بڑی مردانہ اور مستقل مزاج عورت ہو کہ لطفِ دنیا سے واقف ہو کر اس کو ترک کیا اور ہم جو تجرد و تنہائی میں پھرتے ہیں تو بات یہ ہے کہ کبھی اس کو چکھ کر سیر ہی نہیں کی۔ بولی کہ آؤ ہمارے ساتھ رہو اور بان پرست[1] ہو جاؤ۔ ہم نے کہا صاحب بس معاف رکھیے۔ جب ایک مہینہ ہوگیا وہ جوگن رخصت ہوئی۔ ہم نے پچاس روپئے نذر کیے اُس نے نہ لیے اور کہا کہ جو کچھ ہم نے کھا لیا یہی بس ہے۔ اس کے سوا مجھ کو کچھ درکار نہیں۔ ایک دن ہم میاں غلام محی الدین کے گھر گئے اور اُن کی بیوی سے کہا کہ مائی صاحب کیا کریں پہلے دو جگہ مُرید ہو چکے ہیں ورنہ اس شان ستار العیوبی میں ہم تمہارے مُرید ہو جاتے۔ آفریں صد آفریں کہ نو برس تک صبر کیا اور کسی پر راز فاش نہ ہونے دیا ؎

صد ہزاراں کیمیا حق آفرید کیمیائے ہم چو صبر آدم نہ دید

اُس نے کہا کہ سنو میاں صاحب! ایک رشتہ تو پہلے سے تھا، نکاح کے بعد دوہرے حقوق ہو گئے۔ اور جب اُن کی عزت میں فرق آتا تو میں کب بچتی۔ صبر کا یہ نتیجہ ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے اُن کی عزت بھی رکھی اور میری بھی۔ لیکن یہ ایسا عذاب تھا کہ دوزخ کا عذاب بھی اُس کے سامنے ہیچ ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ آپ کے قدموں کی برکت سے وہ دن بھی گذر گئے فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا۔ ؎

---

[1] بان پرست وہ ہے کہ عورت مرد دونوں جنگل میں ہوں کوئی مانع بھی نہ ہو آپس میں محبت بھی ہو طرفین میں کوئی قصور نہ ہو ایک جگہ لپٹ کر سو دیں اور باوجود قدرت شہوت کے ضائع نہ کریں ۱۲ منہ۔

یوسفِ گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور — کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور
دورِ گردوں گر دو روزے بر مراد ما نگشت — دائماً یکساں نہ باشد کارِ دوراں غم مخور
گرچہ منزل بس خطرناک ست و مقصد ناپدید — ہیچ راہے نیست کاں را نیست پایاں غم مخور
گر بہارِ عمر باشد باز بر تختِ چمن — چترِ گل بر سر کشی اے مرغِ خوشخواں غم مخور
در بیاباں گر ز شوقِ کعبہ خواہی زد قدم — سرزنش ہا گر کند خارِ مغیلاں غم مخور
ہاں مشو نومید چوں واقف نۂ ز اسرارِ غیب — باشد اندر پردہ بازیہائے پنہاں غم مخور
ہر کہ سرگرداں بہ عالم گشت و غمخوار نیافت — آخر الامر او بہ غمخواری رسد ہاں غم مخور

وہاں سے رخصت ہو کر ہم رام پور میں پہونچے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب ہم دوبارہ رام پور میں گئے تو سرائے میں ٹھہرے اتفاقاً مولوی فضل حق صاحب سے ملاقات ہوئی۔ نہایت محبت و عنایت سے پیش آئے اور اپنے نوکر سے کہا کہ جاؤ آپ کا اسباب اٹھا لاؤ۔ میں نے کہا کہ حضرت برائے خدا مجھے وہیں رہنے دیجیے کہ بہت آرام سے ہوں۔ کہا اچھا جہاں آپ خوش رہیں لیکن بھٹیاری کو کہلا بھیجا کہ اُن کے خرچ کا حساب ہمارے ذمہ ہے اگر پانچ روپیہ روز بھی اُٹھیں تو کچھ مضائقہ نہیں، ہم دیں گے۔ لیکن یہ شرط ہے کہ میاں صاحب بلا اجازت ہمارے کہیں چلے نہ جاویں۔ ایک روز پچھلی باتوں کا ذکر آگیا۔ اپنے والد بزرگوار کو یاد کر کے روتے رہے۔ ہم نے کہا کہ مولوی صاحب آپ کو وہ دن بھی یاد ہے کہ مولوی صاحب نے تھپڑ مارا تھا اور آپ کی دستارِ فضیلت دور جا پڑی تھی۔ ہنسنے لگے اور فرمایا کہ خوب یاد ہے۔ وہ عجب زمانہ تھا اور وہ قصہ اس طرح تھا کہ مولوی فضلِ امام صاحب نے ایک طالب علم کو فرمایا کہ جاؤ فضل حق سے سبق پڑھ لو۔ وہ آیا غریب آدمی، بدصورت، عمر زیادہ، علم کم، ذہن کند، یہ نازک طبع، نازپروردہ، جمالِ صورت و معنی سے آراستہ چودہ برس کا سن و سال، نئی فضیلت ذہن میں جودت، بھلا میل ملے تو کیسے ملے اور صحبت راس آئے تو کیوں کر آئے۔ تھوڑا سبق پڑھایا تھا کہ بگڑ گئے جھٹ اُس کی کتاب پھینک دی اور بُرا بھلا کہہ کر نکال دیا۔ وہ روتا ہوا مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا حال بیان کیا۔ فرمایا کہ بلاؤ اُس خبیث کو۔

مولوی فضل حق صاحب آئے اور دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ مولانا صاحب نے ایک تھپڑ دیا ایسے زور سے کہ اُن کی دستارِ فضیلت دور جا پڑی اور فرمانے لگے کہ تو تمام عمر بسم اللہ کے گنبد میں رہا، نازو نعمت میں پرورش پائی جس کے سامنے کتاب رکھی اُس نے خاطرداری سے پڑھایا۔ طالب علموں کی قدر و منزلت تو کیا جانے۔ اگر مسافرت کرتا بھیک مانگتا اور طالبِ علم بنتا تو حقیقت معلوم ہوتی۔ ارے! طالب علمی کی قدر ہم سے پوچھ ؎

درازیٔ شب از مژگانِ من پرس ۔۔۔ کہ یک دم خواب در چشمم نگشت ست

خبردار تم جانو گے اگر آیندہ ہمارے طالب علموں کو کچھ کہا۔ یہ چپ کھڑے روتے رہے کچھ دم نہ مارا۔ خیر قصہ رفع دفع ہوا۔ لیکن پھر کبھی کسی طالب علم کو کچھ نہیں کہا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ مولوی فضل حق صاحب نے ایک قصیدہ عربی زبان میں امراء القیس کے قصیدہ پر کہا اور مولانا شاہ **عبدالعزیز** صاحب کی خدمت میں لائے۔ شاہ صاحب نے ایک مقام پر اعتراض کیا۔ اس کے جواب میں اُنھوں نے بیس شعر متقدمین کے پڑھ دیے۔ مولوی فضل امام صاحب نے فرمایا کہ بس حدّ ادب۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ حضرت یہ کوئی علم تفسیر و حدیث تو ہے نہیں۔ فنِ شاعری ہے اس میں بے ادبی کی کیا بات ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ برخوردار تو سچ کہتا ہے مجھ کو سہو ہوا تھا۔ غرض ہم رام پور میں مہینہ بھر تک مولوی صاحب کے مہمان رہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ رام پور میں میاں **سبحان شاہ** صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ اُنھوں نے نہایت خاطر و مدارات سے اپنے مکان پر ٹھہرایا۔ ہم نے اُن کو نماز پڑھتے کبھی نہیں دیکھا۔ مگر ہر وقت تسبیح ہاتھ میں اور باوضو درود شریف پڑھا کرتے تھے۔ اُن کی نسبت ایسی تھی کہ جب کوئی مشائخ اُن کے کوچہ میں جا نکلتا تو اُس کی کیفیت سرد ہو جاتی۔ چنانچہ مشائخوں کا قول تھا کہ اس بدعتی فقیر کے کوچہ میں جانے سے قلب پر تاریکی چھا جاتی ہے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ ایک نابینا اُن کی خدمت میں آیا اور ارادت ظاہر کی۔ شاہ صاحب نے کہا بھلا حافظ جی تم کب سے نابینا ہوئے ہو۔ کہا کہ نو برس کی عمر میں چیچک نکلی تھی، جب سے آنکھیں جاتی رہی ہیں۔ پھر پوچھا بھلا آنکھیں کس نے کھوئیں؟۔

حافظ جی نے کہا اللہ نے۔ شاہ صاحب نے کہا ارے عقل کے دشمن! جس نے تیری آنکھیں کھوئیں تیرے ماں باپ کو مارا اور تیری فکر میں ہے، ایسے دشمن کو کیوں تلاش کرتا ہے خبردار! اس خبط میں مت پڑ۔ یہ باتیں سُن کر وہ گالیاں دیتا چلا گیا۔ ایک دن شاہ صاحب سے کسی نے پوچھا حضرت آپ نماز تو پڑھتے نہیں مگر تسبیح رکھتے ہیں، اس کی کیا ضرورت ہے۔ جواب دیا کہ میاں عبرت کے لیے کیوں کہ امام کے اندر دو دھاگے ہیں اور مقتدی کے اندر ایک۔ پس میں چاہتا ہوں کہ امامت و اقتدا دونوں سے بچوں۔ وہ شخص لاحول پڑھ کر چلا گیا۔ ایک روز مفتی صدر الدین صاحب صدر الصدور سجان شاہ صاحب کے پاس تشریف لائے۔ مفتی صاحب کی عادت تھی کہ ہر وقت تسبیح پر نفی اثبات کا دور رکھتے تھے۔ حسب عادت یہاں بھی تسبیح پڑھتے رہے۔ شاہ صاحب نے کہا کہ مفتی صاحب کیا اب تک آپ کا شک رفع نہیں ہوا۔ مفتی صاحب نے سکوت کیا۔ کئی بار پوچھا کچھ جواب نہ دیا۔ جب مفتی صاحب تشریف لے گئے تو ہم نے کہا کہ میاں صاحب آپ نے کیا لچر سوال کیا تھا۔ وہ عالمِ متبحّر تھے اگر چاہتے تو ہزار طرح سے جواب دیتے مگر وہ اپنی کسرِ شان سمجھے ورنہ میدانِ سخن تنگ نہ تھا۔ اُن کی پختگی تو دیکھو آپ نے بہت ہی سر مارا لیکن اُنھوں نے اپنی عادت کو ترک نہ کیا۔ اب میں اُن کی طرف سے جواب دیتا ہوں۔ یہ تو فرمائیے کہ حضرت رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم ہمیشہ نماز میں اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کیوں پڑھتے تھے۔ اور ہر نماز کے بعد تین بار استغفار کس واسطے کہا کرتے تھے کیا حضرت کو کچھ شک تھا؟ شاہ صاحب نے جواب دیا کہ حضرت کو کچھ شک نہ تھا بلکہ مراتبِ اعلیٰ کی ترقی تھے لیے طلبِ ہدایت تھی اور مراتبِ حاصل شدہ کی نسبت استغفار۔ ہم نے کہا کہ بس یہی مقصد ہمارا بھی ہے اگر ہم نے رسولِ خدا کی متابعت کی تو کیا قباحت لازم آئی۔ نہ خدا کی کوئی حد نہ اس کی طلب کی کچھ انتہا ؎

مرا کمالِ محبت ترا کمالِ جمال   مباد ایں کہ پذیرد زوال ایں و کمال

یہ بات سُن کر شاہ صاحب چپ ہو گئے، کچھ جواب نہ دیا۔ ایک روز ہمارے پیر بھائی اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہیں بستر لگا یا۔ میاں صاحب نے کہا کہ یہاں کا دستور یہ ہے کہ صرف صبح کو روٹی ملتی ہے، رات کو نہیں ملتی کہ نیند غلبہ نہ کرے اور یادِ خدا میں

خلل نہ پڑے۔ ؎

اندروں از طعام خالی دار تا دروں نورِ معرفت بینی

ہمارے پیر بھائی نے جواب دیا کہ صاحب ایسے خدا کو سلام ہے جو رات کی روٹی سے بھاگ جائے۔ ہم تو دونوں وقت کھائیں گے، خواہ آپ اپنے مکان پر رہنے دیں خواہ نہ رہنے دیں۔ شاہ صاحب ہنسے اور بھنڈاری سے کہا کہ بھائی یہ فقیر نہیں مانیں گے۔ ان کو دونوں وقت روٹی دو۔ ہمارے پیر بھائی باوجود خوب کھانے کے محنتی بھی ایسے تھے کہ شام سے بیٹھتے تو صبح کر دیتے تھے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ رام پور میں تین دروازہ کے باہر باغ میں میاں **حبیب اللہ شاہ** صاحب ابوالعلائی رہتے تھے۔ ہم بھی ایک دن اُن کی ملاقات کو گئے۔ دیکھتے ہی پتھر اُٹھایا اور ہماری طرف دوڑے۔ ہم نے کہا کہ تم اپنا پتھر تو رہنے دو۔ ہم تمھارے پیر اور دادا پیر سے بھی مل آئے ہیں۔ اگر تم نہیں ملتے نہ ملو، کوئی مطلب دین و دنیا کا لے کر ہم تمھارے پاس نہیں آئے۔ بولے کہ خیر آ جاؤ۔ پھر تو آمد و رفت ہو گئی۔ چونکہ مولوی حبیب اللہ شاہ بڑے صاحبِ ذوق و شوق تھے اُن کے پاس طبیعت گرم ہو جاتی تھی، اور سبحان شاہ کے پاس سرد۔ ایک دن ایک مسافر طالبِ خدا میاں حبیب اللہ شاہ کی خدمت میں آیا اور بزرگان دین کی شکایت شروع کی کہ بغداد گیا، مدینہ ہو آیا، اجمیر کی خاک چھانی، زندہ مردہ سب دیکھے، نہ کچھ اُن میں تھا نہ ان میں۔ ؎

مکّے گئے مدینہ گئے کربلا گئے جیسے گئے تھے ویسے ہی چل پھر کے آ گئے

یہ سن کر اُن کو جذبہ آیا۔ ہم نے سوچا کہ اب ان دونوں میں سے ایک کی خیر نہیں، یا تو یہ شرمندہ ہوں گے یا وہ مر جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میاں صاحب نے کہا کہ ہمارے سامنے بیٹھ۔ وہ سوختہ جگر چپٹ آن کر بیٹھ گیا۔ نظر جو ڈالی تو اُس غریب کا قلب شق ہو گیا۔ ہر بُن مو سے خون ٹپکنے لگا اور تیسرے دن مر گیا۔ ہم نے اُن سے کہا کہ آپ نے غضب کیا۔ پھر کبھی ایسا نہ کرنا کیونکہ ہر قسم کے سوختہ جگر آتے ہیں اور طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں اگر تعلیم کرنا منظور ہو تو قاعدہ اور طریقہ کے موافق کرو، ورنہ بکنے دو خود تھک کر چلے جائیں گے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہم دو برس تک رام پور میں رہے وہاں سے چل کر پھر نگری میں آئے۔ دیکھا کہ میاں غلام محی الدین کے دو لڑکے موجود تھے۔ ایک کھیلتا تھا دوسرا گود میں تھا۔ ہم نے شکر خدا کیا۔ وہاں سے چل کر میرٹھ آئے اور چند روز ٹھہرے۔ یہاں ایک مجذوب شتر خانہ کے قریب رہتے تھے۔ ہم بھی اُن کے پاس جایا کرتے تھے۔ ایک دن گوروں کا رسالہ اُدھر سے گذرا۔ ایک افسر اُن میں سے جُدا ہو کر میاں صاحب کے پاس آیا اور گلے لگ کر رونے لگا۔ پھر دو چار باتیں کر کے چل دیا۔ ہم نے پوچھا کہ میاں صاحب یہ کیوں روتا تھا اور آپ سے کیا کہتا تھا۔ فرمایا کہ یہ بھی خدا تعالےٰ کا ایک بھید ہے۔ ہم نے کہا یہ تو ہم خود بھی جانتے ہیں کہ بھید ہے، لیکن آپ بتائیے کہ وہ بھید کیا ہے۔ کہنے لگے کہ یہ افسر کہتا تھا کہ اس رسالہ کے قتل کا حکم ہوا ہے۔ ہم میں سے بہت لوگ مارے جائیں گے اور بہت کشت و خون ہوگا۔ آپ دعا کریں۔ میں نے کہا کہ حکم قطعی ہو چکا ہے، اب دم مارنے کی جگہ نہیں، راضی بہ رضا رہو۔ اُس وقت تک بالکل امن و امان تھا۔ چند روز بعد ہم وہاں سے بابری چلے گئے اُس سے ایک مہینے بعد یکایک غدر شروع ہو گیا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب کسی قدر غدر فرو ہوا تو مجرموں کو انگریزوں نے پھانسی دینی شروع کی۔ ہم کو بھی ایک انگریز نے جو تحقیقات کرتا تھا بمقام شاملی طلب کیا اور پوچھا کہ جب یہاں لڑائی ہوئی اور تحصیل و تھانہ پر لوگوں نے یورش کی تو تم کہاں تھے۔ ہم نے کہا کہ صاحب ہم تو بابری میں تھے اور اُن دنوں میں ہم کو بخار آتا تھا۔ بولا کہ تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو۔ ہم نے کہا کہ صاحب گھبرانے کی بات یہ ہے کہ آپ حاکم ہیں آپ نے بلایا، ہم فوراً دوڑے چلے آئے۔ اب تک کھانا بھی نہیں کھایا۔ دوسرے یہ اندیشہ ہے کہ دیکھیے آپ کیا حکم دیں۔ بولا کہ سنو صاحب! ہم ظلم نہیں کرتا اور خواہ مخواہ کسی کو نہیں ستاتا۔ جس کی نسبت تمھارے بھائی بند قسم کھا کر گواہی دیتے ہیں کہ یہ مجرم ہے اُسی کو ہم سزا دیتا ہے۔ اس میں ہمارا کچھ قصور نہیں۔ اگر جھوٹ بولا تو یہ عذاب اُن کے سر پہ ہوگا۔ پھر اپنے خانساماں کو بُلا کر کہا کہ ان کو کھانا کھلاؤ۔ وہ ہم کو اپنے پاس لے گیا۔ اتفاق سے اُس دن صاحب کا بچہ نہایت بے چین ہو رہا تھا۔ برابر روتا تھا۔ زبان تالو سے

نہیں لگتی تھی۔ کسی شخص نے صاحب سے کہہ دیا کہ جس کو آپ نے بابری سے بلایا ہے، وہ بہت بزرگ آدمی ہے۔ اس بچہ پر دعا پڑھ دے گا تو یقین ہے کہ اس کو جلد آرام ہو جائے گا۔ اُس نے آیا کے ہاتھ بچّے کو ہمارے پاس بھیجا۔ ہم نے کچھ پڑھ کر دم کر دیا۔ خدا کی قدرت بچہ اُسی دم چُپ ہو گیا۔ صاحب اور میم دونوں اُس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ پھر ہم کو بلا کر کہا کہ آپ کو اختیار ہے جہاں چاہو چلے جاؤ، کوئی مزاحم نہیں۔ ہم وہاں سے رخصت ہو کر بابری آئے اور بعد چندے سونی پت چلے گئے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ بعد سیر امصار و دیار کے ہم نے سونی پت آکر میر **اعظم علی شاہ** صاحب قبلہ کے مزار پر چھ مہینے تک قیام کیا۔ وہاں مولوی **محب اللہ** صاحب پانی پتی سے ملاقات ہوئی۔ ہم نے کہا کہ مولوی صاحب کسی فقیر کامل کی خبر دو۔ انھوں نے کہا کشمیر میں سیّد احمد **شاہ** صاحب نہایت کامل و آزاد منش درویش ہیں۔ میرا بھی جانے کا ارادہ ہے، اگر آپ کا عزم ہو تو باتفاق چلے چلیں۔ ہم نے کہا کہ پہلے اپنے حال کا ایک عریضہ لکھ کر ہم آپ کو دیتے ہیں جو کچھ اُس کا جواب آئے گا اُس پر عمل کیا جائے گا۔ چنانچہ مولوی صاحب عریضہ لے گئے۔ جس کا جواب شاہ صاحب نے یوں تحریر فرمایا کہ میں تو اس قابل نہیں ہوں، ہاں! اگر آپ تشریف لائیں تو شاید آپ کی ذات سے مجھ کو کچھ فائدہ ہو جائے۔ اس کے بعد ہم نے مصمم ارادہ کر لیا کہ پچیس روپیہ جمع ہو جائیں تو چل دیں، مگر یہ کیونکر ہوتا۔ **شعر**

قرار در کفِ آزادگاں نہ گیرد مال ۔۔۔ نہ صبر در دلِ عاشق نہ آب در غربال

ایک مدت کے بعد کچھ روپیہ جمع ہوا تو قصدِ کشمیر کیا۔ سونی پت سے چل کر بستم شعبان ۱۲۷۰ھ ہجری کو پانی پت پہونچے نو دس دن ماہِ صیام میں باقی تھے۔ دل میں آیا کہ یہ ایام یہیں بسر کریں۔ رمضان شریف کی پانچویں تاریخ تھی کہ مولوی **محب اللہ** صاحب اور منشی **فضل رسول صاحب** کا خط آیا کہ سید احمد شاہ صاحب اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے **اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ**۔ یہ خبر پا کر ہم نے ارادہ ملتوی کیا اور قلندر صاحب کے حُجرے میں رہنے لگے۔ مشیت ایزدی یہی تھی کہ پانی پت میں قیام ہو۔

بابِ چہارم

در بیانِ توحید

تمہید

توحید ایسا مسئلہ ہے جو کبھی نسخ پذیر نہیں ہوا۔ ہر ایک دین وملت میں اس کی شہادت موجود ہے۔ کوئی قوم پردۂ زمین پر ایسی نہیں جس میں خدا کی یگانگی کے تسلیم کرنے والے نہ ہوں۔ جملہ انبیاء، واولیاء اور ہادیانِ راہِ خُدا، خواہ کسی سرزمین اور کسی زمانہ میں ہوئے ہوں۔ اُن کی تعلیم وتلقین کی بنیاد اِسی لازوال مسئلہ پر ہے۔ یہی مسئلہ اسلام کا رُکن اور ایمان کی کلید ہے۔ یہی معلوماتِ ظاہر کا قبلہ اور یہی مکشوفاتِ باطن کا کعبہ ہے۔ یہی شریعت اور طریقت کی جان ہے۔ یہی حقیقت ومعرفت کی نردبان ہے۔ یہی جُملہ طاعات کا راس اور یہی حکمت کی اساس ہے۔ طبعی، ریاضی، الٰہی، سب کے سلسلے اِسی پاک مسئلہ سے شروع اور اِسی پر ختم ہوتے ہیں۔ اِس کی تصدیقِ دعوتِ عام ہے۔ اور اسی کی تحقیق ضیافتِ خاص ہے۔ یہی مسئلہ ایسا سہل اور ایسا آسان ہے کہ عوام الناس کا وِردِ زبان ہے۔ اور یہی ایسا دقیق ہے کہ جس کی تحقیق میں خواص کی عقل بھی حیران وسرگردان ہے۔ چونکہ اکثر کلام حضرت مولانا ومرشدنا کا دربابِ توحید پر مشتمل تھا جیسا کہ ارشادات سے جو بابِ آئندہ میں مذکور ہیں، ظاہر ہوگا۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوا کہ اول کچھ بیان توحیدِ باری عزّ اسمہٗ کا تحریر کیا جائے تاکہ سالکانِ طریق وطالبانِ تحقیق کو اِن نکات وارشادات سے جو بابِ ارشادات میں اُن کی نظر سے گذریں گے حظِ وافی حاصل ہو۔

تعریف وتقسیمِ توحید

توحید کے معنی ہیں شے کے واحد ہونے پر حُکم کرنا۔ اور شے کے واحد ہونے کا

علم بھی توحید ہے۔ اکابرِ صوفیہ نے طرح طرح سے اُس کی توزیع و تقسیم کی ہے، جیسا جس کو علم و انکشاف ہوا اُس کے موافق بیان فرمایا۔

(۱) ایک قول یہ ہے کہ توحید کی چار قسمیں ہیں۔

اوّل توحیدِ شریعت۔ یعنی اس بات کا یقین کرنا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے قدیم ہے، اپنی حیات سے حیؔ، اپنے سمع سے سمیع، اپنے بصر سے بصیر، اپنے کلام سے کلیم، یہ توحیدِ ظاہری ہے۔ خواہ تقلیدًا ہو خواہ بدلائل عقلی و نقلی۔

دوّم توحیدِ طریقت۔ یعنی حق تعالیٰ کی وحدانیت شواہدِ اکوان و امکان میں نورِ ایمان سے ملاحظہ کرکے واجب الوجود کا اثبات کرنا۔ اِضافتِ جمیع موجودات کو معدوم سمجھنا ہستی، جمیع موجودات کو ذاتِ واحد میں دیکھنا۔ اس میں تقلید و استدلال کی حاجت نہیں۔ ؎

ہر کہ بیند مسبّب را عیاں کے نہد دل بر سببہائے جہاں

اس توحید کے تین مراتب ہیں۔ **پہلا توحیدِ افعالی**۔ یعنی جملہ موجودات کو افعالِ خدا سمجھنا **دوسرا توحیدِ صفاتی**۔ یعنی صفاتِ جملہ موجودات کو صفاتِ خدا سمجھنا **تیسرا توحید ذاتی** یعنی وجودِ جملہ موجودات کو وجودِ باری تعالیٰ یقین کرنا۔ اور مؤثرِ حقیقی و موجودِ اصلی ذاتِ حق کے سوائے دوسرے کو نہ جاننا۔

سوّم توحیدِ حقیقت۔ یعنی نفی غیریت یہاں تک کہ اپنے وجود کا ادراک بھی نفی ہو جائے اور تعیناتِ موجودات بھی فنا۔ ہستیٔ حق کے سوا کچھ باقی نہ رہے۔ اپنے اور نیز جملہ موجودات کے وجود میں حق کو مشاہدہ کرے۔ اس توحید میں ۹ مراتب ہیں۔

اوّل مرتبۂ انفسی۔ یعنی اللہ تعالیٰ بہ کمالِ اقربیّت، مطابق آیت وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ ذاتِ عارف میں تجلّی فرماتا ہے اور نفس و عقل نورِ الٰہی میں فنا ہو جاتے ہیں۔ اس حالت میں سُبْحَانِي مَا أَعْظَمَ شَانِي اور أَنَا الْحَقُّ بے اختیار سرزد ہوتا ہے۔

دوّم مرتبۂ آفاقی۔ یعنی حق سبحانہ تعالیٰ موافق آیۂ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عارف کی نظر میں متجلّی ہوتا ہے اور وجودِ جملہ موجودات واحد نظر آتا ہے۔ اُس وقت ہمہ اوست

کا نعرہ دلِ عارف سے نکلتا ہے۔

سوئم مرتبہ اسمائی۔ یعنی عارف بکثرت ذکر الٰہی کرتا ہے اور ہر اسم کے رنگ میں اسی ذاتِ پاک کو متجلی دیکھتا ہے۔ اور ذکر سلطان الاذکار وجودِ عارف میں ظاہر ہوتا ہے اور غیریت بالکل مفقود ہو جاتی ہے۔ شعر

بنامِ آں کہ او نامے نہ دارد ٭ بہر نامے کہ خوانی سر برآرد

چہارم مرتبہ صفاتی۔ یعنی اللہ تعالےٰ سالک کے اعضائے حسی سمع و بصر وغیرہ پر تجلی فرماتا ہے۔ اور بِیْ یَسْمَعُ وَبِیْ یُبْصِرُ کی کیفیت طاری ہوتی ہے ؎

نیست گشتم من زہستی ہائے تو ٭ من بروں رفتم دروں شد جائے تو

پنجم مرتبہ تمثیلی۔ یعنی سالک کو ہر فردِ موجودات جُدا گانہ عینِ حق نظر آتا ہے اور اس مقام میں سجدۂ بُت عین سجدۂ خُدا ہے۔ ع

نہ دیدم غیر تو در کعبہ و دیر

ششم مرتبہ شیونائی۔ یعنی اللہ تعالےٰ عارف پر بہ تجلیٔ افعال متجلی و ظاہر ہوتا ہے اور افعالِ موجودات عینِ افعالِ حق نظر آتے ہیں یَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَیَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ اس مقام میں دہندہ و کشندہ دونوں برابر ہیں لیکن ادراک رنج و راحت باقی رہتا ہے۔

ہفتم مرتبہ شہودی۔ یعنی اللہ تعالیٰ عارف پر اس طرح تجلی فرماتا ہے کہ حجابِ ظلمانی رفع اور کیفیت نورانی منکشف ہو جاتی ہے اور معرفتِ بے کیف و مشاہدۂ مدام میں مستغرق رہتا ہے۔ اس مقام میں وجودِ رنج و راحت کچھ باقی نہیں رہتا۔

ہشتم مرتبہ وجودی۔ یعنی تجلیٔ وجودِ الٰہی میں ہستیٔ سالک اس طرح فنا ہو جاتی ہے جیسے نورِ چراغ ضیاءِ آفتاب میں۔ اِس مقام میں سالک مثل جماد اپنے حرکات و سکنات سے محض بے خبر ہو جاتا ہے۔ اور اس حالت میں امتیازِ مشاہدہ و مشہود بھی کُفر ہے۔

نہم مرتبہ تنزیہی۔ اس مرتبہ میں جملہ کائنات کی ہستی پر توِ انوارِ الٰہی میں ایسی فنا ہو جاتی ہے کہ نظرِ سالک میں اصلاً نہیں آتی۔ جب اس دریائے ناپیدا کنار کا شناور صفاتِ موجودات کی تجلیات سے فناءِ کلی حاصل کرتا ہے اور حدوث و امکان کی آلائش سے

مُجرّد ہو جاتا ہے تو ایک موج قعرِ دریائے ذات سے سرِّ خفی پر وارد ہوتی ہے، جو عارف کو ورطۂ عدم میں ڈال دیتی ہے محو در محو اور فنا در فنا ہو جاتا ہے۔ اس مقام میں نہ وجود نہ شہود نہ اسم نہ مسمّٰی نہ قدم نہ عدم نہ فرش نہ عرش نہ اثر نہ خبر نہ علمِ خود نہ علمِ حق، غرض کچھ باقی نہیں رہتا ہے لِیْ مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ لَا یَسَعُنِیْ فِیْہِ مَلَکٌ مُقَرَّبٌ وَلَا نَبِیٌّ مُرْسَلٌ دریائے جمع الجمع میں مستغرق ہو جاتا ہے اس وقت مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے ؎

ہست از پسِ پردہ ایں صدائے من و تو　　چوں پردہ بر افتد نہ تو مانی و نہ من

(۴) چہارم توحیدِ معرفت۔ اسی کو توحیدِ ازلی، ذاتی، قدیمی اور الٰہی بھی کہتے ہیں۔ جس وقت عارفِ کامل مقامات و مراتب سیر الی اللہ و فی اللہ و مع اللہ سے عروج کر کے مقامِ عین الجمع و جمع الجمع میں پہونچتا ہے جو کہ انتہائے مراتب توحید سے ہے۔ اُس وقت اپنے آپ کو عدمِ محض پاتا اور خودی سے بے خود ہو جاتا ہے۔ جیساکہ پیش از ترکیب اجزاءِ جسمی بصورِ اعیانِ ثابتہ، علمِ قدیم میں موجود تھا۔ اسی حالت کا بیان ہے اس آیت شریف میں۔ ھَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّھْرِ لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا۔ ترجمہ آیا انسان پر وقتوں میں سے کوئی وقت گذرا ہے کہ وہ ایسی چیز نہ تھا جس کا ذکر کیا جائے یعنی ایک وقت انسان کے لیے ایسا تھا کہ وجودِ خارجی تو کیا وجودِ ذہنی و لفظی بھی نہ رکھتا تھا۔ روایت ہے کہ حضرت عمر فاروق اس آیت کو قاری سے سنتے تو فرماتے یَا لَیْتَھَا تَمَّتْ یعنی کاش یہ حالت پوری ہو جائے۔ یعنی جہاں سے ہم نے سفر کیا ہے وہیں جا پہونچیں اور کثرتِ وحدت میں گم ہو جائیں۔

(۲) ایک قول یہ ہے کہ توحید کے لیے ظاہر، باطن اور حقیقت ہے۔ ظاہرِ توحید تو اسلام ہے۔ اور باطنِ توحید ایمان۔ اور حقیقتِ توحید تقویٰ اور عملِ صالح۔ پس اسلام کی صحت ایمان سے ہے اور ایمان کی صحت تقویٰ اور عملِ صالح سے۔

(۳) ایک قول یہ ہے کہ توحید کے تین مراتب ہیں۔ اوّل تو افعال یعنی افعال و مفعولاتِ کُل کو باوجود کثرت و اختلاف کے، اللہ تعالےٰ کی طرف منسوب کرنا جیساکہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ

اللہُ رَمیٰ ۔ قُلْ کُلٌّ مِنْ عِنْدِ اللہِ ۔

دوم توحیدِ صفات ۔ یہ علم قلب ہے ۔ عبارت میں نہیں آسکتا اور جو شخص گمان کرے کہ یہ علم کتابوں سے پورا ہو سکتا ہے ۔ وہ ناقص المعرفت ہے ۔

سوم توحیدِ ذات ۔ علم صفات عارفین کے سوائے کسی کو حاصل نہیں ہوتا ہے ۔ البتہ جس نے توحیدِ افعال سے توحیدِ صفات کی طرف ترقی کی ہے اُس کی نسبت یہ توقع ہو سکتی ہے کہ اگر خدا کو منظور ہو تو توحیدِ ذات کا علم اُس کو ہو جائے اور جو کوئی بغیر اس طریقہ کے مرتبۂ ذات میں تکلیف کرے گا، وہ تشبیہ واتحاد میں جا پڑے گا ۔ اس واسطے حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تَفَکَّرُوْا فِیْ خَلْقِ اللہِ وَلَا تَفَکَّرُوْا فِیْ ذَاتِ اللہِ تَعَالیٰ ۔ اس مقام کے علم کا طریق فکر فی الافعال اور نظر و استدلال ہے کیونکہ افعال صفات سے صادر ہوتے ہیں ۔ اور وہ صفات کی رہنمائی کرتے ہیں جو قائم بالذات ہے ۔

(۴) امام محمد غزالی فرماتے ہیں کہ توحید اصل ایمان ہے اور اس میں کلام طویل ہے ۔ کیونکہ یہ علم مکاشفہ ہے ۔ ہم تھوڑا سا بیان کرتے ہیں ور نہ توحید ایک دریائے ناپید اکنار ہے نہ اس کی ابتدا ہے نہ انتہا ۔ توحید کے چار مراتب ہیں ۔ ایک مغز، دوسرا مغز کا مغز، تیسرا پوست، چوتھا پوست کے اوپر کا پوست ۔ اور کم فہموں کے سمجھانے کو ہم ایک مثال فرض کرتے ہیں کہ توحید کو ایک اخروٹ سمجھو جس پر دو چھلکے ہوتے ہیں اور اندر ایک مغز اور مغز میں روغن ۔ پس توحید کا مرتبۂ اول یہ ہے کہ آدمی اپنی زبان سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کہے مگر دل اس سے غافل ہو، یا منکر، مثل منافقین کے ۔ مرتبۂ دوم یہ ہے کہ اس کلمہ کے معنی کو دل سے سچ جانتا ہو جیسے عوام مسلمان اس کی تصدیق کرتے ہیں ۔ مرتبۂ سوم یہ ہے کہ بذریعہ نورِ حق یہ معنی کشف کے طور پر مشاہدہ ہو جائیں ۔ یہ مقام مقربین کا ہے ۔ اور اس کا حال یہ ہے کہ اشیا کو کثیر تو جانتا ہے مگر باوجود کثرت ان کو اللہ کی طرف سے سمجھتا ہے ۔ مرتبۂ چہارم یہ ہے کہ جملہ موجودات کے وجود میں بجز ذاتِ واحدِ یکتا کے اور کسی کو نہ دیکھے ۔ ؎

چو سلطانِ عزت علم بر کشد جہاں سر بجیبِ عدم در کشد

اور یہ مرتبہ صدیقین کا ہے ۔ اسی کو صوفیۂ کرام فنا در توحید کہتے ہیں ۔

(۵) ایک قول یہ ہے کہ توحید کے چار مراتب ہیں۔

اوّل توحیدِ ایمانی ۔ وہ یہ ہے کہ بہ مقتضائے اشارۂ آیات و اخبار دل سے سچ جانے اور زبان سے اقرار کرے کہ اللہ تعالےٰ اپنے اوصاف میں فرد اور استحقاقِ عبودیت میں واحد ہے۔

دوم توحیدِ علمی ۔ وہ علم الیقین سے حاصل ہوتی ہے۔ از راہِ یقین یہ جان لے کہ موجودِ حقیقی اور مؤثرِ مطلق خداوندِ عالم کے سوا کوئی نہیں ہے۔ جملہ ذات و صفات و افعال اللہ تعالےٰ کی ذات و صفات و افعال میں محو ہیں۔ جہاں کہیں علم و قدرت و ارادت و سمع و بصر پائے جاتے ہیں، یہ صفاتِ مطلق کے پر تو ہیں۔

سوم توحیدِ حالی ۔ وہ ہے کہ جمالِ واحد کے مشاہدہ میں اپنی ہستی پر نظر نہ رہے۔ یہاں تک کہ توحید کو واحد کی صفت دیکھے بلکہ دید کو بھی اُس کی صفت سمجھے اور اسی طریقہ سے غرقِ جمع ہو جائے۔

چہارم توحیدِ الٰہی ۔ وہ ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ ازل الازال میں جو صفِ وحدانیت و فردانیت موصوف تھا۔ اپنے آپ نہ کسی دوسرے کی توحید سے کَانَ اللّٰہُ وَلَمْ یَکُنْ مَعَہٗ شَیْءٌ وَالْاٰنَ کَمَا کَانَ اور ابدالآباد تک اُسی وصف پر رہے گا کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ یعنی ہستیٔ اشیا اُن کی ہستی میں آپ ہی نیست و نابود ہے۔ یہ ایسی توحید ہے کہ نقصان سے بری ہے اور یہی توحید حق ہے۔

(۶) **توحید کی قسمیں** ۔ وجودی۔ شہودی اور عینی و ظلّی بھی مشہور ہیں۔ ہر چند کہ یہ مسائل کشفِ باطن اور وجدان سے تعلق رکھتے ہیں مگر ظاہر عبارت میں اس کی تقریر اس طرح لکھی ہے کہ وجود یعنی ہستیٔ حقیقی واحد ہے۔ لیکن ایک ظاہر وجود ہے اور ایک باطن۔ باطن وجود ایک نور ہے جو عالم کے لیے بمنزلہ جان کے ہے اسی نور باطن کا پرتو ظاہر وجود ہے جو ممکنات کی صورت میں نظر آتا ہے۔ ہر اسم و صفت و فعل کہ عالم ظاہر میں ہے۔ ان سب کی اصل وہی وصفِ باطن ہے۔ اور حقیقت اس کثرت کی وہی وحدتِ صرف ہے جیسے امواج کی حقیقت عینِ ذاتِ دریا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جملہ افرادِ کائنات تجلّیات حق ہیں — سُبْحَانَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَشْیَاءَ وَهُوَ عَیْنُهَا ۔ اور اس کثرتِ اعتباری کا وجود اُسی وحدتِ حقیقی

سے ہے۔ اَلْحَقُّ مَحْسُوْسٌ وَالْخَلْقُ مَعْقُوْلٌ۔ یہ خلاصہ وحدت الوجود کی تقریر کا ہے۔ اور وحدتِ شہود کا بیان یہ ہے کہ وجودِ کائنات اور ظہورِ آثار وصفاتِ مختلفہ واحدِ مطلق کی ذات وصفات کا ظِل وعکس ہے۔ جو عدم میں منعکس ہو رہا ہے۔ اور یہ ظِل عینِ صاحبِ ظِل نہیں ہے بلکہ محض ایک مثال ہے۔

آیات واحادیث دربارۂ توحید

آیات (۱) وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝ اور تمہارا رب اکیلا رب ہے کسی کو پوجنا نہیں اُس کے سوائے۔ بڑا مہربان ہے رحم والا (۲) اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝ اللہ اُس کے سوائے کسی کی بندگی نہیں۔ جیتا ہے۔ سب کا تھامنے والا۔ (۳) شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ اللہ نے گواہی دی کہ کسی کی بندگی نہیں اُس کے سوائے۔ اور فرشتوں نے اور علم والوں نے۔ وہی حاکم ہے انصاف کا کسی کی بندگی نہیں اُس کے سوا۔ زبردست ہے حکمت والا۔ (۴) وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۝ اور بندگی کسی کو نہیں مگر ایک معبود کو۔ (۵) قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۝ تو کہہ کہ میں بھی ایک آدمی ہوں جیسے تم۔ حکم آتا ہے مجھ کو کہ تمہارا صاحب ایک صاحب ہے۔ (۶) اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۝ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا۔ تمہارا صاحب وہی اللہ ہے جس کے سوا بندگی نہیں کسی کی۔ سما گئی ہے سب چیز اُس کے علم میں۔ (۷) لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ اگر ہوتے اِن دونوں میں اور حاکم سوائے اللہ کے تو دونوں خراب ہوتے سو پاک ہے اللہ تخت کا صاحب، اِن باتوں سے جو بتاتے ہیں۔

لہ ۲ پارہ ۔ ۱ رکوع ۱۲ ؎۲ ۳ پارہ ۔ ۲ ع ۱۲ ؎۳ ۳ پارہ ۱۰ ع ۱۱ ؎۴ ۶ پارہ ۱۳ ع ۱۲ ؎۵ ۱۶ پارہ ۳ ع ۱۲ ؎۶ ۱۶ پارہ ۱۳ ع ۱۲ ؎۷ ۱۷ پارہ ۳ ع ۱۲

(٨) قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰى اِلَىَّ اَنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ تو کہہ مجھ کو تو حکم یہی آیا ہے کہ
صاحب تمہارا ایک صاحب ہے۔ (٩) وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ
لَهٗ بِهٖ اور جو کوئی پکارے اللہ کے ساتھ دوسرا حاکم جس کی سند نہیں اُس کے پاس۔
(١٠) فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ۚ سو تو مت پکار اللہ
کے ساتھ دوسرا حاکم۔ پھر پڑے تو عذاب میں۔ (١١) وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ
لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ۚ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۚ
اور مت پکار اللہ کے سوا اور حاکم کسی کی بندگی نہیں اُس کے سوا۔ ہر چیز فنا ہے
مگر اُس کا منہ اُسی کا حکم ہے اور اُسی کی طرف پھر جاؤ گے۔ (١٢) هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ
لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۚ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ
لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ
سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۚ وہ اللہ ہے جس کے سوائے بندگی نہیں کسی کی۔
جانتا ہے چھپا اور کھلا۔ وہ ہے بڑا مہربان، رحم والا، وہ اللہ ہے جس کے
سوائے بندگی کسی کی نہیں وہ بادشاہ ہے پاک ذات، چنگا، امان دیتا، پناہ میں لیتا،
زبردست دباؤ والا، صاحب بڑائی کا، پاک ہے اللہ، اُس سے جو شریک بتاتے ہیں۔
(١٣) قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا
اَحَدٌ ۚ تو کہہ وہ اللہ ایک ہے اللہ نرادھار ہے۔ نہ کسی کو جنا نہ کسی سے جنا گیا اور نہیں
اُس کی جوڑ کا کوئی۔

احادیث مشتمل بر توحید۔ (١) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ كَذَّبَنِيْ ابْنُ اٰدَمَ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ ذٰلِكَ وَشَتَمَنِيْ
وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ ذٰلِكَ فَاَمَّا تَكْذِيْبُهٗ اِيَّايَ فَقَوْلُهٗ لَنْ يُّعِيْدَنِيْ كَمَا بَدَاَنِيْ وَلَيْسَ
اَوَّلُ الْخَلْقِ بِاَهْوَنَ عَلَيَّ مِنْ اِعَادَتِهٖ وَاَمَّا شَتْمُهٗ اِيَّايَ فَقَوْلُهٗ اتَّخَذَ اللّٰهُ

ف٨ ١٦ پارہ-١٣ رکوع ١٢ ف٩ ١٨ پارہ-٦ ع ١٢ ف١٠ ١٩ پارہ-١٩ رکوع ١٢ ف١١ ٢٠ پارہ-١٢ ع ١٢
ف١٢ ٢٨ پارہ-سورۂ حشر ١٢ ف١٣ ٣٠ پارہ سورۂ اخلاص ١٢-

وَلَدًا وَ اَنَا الاَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِیْ لَمْ اَلِدْ وَلَمْ اُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لِیْ کُفُوًا اَحَدٌ وَ فِیْ رِوَایَۃِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَ اَمَّا شَتْمُہٗ اِیَّایَ فَقَوْلُہٗ لِیْ وَلَدٌ وَ سُبْحَانِیْ اَنْ اَتَّخِذَ صَاحِبَۃً اَوْ وَلَدًا ۔ رَوَاہُ البُخَارِیْ ترجمہ روایت ہے ابوہریرہؓ سے کہ کہا فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے جھٹلاتا ہے مجھ کو بیٹا آدم کا اور نہیں لائق اُس کو یہ اور بُرا کہتا ہے مجھ کو اور نہیں لائق اُس کو یہ پس جھٹلانا اُس کا مجھ کو پس کہنا اُس کا کہ ہرگز زندہ نہ کرے گا مجھ کو بعد مرنے کے جیسا کہ پیدا کیا ہے پہلی بار اور نہیں پیدا کرنا مجھ پر سہل تر پھر زندہ کرتے اُس کے سے اور لیکن بُرا کہنا اُس کا مجھ کو پس کہنا اُس کا ٹھہرایا اللہ نے بیٹا اور حال یہ ہے کہ میں ایک ہوں بے پرواہ وہ ذات کہ نہ جنا میں نے اور نہ جنا گیا اور نہیں واسطے میرے ہم قوم کوئی اور ابن عباسؓ کی روایت میں یوں ہے کہ بُرا کہنا اُس کا مجھ کو پس کہنا اُس کا واسطے میرے فرزند ہے اور پاک ہوں میں اس بات سے کہ ٹھہراؤں میں کسی کو جورو یا فرزند۔ روایت کیا اس کو بخاری نے۔

(۲) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ اَتَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَعَلَیْہِ ثَوْبٌ اَبْیَضُ وَھُوَ نَائِمٌ ثُمَّ اَتَیْتُہٗ وَقَدِ اسْتَیْقَظَ فَقَالَ وَمَا مِنْ عَبْدٍ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ثُمَّ مَاتَ عَلٰی ذٰلِکَ اِلَّا دَخَلَ الْجَنَّۃَ قُلْتُ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ قَالَ وَاِنْ زَنٰی وَ اِنْ سَرَقَ قُلْتُ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ قَالَ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ قُلْتُ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ قَالَ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ عَلٰی رَغْمِ اَنْفِ اَبِیْ ذَرٍّ۔ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ۔

روایت ہے ابی ذرؓ سے کہا آیا میں پاس نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے اور حضرت پر کپڑا تھا سفید اور وہ سوتے تھے پھر گیا میں پھر آیا میں اُس وقت میں کہ جاگے تھے پس فرمایا کہ نہیں کوئی بندہ کہ کہے نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے پھر مرے اسی پر مگر کہ داخل ہوگا جنت میں۔ کہا میں نے اگرچہ زنا کرے اور چوری۔ فرمایا اگرچہ زنا کرے اور چوری۔ کہا میں نے اگرچہ زنا کرے اور چوری۔ فرمایا اگرچہ زنا کرے اور چوری۔ کہا میں نے اگرچہ زنا کرے اور چوری۔ فرمایا اگرچہ زنا کرے اور چوری اوپر خاک آلودہ ہونے ناک ابی ذرؓ کے۔ روایت کی بخاری اور مسلم نے۔

(۳) وعن عُثْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ مَّاتَ وَھُوَ یَعْلَمُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ رَوَاہُ مُسْلِمٌ اور روایت ہے حضرت عثمانؓ سے کہا فرمایا ہے رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے جو کوئی مرے اور وہ یہ جانتا ہو کہ تحقیق سوائے خدا تعالےٰ کے کوئی معبود نہیں داخل ہوگا بہشت میں روایت کی یہ مسلم نے

(۴) مسلم نے ایک لمبی حدیث بیان کی ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضرت رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم ہمارے مجمع میں سے اُٹھ کر باغ بنی بخار میں تشریف لے گئے میں بھی ڈھونڈھتا ہوا پہونچا ہر چند دروازہ باغ تلاش کیا نہ ملا نالی کی راہ باغ میں داخل ہوا آپ نے فرمایا اے ابو ہریرہ ہماری دو پاپوشیں لے جاؤ مَنْ لَقِیَکَ مِنْ وَّرَآءِ ھٰذَا الْحَائِطِ یَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُسْتَیْقِنًا بِھَا قَلْبُہٗ فَبَشِّرْہُ بِالْجَنَّۃِ فَکَانَ اَوَّلَ مَنْ لَقِیْتُ عُمَرُ۔ الخ پس جو ملے تجھ سے پیچھے اس باغ کے گواہی دیتا ہو اس کی کہ نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے یقین رکھتا ہو ساتھ اس کے دل اُس کا پس بشارت دے اُس کو بہشت کی پس سب سے پہلے مجھ سے حضرت عمرؓ ملے الخ۔

(۵) کَانَ اللّٰہُ وَلَمْ یَکُنْ مَّعَہٗ شَیْءٌ رواہ البخاری۔ تھا اللہ اور نہ تھی ساتھ اُس کے کوئی شے۔ روایت کی یہ بخاری نے۔ وَالْاٰنَ کَمَا کَانَ اور اب بھی وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ تھا۔

(۶) وعن مَعَاذِ ابْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَفَاتِیْحُ الْجَنَّۃِ شَھَادَۃُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ رَوَاہُ اَحْمَدُ روایت ہے معاذ ابن جبل سے کہا فرمایا میرے واسطے رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے کنجیاں بہشت کی گواہی دینا اس کا ہے کہ نہیں کوئی معبود سوائے خدا کے۔ روایت کی احمد نے۔

(۷) وعن وَھْبِ بْنِ مُنَبِّہٍ قِیْلَ لَہٗ اَلَیْسَ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مِفْتَاحُ الْجَنَّۃِ قَالَ بَلٰی وَلٰکِنْ لَیْسَ مِفْتَاحٌ اِلَّا وَلَہٗ اَسْنَانٌ فَاِنْ جِئْتَ بِمِفْتَاحٍ لَہٗ اَسْنَانٌ فُتِحَ لَکَ وَاِلَّا لَمْ یُفْتَحْ لَکَ رواہ البخاری اور روایت ہے وہب بیٹے منبہ کے سے کہ کہا گیا واسطے وہب کے کیا نہیں ہے لا الٰہ الا اللہ کنجی بہشت کی کہا کہ ہاں ضرور ہے لیکن نہیں ہوتی کنجی مگر واسطے اس کے ہوتے ہیں دندانے پس اگر لاوے تو کنجی کو کہ اُس کے دندانے ہیں

کھولا جائے واسطے تیرے اور اگر نہ لایا اس طرح کی کنجی نہ کھولا جائے گا واسطے تیرے۔ روایت کی یہ بخاری نے۔ دندانوں سے مراد یہاں اقرار زبان اور تصدیق قلب ہے۔

مقالاتِ اہلِ توحید

(۱) حضرت جُنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: "علمِ توحید اُس کے وجود سے جُدا ہے۔ اور اُس کا وجود علم سے الگ۔ توحید کیا ہے؟ خدا کا جاننا۔ اور اُس کے قِدَم کو حُدوث سے پہچاننا۔ اور توحید کی غایت توحید کا انکار ہے۔"

(۲) حضرت ابوبکر واسطی کا قول ہے: "راہِ حق میں خلق نہیں اور راہِ خلق میں حق نہیں۔ ایک تو شرعِ توحید ہے اور ایک حقِ توحید۔ شرعِ توحید کا گذر نبوت کے دریا میں ہے۔ اور حقِ توحید بحرِ محیط ہے۔ شرع کی راہ آلات پر ہے یعنی سمع، بصر، قال، شناخت، حال اور یہ سب اثبات چاہتے ہیں۔ اور تیرا اثبات شرک کی نسبت رکھتا ہے۔ اور وحدانیت شرک سے مُنزّہ ہے۔ ایمان جو چلتا ہے تو شرک کی بھیڑ بھاڑ میں چلتا ہے۔ اور ایمان بڑی چیز ہے، مگر بے شرک کے بنتی نہیں۔ شرعِ توحید مانندِ چراغ ہے اور حقِ توحید مثلِ آفتاب۔ پس جہاں آفتاب چمکا نورِ چراغ عالمِ عدم کو کھسکا۔ وہ ایک موجود ہے مگر عدم میں۔ اور نورِ چراغ کو نورِ آفتاب پر کچھ حکومت نہیں۔ شرعِ توحید نسخ پذیر ہے لیکن حقِ توحید نسخ پذیر نہیں۔ زبان نسخ پذیر ہے۔ دل سے منسوخ ہو جاتی ہے۔ اور جب کہ مرد مقامِ دل میں پہونچتا ہے تو زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ اور جان سے دل منسوخ ہو جاتا ہے۔ اور اُس وقت جو بولتا ہے مِنْهُ اِلَيْهِ (اُسی سے اُسی کی طرف) ہوتا ہے اور یہ گفتگو عین میں نہیں ہے۔ بلکہ صفت میں ہے۔ صفت بدل جاتی ہے اور عین نہیں بدلتا۔ جب پانی پر دھوپ پڑی وہ گرم ہو گیا۔ صفت بدل گئی عینِ آب میں کچھ فرق نہیں پڑا۔ کسی کا وجود توحید کی شناخت کو قبول نہیں کرتا۔ اور کس کی مجال ہے کہ صحرائے وجود میں قدم رکھے۔ چنانچہ بزرگوں نے کہا ہے اِثْبَاتُ التَّوْحِيْدِ فَسَادٌ فِي التَّوْحِيْدِ یعنی توحید کا ثابت کرنا ہی توحید میں خرابی ہے۔ جو شخص اپنے ہوتے اُس کی ہستی کا خطبہ پڑھتا ہے وہ اپنے شرک پر گواہی دیتا ہے۔ اور جو شخص اُس کے ہوتے

اپنی ہستی کا خطبہ پڑھتا ہے وہ اپنے کفر پر مُہر کرتا ہے۔ اور جو اُس کی ہستی کے سامنے اپنی ہستی دیکھتا ہے، کافر ہے۔ اور جو اُس کے ہوتے اپنی ہستی ڈھونڈھتا ہے اُسے پہچان نہیں جس نے آپ کو دیکھا اُس کو نہیں دیکھا۔ اور جس نے اُس کو دیکھا، اپنے آپ کو نہ دیکھا۔ اور اپنی یاد نہ رہی عبارت شنود۔ اور دانست محرمِ راہِ توحید نہیں خیال اور وہم اور گمان گردِ حدوث میں اٹے ہوئے ہیں۔ اور توحید اپنے عالمِ قدس میں کشف و شنید سے پاک ہے۔ عبارت و اشارت و دید و صورت و خیال و حس و حیات یہ سب لوثِ بشریت رکھتے ہیں۔ اور شناختِ توحید لوثِ بشریت سے پاک ہے۔ اسرارِ مشائخ روضۂ توحید ہیں، نہ عینِ توحید۔ یہ خلفت قدرت میں نمودار ہے۔ اور توحید میں لیامیٹ۔ اپنا انکار بھی ناممکن ہے کیونکہ قدرت کا انکار ہے اور اپنے تئیں ثابت نہیں کر سکتے کہ اس میں توحید کا بگاڑ ہے۔ نہ صورتِ اثبات ہے، نہ صورتِ نفی۔ مثبت بھی ہے اور منفی بھی۔ قدرت تجھ کو دکھاتی ہے اور وحدانیت مٹاتی ہے۔ راہِ حق میں نیست ہو جانا بہتر ہے، بہ نسبت اس کے کہ تجرید اور توحید پر نظر ہو اور وہاں منزل ہو، یا وقوف ہو، یا اس کو اپنا مشرب بنالے۔

حضرت ابوبکر شبلی نے سوال اصحاب کے جواب میں فرمایا جو کوئی عبارت میں توحید کی خبر دے وہ مُلحد ہے۔ اور جو کوئی اُس کی طرف اشارہ کرے وہ ثنوی[1] ہے اور جو ایما کرے وہ بُت پرست اور جو اُس کی بات چیت کرے وہ غافل اور جو اُس سے چُپ رہے وہ جاہل۔ اور جس کو گمان ہو کہ وہ اُس تک پہونچا اور کچھ حاصل ہوا وہ بے حاصل ہے۔ اور جو نزدیکی کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ دور ہوتا ہے۔ اور جو آپ سے پاتا ہے وہ گم گشتہ ہے۔ اور جو کچھ وہم سے ٹٹولے یا عقل سے تولے وہ سب گھڑت ہے، جیسے تم خود ہو۔ توحید موحِد کے لیے جمالِ اَحدیت کا حجاب ہے۔ توحید اس لیے ٹھیک نہیں ہوتی کہ تم اُس کو آپ سے طلب کرتے ہو۔

حضرت محی الدین ابنِ عربی نے لکھا ہے کہ اگر تو بالتنزیہ کہتا ہے تو قید لگاتا ہے۔ اور جو بالتشبیہ کہتا ہے تو محدود کرتا ہے۔ ہاں جو دونوں میں کہتا ہے تو یہ ٹکی بات ہے

---

[1] جو دو خدا مانتا ہو ۱۲۔

جو دو کہتا ہے وہ مشرک ہے اور جو فرد کہتا ہے وہ موحد۔ پس تشبیہ سے بیچ اگر تو دوسرا بھی مانتا ہے اور تنزیہ سے بیچ اگر الگ جانتا ہے پس تو وہ نہیں ہے تو عین وہی ہے اور تو اُس کو عینِ امور میں مشروح و مُقیّد دیکھتا ہے۔

بعض نے فرمایا (۱) کہ توحید کے واسطے زبان نہیں کیونکہ کوئی مخاطب نہیں۔ (۲) جس نے اُس کے ذریعہ سے توحید کی تو اُس کی توحید نہیں کی اور جس نے اپنے ذریعہ سے کی تو اپنے نفس کی توحید کی (۳) توحید میں ہوں اور متکلّم حق۔ (۴) توحید یہ ہے کہ تو اُس میں غائب ہو جائے یا وہ تجھ میں۔ (۵) توحید کیا ہے؟ احکام کا ثابت کرنا اور ذات سے معانی کا نفی کرنا۔ (۶) توحید حیرت ہے۔ (۷) توحید عین ہے نہ کہ عِلم جس نے اُسے دیکھا توحید کو پہچانا اور جس نے اُس کو جانا اُسے توحید نہیں۔ (۸) توحید کو کوئی نہیں پہچانتا مگر جو واحد ہو۔ (۹) توحید کیا ہے؟ توحید کا بھول جانا جلالِ واحد کے مشاہدہ میں، یہاں تک کہ تیرا قیام واحد کے ساتھ ہو نہ توحید کے ساتھ۔ (۱۰) توحید کیا ہے؟ توحید کو چھوڑ دینا، توحید ہی میں۔ (۱۱) توحید کیا ہے؟ نسبتوں کو دور کر دینا۔

آثار و اطوارِ اہلِ توحید

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک بار جلوت میں سُبْحَانِیْ مَا اَعْظَمَ شَانِیْ کہا۔ مُریدوں نے عرض کیا کہ حضرت آپ کی زبان سے یہ کلمہ نکلا۔ فرمایا کہ اگر اب کے بار ایسا سنو تو بے تامّل چُھری مارنا۔ اگلے دن پھر وہی کیفیت ہوئی۔ مُریدوں نے چُھریاں ماریں مگر اُن پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اصحاب نے یہ واقعہ بیان کیا۔ فرمایا کہ بایزید یہ ہے جسے تم دیکھتے ہو۔ وہ بایزید نہ تھا۔ اور فرمایا ہے کہ میں چالیس سال دِل کی تاک جھانک میں رہا۔ آخر یہ دیکھا کہ بندگی اور خداوندی دونوں حق کی طرف سے ہیں۔

حضرت ابوالقاسم جُنید بغدادی نے فرمایا ہے لَیْسَ فِیْ جُبَّتِیْ اِلَّا اللّٰہُ نہیں میری جُبّہ میں لیکن خُدا۔ یہ بھی اُن کا قول ہے اَلْفَقِیْرُ لَا یَحْتَاجُ اِلٰی نَفْسِہٖ وَ لَا اِلٰی رَبِّہٖ۔ فقیر وہ ہے کہ نہ اپنے نفس کا محتاج ہو نہ رب کا۔ یعنی دوئی وجود کا وہم

مُرتفع ہو جائے۔

حضرت ابو بکر واسطی کا قول ہے "میں اُس خدا سے بیزار ہوں جو میری اطاعت کے سبب مجھ سے خوش ہو اور میرے گناہ کے باعث مجھ سے ناراض۔ بھلا وہ خُدا کاہے کو ہوا، جو ایسا میرے بس میں ہو کہ اُس کو جو چاہوں بنا لوں۔

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روز برسرِ منبر اسرارِ توحید بیان کرنے شروع کیے۔ حضرت جُنید نے عتاب فرمایا۔ اُس وقت آپ نے جواب دیا "اَنَا اَقُوْلُ وَاَنَا اَسْمَعُ وَھَلْ فِی الدَّارَیْنِ غَیْرِیْ۔ میں کہتا ہوں اور میں سنتا ہوں۔ بھلا میرے سوا دونوں جہان میں ہے کون؟ جب آپ کا وقتِ آخر قریب آیا تو لوگ جمع ہوئے اور بولے کہ حضرت لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پڑھو۔ آپ نے فرمایا کہ جب غیر ہے ہی نہیں تو نفی کس کی کروں۔ لوگوں نے کہا کہ خیر کلمہ پڑھنا تو ضروری بات ہے۔ جواب دیا کہ سلطانِ محبت فرماتا ہے، یہاں رشوت قبول نہیں ہوتی۔ آخر ایک شخص نے باآوازِ بلند شہادت تلقین کی۔ فرمایا کہ واہ! مُردہ زندہ کو تلقین کرنے آیا ہے۔

بعض اولیا نے فرمایا ہے لَا یَذْکُرُ اللّٰہُ اِلَّا اللّٰہُ وَلَا یَرَی اللّٰہَ اِلَّا اللّٰہُ یعنی خدا کو خدا ہی یاد کرتا ہے اور خدا کو خدا ہی دیکھتا ہے۔

حضرت حُسین ابنِ منصور حلاج کا قول مشہور ہے اَنَا الْحَقُّ کَفَرْتُ بِدِیْنِ اللّٰہِ وَالْکُفْرُ وَاجِبٌ لَدَیَّ وَعِنْدَ الْمُسْلِمِیْنَ قَبِیْحٌ۔ میں حق ہوں۔ میں نے دینِ خدا سے کُفر کیا۔ یہ کُفر میرے نزدیک تو واجب ہے اور مسلمانوں کے نزدیک بُرا۔

گفتگوئے مہارِشی سنیاس متا

جُملہ عُلما، حکما، پنڈت، گیانی فرماتے ہیں کہ پہلے کچھ نہ تھا۔ فقط ایک الکھ تھا۔ یعنی ذاتِ لاتعین۔ بے نام و بے نشان۔ تعیناتِ حسّی سے مُنزّہ و مُبرّا۔ اُسی ذات سے یہ تمام اجسامِ ارضی و اجرامِ فلکی یعنی پرجاپت دھرن گربھ اور ارواح و نفوس، قرآن و انجیل و بید و شاستر، پیر و مرشد، شاہ و گدا، امیر و فقیر وغیرہ ظہور میں آئے۔ اور جب کہ یہ سب

موجودات اور کُل کائنات فنا ہو جائے گی، تو بھی وہ ذات جیسی تھی ویسی ہی قائم و برقرار رہے گی تو اب تم غور کرو اور از رُوئے انصاف بتاؤ کہ یہ جو کچھ آیا تو کہاں سے آیا اور گیا تو کہاں کو گیا۔ نہ کہیں سے آیا، نہ کہیں گیا۔ نہ وجودِ غیر پہلے تھا، نہ اب ہے، نہ آئندہ ہوگا ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

لیکن باعتبار سنکلپ روپ ہے اور باعتبار نرسنکلپ اروپ۔ اور بصورتِ جسم فانی ہے اور بہیئت روح باقی، نہ مَرے نہ زندہ ہو۔ جب تک جسم کو اگیان یعنی جہل ہے جیو آتما ہے اور جب گیان ہوا اُسی کا نام پرم آتما یعنی ذاتِ خدا ہے۔ اور جب جسم فنا ہوا تو علم و جہل اور تعلقات و محسوسات بھی سب جاتے رہے۔ اور الفاظ جسم و جان وغیرہ اور اضافات و اعتبارات مرتفع ہو گئے، تو باقی وہی ایک ذات ہے جو پہلے تھی۔ اور وہ ذات متحرک ہے کہ ہر منزل و مقام میں پہونچی ہے۔ نہ وہ بے حرکت ہے نہ کہیں سے آئی، نہ جُدا ہوئی۔ اور صاحبِ مکان ہے کیونکہ ہر مکان میں موجود ہے۔ اور لامکان ہے کیونکہ کسی مکان میں اُس کی گنجائش نہیں۔ وہ بڑا اگیانی یعنی صاحبِ علم ہے کہ ہر شے کے جزو و کل سے واقف ہے، مگر کچھ علم نہیں رکھتا کیونکہ وہ عینِ علم ہے سوائے اُس کے کچھ نہیں۔ پس یہ جو نام و نشان جہان میں ہیں یعنی خدا، رسول، اولیاء، فرشتے، جن و انسان، بھوت، چڑیل، شیطان، ایشر، اوتار، رشی، مُنی، ملیکش، سرگ، نرگ، بہشت و دوزخ، یہ سب حضرت انسان کا وہم و خیال اور عقلِ جزوی گھڑت ہے۔ ؎

مالا لکڑ ٹھاکر پتھر تیرتھ ہیں سب پانی رام کرشنا مر گئے دیکھے چاروں وید کی کہانی

نہ کوئی ساجد نہ مسجود، نہ عابد نہ معبود، نہ آدم نہ ابلیس، صرف ایک ذاتِ قدیم، صفاتِ رنگارنگ میں جلوہ گر ہے۔ نہ اُس کی ابتدا، نہ انتہا، نہ اُس کو کسی نے دیکھا نہ سمجھا، نہ فہم و قیاس میں آئے، نہ وہم و گمان میں سمائے۔ جیسا تھا ویسا ہی ہے اور جیسا ہے ویسا ہی رہے گا۔ نہ گھٹے نہ بڑھے نہ اُترے، نہ چڑھے۔ لَمْ یَزَلْ وَلَا یَزَالُ واحدِ بے مثال یگانہ و یکتا وہ ایک ہے لیکن ایک بھی نہیں۔ کیونکہ اُس کو موجودات سے اور موجودات کو اُس سے پرتھک سمجھنا محض اوڈیا اور نادانی ہے۔ کون طالب کس کی طلب اور کیسا مطلوب۔ دنیا میں طرح طرح کے

کاروبار اور رنگارنگ اشغال مروّج ہیں ایسے ہی خُدا جوئی اور خدا شناسی بھی ایک دھندا ہے۔ جس کا سر ہے نہ پانوں۔ ع

نام عنقا فاش و ذاتش ناپدید

وہ ذات پاک کہ اروپ و امر بے چون و بے نمون ہے اس کا حصول و وصول خیال محال ہے۔ ع

غایت وہم ست اثبات خدا

شعر

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں ۔۔۔ کیں جا ہمیشہ باد بدست ست دام را

لیکن انسان جس صنعت، جس ہنر، جس فن، جس کرتب کا ابھیاس کرتا ہے اُس میں کچھ نہ کچھ مشق و مہارت حاصل کر لیتا ہے اور ہزار ہا نئی باتیں ایجاد کر کے عقل کو حیرت میں ڈالتا ہے ایسے ہی جو لوگ طاعت و عبادت تپشیا، تیاگ، محنت و مجاہدہ کرتے ہیں آخر کار اس کا ثمرہ اور پھل پاتے ہیں۔ گوناگوں اوصاف و کمال اُن کی ذات میں پیدا ہو جاتے ہیں اور یہ اپنی ہی قوتوں کا کھیل ہے، کیونکہ انسان ایک جوہر لطیف ہے، جو چاہتا ہے بنا لیتا ہے مثلاً کوئی سنیاسی اپنے انتیس کرن گیان اندری اور کرم اندری کو بموجب بیدانت شاستر کے کرم کانڈ میں تیاگی ہو کر کشٹ کرے اور بالفرض وہ صاحب کشف و کرامات بھی ہو جائے تو ذاتِ نرا کار میں کیا نفع و نقصان اور سود و زیاں ہو گا۔ اور پہلے کیا نہ تھا اور اب اس کو کیا مل گیا، جیسا تھا ویسا ہی رہا۔ جو ذات اس میں ہے وہی سب میں یکساں بلا فرق و امتیاز موجود ہے۔ البتہ ایک کرتب اُس نے سیکھ لیا اور جو ریاضت و عبادت کی تھی اس کا پھل پایا۔ پہلے کُھلی آنکھ سے دیکھتا تھا اب آنکھیں بند کر کے دیکھ سکتا ہے۔ اور بغیر کانوں کے سن سکتا ہے۔ جہاں چاہے اُڑ کے چلا جائے۔ مرے اور جی اُٹھے۔ دریا پر چلے اور قدم تر نہ ہو، یہ سب کرتب ہیں جو سیکھے اور اس کے سیکھنے کی قابلیت رکھتا ہو، ان باتوں میں کمال حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ حکما، اشراقین کیسے کیسے کمال رکھتے تھے۔ ہم کو حیرت ہے کہ ان اوصاف کے حصول کو خُدا کا حصول اور ان کرتبوں کے جاننے کا نام خدا شناسی کیوں رکھ لیا۔

ایک بات ہے اعجازِ مسیحا میرے نزدیک ایک کھیل ہے اورنگِ سُلیماں میرے آگے

جو پہچانا وہ خدا نہیں اور جو خدا ہے وہ پہچان میں نہیں آسکتا۔ پھر یہ اوصاف ہوئے تو کیا اور نہ ہوئے تو کیا۔ جس میں جس کام کی قابلیت رکھی گئی وہ اُس کو ایسا ہی کرسکتا ہے جیساکہ دوسروں نے کیا ہے

دیگراں ہم بکنند آں چہ مسیحا می کرد فیضِ روح القدس ار باز مدد فرماید

وہ سرب بیاپک نفی کرنے سے نفی نہیں ہوتا۔ نہ اثبات سے ثابت نہ طاعت سے خوش، نہ گناہ سے ناراض، نہ شاغل پر مہرباں، نہ غافل سے بیزار، نہ عارف سے قریب، نہ جاہل سے بعید، نہ مومن کا دوست، نہ کافر کا دشمن، نہ اُس کو ہندے سے تعلّق، نہ عرب سے واسطہ، نہ ہردوار سے نفور، نہ مکّہ سے دور۔ کسی نے اللہ اللہ کہہ کر دل خوش کیا۔ کوئی اوم جپ کر مگن ہوا۔ کسی نے دل میں اُس کا دھیان جمایا۔ کسی نے اینٹ پتھر کو سر جھکایا۔ یہ سب اُسی کے نام اور اُسی کے کام ہیں۔ نرگن کہو یا سرگن ذات کہو یا صفات، ہادی کہو یا مضل، وہی ایک ذات ہے۔ دوسرا کہاں سے آیا۔ چنانچہ مولانا روم فرماتے ہیں۔ ؎

گوہر و ماہیش غیر موج نیست بحر وحدانی ست جفت و زوج نیست

دور از آں دریا و موجِ پاکِ او اے محال واے محالِ اشراک د

لیک با احول چہ گویم ہیچ ہیچ نیست اندر بحر شرک و پیچ پیچ

مگر توحید کے اُس اُجاڑ سنسان میدان میں ٹھہرنے والا تو لاکھوں میں ایک ہوتا ہے۔ اس لیے عوام الناس کی استعداد و لیاقت کے موافق ملّت و مذہب شرع و شاستر سے آداب و اخلاق طاعت و عبادت اور بھلے بُرے کی تمیز قائم ہوئی۔ کوئی قوم ٹھاکر، دیوتا، دیبی وغیرہ کی مورتیں گڑھ کر اور استھان بنا کر اُن کی پوجا او راستھاپنا کرتی ہے۔ کوئی قوم ایک خیالی خدا اپنے دل میں بنا کر اُس کے سامنے ہاتھ باندھ کر رکوع و سجود بجا لاتی ہے۔ اُن کا جمادی بُت اُن کے سامنے رکھا ہے۔ اِن کا خیالی بُت، اِن کے دل میں موجود ہے۔ غرض یہ سب عقلِ جزوی کے پاکھنڈ ہیں ؎

بر عارفاں جز خدا ہیچ نیست رہِ عقل جز پیچ در پیچ نیست

جتنے اوتار، پیمبر، ہادی و رہنما گذرے اور صاحب ملت و مذہب ہوئے اُن کی تعلیم ظاہری عام کی عقل و خیال کے موافق تھی۔ اور تعلیم باطنی خاص آدمیوں کے واسطے تھی۔ جس کو جیسا پایا ویسا ہی اُس کو سمجھایا۔ باششٹ جی نے راجہ رام چندر کو، اشٹا بکر نے راجہ جنک کو اور راجہ جنک نے بیدا بیاس کے پتر سکھ دیو جی کو، سری کرشن جی نے راجہ ارجن کو، رسول عربی محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت علیؓ اور دیگر اصحابؓ کو خاص تعلیم کی۔ کیونکہ وہ لوگ مہاپرش تھے جیسی اُن کی سمرتھی تھی ویسا علم اُن کو دیا گیا۔ عوام اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ جو مہاپُرش گیانی ہو گیا اُس کے نزدیک ہر کام، ہر فعل، عبادت ہے۔ نہ کسی میں بھلائی نہ کسی میں بُرائی۔ مصرع

رازِ عارف می بود در ہر شئے

اسی واسطے جو کرم دھرم طاعت و عبادت کے قاعدے عوام کے لیے مقرر ہوئے خواص بھی اس میں شامل رہے اس لیے کہ کسی بات میں ان کا حرج و نقصان نہیں ؎

گیان دھیان سب اُٹھ گیو سبھا بھئی سب سُن اونچ نیچ انتر نہیں نہیں پاپ نہیں پُن

نہ اِن کو اُمیدِ ثواب، نہ خوفِ عذاب، نہ طمع بہشت نہ ہیبتِ دوزخ۔ جو ہو رہا ہے سب درست و بجا ہے۔ نہ اس کی ابتدا نہ انتہا۔ لوگ کہتے ہیں کہ نراکار پرم آتما نے روزِ ازل میں نزول کیا۔ جس سے یہ سنسار پراپت ہوا پہلے علم الٰہی میں تھا اب ظہور پکڑا۔ ابد میں پھر عروج کرے گا۔ اُس وقت تمام کائنات فنا ہو جائے گی۔ یہ بات عام کی سمجھ کے موافق کہی گئی ہے۔ ذرا اس پر غور کرو۔ پرم آتما کا نزول کیا اور عروج کیا۔ وہ بے حد و بے نہایت کدھر سے اُترے۔ کدھر چڑھے۔ یہ صرف ایک اعتباری بات ہے، بیان کرنے کے لیے ورنہ خدا کے لیے اُتار چڑھاؤ ممکن نہیں پھر ایک خدا مانا اور اُس کا علم اور علم میں سب سنسار، لیکن جب خدا کہا تو اُس میں اُس کا علم بھی موجود ہے۔ علم غیر خدا نہیں اور علم میں سب کائنات ہے۔ تو جملہ کائنات غیر علم نہیں، پس خدا اور خدا کا علم اور جو علم کے اندر ہے سب خدا ہی خدا ہے، نہ نزول ہے نہ کمال، نہ عروج ہے نہ زوال۔ پھر کائنات نے ظہور کیا، تو کہاں کیا؟۔ آیا علم الٰہی سے نکل کر باہر ہو گئے۔ اب بھی تو اُسی طرح یہ تمام موجودات و کائنات علم الٰہی

میں موجود و برقرار ہے، جیسی کہ تھی ۔ یہ ہی خفا ہے اور یہی ظہور۔ لیکن طرفہ تر ماجرا یہ ہے کہ خدا کی ذات میں علم اور علم میں سب کائنات اور انسان کی ذات میں انسان کا علم اور اس علم میں خدا مع اپنے جاہ و حشم کے موجود۔ وہ اس پر محیط یہ اُس پر حاوی۔ وہ اس کے علم میں یہ اُس کے علم میں۔ اب کس کو محاط کہیں، کس کو محیط۔ کس کو خدا سمجھیں کس کو بندہ۔ اس دھیان گیان میں تو دوئی سے چھٹکارا نہیں۔ ایک بندہ ایک خدا۔ خدا کے معنی بندہ اور بندہ کے معنی خدا۔ اس اُلٹ پھیر کا کیا ٹھکانا۔ ؎

ہست نادانی دریں رہ علم نیست　　　علم را بگذار تا دانی یکے ست

جس کو سامرتھ ہے اتنا ہی کافی ہے کہ اگر در خانہ کس ست حرفے بس ست را ور جو اسمرتھ اور مورکھ ہے اُس کے سنکھ تمام بیدانت شاستر اور علم تصوف طوطا کہانی ہے۔ میرے کلام کے اَرتھوں کا اشٹ اُتم گیانی پُرش سمجھیں گے اور من میں پرسن ہوں گے۔ مورکھ اگیانی کیا جانے۔ نہ مجھ کو اس سے کچھ پرایت نہ دوش بس سب کو نمسکار کرتا ہوں"۔ یہ گفتگو ہے سنیاسی مہا پرش کی اور اسی قسم کا کلام موحدانِ بے قید اور مجردانِ آزاد کا ہوتا ہے لیکن جنابِ قبلہ نے بارہا ارشاد فرمایا کہ ایسی باتیں طالبوں کے لیے زہرِ قاتل کا حکم رکھتی ہیں۔ پس جملہ طالبانِ حق اور سالکانِ طریق کو لازم ہے کہ اس قسم کے کلام موحدانہ سے بچیں اور استقلال و استحکام کے ساتھ قدمِ ثبات طلب و تلاش میں رکھیں اور حصولِ مقصود میں سرگرم اور ذوق و شوق الٰہی میں شب و روز مشغول و مصروف اور یاد و بودِ معشوقِ حقیقی میں مست و مستغرق رہیں۔ اس موقع پر سنیاس مت کی باتیں مشتے نمونہ از خروارے لکھی گئی ہیں۔ یہ کلام شمشیرِ بے نیام ہے اور زہرِ ہلاہل کا جام۔ سُن سُنا کر اکثر گمراہ اور ملحد و بے باک ہو جاتے ہیں نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا۔ راہِ راست اور صراطِ مستقیم صرف وہی ہے جو کلامِ الٰہی اور حدیثِ نبوی سے ثابت ہے۔ پس ہر کلام کو معیارِ کتاب و سنت پر جانچ لینا چاہیے اور وہی کہنا اور یقین کرنا چاہیے جو بزرگانِ دین نے کہا ہے تاکہ عوام کے دل میں انکار و اصرار پیدا نہ ہو، چنانچہ حضرت مولانا روم دفترِ ششم میں فرماتے ہیں۔ ؎

چوں کہ جُفت احولانیم اے شمن　　لازم آمد مشرکانہ دم زدن
آں یکے زاں سوے وصف ست و خیال　　جز دوئی ناید بہ میدانِ مقال
یا چو اَحْوَلْ ایں دوئی را نوش کُن　　یا دہاں بر دوز ولب خاموش کن
یا بہ نوبت گہہ سکوت و گہہ کلام　　احولانہ طبل می زن والسّلام

مولانا اسمٰعیل صاحب فرماتے ہیں۔ ؎

یہ پنڈت کون ہے اور وید کیا ہے　　یہ مولانا کے اندر بھید کیا ہے
نہ پنڈت ہے نہ مولانا ہے کوئی　　نہ اپنا ہے نہ بیگانہ ہے کوئی
یہ سب ہیں نام بے نام و نشاں کے　　کہاں کے مولوی پنڈت کہاں کے

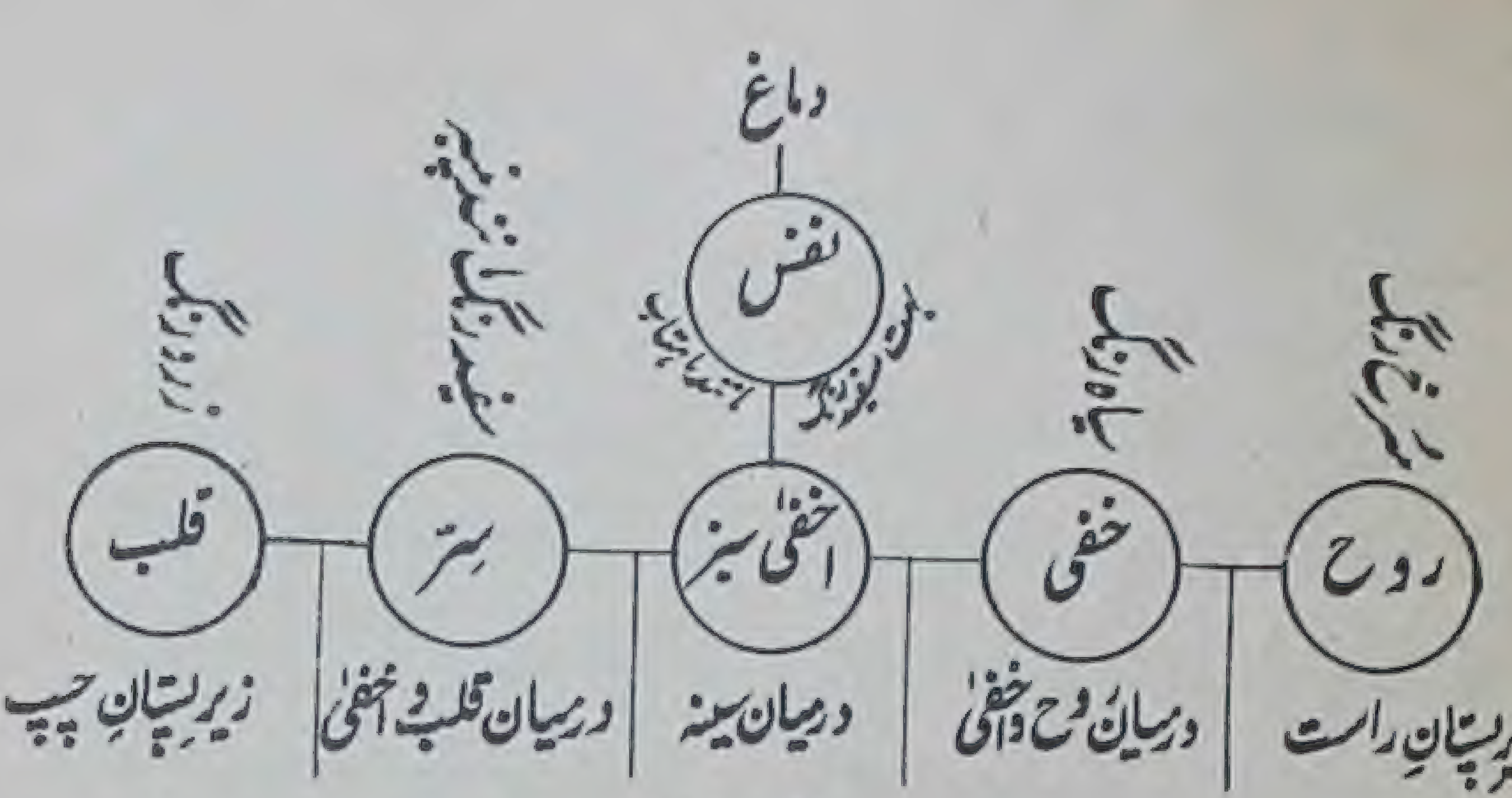
بابِ پنجم

ارشاداتِ حضرت متعلق تعلیم سلوک

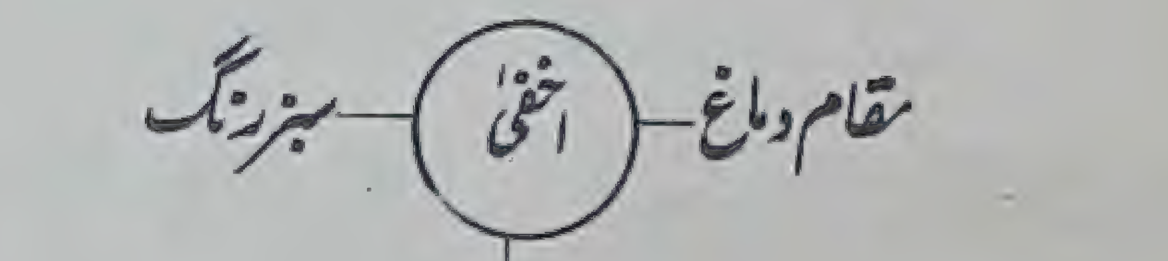
مشتمل بر سہ صد و سیزدہ ۳۱۳ ارشاد

ایک روز ارشاد[۱] ہوا کہ خاندانِ نقشبندیہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جس وقت حضرت خواجہ بہاؤالدین رحمۃ اللہ علیہ حضرت میر کلال صاحبؒ کی خدمت میں مشرف بہ بیعت ہوئے تو حضرت میر کلالؒ نے ظروف پر اسم ذات لکھنے کی خدمت اُن کو سپرد کی۔ اتفاقاً ایک روز برتنوں پر اسم ذات کا لکھنا بھول گئے۔ کسی دشمن نے تمام برتن اُٹھا کر میر صاحبؒ کے روبرو پیش کیے کہ حضرت دیکھیے آپ کے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ آپ نے خواجہ بہاؤالدین کو بُلا کر فرمایا کہ تم نے برتنوں پر اسم ذات کیوں نہیں کندہ کیا۔ خواجہ صاحب نے جو برتنوں پر نظر ڈالی تو سب پر اسم ذات کندہ ہوگیا۔ اور عرض کی کہ حضرت میں نے تو اسم ذات لکھ دیا ہے۔ حضرت میر کلال نے جو دیکھا تو اسم ذات کندہ ہے۔ اُس وقت میر صاحب نے فرمایا کہ تم نقشبند ہو۔ اُنھیں خواجہ بہاؤالدینؒ سے خاندانِ نقشبندیہ منسوب ہے۔

ایک روز ارشاد[۲] ہوا کہ دار و مدار خاندانِ نقشبندیہ کا لطائفِ ستہ پر ہے۔ اور وہ یہ ہیں بطریق قدیم از بزرگان سلف رہ۔



بطریق جدید از مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ



حقیقتِ طورِ لطائفِ خمسہ کو کسی بزرگ نے اس طرح بیان کیا ہے وہو ہذا

در بیانِ حقیقتِ طورِ قلب

باش حق را و سوائے حق گذار ہاں قُلِ اللّٰہُ ثُمَّ ذَرْھُمْ یاد دار

بادل پر درد یاد دوست کن — پر ز یاد دوست مغز و پوست کن
چونکہ ذاکر گشتی اے جویائے کام — در توجہ سوئے دل باشی مدام
در تصور لفظ اللہ ہست بود — تاکہ جاری دل ز اسم اللہ شود
خویش را یابی تو از سر تا بپائے — غرقِ بحر اللہ اے مردِ خدائے
گفت خوش سلطانِ باہو ایں سخن — محو ہو شد رست چوں از خویشتن
جسم خود در اسم اللہ کن نہاں — چوں الف دریائے بسم اے نور جاں
شوم راقب زاں سپس اے تیز ہوش — ہمچو گربہ بر سر سوراخ موش
غرقِ ایں دریا چو گردی لاتخف — نورِ سرخی آوری از وے بکف

۳ [margin note] بیت ۱۱

در بیانِ طورِ حقیقتِ روح

بعد طورِ قلب آمد طورِ روح — قلب گشتی داں و روح او را چو نوح
صاحبا ایں طور ہست از ممکنات — از توجہ سوئے اسماء و صفات
سالکاں را غفلت ایں جا کم بود — دل پر آتش چشم شاں پرنم بود
حرف و صوت و لفظ ایں جا کے سزاست — زانکہ صرف معنی اے صاحب صفات
یاد کن بے حرف و صوتش اے عزیز — ایں سخن بشنو تو از عطار نیز
تا بہا و ہو اشارت می کنی — یا بحرف ہا عبارت می کنی
بندۂ حرفے نیاید از تو کار — جہد کن تا از رہت خیزد غبار
ہا ز باطن واو از ظاہر بود — معنی ہو اول و آخر بود
ہا بیفگن واو را آزاد کن — بندہ شو بے ہا و واوش یاد کن
بشنو اکنوں چوں شنیدی ایں کلام — نورِ زردی نورِ روح آمد تمام

۴ [margin note] بیت ۱۲

در بیانِ طورِ حقیقتِ سرّ

طورِ سرّ آمد ز بعدِ طورِ روح — ہست سالک را در ینجا صد فتوح

اکثر از اعضائے سالک اے رہی / با خبر باشند اندر آگہی
چونکہ آگاہی پدید آمد ترا / می شود مشہود در سرت خدا
سرچہ باشد گر سوالت کرد کس / گو مسمّٰی می شود مشہود بس
خوش بہ گفتا مولوی آں محو ہو / قدس اللہ تعالےٰ سرّہٗ
رو کہ بے یسمع و بے یبصر توئی / سر توئی چہ جائے صاحب سر توئی
رنگ او آمد سفید اے یار من / فکر کن در سر اگر داری سخن

در بیانِ حقیقتِ طورِ خفیہ

طورِ خفیہ آں کہ از سر تا بہ پائے / می شود مستغرق بحر خدائے
موئے مویت دیدہ گردد در شہود / لیک می باشد شعورت از وجود
زیں سبب گفتا جناب مولوی / در کتابِ خویش یعنی مثنوی
راست گفتا آں شہِ شیریں زباں / چشم گردد موئے موئے عارفاں
پس شود نورِ سیہ بر تو پدید / بر مثالِ مردمِ چشم اے سعید
در سیاہی ہست چوں آبِ حیات / زاں سیہ مشہود گردد نورِ ذات

در بیانِ حقیقتِ طورِ اخفا

بعد طورِ خفیہ اخفا دان و بس / غیرِ کامل واقف آں نیست کس
حق تجلّی می کند بر تو عیاں / آں چناں کز تو نمی ماند نشاں
زاں تجلّی چوں شدی فانی تمام / طورِ اخفا نام آں شد والسّلام
سبز آمد نورِ اخفی بس جلی / ایں چنیں کردہ بیاں سید علی
شاہ ہمداں آں امامِ اولیا / ثانیٔ شاہ ولایت مرتضےٰ
بعد سبزی نورِ بے رنگی عیاں / می شود مشہود تو بس بے نشاں
طے اطوار آمدہ چوں در قلم / چار سیر سالکاں سازم رقم

ہست ایں اطوار اے جویائے کام ۔ درج در سیر الی اللہ بالتمام

در بیانِ چار سیرِ سالک

بعد ازاں آنت سیر فی اللہ می شود ۔ وانگہاں سیر مع اللہ ہست بود
عاقبت سیر من اللہ ست بس ۔ جز مکمل واقف آں نیست کس
سیر سالک چوں رسید اینجا نگاہ ۔ مرشد کامل شد از فضل الٰہ
اندریں سیرت بقا بعد از فناست ۔ چوں فنا گشتی بقا اندر بقاست
درمیان چار سیرت اے پسر ۔ ہم تجلّی چار گردد جلوہ گر
ہست در افعال و آثار و صفات ۔ بعد ازاں باشد تجلّیات ذات

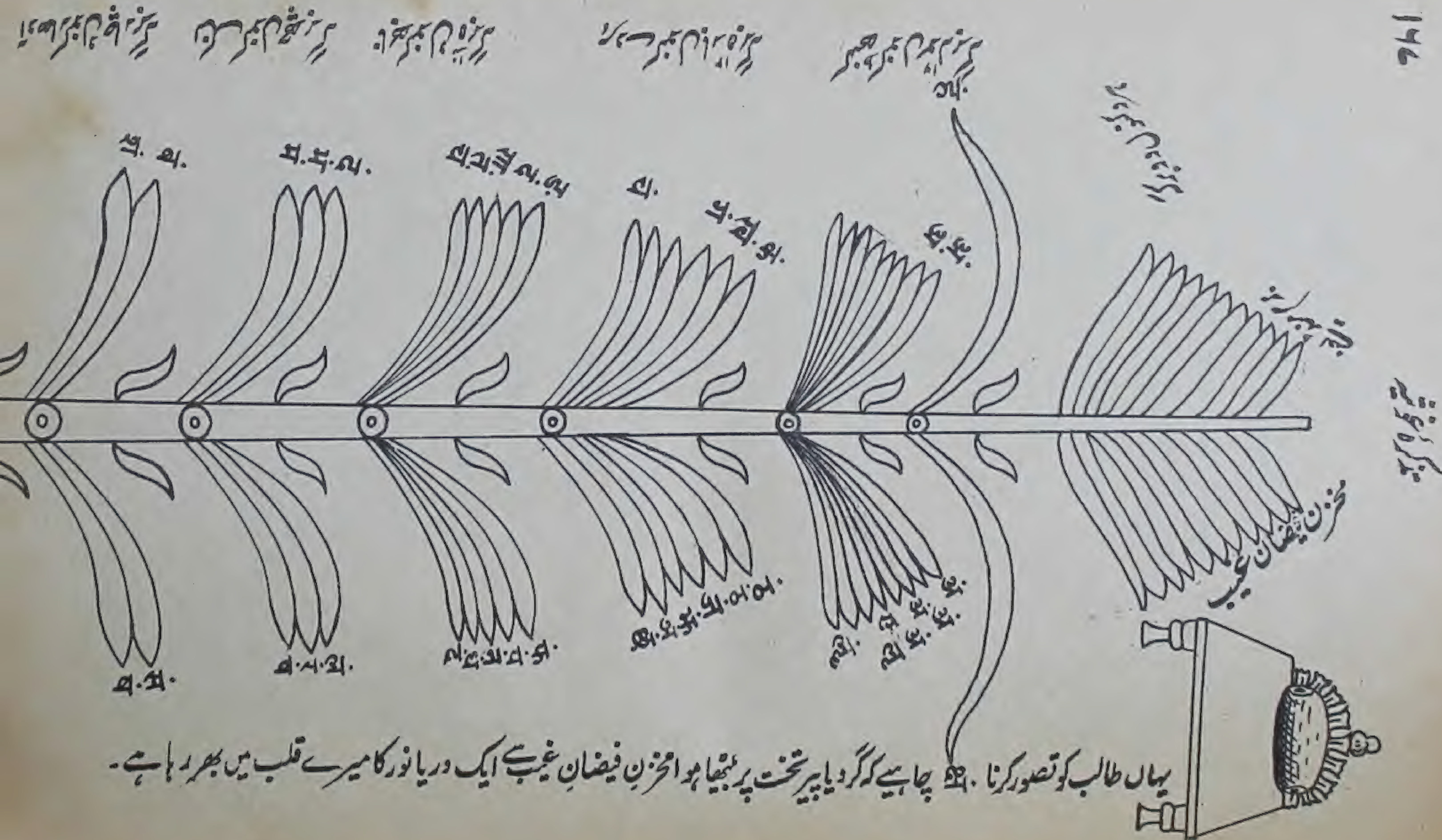
اور یہ لطائف ستہ سنیاس متا میں بھی ہیں ۔ کھٹ[1] کنول یا کھٹ چکر بطریق یوگ شاستر ہیں یعنی نابھ کنول ۔ من کنول ۔ ہردے کنول بھرکٹی ترکٹی بھنور گپھا ۔ اور بعض نے یوں بیان کیا ہے :۔ آدھار کنول ۔ لنگ کنول ۔ نابھ کنول ۔ ہردے کنول ۔ کنٹھ کنول ۔ برؔ کنول ۔

---

[1] اس اجمال کی تفصیل میں کسی گیانی کا مقولہ ہے :۔

ادھار ۔ لنگ ۔ نابھو ۔ پرکھٹ ۔ ھردئ ۔ تال ۔ مول ۔ للاٹی ۔ دوی پتری ۔ شوڑ
نشستگاہ ۔ اندام نہانی ۔ ناف ۔ گل شگفتہ ۔ دل ۔ تالو ۔ بیخ ۔ پیشانی ۔ دو کلی کا کنول ۔ سولہ کلی کا کنول
شاری ۔ دوی دش ۔ دش دلی ۔ دوارشار دِھنی ۔ چتشکی ۔ واسانتی ۔ بال مدھی ۔ ڈپھہ
بارہ کلی کا کنول ۔ دس کلی کا کنول ۔ چھ کلی کا کنول ۔ چار کلی کا کنول ۔ وا ہ سے س تک ب سے ل تک ڈ سے پھے تک
کٹھہ ۔ سہتی ۔ کنٹھ ۔ دلشی ۔ سُوَراسِیہ ۔ ھم اکھشم ۔ تو ادتیہ یکیم سکل دل کتم برن نہ یم نماچی
ک سے ٹھے تک ۔ کنٹھ ۔ مقام ۔ سولہ سُر ۔ بندو کرکے اوپر تمام پتوں میں برن روپ ۔ والسلام

یعنی شگفتہ کنول آدھار کنول ۔ لنگ کنول نابھ کنول ۔ ہردے کنول کنٹھ کنول ۔ برؔ کنول ۔ دو کلی برؔ کنول کے ہیں ۔ اور سولہ کنٹھ کنول کی اور بارہ ہردے کنول کے ہیں اور دس نابھ کنول کی اور چھ لنگ کنول کی چار کلی آدھار کنول کی پھر حروف شاستر کے ان پتوں میں اس ترکیب سے لکھو کہ واد سے س تک آدھار کنول میں اور ب سے ل تک لنگ کنول میں اور ڈ سے پھے تک نابھ کنول میں اور ک سے ٹھے تک ہردے کنول میں اور کنٹھ کنول میں سولہ سُر اور برؔ کنول میں ہم اکھشم لکھیں ہر حرف پر نقطہ بھی ضرور لگا دیا جائے والسلام ۔ صورت اُس کی یہ ہے :۔ (طریق شغل صفحہ ۶۸ پر ملاحظہ ہو)



یہاں طالب کو تصور کرنا چاہیے کہ گردیا پیر تخت پر بیٹھا ہوا مخزنِ فیضانِ غیب ہے ایک دریا نور کا میرے قلب میں بھر رہا ہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ طریقۂ نقشبندیہ میں بعد بیعت تعلیم کا یہ طرز ہے کہ مرید کو شیخ اپنے سامنے بٹھا کر، اوّل لطیفۂ قلب کی طرف متوجّہ کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ قلب میں اسم ذات کا تصوّر کرو۔ اور اپنے قلب سے مرید کے قلب میں گرمی پہونچاتا ہے۔ لیکن یہ توجّہ پائدار نہیں جب تک شیخ کے سامنے ہے اور ذکر و شغل میں مشغول ہے اثر رہتا ہے، ورنہ کچھ بھی نہیں۔ اس کی مثال فوّارہ کی سی ہے کہ پانی حوض سے آیا تو چلا ورنہ خشک۔ توجّہ کے معنی ہیں کسی کی طرف رُخ کرنا۔ مگر اصطلاحِ صوفیہ میں یہ مراد ہے کہ فیض و گرمی مرید کے دل میں پہونچانا از روے باطن۔ مرید کی طرف متوجّہ ہونا اور ذکرِ الٰہی کا پرتو اُس کے دل میں ڈالنا۔ خواہ اسمِ ذات کا، خواہ نفی و اثبات کا۔ جب لطیفۂ قلب سے کہ زیرِ پستان چپ ہے مرید آگاہ ہو جاتا ہے تب لطیفۂ روح پر توجّہ کرتے ہیں جو زیرِ پستانِ راست ہے۔ جب وہ بھی جاری ہو جاتا ہے تو لطیفۂ سِرّ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جو قلب و روح میں حائل ہے۔ اس کے بعد لطیفۂ نفس پر جو زیرِ ناف ہے۔ پھر لطیفۂ خفی پر جو پیشانی میں ہے۔ پھر لطیفۂ اخفا جس کا مقام دماغ میں ہے۔ غرض جب یہ لطائفِ ستّہ جاری ہو جاتے ہیں تو سلطانُ الاذکار تلقین فرماتے ہیں۔ اُس وقت اسمِ ذات ہر بُن مو اور گوشت و پوست سے نکلنے لگتا ہے۔ اور اکثر طرح طرح کے انوار و تجلّیات کا غلبہ طالب کے دل پر بلکہ تمام وجود پر ہوتا ہے۔ اگر طالب کا ظرف عالی اور حوصلہ فراخ ہے تو ان سب کو نوش کر کے نفی کے تحت میں لاتا ہے، اور قدم آگے بڑھاتا ہے۔ اگر کوتاہ نظر و بے استعداد ہے چوکڑی بھول کر کیفیتِ اذکار کی دولت کھو بیٹھتا ہے۔ البتہ اگر مرید سلطان الاذکار سے اچھے طور نکلا اور اس کی کیفیت حاصل کر چکا تو لطائفِ ستّہ کے اثنائے اجرا میں وجد و جذب ہوتا ہے۔ وجد کی حقیقت یہ ہے کہ جب تصفیہ و تزکیۂ باطن حاصل ہو جاتا ہے، تو پیر و مرشد مرید کی روح کو اپنی روح کے ہمراہ لے کر عرش و کرسی کی جانب پرواز کرتا ہے

(بقیہ مضمون صفحۂ ۱۶۶) طریقِ شغل اس طرح ہے کہ ہر حرف کو کلی میں سے بتصوّر اس نلی کے اندر لائے اور نلی کو ایک دریائے عظیم خیال کرے بر منڈ تک نیچے سے اوپر لے جائے اور جب تمام حروف اوپر جمع ہو جائیں تو پھر بترتیب ہر ایک کو اتارے، چند روز میں لطائف جاری وتمام جسم منوّر ہو جائے گا۔

وہاں گوناگوں انوار و عجائب اسرار مُرید کے دل پر غلبہ کرتے ہیں اور اُس کو مدہوش بنا دیتے ہیں۔ جب کہیں سوائے انوار کے کچھ نظر نہیں آتا تو مرید حیران و سرگردان ہو کر واپسی کا ارادہ کرتا ہے لیکن راہ نہیں پاتا۔ ناچار ہائے ہو مچاتا ہے اور نالہ و زاری کرتا ہے۔ تب پیر و مرشد توجۂ افاقیہ دیتا ہے۔ اُس وقت اوسان درست ہو جاتے ہیں۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضراتِ مشائخ میں لطائفِ ستّہ کی بیداری کے واسطے طرح طرح کے اذکار مُروّج ہیں مثلاً۔ حدادی۔ ندائی۔ دو ضربی۔ سہ ضربی۔ شش ضربی۔ پاسِ انفاس حبسِ دم۔ اسمِ ذات۔ نفی اثبات۔ نظر بر قدم۔ ہوش در دم۔ وغیر ذٰلک۔ بعد ازآں مُراقبات و مکاشفات جو معمولِ خاندان ہوں تعلیم کرتے ہیں۔ اور اُن کے لیے کچھ حدّ و حصر نہیں۔

ایک مراقبہ یہ ہے کہ مُرید سے فرماتے ہیں کہ خدائے تعالےٰ کو ہر حال و قال میں بصیر و خبیر سمجھو تاکہ ظاہر و باطن میں کوئی حرکت ناز یبا سرزد نہ ہو۔

ایک مراقبہ یہ ہے کہ خدا کو اقرب و نزدیک سمجھو تاکہ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ کے معنی ظاہر ہو جائیں۔

ایک مراقبہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو بحر میں تصوّر کرو یعنی سب جگہ راست و چپ زیر و زبر۔ دریا ہی دریا ہے اور میں اس میں غرق ہوں۔ اس کو مراقبہ بحری کہتے ہیں۔

ایک مراقبہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو لق و دق بیابان میں خیال کرو اس کو مراقبۂ برّی کہتے ہیں۔

ایک مراقبہ یہ ہے کہ اپنے تئیں حضرت رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے نزدیک تصوّر کرو تاکہ فنائیت اور نسبت آنحضرتؐ کی حاصل ہو۔ غرض اسی قسم کے مراقبے اور مکاشفے طالبین سے کراتے ہیں۔ مراقبہ کے معنی یہ ہیں کہ خطرات و خیالاتِ فاسدہ سے خاطر کی نگہداشت کرے۔ اور مکاشفہ کے معنی یہ ہیں کہ ظلمات کے پردے سامنے سے اُٹھائے اس کی تفصیل کتبِ مشائخ میں بہت کچھ درج ہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہمارے زمانہ کے مشائخین کی سیر و سلوک یہ ہے کہ

ذاتِ شیخ سے نسبت و فنائیت حاصل ہو جائے۔ جب اُن کو کوئی بات معلوم کرنی منظور ہوتی ہے تو اپنے شیخ کے برزخ یعنی صورت کی طرف متوجہ ہو کر استعانت و استمداد اپنے کاموں میں کرتے ہیں اور اسی کو کمالِ فقر جانتے ہیں۔ مگر ذاتِ باری تعالےٰ کی تشبیہات و تنزیہات میں نہ اُن کو کچھ دخل نہ اُس سے سروکار۔ رہی معرفت و حقیقت کی چاشنی سو اس کی لذت و کیفیت کا حصول معلوم۔ نہ یہ جانتے ہیں کہ ہم کون ہیں کیا ہیں کہاں سے آئے ہیں۔ ہماری اصل کیا ہے اور ذاتِ خداوندی کیا چیز ہے۔ اگر کوئی عالی حوصلہ ہوا تو اُس کو برزخِ رسول الثقلین حاصل ہو جاتی ہے ورنہ خیر۔

خود شناسی کار باشد اے فلاں کار دیگر ہیچ و پوچ و ہیچ داں

تا نیفتد بر تو مردے را نظر از وجودِ خود کجا یابی خبر

ایک روز ارشاد ہوا کہ گروہِ کاملین تین قسموں پر منقسم ہے۔ کامل۔ اکمل۔ مکمل۔

کامل اُس کو کہتے ہیں جو خود تو صاحبِ کمال ہو مگر کسی کو فیض و فائدہ نہ پہونچا سکے۔ اس کو لازمی بھی کہتے ہیں۔ اکمل وہ ہے کہ خود بھی صاحبِ کمال ہو اور فیضانِ باطنی و ہدایتِ ظاہری سے اوروں کو بھی فائدہ پہونچائے۔ یہ شخص اول سے بدرجہا بزرگ ہوتا ہے۔ مکمل اُس کو کہتے ہیں کہ اوروں کو مشیّت ایزدی اور تقدیر الٰہی کے موافق خواہ گھنٹہ میں خواہ مہینہ میں خواہ سال بھر میں کامل و مکمل بنادے اور جو کرامات و مکاشفات اپنی ذات میں رکھتا ہے مُرید کو عطا فرما دے۔ ایسا شخص مذکورۂ بالا سے بھی نہایت معظّم و مکرّم ہوتا ہے۔

گروہ کُملا کے تعلیم و تلقین کا طریقہ یہ ہے کہ اوّل طالب کو خاندان کے موافق بیعت کر کے ذکر ارشاد فرماتے ہیں۔ خواہ اسم ذات، خواہ نفی و اثبات، مگر اس زمانہ کے مشائخین کی طرح سامنے بٹھا کر توجہ نہیں دیتے۔ البتہ قلبی توجہ دیتے ہیں، جہاں کہیں مُرید ہو چاہے ہزار فرسنگ کے فاصلہ پر، چاہے میں بھر کے۔ پھر اپنا برزخ اُس کے دل میں حلول کردیتے ہیں۔ اور اس توجہ کا اثر طالب کے دل سے زائل نہیں ہوتا۔ شراب پیے یا زنا کرے، گویا کہ پتھر کی لکیر ہے۔ اُس کو گھسو یا رگڑو، بدستور موجود ہے۔ اور اس گروہ کی توجہ تین طرح کی ہوتی ہے۔ اصلاحی۔ القائی۔ اتحادی۔ اصلاحی توجہ یہ ہے کہ مُرشد اپنی برزخ ہمّت کے

صابون سے دلِ مرید کو پاک وصاف کردے اور اُس کے آئینۂ دل کا غبار اپنے دل کی حرارت سے مٹادے۔ اور اپنی ہمتِ باطن کو مُرید کی تہذیب وآراستگی میں مصروف رکھے۔ القائی توجہ یہ ہے کہ جب ضمیرِ مُرید کی صفائی نہایت کو پہونچ جائے تو حالاتِ پوشیدہ کی دریافت واِستدراک کے واسطے اِلقا کرے۔ یعنی جو کچھ کہنا ہو مُرید سے، برزخ میں کہے خواہ مرید دور ہو خواہ نزدیک۔ لیکن بعض ہی طالب اس توجہ تک پہونچتے ہیں۔ اتحادی توجہ یہ ہے کہ مُرشد یک لخت بغیر تصفیہ وتزکیۂ قلب کے مرید کو فیضانِ باطنی عطا کرے اور خاصّہ اس توجہ کا یہ ہے کہ طالب کا برزخ مُرشد کی صورتِ بابرکت کے مشابہ ہوجاتا ہے۔ مگر اس قسم کی توجہ شاذ ونادر ہوتی ہے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ حضرت خواجہ باقی باللہ علیہ الرحمہ نے ایک نان بائی کو دی تھی جو کم ظرفی اور بے استعدادی کی وجہ سے تیسرے دن مرگیا، کیونکہ تصفیہ باطن اس کو حاصل نہیں ہوا تھا۔ اگر صفائی ہوتی تو اس توجہ کو برداشت کرتا اور جیسے اس توجہ کے دینے والے خال خال ہوتے ہیں ایسے ہی طالب بھی اسی قدر عالی حوصلہ عالی ظرف کم ہوتا ہے جو اس توجہ کا متحمل ہو، ورنہ بیم ہلاکت ہے۔ جب طالب تذکر میں ٹھیک ہوجاتا ہے تو پیر ومرشد اُس کو تفکر ارشاد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ صانع حقیقی کی صنائع وبدائع میں متفکر رہو مثلاً قالبِ انسان کس حکمت وفراست سے بنایا ہے۔ اس کے اندر صدہا بیماریاں اور سیکڑوں آرام رکھے ہیں۔ آسمان بغیر ستون قائم کردیا۔ زمین کو پانی پر پھیلادیا مینھ کا برسنا، نباتات کا اُگنا، پھول پھل کا پیدا ہونا، یہ سب اُس کے کمال صنعت کا تماشا پیشِ نظر ہے۔ اور مرتبۂ تفکر میں اکثر طالب کو استغراق وسُکر حاصل ہوتا ہے۔ اِستغراق کے معنی ہیں پانی میں ڈوب جانا اور یہاں یہ مراد ہے کہ حقیقت ومعرفت کے دریا میں قصد ونیّت کے ساتھ غرق ہونا۔ اور سُکر کے معنی ہیں بے ہوشی ومدہوشی۔ جب طالب مرتبۂ تفکر وتذکر میں ٹھیک ہوگیا تو اب عرفان کی تعلیم کرتے ہیں کہ ان تمام ممکنات وموجودات کو واجب الوجود خیال کرنا اور اِن فروعات کو اصلِ اصول سمجھنا چاہیے۔ اور تمام وسیلے اور واسطے درمیان سے اُٹھا ڈالنے چاہییں اور جو کرو جان لو کہ اُسی کی مشیت سے کرتے ہیں اور جو آفت وراحت کسی سے پہونچے منجانب اللہ سمجھے جیسے کتّے کو کوئی پتھر مارے تو وہ پتھر کو

نہیں دیکھتا بلکہ جان لیتا ہے کہ مارنے والا کوئی اور ہے۔ پتھر خود نہیں لگا۔ اسی واسطے پتھر مارنے والے کی طرف دوڑتا ہے۔ ؎

رہِ عقل جز پیچ بر پیچ نیست ——— بہ عارفاں جز خدا ہیچ نیست

عرفان میں بھی استغراق ہوتا ہے لیکن استغراق و سکر منازل مروّجہ و مقررہ سے نہیں ہیں بلکہ منازل کے شعبے ہیں، جیسے کسی شخص کا ارادہ دہلی جانے کا ہے اور جہاں سے چلا ہے دہلی سات منزل ہے۔ اب ان منازل کے بیچ میں جو دیہات واقع ہوتے ہیں اُن کو منزل نہیں کہہ سکتے بلکہ شعبۂ منازل ہیں۔ جب مُرید نے یہ تین مقام طے کر لیے تو حضرت پیر و مرشد توحید کی ہدایت فرماتے ہیں یعنی اپنے تمام اعمال و افعال، احوال و اقوال و حرکات و سکنات کو تقدیرِ الٰہی اور مشیّت ایزدی سے سمجھنا چاہیے لیکن یہ تعلیم مبتدیوں کے واسطے ہے۔ منتہیوں کی تعلیم یہ ہے کہ تمام ممکنات و موجودات کو مظہرِ الٰہی بلکہ عین ذات نامتناہی جاننا چاہیے۔ جیسے ایک چراغ دوسرے چراغ سے روشن کریں تو وہ بھی روشنی میں پہلے کی برابر ہے۔ کچھ فرق دونوں میں نہیں ہے۔ کیونکہ حدوث نے قدم کی خواہش سے کوئی وجودی لباس پہنا اور صورت اختیار کی پھر حدوث قدم سے الگ کس طرح ہو سکتا ہے کیونکہ روزِ ازل سے حدوث و قدم میں یگانگی و ہمدانیت کا واسطہ ہے اور ایک لحظہ و یا ایک ساعت بھی اُس سے جُدا نہیں۔ معنیٰ توحید یہ ہیں کہ باری تعالےٰ کو بے ہمتا اور یکتا جاننا ہر حال و ہر مقام میں۔ اگرچہ جلایا جائے یا قتل کیا جائے ؎

چیست توحید آنکہ از غیرِ خدا ——— فرد آئی در خلا و در ملا

اور توحید کے جاننے والے کو موحّد کہتے ہیں اور موحّدین کی دو قسمیں ہیں۔ ایک موحّد حنیفت دوسرا موحّد تابع۔ موحّد حنیفت اُسے کہتے ہیں کہ خدا تعالےٰ کو ایک جانے، بلا واسطہ انبیا علیہم السلام کے اور نبی و رسول کی اطاعت اُس کے لیے اختیاری ہوتی ہے اور اس قسم کے موحّد اکثر جوگیوں کے فرقہ میں ہوتے ہیں۔ اور اگر شاذ و نادر زمرۂ اسلام سے ہوتے ہیں تو دینِ اسلام کی پیروی کبھی کبھی کرتے ہیں، البتہ دل سے انبیاء علیہ السلام کی رسالت و نبوت کا اقرار و اعتراف رکھتے ہیں۔ لیکن توحید کے غلبہ میں ہوش بجا نہیں رہتے۔ جب سمجھ بوجھ ٹھکانے آتی ہے تو شرعِ متین

کی جبل متین سے سہارا لیتے ہیں۔ اور موحد تابع وہ ہے کہ اپنے تمام عبادات و معاملات کو شریعت غرا اور ملتِ بیضا کے موافق رکھے اور کبھی سرِ مو تجاوز نہ کرے اور اپنے دل میں خداوند تعالےٰ کو اور وراے ذات و صفات یگانہ و بے ہمتا سمجھے، اور بیچون و بیچگون خیال کرے۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ موحدِ تابع کو مقامِ توحید میں اتنی مدہوشی و بے ہوشی نہیں ہوتی کہ بے اختیار ہو جائے۔ البتہ اُس پر باری تعالےٰ کی وحدانیت اور یگانگی کا غلبہ رہتا ہے۔ جب طالب ان چار مقامات کو طے کر چکا تو مرشد مقام استغنا سے اُس کو مشرف فرماتا ہے۔ استغنا کے معنی ہیں بے پروا ہو جانا اگروہِ جن و انسان سے اور سب کام خدا کو سونپ دینا۔ اس مقام میں طالب کو استغنا اور بے پروائی اس قدر ہو جاتی ہے کہ بہشت و دوزخ کا خیال بھولے سے بھی اُس کے دل میں نہیں آتا۔ اور شاداں و فرحاں رہتا ہے۔ اور امیر و غریب کو یکساں خیال کرتا ہے۔ جب طالب ان پانچوں مقامات کو طے کر چکا تو حضرت پیر و مرشد اُس کو مقامِ فنا سے معزز و ممتاز کرتے ہیں۔ اور ارشاد فرماتے ہیں کہ تمام حیوانات و جمادات و زمین و آسمان کو اور میں اور ہم اور یہ اور وہ سب کو نیست و ہالک و منفی سمجھو اور خیال کرو کہ بجز ذات لاہوت کے سب معدوم اور ناپیدا ہیں۔ صرف ذات واجب الوجود اُسی صفت پر جیسی کہ ازل سے قائم ہے جلوہ گر و ہویدا ہے۔ اوّل طالب کو اس مقام میں دو دو گھڑی تک بے ہوشی رہتی ہے اور ایسا حال بہت دنوں تک ہوتا ہے۔ جب طالب کو نفی بحبت حاصل ہوئی اور اس کو سہہ گیا تو پھر حضرت پیر و مرشد اُس کے حوصلہ اور ظرف کے موافق اس مقام کی انتہا تعلیم کرتے ہیں اور اُس کے لیے کوئی حد نہیں، لیکن جس وقت یہ حالت درجۂ غایت کو پہونچ جاتی ہے تو اسی کا نام محویت ہے۔ الحاصل مرشدِ کامل کی توجہ سے جب یہ چھ مقام طالب کو طے ہو جاتے ہیں تو اُس کو بقا کی طرف متوجہ کرتے ہیں، یعنی فنا و محویت سے نکال کر بقا و صحو کی طرف لاتے ہیں۔ اور بقا کے معنی ہیں فنا سے نکل کر قائم ہونا۔ ان مقامات کے بعد مرتبہ وصل کا ہے، لیکن اس کا حصول محض عنایتِ الٰہی پر منحصر ہے۔ اس میں مرشد کی توجہ اور طالب کی کوشش کو کچھ دخل نہیں۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ ۝

چوں حسنِ عاقبت نہ برندی و زاہدی ست — آں بہ کہ کارہا بہ عنایت رہا کنند

غرض یہ سات مقام ہیں جو اوپر مذکور ہوئے اور ہر ایک مقام کے ساتھ ایک شاخ بھی ہے چنانچہ طلب کی شاخ ذکر ہے کہ بے اس کے کچھ ثمر نہیں ملتا۔ دوم مقام عشق۔ اس کی شاخ تفکر ہے کہ بغیر اس کے کچھ کیفیت نہیں آتی۔ سوم مقامِ عرفان ہے۔ اس کی شاخ استغراق و شکر ہے کہ بغیر اس کے معرفت کی حقیقت نہیں کھلتی۔ مقام چہارم توحید ہے اس کی شاخ بیداری ہے پنجم مقام استغنا ہے۔ اس کی شاخ خوشی ہے۔ ششم مقام فنا ہے اس کی شاخ محویت ہے۔ ہفتم مقام بقا ہے۔ اس کی شاخ صحو ہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ مکاشفہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کونی اور ایک ذاتی۔ مکاشفہ کونی میں انسان پر کل موجودات کا حال علیٰ قدر استعداد کھلتا ہے اور اس میں بہ آہستگی ترقی ہوتی ہے کہ اوّل تو لوگوں کے دلوں کا حال معلوم ہونے لگتا ہے۔ پھر اگر استعداد کامل ہے تو تمام جہاں کا حال آئینہ ہوجاتا ہے۔ مکاشفہ ذاتی اُسے کہتے ہیں کہ ذات بحت کی جستجو میں قدم رکھے اور جو انوار تجلی پیش آئیں سب کو ہیچ سمجھے۔ اگرچہ اس میں حیرت و عظمت بہت پریشان و سرگردان کرتی ہے مگر قدم ہمت آگے کو بڑھائے اور صفاتِ ذاتیہ پر کبھی قناعت نہ کرے۔ اسی لیے طالب تنزیہ ہمیشہ سراسیمہ رہتا ہے اور اُس کی آتش طلب کبھی فرو نہیں ہوتی۔ چنانچہ حضرت شبلی کا مقولہ تھا دَبِّ زِدْنِی تَحَیُّراً۔ لیکن اس قسم کے طالب فی زمانہ بہت کم ہیں۔ اور جو ہیں تو حیران و پریشان ہیں اور آج کل کے مشائخوں کو تو اس کی ہوا بھی نہیں لگی ؎

راز درون پردہ ز رندان مست پرس　　کیں حال نیست صوفیٔ عالی مقام را

سچ تو یہ ہے کہ ان مقامات کی حقیقت و ماہیت جب سمجھ میں آتی ہے کہ طالب کسی اہل اللہ سے بیعت ہو کر تصفیۂ باطن حاصل کرے پھر نقل مطابق اصل خود ظاہر و عیاں ہوجائے گی۔ جب تک کہ طالب عین الیقین میں ہے کیفیتِ حق الیقین کہاں اور جب تک کہ علم الیقین میں ہے تو منزلِ مقصود بہت ہی دور رہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ اولیاء اللہ کی بہت سی قسمیں ہیں اگرچہ ٹھیک ٹھیک سوائے ذاتِ پاک کے کوئی بھی نہیں جانتا لیکن مشہور یہ ہیں: قطب ارشاد، قطب مدار،

قلندر۔ خضر وقت ۔ غوث ۔ ابدال ۔ اوتاد۔ صوفیٔ ابو الوقت۔ صوفیٔ ابن الوقت ۔ قطب لغت میں چکّی کی کیلی کو کہتے ہیں۔ جس پر تمام چکّی کا مدار ہے ۔ ایسے ہی اگر قطب جہان میں نہ ہوں تو انتظام عالم تباہ و خراب ہو جائے ۔ اور ارشاد کے معنی رہنمائی کے ہیں، پس قطب ارشاد سے خلق اللہ کو ہر طرح کا نفع ظاہر اور باطن کا بے حساب پہونچتا ہے ۔ قطب مدار وہ ہے کہ اپنی جگہ سے نہ ہلے اور بذات خود کامل واکمل ہو۔ مدار کے معنی ہیں جائے گردش یعنی ساری مخلوقات اُس کی گرویدہ ہو اور اپنے کاموں میں اُس سے مدد چاہے اور اُسی کو قطب الاقطاب بھی کہتے ہیں ۔ اور اُس کے بدن میں کسی جگہ ناسور رسائل بھی ہوتا ہے قلندر وہ ہے کہ تجرید و تفرید میں یکتا اور بے پروا ہو اور تمام عالم کا حال اُس پر آئینہ ہو اور جو صفت کہ عارفوں میں ہونا چاہیے اُس میں بے مثل ہو اور شرط یہ ہے کہ مجذوب بھی ہو اور سالک بھی، جیسے حضرت شیخ شرف الدین بو علی قلندر رتھے یا اس زمانہ میں حضرت جنگو شاہ گذرے ہیں۔ خضر وقت وہ ہے کہ مثل حضرت خضر علیہ السّلام کے اُس پر علم لدُنی منکشف ہو اور اسرار سے واقف ہو اور ایک نظر جس پر ڈالے اُس کو کامل کر دے ۔ مگر ایسا شخص کسی خوش نصیب ہی کو ملتا ہے ۔ اور غوث ' فریاد رس کو کہتے ہیں ۔ یعنی جو بندگان خدا کے معاملات میں ظاہراً و باطناً عدل وانصاف فرماتے ہیں ۔ اُن کی شناخت مشہور ہے کہ جب چاہیں اپنے اعضاء جُدا کر لیتے ہیں ۔ ابدال اگر یہ گروہ نہ ہو تو تمام عالم مسخ ہو جائے اور یہ ستر تن ہوتے ہیں ۔ چالیس تو مُلک شام میں اور تیس تمام ممالک میں متفرق رہتے ہیں، مگر ان سے کچھ کام نہیں نکلتا نہ کچھ فائدہ حاصل ۔ ہاں! وہ بھی اپنی خدمت پر مامور رہتے ہیں اور ابدال اس لیے کہلاتے ہیں کہ اگر کوئی اُن میں کم ہو جاتا ہے تو اوتاد میں سے بدل اُن کا مقرر ہوتا ہے ۔ اوتاد جمع ہے وتد کی اور وتد کے معنی ہیں میخ، یعنی یہ لوگ مثل میخ آہن اپنے اپنے مقام پر جمے رہتے ہیں ۔ اگرچہ ظاہر و باطن کا فائدہ اُن سے محسوس نہیں ہوتا مگر ان کی برکات تمام عالم میں محیط و منتشر رہتی ہیں ۔ صوفیٔ ابو الوقت وہ ہے کہ وقت پر قادر ہو یعنی حالت اُس کے اختیار میں ہو، جب چاہے طاری کرلے جب چاہے دور کر دے اور ہوش میں آجائے ۔ یہ صوفیٔ ابن الوقت سے

بدرجہا اعلیٰ ہوتا ہے مگر ایسے لوگ اس زمانہ میں نہیں ہیں، البتہ اگلے زمانہ کے قدما مثل حضرت بایزید بُسطامی ان مراتب کو پہونچے ہیں۔ اب ایسے لوگ نظر نہیں آتے، اگر ہوں گے تو خال خال ہوں گے۔ اس زمانہ کے صوفی اکثر ابن الوقت ہوتے ہیں۔ صوفی ابن الوقت وہ ہے کہ ظاہر و باطن کی صفائی رکھتا ہو اور وقت کا پابند ہو یعنی جب کوئی حال باری تعالےٰ کی طرف سے اُس پر وارد ہو تو مدہوش و بے ہوش ہو جائے جیسے کسی کو بخار یا لرزہ چڑھتا ہے اور وہ بے اختیار ہو کر اُس کو دور نہیں کر سکتا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ مجاذیب کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو ازلی و وہبی، دوسرے کسبی و بے اختیاری مجذوب ازلی وہ ہے کہ روزِ ازل میں اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کی ندا سُن کر اور بلیٰ کہہ کر حضرت رب العزت کے مشاہدۂ جمالِ لایزال سے مست ہو گیا اور تمام شہوات و لذاتِ دنیوی و اُخروی کو دل سے دور کر دیا۔ جب عالم ارواح سے عالم اجسام میں آیا تو اسی طور پر بے خبر رہا اور نیز عالمِ برزخ میں بھی مست الست جائے گا ؎

پندار اینکہ مہرت از دل عاشق رود ہرگز　　چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد

مگر یہ مجذوب مقاماتِ مشہورہ سے بے خبر اور سیر و سلوک سے ناواقف ہوتا ہے۔ ہاں! جس قدر روزِ ازل سے اُس کو معلوم ہو گیا اُسی منزل پر مستقل رہتا ہے اور اکثر مجذوبوں کو مکاشفہ کونی ہوتا ہے نہ مکاشفۂ ذاتی۔ بے اختیاری مجذوب وہ ہے کہ عالم اجسام کے اندر بالکل ہوشیار آیا اور مدت تک سمجھ بوجھ میں رہا لیکن اتفاقاً کسی کامل کا مرید ہوا اور مرشد نے اپنے خاندان کے موافق اُس کو تعلیم و تلقین فرمائی۔ جب نوبت سلطان الذکر کی پہونچی اور ہر جانب سے غلبۂ انوار ہوا تو بے اختیار ہو کر ہوش و خرد کے جامہ سے باہر نکل گیا۔ اگر سلطان الذکر کا متحمل ہو جاتا تو سالکوں میں سے ہوتا۔ یا اس طرح پر کہ کسی مست و مجذوب کی نگاہ دفعۃً پڑ گئی اور بے قرار ہو کر مست و مدہوش ہو گیا۔ بس اگر اُس کا حوصلہ بلند اور توفیق الٰہی رفیق حال ہے تو مکاشفات کی بہار اور مقامات کی سیر دیکھتا ہے اور تمام منازل کو طے کرتا اور کبھی کبھی ہوش میں آ کر ہوشیاری کی گفتگو کرتا ہے ع

کہ دیوانہ ہے لیکن بات کہتا ہے ٹھکانے کی

اور ایسے مجذوب کو مکاشفۂ صفاتی از حد ہوتا ہے اور اُس کی طبیعت تشبیہ کی طرف راغب رہتی ہے۔ لیکن مجاذیب سے فیض بہت کم ہوتا ہے اور اگر ہوا بھی تو یہ ہوا کہ اپنا سا بنا لیا۔ حاصل یہ ہے کہ سالک کا مرتبہ مجذوب سے کہیں بڑھ کر ہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ کی اِن رباعیات کا ورد واسطے دفعِ وسواس اور ازدیادِ محبتِ الٰہی کے بوقتِ تہجد موجبِ منافعِ کثیر ہے۔ رباعی

یارب زگناہِ زشتِ خود منفعلم | وز قولِ بد و فعلِ بدِ خود خجلم
فیضے بدلم زعالمِ قدس بریز | تا محو شود خیالِ باطل زدلم

رباعی

تسبیح ملک را و صفا رضواں را | دوزخ بدرا و بہشت مرنیکاں را
دُنیا جم را و قیصر و خاقاں را | جاناں مارا و جانِ ما جاناں را

رباعی

اے آنکہ بملکِ خویش پایندہ توئی | وازِ ذا امن شب صبح نمائندہ توئی
کارِ من بے چارہ قوی بستہ شدہ | بکشائے خدایا کہ گشائندہ توئی

ایک روز ارشاد ہوا کہ خاندانِ قادریہ و چشتیہ میں ذکرِ جہر معمول و مختار ہے کیونکہ اِس میں ترقیٔ ذوق و شوق ہے، لیکن اگر نقشبندی یا سُہروردی ذکر جہر کریں تو پہلا ذوق و شوق بھی جاتا رہتا ہے بقول شخصے ؎

کاہو کے من کچھو بسے کاہو کے من کچھ نہ سُہائے | آگ پھونک سے بل اُٹھے دیا پھونک سے بُجھ جائے
در حقِ او مدح در حقِ تو ذَم | در حقِ او شہد در حقِ تو سَم

ایک روز ارشاد ہوا کہ اس شعر میں ایک شغل بیان کیا ہے۔

می بخور د مُصحف بسوز و آتش اندر کعبہ زن | ساکنِ بتخانہ باش و مردم آزاری مکن

مے سے مراد عشق ہے اور مصحف سے جسمِ انسان۔ کعبہ دل اور بُت خانہ تصورِ شیخ

یار سول یا معشوق اور مردم آزاری سے مراد ہے پلک مارنا۔ اسی طرح اس شعر میں ایک شغل ہے۔ ؎

چشم بند و گوش بند و لب بہ بند گر نہ بینی سرّ حق بر ما بخند

یہی مضمون کبیر صاحب نے فرمایا ہے۔ ؎

دیکھ رہی[1] دیکھ تجھ میں تیرا دھنی دم کو روک دیدار پاوے
دم کو روک اور رمول کو بند کر، چاند سورج گھر ایک آوے
نابھ کے سانس سے منتر جپ جپ کرے اور کنول کی کلی پہ بھنور چھاوے
کہیں کبیر اگم کی پیڑیاں سُن کے سیج کوئی سنتہ جاوے

یہ اشعار پڑھ کر مولانا گل حسن سے ارشاد فرمایا کہ تم اس شغل کو سمجھے یا نہیں۔ انھوں نے عرض کیا کہ حضرت میری سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ نے ترکیب مذکورہ کے بموجب ان کو اپنے سامنے بٹھایا اور فرمایا کہ سورج تو ناک کا داہنا نتھنا ہے اور چاند بایاں۔ اور رمول سے مراد مقعد ہے اور یاد رکھو کہ جس طرح گھوڑے کی دونوں باگیں برابر ہوتی ہیں تو سیدھا جاتا ہے اسی طرح جب دونوں نتھنوں سے سانس برابر اور یکساں جاری ہوتا ہے تو دل بھی قائم و ثابت ہو جاتا ہے اور وسواس و خطرات من کل الوجوہ دور ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ترکیب دونوں سروں کو تساوی کرنے کی بتائی تو فوراً دونوں سانس برابر ہو گئے اور حقیقت میں دل قائم ہو گیا اور ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ اور پھر فرمایا کہ اسی باب میں کمال پسر کبیر نے بھی فرمایا ہے ؎

آنکھ، ناک، منھ ڈھانپ کے نام نرنجن لے اندر کے پٹ جد کھلیں جد باہر کے پٹ دے

ایک روز ارشاد ہوا یہ بھی ایک شغل ہے۔ ؎

سن مکھ کرو دیدار محل میں پیارا ہے تربینی کے گھاٹ میں ماجھی دھارا ہے

تربینی اس مقام کو کہتے ہیں جہاں تین دریا جمع ہو جائیں اور یہاں مراد ہے دماغ سے

---

[1] یعنی دیکھ اپنے آپ میں اپنے مالک کو اس ترکیب سے کہ دم اور مقعد کو بند کر تاکہ سانس ہر دو سوراخ بینی کا برابر چلنے لگے اور سانس کو نابھ کنول سے کھینچ کر من کنول پر ایسی ضرب لگاؤ کہ جیسے پھول پر بھونرا گونجتا ہے تاکہ ذات الٰہی کا ظہور ہو یہ راہ سلوک ہے اور توحید کے بھید ان میں جا نامردوں کا کام ہے ۱۲۔

یعنی جس وقت انسان اس شغل کو کرتا ہے تو مقام دماغ میں جس کا نام ہندی میں برم منڈ یعنی اخفی ہے تین آنکھیں یک جا جمع ہو جاتی ہیں۔ دو چشم ظاہر اور ایک چشم دل جس کا نام سُویدا ہے۔ اس شغل کا نام ترکُٹی ہے اور اسی کو نصیراً محمود ابھی کہتے ہیں۔ ترکیب یہ ہے کہ اول دونوں آنکھوں کی نظر سرِ بینی پر قائم کرے۔ چند روز کے بعد پتلی بہ طرفِ دماغ چڑھ جائے گی۔ اور چشم دل بھی اُسی طرف رجوع کرے گی۔ جب ہر سہ چشم دماغ میں مجتمع ہو جاتی ہیں تو روح کو صعود حاصل ہوتا ہے۔ اور اس صعود کا انجام تین حال سے خالی نہیں۔ اگر طالب کم ظرف اور مُرشد ناقص ہے تو پردۂ دماغ پھٹ جائے گا اور روح نکل جائے گی۔ اور اگر طالب خود قوی ہے تو پرم ہنس یعنی مجذوب بن جائے گا۔ اور اگر مرشد کامل ہے تو روح اس صعود سے نزول کرے گی اور انوارِ روحانی سے تمام جسم روشن اور منوّر ہو جائے گا، لیکن غذا اس عمل میں نہایت لطیف ہونی چاہیے جیسے دودھ چاول اور مسکہ گاؤ کا استعمال بھی ضروری ہے۔ ابتدا میں آنکھوں پر بڑا زور پڑتا ہے، بتدریج اس کی مشق بڑھایا کرتے ہیں۔

ایک روز ارشاد ہوا [۱۴] کہ جب منشی فضل رسول صاحب نے دو سوال پیش کیے جو میر عباس علی صاحب نے بغرض حصولِ جواب ارسال کیے تھے۔ سوال اول یہ تھا کہ کامل کی کیا شناخت ہے آپ نے فرمایا کہ اول تو کامل کوئی ہوا ہی نہیں سب مُبتدی رہے۔ یہاں تک کہ پیغمبر خُدا صلعم نے بھی خود فرمایا ہے وَمَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ پس جب سب کے پیشوا ایسا ارشاد فرمائیں تو اوروں کی کیا حقیقت ہے ؎

دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر — ما ہمچناں در اوّلِ وصفِ تو ماندہ ایم

اور عُرفِ عام میں جو کامل و مکمل کہا جاتا ہے سو ہندوستان بھر میں ایک ہی دو کامل ہوں گے اور شناخت نسبت کی اہلِ نسبت کر سکتا ہے۔ رہا عرفان و حق شناسی اس کو کوئی کیا پہچان سکتا ہے اور یہ امر سائل سے پوچھنا چاہیے کہ وہ کس بات کو کمال سمجھتے ہیں تو اُس کا حال بیان کیا جائے۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ کامل کی سیر کہاں تک ہے اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ سدرۃ المنتہیٰ تک تو خودی قائم رہتی ہے۔ اس کے بعد کا حال قابلِ بیان نہیں۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ لوگوں کے عقائد تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک فرقہ کہتا ہے کہ جو کچھ ہے خدا ہی کے اختیار سے ہے، بندہ کا کچھ اختیار نہیں۔ دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ کچھ تو بندہ کا اختیار ہے، باقی خدا کا۔ تیسرا گروہ قائل ہے کہ نیکی خدا کی طرف سے ہے اور بدی اپنی طرف سے اگرچہ یہ بات کہی جاتی ہے، مگر اصل میں جھوٹ ہے۔ جو کچھ ہے اُسی کی طرف سے۔ بھلا شیطان کو کس نے پیدا کیا اور اس کو تعلیم کس نے کی اور پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو کس نے پیدا کیا اور کس نے تعلیم کی۔ کسی کو شانِ مذلی کی تعلیم دی اور کسی کو شانِ عزّی کی تعلیم فرمائی۔ اُستاد دونوں کا ایک ہے۔ ع

بحرِ وحدانی ست جفت و زوج نیست

ایک روز ارشاد ہوا کہ فقرا کے دو فرقہ ہیں ؎

قومے بجد و جہد نہادند وصلِ دوست — قومے دگر حوالہ بہ تقدیر می کنند

لیکن جدّ و جہد بھی بدون کشش سرکاری نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ ہر امر تقدیرِ الٰہی سے وابستہ ہے لَا تَتَحَرَّكُ ذَرَّةٌ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ اگر انسان غور کرے تو سب کچھ اپنے آپ میں موجود ہے ؎

جان اَجان جہان میں سب میں ہے بھرپور — پاس کہوں تو پاس ہے اور دور کہوں تو دور

کہ جوں بو گل کی گُل کے درمیاں ہے — خدا بندہ میں آکر یوں نہاں ہے

وہ رہا آغوش میں لیکن گریزاں ہی رہا — اُس میں مجھ میں ربط ہے اے ذوق مثلِ بو و گُل

بعض توحیدِ وجودی کے قائل ہیں، بعض شہودی کے، بعض اتحادی کے ہیں، بعض حلولی۔ کوئی عینی ہے کوئی ظلّی، کوئی اوست کا قائل ہے، کوئی از وست کا، کوئی ہمہ اوست کا۔ چنانچہ شیخ عطار فرماتے ہیں ؎

او چو خورشید است ماچوں سایہ ایم — ہمچو نور و سایہ ماہمسایہ ایم

لیکن بہتر یہ ہے کہ جو کچھ عبادت و طاعت زہد و ریاضت انسان کرتا ہو، اُسی میں لگا رہے۔ اہلِ شریعت کو ورع و تقویٰ اور صوم و صلوٰۃ اور اہلِ طریقت کو اپنے ذکر و فکر میں مشغول رہنا چاہیے، کیونکہ رازِ بطون نہ کسی پر ختم ہوا اور نہ ہو ؎

حدیث از مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو — کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معمّا را

نیست کس را از حقیقت آگہی   جملہ می میرند با دستِ تہی

ایک روز ارشاد ہوا کہ اَلطُّرُقُ اِلَی اللّٰہِ بِعَدَدِ اَنْفَاسِ الْخَلَائِقِ کے کیا معنی ہیں۔ مولانا گل حسنؒ نے عرض کیا کہ حضور ہی بیان فرمائیں۔ فرمایا کہ نہیں تم بیان کرو تاکہ تمھارے ذہن کی رسائی معلوم ہو۔ اُس وقت اُنھوں نے عرض کیا کہ میرے قیاس میں تو یہ معنی آتے ہیں کہ ہر ایک کے لیے ایک کام مقرر ہے اور وہی کام اس کے واسطے طریق موصل الی المطلوب ہے۔ ؎

ہر کسے را بہر کارے ساختند   میل آں اندر دلش انداختند

یعنی جس کام میں مشغول ہے وہی کام کرتے کرتے فنا ہوگیا جہاں سے آیا تھا وہیں جا پہونچا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؎

حباب وار زبہر نظارہ آمدہ ایم   کہ سر زنیم و تماشا کنیم و باز رویم

اور اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ ۝ یعنی نہیں پیدا کیا میں نے جن اور انس کو مگر واسطے عبادت کے پس کون ہے جو خلاف مرضی خدا کر سکے یعنی خدا نے تو واسطے عبادت کے پیدا کیا اور وہ برخلاف کرے کہ نقش نقاش سے خلاف نہیں کر سکتا اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو شخص جس کام میں ہے اُس کے واسطے وہی عبادت ہے ؎

از ازم کہ بر سر نوشتی ز پیش   تم کردم اے بندہ پرور بہ بیش

رباعی

گر زر عملند خلق و گر معزولند   چوں در نگری جملہ بحق مشغولند
در مذہب تست بر گزینی کردن   ایں جا کہ منم جملہ جہاں مقبولند

کما قال اللہ تعالےٰ وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ اِلَّا ھُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِیَتِھَا اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ یعنی کوئی جنبندہ نہیں ہے مگر اس کی چوٹی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ بدرستے کہ میرا پروردگار راہ مستقیم پر ہے یعنی جس کے ہاتھ میں سب کی چوٹی ہے وہ راہ راست پر ہے تو ظاہر ہے کہ سب راہ راست پر اور سب کا منتہی حق ہے۔ وَاِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی ؎

چوں از و بود ابتدائے ہمہ   ہم بدو باشد انتہائے ہمہ

چوں ہمہ راہ اوست از چپ و راست — تو بہر رہ کہ می روی او راست
کس کشاند می کشد کانا الیہ راجعون — چوں روی جائے دگر فکر غلط باشد جنوں

آپ نے فرمایا کہ تم خوب سمجھے۔ یہی معنی ہیں ؎

ہر چند اس کی سمت سوا راہ ہی نہیں — تس پر بھی حیف یہاں کوئی آگاہ ہی نہیں
گتنے ہو یوں کہ ہے وہی ہادی وہی مضل — تو راہ پر ہیں سب کوئی گمراہ ہی نہیں

حضرت جنید سے کسی نے پوچھا کہ مَا مُرَادُ الْحَقِّ بِالْخَلْقِ یعنی اللہ کی مراد خلقت کے پیدا کرنے میں کیا ہے۔ تو حضرت نے فرمایا مَا عَلَیْہِمْ جَرٰت یعنی یہی مراد حق ہے جو خلق پر گذر رہا ہے۔ ؎

مومن و ترسا جہود و گبر و مغ — جملہ را رو سوئے آں سلطان الغ
مومن و ترسا جہود و نیک و بد — جملہ گاں را بست رو سوئے احد
صورت از بے صورتی آمد بروں — باز شد انا الیہ راجعون

ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک طالب خدا تھا جہاں کسی فقیر کو سنتا اُس کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ اسی وتیرہ پر بزرگانِ دین کی خدمت میں پھرتے پھرتے ایک مدت گذر گئی، لیکن حصول مقصود کے آثار کچھ نظر نہ آئے۔ ناچار سب سے امید منقطع کی اور جنگل میں ایک درخت کے تلے اس نیت سے جا بیٹھا کہ بس اب خدا کو خدا سے طلب کریں گے ؎

سرمد اگرش وفاست خود می آید — در آمدنش رواست خود می آید
بیہودہ چرا در پئے او می گردی — بنشیں، اگر او خداست با خود می آید

مالا جپوں[1] نہ کر جپوں اور مکھ سے کہوں رام — مورا رام ہمہ کو جپے تو میں پاؤں بسرام

مراقب ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ زمانہ حضرت جُنیدِ بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ حضرت کے پاس ایک گھوڑی تھی خیال آیا کہ اس کو پانی پلانا چاہیے۔ اس لیے سوار ہو کر دریائے دجلہ کی طرف چلے لیکن گھوڑی نے جنگل کی راہ لی۔ ہر چند روکا نہ رُکی۔ گمان کیا کہ کچھ سرِّ الٰہی ہے۔ اس کو

---

[1] مالا تسبیح جپوں یاد کروں کر ہاتھ مکھ منھ رام خدا بسرام آرام یعنی نہ تسبیح پڑھوں نہ ہاتھ پر نہ منھ سے خدا کہوں بلکہ میرا خدا مجھ کو یاد کرے تو میں آرام پاؤں ۱۲ -

مطلق العنان کر دیا۔ چلتے چلتے پہر بھر کے بعد اُس درخت کے پاس پہونچے جہاں وہ طالب، دل سوختہ بیٹھا تھا۔ اُس وقت حضرت کو دریافت ہوا کہ اسی طالب کی کشش تھی، ایک نگاہ میں مقصد اُس کا پورا کیا ؎

سالہا بروند مرداں انتظار تا یکے را بار شد از صد ہزار

پھر حضرت جُنید نے اُس طالب سے ارشاد کیا کہ تم جانتے ہو میں کون ہوں۔ اُس نے جواب دیا آپ میرے پیر و مرشد اور رہنما ہیں۔ حضرت نے فرمایا اگر تم کو اس راہ میں پھر کبھی قبض واقع ہو اور حیرانی پیش آئے تو بغداد میں میرے پاس چلے آنا۔ اُس نے جواب دیا کہ حضرت اب میں آپ کے پاس آیا ہوں یا آپ میرے پاس۔ میں تو ایسے کا دروازہ پکڑ کے بیٹھا ہوں کہ اگر اس قسم کا معاملہ پھر پیش آیا تو کسی اور کی گردن پکڑ کے بھیج دے گا۔ مجھ کو کسی کی پروا نہیں۔ آپ نے فرمایا شاباش، اس راہ میں طالب کو ایسا ہی چاہیے۔ یک در گیر و محکم گیر ؎

ہم مٹ گئے تو صورتِ ہستی نظر پڑی ویراں جب آپ ہو گئے بستی نظر پڑی
دیکھا تو خاکسار ہی عالی مقام ہیں جوں جوں بلند ہم ہوئے پستی نظر پڑی

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت جنید حقیقت میں بڑے فیاض تھے اور آپ سے بہت کچھ فیض ہوا ہے۔ چنانچہ نقل ہے کہ ایک روز مسجد میں تھے ایک شخص آیا اور کہا کہ حضرت آپ کا وعظ شہر ہی میں کام کرتا ہے یا جنگل میں بھی کچھ تاثیر بخشتا ہے آپ نے حال پوچھا۔ اُس نے عرض کیا کہ چند اشخاص فلاں مقام پر جنگل کے اندر راگ رنگ میں مصروف اور دورِ شراب سے سرمست ہیں۔ آپ اُسی دم تنہا کھڑے ہو گئے اور منہ لپیٹ کے جنگل کی راہ لی۔ جب قریب پہونچے تو وہ لوگ بھاگنے لگے۔ فرمایا کہ بھاگو مت، میں بھی تمھارا ہم مشرب ہوں اور اسی واسطے آیا ہوں۔ وہ لوگ جمع ہو کر بیٹھ گئے۔ آپ نے فرمایا کہ یارو! ہمارے واسطے بھی لاؤ شہر میں تو پی نہیں سکتے۔ آج تمھارا حال سُن کر پوشیدہ طور پر یہاں آئے ہیں کہ یارانِ ہم مشرب میں چل کر پییں گے۔ اُن لوگوں نے کہا کہ حضرت ہم کو یہ معلوم ہوتا تو ہمیشہ آپ کو بلایا کرتے۔ افسوس ہے کہ اس وقت کچھ بھی شراب باقی نہیں ہے۔ فرمایئے تو شہر سے منگائی جائے۔ حضرتؒ نے فرمایا کیا تم کو کوئی ایسی بات نہیں آتی کہ شراب خود بخود آ جایا کرے؟ وہ بولے کہ صاحب یہ کمال تو ہم میں نہیں ہے۔

فرمایا کہ آؤ میں تم کو ایک ایسی بات سکھاؤں کہ شراب خود آجائے پھر شراب کا مزا دیکھو وہ سب مشتاق ہوئے کہ یہ کمال تو ضرور بتا دیجیے۔ کہا کہ اچھا اوّل نہاؤ پھر کپڑے بدل کر میرے پاس آؤ۔ سب نے غسل کیا کپڑے دھوئے اور پاک وصاف ہو کر آموجود ہوئے۔ تب فرمایا کہ سب دو دو رکعت نماز پڑھو۔ جب وہ نماز میں مشغول ہوئے تو آپ نے دعا مانگی کہ یارِ ندایا! میرا تو اتنا ہی اختیار تھا کہ آپ کے حضور میں ان کو کھڑا کر دیا۔ اب تم کو اختیار ہے یُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ ۔ ہمت مرداں مددِ خدا۔ حضرت کی دُعا منظور ہوئی اور وہ سب کامل ہوگئے۔

فضلِ ساعت کارِ صد سالہ کُند نارِ ابراہیم را لالہ کُند
ذرّہ سایہ عنایت بہتر ست از ہزاراں کوششِ طاعت پرست

کہتے ہیں کہ حضرت جُنید کے اُنیس[۱۹] خلیفہ ہوئے ہیں کہ ہر ایک اُن میں سے بہتر و برتر تھا اور سوائے اُن کے اور بہت لوگوں کو حضرت سے فیض پہونچا ہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت جُنید رحمۃ اللہ علیہ ایک بار مع اپنے رُفقاء کے جہاد میں گئے، جب جنگ شروع ہوئی تو آپ نے دیکھا کہ گیارہ محافے لیے ہوئے فرشتے کھڑے ہیں اور حوریں اُن کے گرد ہیں۔ خیال آیا کہ ہم گیارہ کے گیارہ شہید ہوں گے۔ چنانچہ ایک رفیق شہید ہوا تو ایک محافہ غائب ہوگیا۔ پھر تو یقین ہوا کہ بالضرور ہمارے واسطے بھی شہادت ہے غرض کہ اسی طرح دس یار تو شہید ہوگئے۔ اب حضرت جُنید کی باری آئی۔ ایک یہودی آکر مقابل ہوا اور اُن کو پہچان کر بولا کہ حضرت آپ کہاں، طالبِ خدا کو لڑائی جھگڑے سے کیا سروکار۔ فرمایا کہ میاں تم دیکھتے نہیں کہ ایک محافہ لیے ہوئے فرشتے موجود ہیں۔ دس محافے تو میرے رفیقوں کو لے کر غائب ہوگئے یہ ایک میرے واسطے باقی ہے۔ اس نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو مجھے بھی ایمان تلقین کرو۔ وہ مسلمان ہو کر اسی دم کفار سے لڑا اور شہید ہو کر اُس بقیہ محافہ میں روانۂ بہشت ہوا۔ حضرت کو الہام ہوا کہ جاؤ، تم اپنا وہی کھرپا جالی سنبھالو۔ ناچار واپس تشریف لائے اور اپنی تسبیح پھیرانے لگے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت سلطان بایزید بُسطامی رحمۃ اللہ علیہ پہلے تو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے بیعت ہوئے۔ دو جگہ اُن کی بیعت او رثابت ہے اور تین سو ساٹھ بزرگوں سے ملے ہیں

لیکن باوجود اس جدّ و جہد و کوشش اور ملاقات کاملین کے، مقصودِ دلی کو نہ پہونچے۔ جب پھرتے پھرتے ناچار ہوے اور اُس بے نشان کا کہیں نشان نہ پایا تو خیال آیا کہ خیر خدا نہ ملا تو چلو خانۂ خدا ہی کی زیارت کریں، چنانچہ مولانا روم صاحب علیہ الرحمہ لکھتے ہیں ؎

سوئے مکہ شیخِ اُمت بایزید — از برائے حج و عُمرہ می دوید
او بہر شہرے کہ رفتی از نخست — مر عزیزاں را بکردی باز جست
گردِ می گشتی کہ اندر شہر کیست — کو برارکانِ بصیرت مُتّکی ست
گفت حق، اندر سفر ہر جا روی — باید اوّل طالبِ مردے شوی
قصد گنجے کن کہ ایں سود و زیاں — در تبع آید تو آں را فرع داں
بایزید اندر سفر جستی بسے — تا بیابد خضرِ وقت خود کسے
دید پیرے با قدے ہمچوں ہلال — بود دروے فر و گفتارِ رجال
دیدہ نابینا و دل چوں آفتاب — ہم چو پیلے دیدہ ہندوستاں بخواب
چشم بستہ خفتہ بیند صد طرب — چوں کشاید آں نہ بیند ایں عجب
پس عجب در خواب روشن می شود — دل درونِ خوابِ روزن می شود
وانکہ بیدار است و بیند خواب خوش — عارف ست و خاک او در دیدہ کش
بایزید او را چو از اقطاب یافت — مسکنت بنمود و در خدمت شتافت
پیشِ او بنشست و می پرسید حال — یافتش درویش و ہم صاحب عیال
گفت عزمِ تو کُجا اے بایزید — رخت غربت را کجا خواہی کشید
گفت قصدِ کعبہ دارم از پگاہ — گفت ہیں با خود چہ داری زاد راہ
گفت دارم از درم نقرہ دو بیست — نک بہ بستہ سخت بر گوشہ ردیست
گفت طوفے کن بگردم ہفت بار — ویں نکوتر از طوافِ حج شمار
واں درم ہا پیشِ من نہ اے جواد — دانکہ حج کردی و حاصل شد مُراد
عُمرہ کردی عُمرِ باقی یافتے — صاف گشتے بر صفا بشتافتے
حق آں حقے کہ جانت دیدہ است — کہ مرا بر بیت خود بگزیدہ است

کعبہ ہر چند ے کہ خانہ برّ اوست — خِلقتِ من نیز خانہ سرِ اوست
تا بکرد آں خانہ را در وے نہ رفت — واندریں خانہ بجز آں حی نہ رفت
چوں مرا دیدی خدا را دیدۂ — گردِ کعبہ صدق بر گردیدۂ
خدمتِ من طاعت و حمدِ خداست — تا نہ پنداری کہ حق از من جداست
چشم نیکو باز کن در من نگر — تا بہ بینی نورِ حق اندر بشر
کعبہ را یک بار بیتے گفت یار — گفت یا عبدی مرا ہفتاد بار
بایزیدا کعبہ را دریافتے — صد بہا و عزّ و صد فر یافتے
بایزید اں نکتہ ہا را ہوش داشت — ہمچو زریں حلقہ اش در گوش داشت
آمد از وے بایزید اندر مزید — منتہی در منتہی آخر رسید

غرض یہ ہے کہ حضرت بایزید سالہا سال جِدّ و جہد میں رہے اور طلب و تلاش میں عمر گذاری اور کچھ حاصل نہ ہوا لیکن قسمت میں تو یوں تھا کہ ایک مردِ خدا آنکھوں کے اندھے گانٹھ کے پورے مل جائیں گے اور دم زدن میں ان کو کامل بنا دیں گے ؂

علم انوار است در جانِ رجال — نے ز راہ دفتر و نے قیل و قال

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کبھی کبھی تھانیسر تشریف لے جایا کرتے تھے اس زمانے میں جلال الدین تھانیسری بڑے متبحّر عالم تھے اکثر آپ کے مریدوں سے یہ ہی کلام خطاب کرتے کہ تمھارا پیر نچنیا آیا ہے ایک روز مریدوں نے حضرت کے روبرو شکایت پیش کی تو آپ نے فرمایا کہ اگر پھر کبھی مولوی صاحب یہ بات فرمائیں تو یوں کہنا کہ ہمارے پیر ناچتے بھی ہیں اور نچا بھی دیتے ہیں۔ اتفاقاً اس محفل میں سے ایک شخص باہر نکلا اور مولانا جلال الدین سے ملاقی ہوا تو انھوں نے حسبِ عادت یہی سوال کیا کہ کیوں میاں تمھارے پیر نچنیا آگئے؟ اُس نے جواب دیا کہ ہاں صاحب ہمارے پیر ناچتے بھی ہیں اور نچا بھی دیتے ہیں اتنا کلام سنتے ہی مولوی صاحب نے کپڑے پھاڑ جنگل کی راہ لی کئی دن کے بعد ہوش آیا تو یہ شعر لکھ کر حضرت کی خدمت میں بھیجا ؂

کر کانپے لیکھن ڈگے اور روم روم تھرّائے — سُدھ آوت چھاتی پھٹے جو پاتی لکھی نہ جائے

ف[1] کر۔ ہاتھ لیکھن قلم۔ ڈگے گرے ر۔م بال تھرائی کانپی سدھ ہوش۔ آوت آدے چھاتی سینہ یعنی ہاتھ اور تمام بدن لرزہ میں ہے قلم ہاتھ سے گرا جاتا ہے۔ خط لکھوں تو کس طرح لکھوں اور جب ہوش آتا ہے تو فراق میں سینہ شق ہوتا ہے ۱۲ منہ۔

حضرت نے جواب میں لکھا ؎

پیتم پتیاں جب لکھوں کہ جو تم ہو بدیس ۔ تن موں من موں نین موں تن کو کیا سندیس

اُسی وقت جلال الدین صاحب حاضر ہوکر مرید ہوئے اور خلافت حاصل کرکے گوشۂ صحرا میں جا بیٹھے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت عبد القدوس گنگوہی کا ایک مرید دہلی کو جانے لگا۔ بروقت روانگی عرض کیا کہ حضرت دہلی کے شاہ ولایت کا پتہ بتا دیجیے تاکہ اُن سے ملوں۔ آپ نے فرمایا کہ عصر کے وقت فلاں بازار میں لکڑیوں کا گٹھا لے کر آئے گا۔ اور یہ شکل شباہت ہے۔ جب یہ شخص دہلی پہونچا بموجب نشان کے پایا اور دور سے کھڑا ہوا دیکھتا رہا۔ اتنے میں ایک سپاہی نے گٹھے کی قیمت پوچھی۔ یہ بولے کہ چار ٹکے اور چار کوڑی۔ وہ بلا کرلے گیا۔ لکڑیاں ڈلوائیں اور چار ٹکے حوالے کیے۔ چار کوڑی پر تکرار ہوئی۔ سپاہی نے مار پیٹ کر نکال دیا۔ ناچار گھر پہونچے اور وہ چار ٹکے بیوی کو دیے۔ وہ جھلائی اور ان کی خوب درستی کی۔ تھوڑی دیر بعد سر سہلاتے ہوئے باہر نکلے تو اُس مرید گنگوہی نے جو ان تمام معاملات سے متعجب کھڑا تھا۔ پوچھا حضرت آپ کا ایسا تو عالی مرتبہ اور یہ کیفیت اوقات۔ کیا بھید ہے؟۔ جواب دیا کہ میاں یہ رُتبہ ہم کو اسی نیک بخت تند مزاج بیوی کے طفیل سے نصیب ہوا ہے۔ کیونکہ ہمیشہ اس کے ظلم سہتا اور صبر کرتا ہوں۔ میرا دستور ہے کہ جب لکڑیاں لاتا ہوں تو اس سے دریافت کرلیتا ہوں کہ بول آج کتنے کو بیچوں۔ جو کچھ وہ کہہ دیتی ہے تعمیل کرتا ہوں۔ اگر اس میں فرق پڑا تو میرا یہ حال ہوتا ہے۔ جو تم نے دیکھا آج چار ٹکے اور چار کوڑی کی فرمائش ہوئی تھی۔ جس کے لیے دو جگہ مار بھگتنی پڑی ؎

کہے کبیر سنو بھائی سادھو کوئی منہ نہیں سو ناری ۔ راجہ دُکھیا پرجا دُکھیا جوگی کو دُکھ دو ناری

ایک روز ارشاد فرمایا کہ جب شیخ جلال تھانیسری رحمۃ اللہ علیہ بعد حج مدینۂ منورہ میں پہونچے اور بوقتِ معاودت حصولِ رخصت کے واسطے روضۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر

۱؎ پیتم دوست۔ پتیاں خط۔ بدیس دور۔ یعنی اے دوست خط اس کو لکھا کرتے ہیں جو دور ہو اور جو تن من اور آنکھوں میں ہو اُس کو کیا پیغام دیا جائے۔ پہلے مصرعہ میں حرف ندا محذوف ہے ۱۲ منہ۔

حاضر ہوئے تو آواز آئی کہ اپنے پیر بدعتی کو ہمارا اسلام کہہ دینا۔ جب شیخ جلال اپنے پیرومرشد کی خدمت میں پہونچے تو عرض کی کہ بوقت رخصت روضۂ رسولؐ مقبول سے یہ آواز آئی تھی کہ اپنے پیر سے ہمارا اسلام کہہ دینا۔ یہ سُن کر حضرت عبدالقدوس بولے کہ نہیں جس طرح ارشاد ہوا ہے وہی الفاظ کہو۔ آپ نے بحکم اَلاَمرُ فوق الادب اُسی طرح بیان کیا۔ یہ سنتے ہی حضرت کو ایک حالتِ وجد پیدا ہوئی اور بار بار حافظ کے اِس شعر کو پڑھتے رہے ؎

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی — جواب تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکر خارا

تین روز تک یہی عالم رہا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب مولانا رکن الدین خلف حضرت عبدالقدوسؒ گنگوہی نے علوم ظاہری کی تحصیل سے فراغت پائی اور دستار فضیلت بندھی تو ایک شخص نے حضرت عبدالقدوسؒ کو مبارک باد دی۔ فرمایا کہ کیا تم اس بات کی مبارک باد دیتے ہو کہ رکن الدین کسی خاک روبہ پر عاشق ہوا ہے۔ اور اُن کی نسبت نہایت ناراضی اور غصہ کے الفاظ فرمائے۔ شیخ جلال الدین صاحب نے نہایت ادب سے عرض کیا کہ حضرت صاحبزادہ کے حال پر بجائے خفگی کے ایسی عنایت ہی کیوں نہیں ہوتی کہ پاک و صاف ہو جائیں۔ غرض صاحبزادہ بلائے گئے۔ حکم ہوا کہ ہمارے پاؤں دباؤ جب وہ پاؤں دبانے بیٹھے تو حضرت نے اپنے کفِ پا کو اُن کے سینہ پر ملنا شروع کیا۔ وہ بولے کہ حضرت حدیث میں آیا ہے کہ حافظِ قرآن اور عالم کے سینہ پر مُہرِ نبوت ہوتی ہے۔ فرمایا کہ ہاں میں اُسی کو مٹاتا ہوں۔ پھر آپ نے نقاب اُٹھا کر ایک نظر اُن پر ڈالی تو لوٹ پوٹ ہو گئے اور بے ساختہ یہ رباعی زبان پر جاری ہوئی۔ **رباعی**

عاشق و عشق و بُت و بُت گر و عیّار یکے است — کعبہ و دیر و مساجد ہمہ جا یار یکے است
گر در آئی بچمن وحدت و یک رنگی بیں — کہ دراں عاشق و معشوق بگل و خار یکے است

جب یہ حال دیکھا تو حضرت عبدالقدوسؒ نے شیخ جلال کو جو کہ آپ کے خلیفہ تھے ارشاد کیا کہ رُکن الدین کو ہر روز گوشتِ مرغ کھلاتے رہو تاکہ حالت فرو ہو جائے ؎

یک زمانے صحبتے با اولیا — بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا
گر تو سنگ خارہ و مرمر بوئی — چوں بہ صاحب دل رسی گوہر شوی

نا سکھ[1] گھوڑے پالکی نا چتر کی چھانھ — یا سکھ ہر کی بھگت میں یا سکھ سنتوں ماںھ

سر پر[2] زیر ناگ پر تینوں پرس سکھ ناںھ — یا سکھ ہر کی بھگت میں یا سکھ سنتوں ماںھ

ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک طالب عبد القادر نام کسی رسالہ میں ملازم تھے۔ اُنھوں نے اپنے مرشد سے دریافت کیا کہ مجھ کو کچھ فیض ہو گا یا نہیں۔ مُرشد نے ایک ترکیب استخارہ کی بتائی تو ان کو معلوم ہوا کہ ایک شیر نے میرا پیٹ چاک کیا اور تمام آنتیں وغیرہ کھا گیا۔ صبح کو پیر کے سامنے حال بیان کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ تم کو کسی مجذوب سے فیض ہو گا۔ اتفاقاً کچھ مدت بعد اُن کا رسالہ پانی پت میں آیا۔ بعد عشا، خیال ہوا کہ قلندر صاحب کی زیارت کر لینی چاہیے ایسا نہ ہو کہ کل کو رسالہ کا کوچ ہو جائے۔ کوئی بارہ بجے کے قریب آئے اُس وقت مزار کا دروازہ مقفّل تھا۔ باہر کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھنے لگے آواز آئی کہ عبد القادر اندر چلے آؤ۔ عرض کی کہ حضرت دروازہ مُقفّل ہے۔ پھر آواز آئی کہ تمھارے واسطے نہیں ہے، آجاؤ۔ ہاتھ لگایا تو قفل کھُل گیا۔ اندر جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ قلندر صاحب قبر پر سوار ہیں اور ایک پیالہ دودھ سے بھرا ہوا رکھا ہے۔ اوّل اُس میں سے قلندر صاحب نے خود پیا۔ پھر اُن کی طرف اشارہ کیا کہ لو، عبد القادر پیو۔ یہ بھی پی گئے۔ قریب صبح باہر نکلے تو ایک جاروب کش نے جو کہ بارہ برس سے مزار فیض آثار کی جاروب کشی میں مصروف تھا چشم بصیرت سے ان کی حالت کو دیکھا اور بولا کہ دُہائی ہے خدا کی کہ بارہ برس والے کا تو خیال نہ ہوا اور ایک رات والا دولتِ قلندری لوٹ لے چلا۔ **عبد القادر** کی زبان سے نکلا کہ داتا دے اور بھنڈاری کا پیٹ پھٹے۔ یہ کہنا تھا کہ جاروب کش کا پیٹ پھٹا اور وہ مر گیا۔ قلندر صاحب نے ان کو پھر بلایا اور فرمایا کہ کیوں صاحب پہلے ہمارے ہی آدمی پر وار کیا۔ اب تمھاری زبان پہلی سی نہیں رہی۔ ذرا سوچ سمجھ کر بات کیا کرو۔ اُنھوں نے عرض کیا کہ حضور سے تلوار عنایت ہوئی تو اُس کی آزمائش بھی ضرور تھی۔ پھر عبد القادر قلندر ایک گوشۂ صحرا میں جا بیٹھے۔ وہ جاروب کش دفن کیا گیا۔ چنانچہ اُس کی قبر قلندر صاحب کے والدین کے مقبرہ میں شکم چاک موجود ہے۔ بند کرنے سے

---

[1] سُکھ آرام۔ چھانھ سایہ۔ خدا بھگت یاد۔ سنت فقیر۔ یعنی آرام نہ گھوڑے پر نہ پالکی میں نہ سایہ چتر میں اگر آرام ہے تو خدا کی یاد میں ہے یا صحبت فقرا میں ۱۲ منہ [2] سر پر۔ عالم بالا۔ زیر عالم ملک یعنی زمین ناگ پر تحت الثریٰ یعنی عالم بالا اور زمین اور تحت الثریٰ ان تینوں جگہ میں آرام نہیں اگر ہے تو خدا کی یاد میں ہے یا فقرا کی صحبت میں ۱۲ منہ۔

بند نہیں ہوتی۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہم کو ایک نقل یاد آئی کہ حضرت عبد الحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ تشنگیٔ طلب میں جا بجا پھرتے رہے مخدوم جلال الدین کبیر الاولیا، کا نام سن کر پانی پت میں آئے۔ اُس وقت مخدوم صاحب قوالی سُن رہے تھے۔ چونکہ حضرت عبد الحق عالمِ باعمل اور متبع شریعت غرّا تھے، یہ بدعت دیکھ کر واپس چل دیے۔ دن بھر قطع مسافت کی، شام کو پہونچے تو وہی پانی پت تین روز یہی کیفیت رہی۔ چوتھے دن چلے تو جنگل میں ایک آدمی نظر آیا۔ اُس سے پوچھا میاں ہم راہ بھول گئے ہیں ہم کو راہ بتا دو۔ وہ بولا کہ صاحب جو راہ تم ڈھونڈھتے ہو وہ تو مخدوم جلال الدین کے دروازہ پر ہے۔ آخر واپس ہوئے اور مخدوم صاحب کی خدمت میں آکر بیعت کی درخواست کی۔ مخدوم صاحب نے اُسی دم خرقۂ خلافت عطا فرمایا اور رخصت کیا۔ شاہ عبد الحق صاحب نے عرض کیا کہ حضرت مجھ کو تو کچھ بھی علم و انکشاف نہ ہوا فرمایا کہ صاحب جو حکم تھا ہم اُس کی تعمیل کر چکے۔ آگے کُھلنا نہ کھلنا خدا کے اختیار ہے ہمارے بس کی بات نہیں ؎

اودست مربر بادشہ را بادشا حکم او را یفعل اللہ مایشا

اس کے بعد شاہ عبد الحق صاحب چالیس برس تک فقیروں کے پاس پھرتے رہے لیکن کچھ حصول نہ ہوا۔ ناچار مرنا اختیار کیا اور ایک قبر کھود کر اُس کے اندر بیٹھ گئے صرف ایک سوراخ آمدِ ہوا کے لیے رکھا۔ باقی سب منفذ بند کر کے چلّہ کیا بفضلِ خدا کشائش مقصود ہو گئی۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ۔ شعر

آب کم جو تشنگی آور بدست تاکہ جوشد آب از بالا و پست

پس اسی پر قیاس کر لو۔ ہم کو جو بتانا تھا بتا چکے۔ اگر تم کو کچھ فائدہ نہیں ہوا تو چھوڑ دو۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت ذوالنون مصری کے ایک مرید نے بے حاصلی کا گلہ کیا۔ آپ نے فرمایا میاں جو کچھ پڑھتے ہو سب چھوڑ دو ؎

ما بے سر و پائیم تو ہم بے سر و پا باش بگذار سند تکیہ و بے تکیہ گدا باش

اس نے سب ورد وظائف دور کیے۔ لیکن عشاء کی نماز کے صرف چار فرض پڑھ کر سو رہا۔ خواب میں رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی فرمایا کہ بہتر ہے صبر کرنا وقت پر سب کچھ ہو جائے گا۔

گھر اُمت! اور اپنے پیر قطاع الطریق سے کہہ دو کہ تم لوگوں کو گمراہ کرتے ہو یا ہدایت صبح دم کیفیتِ معاملہ حضرت ذوالنون سے گذارش کی۔ بولے کہ شاید تم نے فرض پڑھے تھے۔ ارے کم بخت! اگر فرض بھی نہ پڑھتا تو خود سرکار تشریف لاتے۔ خیر اب ہم کچھ نہیں کہہ سکتے زبردست کا واسطہ درمیان ہے، تم جانو اور وہ جانیں۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جہانگیر بادشاہ کو شاہ حسین ڈھڈا کی زیارت کا اشتیاق پیدا ہوا جو لکڑی کا گھوڑا بنائے اُس پر سوار پھرا کرتے تھے۔ وزرا نے کہا کہ حضور وہ لڑکوں میں کھیلتا رہتا ہے اُس کے پاس جانا مناسب نہیں۔ اتفاقاً رات کے وقت وہ فقیر محلِ شاہی کے جھروکے تلے آنکلے۔ کسی نے بادشاہ کو خبر دی۔ اُس نے جھٹ پٹ کمند لٹکا دی اور شاہ صاحب کو اوپر کھینچ لیا۔ اُس وقت بادشاہ نے پوچھا کہ بھلا خدا آپ کو کیسے ملا۔ کہا جیسے تو۔ بادشاہ بولا میں کیسے ملا کہا کہ جیسے خدا۔ تب بادشاہ نے کہا کہ صاحب اس معمے کا مطلب سمجھائیے فرمایا کہ سنو! اگر میں تم سے مُلاقات کرنی چاہتا تو پہلے دربانوں سے ملتا، پھر اہل کاروں کی التجا کرتا، پھر امیروں، وزیروں کی خوشامد کرتا۔ نہا دھو کے معقول لباس پہن کر حاضر ہوتا۔ پھر نہیں معلوم کہ اُس وقت کے بعد بھی آپ کا جی ملنے کو چاہتا یا نہ چاہتا۔ لیکن جب خود تمھارا جی چاہا تو بے راہ گھسیٹ لیا کسی کو خبر بھی نہ ہوئی ؎

کیسی گلی رقیب کی کیا طعنِ اقربا   تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

اس حکایت کے بعد جناب قبلہ نے فرمایا کہ اسی طرح فقرا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اکتسابی جو درجہ بدرجہ سلوک طے کرتے ہیں اور ایک وہبی کہ جذبۂ غیبی اُن کو ایک آن میں کھینچ لیتا ہے ؎

جب لاگیں برسن کے چاؤ[۱]   بچھوا دیکھیں نہ پروا باؤ

ایک روز ارشاد ہوا کہ میاں گلشن شاہ حضرت مرزا جانِ جاناں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مُرید بلکہ خلیفہ تھے۔ جب حج کو چلے تو راہ میں خیال آیا کہ کسی مردِ خدا کو تلاش کرنا چاہیے ؎

---

[۱] یعنی جب عشق کی برسات ہونے لگتی ہے تو پروا پچھوا اسے نہیں روکتی ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء ۱۲۔

گفت حق اندر سفر ہر جا روی | باید اوّل طالبِ مردے شوی
گر سفر داری بدیں نیت بُرو | در حضر باشد ازیں غافل مشو
فاختہ ساں روز و شب کو کو و کو | گنج پنہانی ز درد پیشے بجو
در بدر می گرد می رد کو بکو | جستجو کن جستجو کن جستجو
رو بجست اندر پناہ مُقبلے | بو کہ آزادت کند صاحب دلے
تا توانی زاولیا رو بر متاب | جہد کن واللہ اعلم بالصواب

غرض جہاں جاتے یہی تلاش رہتی۔ جب مکّہ اور مدینہ کی زیارت سے واپس ہو کر سورت میں پہونچے تو جنگل میں ایک بزرگ سے ملے جو خضر وقت تھے ؎

ہمچو اسرافیل کاوازش بفن | مردگاں را جاں درآرد در بدن
اولیا را در دروں ہم نغمہ ہاست | طالباں را زاں حیات بے بہاست
ہیں کہ اسرافیل وقت اند اولیا | مردہ را زیشاں حیاتست و نما
جانہائے مُردہ اندر گورِ تن | بر جہد ز آواز شاں اندر کفن
یک زمانے صُحبتے با اولیا | بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا
گر تو سنگ خارہ و مرمر بوی | چوں بہ صاحب دل رسی گوہر شوی
مہر پاکاں درمیانِ جاں نشاں | تن مدہ الّا بہ مہر دل خوشاں
دل ترا در سوئے اہل دل کشد | تن ترا در حبس آب و گل کشد
ہیں غذائے دل بدہ از ہمدلی | رو بجو اقبال را از مقبلے
دست زن در ذیل صاحب دولتے | تا ز افضالش بیابی صولتے
صحبت صالح ترا صالح کُند | صحبت طالح ترا طالح کُند

کئی مہینے تک اُن کے پاس رہے۔ ایک دن اُن بزرگ نے فرمایا کہ آج تمھارے پیر کو ایک شخص نے قرابین سے شہید کیا ہے۔ جنازے کی تیاری ہے۔ اگر نماز پڑھنی چاہو تو ہم پہونچا دیں۔ میاں کلّو شاہ نے عرض کیا کہ بہت اچھا۔ اُنھوں نے سر پہ ہاتھ رکھا تو شاہ صاحب دہلی داخل ہوئے۔ یار دوستوں سے ملے۔ جنازہ کی نماز پڑھی۔ جب فارغ ہوئے تو اُنھوں نے سر پہ

ہاتھ اٹھالیا۔ پھر وہیں موجود تھے۔ چند روز کے بعد عرض کیا کہ میرا ارادہ وطن کا ہے فرمایا کہ اچھا رخصت۔ تین باتوں میں سے ایک بات اختیار کرو۔ اگر اپنے پیر جیسا بننا چاہتے ہو تو دہلی تک پہونچتے پہونچتے ہو جاؤ گے۔ اور جو مجذوب ہونا چاہتے ہو تو ابھی لو۔ اگر ہم جیسا ہونا چاہتے ہو تو ایک سال ہمارے پاس رہو۔ اب تم سمجھ لو یہ تیر لگا ہوا پھر کسی سے نکلنے کا نہیں۔ میاں کلن شاہ نے جواب دیا کہ حضرت جو ہونا ہے اسی وقت عنایت ہو جائے۔ کہا بہت اچھا لو!۔ دفعتاً جو القا کیا تو ہوش و حواس جاتے رہے ؎

ست گرو ایسا چاہیے جو سِقلی گر سا ہو ۔۔۔ جنم جنم کے مورچے پل میں ڈالے کھو
نین چھپائے نا چھپیں پٹ گھونگھٹ کی اوٹ ۔۔۔ چتر نار اور سورماں کریں لاکھ میں چوٹ
ست گرو میرا سورما کرے شبد کی چوٹ ۔۔۔ مارے گولہ پریم کا ڈھئے بھرم کا کوٹ
سات پانچ گر کیجیے کوئی ۔۔۔ بھرم مٹاوے ست گرو سوئی
چشم تو افتادہ بوجودم ہمہ حک شد ۔۔۔ ہر چیز کہ در کانِ نمک رفت نمک شد
پریم لگی میں گھل گیو جیسے نیر میں لون ۔۔۔ لون گلا پانی بھیا پنتھ بتادے کون
چلے پوتلی لون کی تھاہ سندھ کا لین ۔۔۔ اپنا تتھ آپوں ملے پھر کو کہے جو بین
این چنیں جویائے درگاہِ خدا ۔۔۔ چوں خدا آید شود جوئندہ لا
سالکاں دانند در میدانِ درد ۔۔۔ تا فنائے عشق با مرداں چہ کرد
سالہا بردند مرداں انتظار ۔۔۔ تا یکے را بار شد از صد ہزار
چوں پس از عمرے بمقصودے رسید ۔۔۔ غرقِ حیرت گشت مقصودے ندید

میاں کلن شاہ کے ساتھی اُن کو لے کر دہلی میں آئے۔ حکما سے علاج کرایا کچھ نہ ہوا مرزا صاحب کے خلفا جمع ہوئے تاکہ نسبت کو سلب کریں ؎

ان دنوں جوشِ جنوں ہے تیرے دیوانے کو ۔۔۔ لوگ ہر سو سے چلے آتے ہیں سمجھانے کو

ہر چند کوشش کی مگر کیا ہوتا تھا بلکہ اُلٹا اثر پڑنے لگا۔ میاں کلن شاہ کی نسبت ان پر غالب آنے لگی۔ پھر تو سب ڈرے کہ ایسا نہ ہو کہیں ہمارا بھی یہی حال ہو جائے۔ ناچار ان کو خانقاہ سے بایں حیلہ نکال دیا کہ پابند شرع نہیں رہا۔ ایک شخص ان کو کوٹ پتلی میں لے آیا۔

اور وہیں آپ کا انتقال ہوا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ شاہجہاں پور میں ایک بزرگ بالاخانہ پر رہا کرتے تھے۔ تعویذ گنڈے پر گذر اوقات تھی۔ اکثر عورتیں بچے اُن کے پاس آتے۔ ایک سپاہی بھی اُن کے ہمسایہ میں رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ ان کو بُرا کہتا اور گالیاں دیتا کہ یہ فقیر بڑا ٹھگ، مکار، فریبی، بدمعاش ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد فقیر صاحب کو عارضہ اسہال لاحق ہوا۔ سپاہی نے بیماری کا حال سُنا۔ دل میں سوچا کہ میں اس فقیر کو ہمیشہ گالیاں دیتا رہا، لیکن اُس نے مجھ کو اپنی زبان سے کبھی کچھ نہیں کہا۔ چلیں اس کی خدمت گذاری کریں اور اپنا قصور معاف کرالیں۔ خیر گالیاں ہم نے دیں تو خدمت بھی ہم کو کرنی چاہیے۔ اول تو عذر تقصیر کیا پھر خدمت شروع کی اور جیسا کہ چاہیے تھا حقِ خدمت ادا کیا۔ آخر اُس فقیر کا دمِ آخر آپہونچا۔ تو سپاہی سے فرمایا کہ ہمارا صندوق کھولو اُس نے کھولا۔ ایک صدری ایک تہ بند ایک ٹوپی نکال سپاہی کو حوالہ کی اور کہا کہ یہی تین چیزیں مرشد نے ہم کو دی تھیں۔ سو ہم تم کو دیتے ہیں۔ اتنا کہہ کر جاں بحق ہوئے۔ کفن دفن کرکے فارغ ہوا تو سپاہی کو نہایت رنج ہوا۔ بروز سوم بہت آدمی جمع ہوئے بعدِ فاتحہ لوگوں نے کہا کہ میاں صاحب نے جو چیز تم کو دی ہے اُس کو ایک دفعہ پہن لو پھر اُتار کر رکھ دینا۔ یہی طریقہ بزرگوں سے چلا آتا ہے۔ سپاہی نے غسل کیا اور وہ خلعت پہنا تو کچھ اور ہی رنگ نظر آیا۔ آنکھوں میں سرسوں پھول گئی۔

سرسوں پھولی آنکھوں میں ۔۔۔ واہ گرو جی خوب پلائی
سرسوں پھولی آنکھوں میں ۔۔۔ لگ گئی پربت کو رائی

اپنا گھر بار چھوڑ کر اُسی بالاخانہ پر جا بیٹھے اور وہ کام جو اُن کے پیر کرتے تھے وہی میاں سپاہی کرنے لگے۔ ۵

تن بھسم لگائی جٹا بڑھائی دودھادھاری لگن کھری ۔۔۔ بن کشٹی کایا کھوج نہ پایا جنم جنم کیے بار مری
بھو تیرتھ سیوی گنگ بھوئی بن ستگر نہیں کاج سری ۔۔۔ گرو کے بلہاری نموں ہمارے جن بھوساگر پار کری

ف۵ بھسم راکھ۔ جٹا بال دودھ دھاری ایک قسم کے فقرا ہوتے ہیں۔ بن کشٹی ثواب کرنیوالا کایا جسم کو کھن پتا بھو بہت تیرتھ زیارت گاہ سیوی پوجا کری کاج کام۔ سری نکلی گرو مرشد۔ بلہاری قربان۔ نموں سلام بھو بہت ساگر دریا یعنی اگر کوئی شخص راکھ لگاوے اور بال بڑھاوے اور دودھ دھاری بن جاوے اور جسم سے ثواب کرے ہر قسم کے اور پوجا کرے زیارت گاہوں میں مثل دریائے گنگ و تالاب بھوتی کے اور ہزاروں دفعہ مرکے زندہ ہو کر بغیر مرشد کامل کے کام نہیں نکلتا قربان جاؤں پیر کے اور سلام کرتا ہوں میں اُن کو کہ بہت دریاؤں سے پار کر دیا ۱۲۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ شہر دہلی میں ایک کسبی نہایت حسینہ وجمیلہ کسی امیر کی ملازم تھی ایک بار گرمی کے موسم میں آدھی رات کے بعد اُس کے مکان کے نیچے کوئی شخص پکارا کہ ہے کوئی ایسا خدا کا بندہ؛ جو ہم کو سرد پانی پلادے۔ اُس آواز سے کسبی بیدار ہوئی اور ایک صراحی برف آب کی اور مُصفّا گلاس ہاتھ میں لیے نیچے اُتری فقیرِ تشنہ کو پانی پلایا۔ جب وہ سیراب ہوا تو جرعہ باقی ماندہ اس کو دیا کہ تو پی لے۔ اُس نے پیا اور پیتے ہی حالت دگرگوں ہوگئی۔ وہ فقیر تو پیالہ پلا کر چل دیے۔ کسبی اُس جگہ بیٹھ گئی۔ امیر کی جو آنکھ کھلی تو آرامِ دل کو پہلو میں نہ پایا ؎

دائیں دیکھا نظر نہ آئی۔ بائیں دیکھا کہیں نہ پائی

بے قرار ہو کر ہر جانب تلاش کرنے لگا۔ دیکھتا کیا ہے کہ وہ دُرِّ یتیم خاک پر غلطاں ہے۔ اُٹھا کر لایا اور سمجھایا۔ دریافت کیا تو وہ بولی کہ اب ہم سے تم سے کچھ رشتہ نہیں۔ نہ میں تمھارے کام کی، نہ تم میرے مطلب کے ؎

عقل گوید دنیا و عقبیٰ بہ جو — عشق می گوید بجز مولےٰ مجو
عقل می گوید کہ خود را پیش کن — عشق می گوید کہ ترک خویش کن

اتنی مہربانی کرو کہ مجھ کو الگ ایک مکان دے دو۔ نہ میں کسی کے پاس جاؤں نہ کوئی میرے پاس آئے۔ چنانچہ سب سے الگ بیرونِ شہر ایک مقبرہ پر رہنا اختیار کیا۔ ایک طالبِ خدا کسی درویش کے پاس گئے۔ اُنھوں نے پتہ دیا کہ فلاں مقام پر ایک عورت رہتی ہے، تم اُس کے پاس جاؤ۔ وہ طالب وہیں پہونچا اور اپنا مطلب بیان کیا۔ وہ بولی کہ میں تو کسبی ہوں اگر کچھ تمھارے پاس ہو تو لاؤ۔ اس کے سوا میں کچھ جانتی نہیں۔ اُس نے کہا آپ کچھ ہی فرمائیں، میں تو ایک بھیدی کا بھیجا ہوا ہوں۔ ٹالے سے ٹلتا نہیں۔ تب کہا خیر تم اس قابل تو نہیں ہو کہ دفعۃً تم کو تعلیم کردی جائے البتہ روزمرہ صبح و شام میرے پاس آ کے بیٹھا کرو لیکن کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ ہم سے اس سے آشنائی ہے۔ ہمیشہ اسی طرح آتے رہے۔ چھ مہینے میں تعلیم کر کے رخصت کیا ؎

دوار کا کہ عبادت گاہ ہیں — آپ کے ملنے کی لاکھوں راہ ہیں

اس کے بعد جناب وقبلہ نے فرمایا کہ جس زمانہ میں ہم مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب سے

پڑھتے تھے تو ہم بھی چند بار اُس عورت کے پاس گئے تھے۔

ایک روز ارشاد فرمایا کہ ایک شخص کسی بزرگ کی خدمت میں واسطے طلبِ کیمیا کے جایا کرتا تھا۔ ایک دن وہ بزرگ بولے کہ ہم تجھ کو کچھ دیں گے۔ چونکہ وہ دنیا دار تھا سمجھا کہ شاید کیمیا بتا دیں گے۔ فقیر صاحب اُس کو غسل کرا کپڑے پہنا جنگل میں لے گئے اور ایک جگہ بٹھا کر کہا تو بیٹھا رہ ہم آتے ہیں۔ یہ کہہ کر چل دیے اور ایک مہینہ تک نہ آئے وہ اُن کو صادق الوعد سمجھ کر وہیں بیٹھا رہا۔ بعد مہینہ بھر کے آئے اور کہا کہ اب تو ذرا کھڑا رہ، ہم آکر اکسیر دیں گے۔ سات روز تک اُسی مقام پر کھڑا رہا۔ پھر آئے اور کہا کہ اچھا بیٹھ جا۔ اُس سے بمشکل بیٹھا گیا۔ بعد اس کے تعلیم و تلقین فرمائی اور وہ شخص نہایت صاحب کمال ہو گیا۔ ع

طلب کس چیز کی تھی اور ملا کیا

خود بخود آں بت عیار ببر می آید — نہ بزور و نہ بزاری نہ بزر می آید

ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک طفل ماہی گیر شکار کو گیا شام تک کوئی مچھلی ہاتھ ہاتھ نہ آئی۔ مایوس بیٹھا تھا کہ سلطان محمود گھوڑے پر سوار پاس آ پہونچا۔ پوچھا کہ او لڑکے غمگین کیوں ہے؟ بولا کہ حضور ہم چار یتیم لڑکے اور ایک ہماری اپاہج ماں ہے اگر کوئی مچھلی مل جاتی ہے تو ہم غریب پیٹ بھر لیتے ہیں۔ سلطان نے فرمایا کہ اے لڑکے مجھے اپنا ساجھی کر لے۔ وہ راضی ہو گیا۔ بادشاہ نے خود شست پھینکی اُس کے نصیب سے سو مچھلیاں شکار ہوئیں لڑکا خوشی کے مارے پھولا نہ سمایا کہا کہ اپنا حصہ بانٹ لو۔ سلطان نے کہا کہ خیر آج کا شکار تو سب تمہارا کل جو شکار ہو گا وہ ہم لیں گے۔ یعنی خود تجھ ہی کو شکار کریں گے۔ چنانچہ اگلے دن سپاہی بھیج کر اُس کو بُلایا اور اپنے برابر تختِ شاہی پر اُس غریب لڑکے کو بٹھایا۔ لوگوں نے کہا بھی کہ حضور کیا کرتے ہیں۔ سلطان نے جواب دیا کہ یہ کیسا ہی غریب و حقیر سہی لیکن ہمارا ساجھی ہے بلکہ ایک بار اُس کو قبول کر لیا تو اب رد نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اُس کو بھی بادشاہ بنا دیا۔ لوگوں نے اس لڑکے سے پوچھا کہ میاں تجھ میں ایسا کیا کمال ہے کہ اس مرتبہ کو پہونچا۔

گفت شادی آمد و شیون گذشت زانکہ صاحب دولتے بر من گذشت

غرض یہ ہے کہ جس کو پیا چاہے وہی سہاگن ہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ زمانۂ ماضیہ میں بموجب حکم اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ یعنی قتل کرو مشرکین کو جس حال میں پاؤ۔ جہاد میں ایک غازی کا کسی مشرک سے مقابلہ ہوا۔ بڑی دیر تک جدال و قتال میں مصروف رہے، کوئی کسی پر غالب نہ ہو سکا۔ نماز کا وقت آیا، غازی نے کہا کہ اب مجھے تھوڑی دیر کے واسطے مہلت دے تاکہ نماز ادا کر لوں۔ اُس نے مہلت دی۔ بعد ازاں نماز پھر مشغول حرب و ضرب ہوئے اتنے میں مشرک کی پوجا کا وقت ہو گیا اُس نے بھی مہلت چاہی اور اپنے دھندے میں لگا۔ مسلمان کو خیال آیا کہ اب وقت نصرت ہے اس کا کام تمام کر دوں۔ ناگاہ غیب سے ندا آئی کہ او بے وفا! کیا اَوْفُوا بِالْعُقُوْدِ کے یہی معنی ہیں۔ اس معاملہ میں تو تجھ سے مشرک ہی افضل نکلا۔ یہ ندا سنتے ہی مسلمان رونے لگا اور گر پڑا۔ جب مشرک اپنی عبادت سے فارغ ہو کر غازی کے مقابلہ میں آیا تو اُس کو زار و بے قرار پایا۔ حال پوچھا۔ اس نے کیفیتِ واقعہ سنائی کہ اس طرح تیرے سبب سے مجھ پر عتاب ہوا۔ مشرک کے دل پر اس بات نے تاثیر کی اور سمجھا کہ بے شک ان کا دین سچا ہے کہ خدا نے عہد شکنی کو جائز نہ رکھا۔ فوراً غازی سے کہا کہ مجھ کو ارکانِ اسلام تعلیم کر اور مسلمان ہو گیا۔ ایسے ہی آج کل کے مسلمان بھی بے وفائی میں یکتا ہیں لیکن ہاتفِ غیب کی ندا ان کو سنائی نہیں دیتی اور قرآن شریف کو دیکھتے نہیں۔ اگر دیکھتے ہیں تو عمل نہیں ؎

بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر این چنیں تسبیح کے دارد اثر

ایک روز ارشاد ہوا کہ بڑا پیر اور رہبر کامل تو بختِ جوان ہے۔ اگر مقسوم میں نہ ہو تو کسی پیر و فقیر سے کچھ نہیں ہو سکتا اور اگر قسمت میں ہے تو پیر خود تعلیم کرنے کو گھر آ جاتا ہے۔ چنانچہ نقل ہے کہ ایک مرد خدا کا وقتِ رحلت قریب ہوا تو بستی میں آئے دیکھا کہ ایک لڑکا جلاہے کا تانی کی پان کر رہا ہے۔ فقیر نے اپنی ٹوپی اُتار اُس کے سر پر رکھ دی اور کہا کہ مجھ کو سرکار نے طلب کیا ہے تو میری تجہیز و تکفین کر دینا۔ اتنا کہہ کر چادر تان کر لیٹ گئے اور رخصت ہوئے۔ ان کے کفن و دفن کے بعد وہ لڑکا سب سے الگ تھلگ قطعِ تعلق کر کے بیٹھ رہا اُس کے وارث رونے پیٹنے لگے اُس نے کہا کہ سنو نہ میں کہیں گیا، نہ کسی سے کچھ طلب کیا۔ نہ میں اس کوچہ سے

واقف تھا۔ خدا نے گھر بیٹھے اپنی نعمت عطا فرمائی ؎

ایکن کو دیت پھراے کے ایکن کو بیٹھے دیت ہے ایکن کو مانگے نہ دیت ایکن کو دیت نہ لیت ہے

اب میں تمھارے کام کا نہیں رہا۔ نہ تم میرے مطلب کے ہو جاؤ اپنا اپنا کام کرو۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ مہاراج کبیر کے گھر ایک بار چند سادھو مہمان آئے اتفاقاً اُس وقت کچھ سامان کھانے پینے کا نہ تھا۔ اپنی بیوی سے کہا کہ اب کیا علاج کیا جائے۔ اُس نے کہا کہ ایک بقّال مجھ پر عاشق ہے۔ اگر کہو تو اُس سے کچھ سودا لے آؤں۔ کہا کہ اچھا شکار کرو ؎

چوں سلاحت ہست وصید بگیر تا بدو شانیم از صید تو شیر
قوس ابرو، تیر غمزہ، دام کید ہر چہ دادت خدا! از بہر صید
روپۂ مرغے شگرفی دام نہ دانہ بنما لیک در خوردش مدہ
کام بناؤ کن او را تلخ کام کے خورد دانہ چو شد محبوس دام

کبیر کی بیوی جو نہایت حسین تھی بقّال کی دُوکان پر گئی اور کہا کہ مہمانوں کے لیے اتنا سامان مطلوب ہے۔ بقّال نے کہا کہ اس شرط پر دیتا ہوں کہ تو رات کو میرے پاس رہے۔ یہ اقرار کرکے سودا لے آئی اور مہمانوں کو پکا کر کھلا دیا۔ جب رات زیادہ گئی تو کبیر نے کہا کہ لو اب کپڑے بدلو اور زیور پہنو، دیکھو تو اس بنیے کی کیا گت بنتی ہے۔ سنگار کرا اپنی چڑھی چڑھا، بنیے کے دروازہ پر جا اُتارا۔ بنیا اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور چونکہ بارش اور کیچڑ ہو رہی تھی، اُس سے پوچھا کہ تمھاری جوتیاں کیوں صاف ہیں۔ ذرا کیچڑ نہیں لگی۔ جواب دیا کہ کبیر اپنی چڑھی چڑھا کر مجھ کو لایا ہے۔ یہ بات سنتے ہی بنیے کی حالت بدل گئی۔ قصور معاف کرایا اور کہا کہ یہ تو میری ماں ہے۔ غرض کبیر نے بقّال کو تعلیم کی اور آٹے دال کا بھاؤ سب بھلا دیا۔

نوٹ: ۔ ایک روز مولانا گل حسنؒ حاضر خدمت ہوئے اُن کی اکثر یہ عادت تھی کہ جس وقت کلام فیض انجام کے سننے کا اشتیاق ہوتا تو یہ شعر زبان پر لاتے ؎

باز گو از نجد و از یاران نجد تا در و دیوار را آری بوجد

جب انھوں نے یہ شعر پڑھا تو مندرجہ صفحہ ۱۹۹ ارشاد فرمایا ۱۲۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ؎

جاکی جاے لگن ہے واکی واکو رام — روم روم میں رم رہے نہیں اور سے کام
پاس کہوں تو پاس ہے اور دور کہوں تو دور — جان اجان جہان میں سب میں ہے بھرپور
دور کہوں تو دور ہے اور پاس کہوں تو پاس — روم روم میں رم رہے جوں پھولن میں باس

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ یعنی ہم قریب تر ہیں بندے کی طرف رگِ گردن سے ؎

یار نزدیک تر از من بمن است — ویں عجب تر کہ من از وے دورم
چہ کنم با کہ تواں گفت کہ او — در کنارِ من و من مہجورم

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہم کو ایک نقل یاد آئی ایک راجہ کو یہ خیال ہوا کہ آخر کار مرنا اور دنیا کو ترک کرنا ہے جیون مکت ہو جانا چاہیے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت ست برجریدۂ عالم دوام ما

لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ تمام برہمنوں کو جمع کیا اور کہا کہ کوئی ایسی بات بتاؤ کہ جس سے جیون مکت ہو جائے۔ برہمنوں نے بچار کے جواب دیا کہ مہاراج ایک تو گاے بناؤ سونے کی اور اتنا اتنا مال دھن برہمنوں کو دو۔ جو تیرتھ کرو، تو بھگوان کی دیا سے جیون مکت ہو جاؤ گے۔ راجہ نے یہ سب کرم کیے مگر کچھ بھی نہ ہوا تب جوگیوں کی طرف رجوع کی۔ انھوں نے اوّل تو کان پھاڑے۔ پھر چار پرکار کی تعلیم کی پہلا پرکار ریچھو چرج دوسرا پرکار بان پرست تیسرا پرکار ڈنڈ کمنڈل چوتھا پرکار بجیا ہوم اور بعض کے نزدیک اول برہم چرج

۱؎ جس شخص کی کسی سے جس قدر محبت ہوتی ہے اُسی قدر اُس کا وہ مطیع ہے اور ہمارے تو بال بال میں بس گیا ہے دوسرے سے مطلب ہی نہیں رہا ۱۲ ۲؎ یعنی ہمارے بال بال میں ایسے بسے ہیں جیسے گل میں خوشبو ۱۲ ۳؎ جیون مکت یعنی جیتے جی آزاد ہو جائے امید بہشت و خوف دوزخ جاتا رہے ۱۲ ۴؎ نہ نفع دے گا مال اور نہ اولاد مگر جو شخص کہ لائے اللہ کے پاس قلب سلیم یعنی وہ دل کہ جس میں محبت غیر خدا مطلقاً نہ ہو یعنی محبت دنیا وغیرہ ۱۲ ۵؎ علم دین خوب حاصل کر کے اس پر عمل جیسا کہ چاہیے کرے ۱۲ ۶؎ جوان و خوبصورت عورت کے ساتھ جفت وخیز کرے کوئی مانع بھی نہ ہو اور خود بھی ہتھیاروں سے درست ہو پھر حملہ نہ کرے بلکہ خیال بھی نہ آوے ۱۲ ۷؎ طالب جہان کا رہنے والا ہے وہاں گھر گھر بھیک مانگی ۱۲ منہ

دوم گھرست سوم بان پرست چہارم بھیا ہوم۔ پہلے تین پرکار تو چیلے کے اختیار میں ہوتے ہیں راجہ نے سب کرلیے۔ چوتھا پرکار گرو کی توجہ پر تھا یعنے پرم ہنس بنا دینا۔ سو کچھ نہ ہوا۔ پھر علماء اسلام کو جمع کیا اور اپنا سوال پیش کیا۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ صاحب اگر دینِ اسلام قبول کرو تو یہ بات ہوسکتی ہے۔ راجہ راضی ہوا کہ بہت اچھا۔ عالموں نے اُس کو مسلمان کیا۔ ختنہ کر ڈالا۔ نماز روزہ حج زکوٰۃ کے ارکان سکھائے۔ جب خوب واقف ہوگیا تو کہا کہ جاؤ اب حج کرو، مدینہ منورہ جاؤ۔ یہ بھی کیا۔ جب اپنے مُلک میں پہونچا تو پھر علماء کو مجتمع کیا اور کہا کہ اب کیا فرماتے ہو مجھے تو کچھ بھی حاصل نہ ہوا ؎

مکّے گئے مدینہ گئے کربلا گئے
جیسے گئے تھے ویسے ہی ہر پھر کے آگئے

اُن سب نے جواب دیا کہ جو کچھ ہمارے دین کی باتیں تھیں ہم تم کو بتا چکے اور ہم کچھ نہیں جانتے۔ جب کہ سب طرف سے جواب ملا اور یاسِ کلّی ہوگئی تو راجہ کو جنون پیدا ہوا۔ ایک ہاتھ سے کان پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے جائے ختنہ اور جابجا کہنا شروع کیا کہ یہ ہندو یہ مسلمان، میں کون ہوں ؎

ظاہر میں گرچہ بیٹھا لوگوں کے درمیان ہوں
پر جانتا نہیں ہوں میں کون ہوں کہاں ہوں

آخر جوئندہ یابندہ وَمَنْ دَقَّ بَابًا وَلَجَّ وَلَجَ ؎

ہر کہ چیزے جست بے شک یافت او
چوں بجد اندر طلب بشتافت او

چوں نہادی در طلب پا اے پسر
یافتی و شد میسر بے خطر

ہیں مباش اے خواجہ یک دم بے طلب
تا بیابی ہر چہ خواہی اے عجب

عاقبت جوئندہ یابندہ بود
چونکہ در خدمت شتابندہ بود

در طلب چالاک شو ایں فتح باب
مے طلب واللہ اعلم بالصّواب

سایۂ حق بر سر بندہ بود
عاقبت جوئندہ یابندہ بود

گفت پیغمبر کہ چوں کوبی درے
عاقبت زاں در بروں آید سرے

چوں نشینی بر سر کوئے کسے
عاقبت بینی تو ہم روئے کسے

لہ توجہ اتحادی یعنی پیر اپنے جیسا بنا دے جیسے حضرت باقی باللہ صاحب نے نان بائی کو بنا دیا تھا ۱۲

چوں ترا چاہے می کشی ہر روز خاک   عاقبت اندر رسی در آب پاک

ناگاہ ایک مردِ خدا مع چند مریدوں کے وہاں آپہونچے۔ راجہ کو دیکھا اور پوچھا کہ کیا کہتا ہے۔ اُس نے کہا یہ ہندو یہ مسلمان میں کون؟ مردِ خدا نے مریدوں کو اشارہ کیا کہ اس کے جوتیاں مارو۔ مارتے مارتے بیچارے کو بے دم کر دیا۔ جب ہوش ہوا تو پھر وہی دُھن۔ غرض اس مردِ خدا نے چار دفعہ پٹوایا اور ہر بار وہی حال پایا پس معلوم کیا کہ عشق اپنی حد پر آگیا ہے۔ ایک نگاہِ پاک اُس پر ڈالی نگاہ کا پڑھنا تھا کہ گم صُم ہوگیا ؎

ستگرُو پورا مل گیو جو کھول دکھائے نین[1]   جگ جھوٹا دیکھن لگا جوڑے پردے کے سین

بجین جھوجھا دس کے اور سُنے سو گڈبڈ ہوئی[2]   بھتے ہر تا پیچ رہے نُہر نہ نکسا کوئی

دریں ورطہ کشتی فرو شد ہزار   کہ پیدا نہ شد تختہ بر کنار

پھر مردِ صاحب دل نے دریافت کیا کہ بولو اب تم کون ہو؟ جواب دیا کہ اب میں کچھ کہہ نہیں سکتا کہ کون ہوں ؎

کچھ نہیں کھلتا مجھے میں کون ہوں   صورتِ حیرت ہوں یا شکلِ جنوں

در بشر روپوش آمد آفتاب   فہم کن واللہ اعلم بالصواب

چندا[3] جھلکے سب گھٹ مائیں   اندھری آنکھ کو دیکھت ناہیں

اب[4] جپ تپ کون کرے مورے بھائی   بھولی مایا گھٹ میں پائی

بھلا[5] میں دیکھا ست گرُ سنتھ سپاہی   رام نام کا پٹا لکھائے اَبھی جاگیر پائی

سرت[6] سینکھری ساج سمجھ کا تن کی تیگ بنائی   جوگ جانگی بُدھی کا مندر پریت پیالی پی آئی

---

[1] یعنی پیر کامل مل گئے آنکھیں کھول دیں تمام جہان چھوٹا معلوم ہوا جب اُنھوں نے دور سے اشارہ کیا ۱۲ [2] لڑائی کے نقارے بج رہے ہیں جو سنتا ہے وہی ست ہو جاتا ہے بہت بہادر اس جنگ میں گئے ہیں اور ایک بھی باہر نہیں نکلا ۱۲ [3] چاند کی روشنی سب جگہ موجود ہے لیکن اندھی آنکھ کو کچھ نظر نہیں آتا ۱۲ [4] اب کون عبادت میں محنت کرے جب کھوئی نعمت و رمال اپنے ہی میں مل گیا ۱۲ [5] یعنی بڑے پیر بہری سپاہی ہیں خدا کے نام کا پروانہ لکھ کر ابھی جاگیر دلوائی ۱۲ [6] اور یہ ہتھیار عنایت کیے ہیں چالاکی سینکھری یعنی کپی بارود کی اور سامان سمجھ کا اور تن کی بندوق اور فقر کی جانگی جو دیسی بندوقوں میں ہوتی ہے جس کو توڑا کہتے ہیں اور عقل کا مندر جس پر جانگی لگائی جاتی ہے اور اس میں محبت کا پیالہ ہے ۱۲ —

ستِ[1] کا سیل جگت کا جمدھر چھما ڈھال ڈہل کاہی ۔۔۔ موہ مورچہ پہلے مارا دُبدا مار ہٹائی
آپا[2] مار، جگت سب مارا تیغ رام پر باہی ۔۔۔ بھرم کے منڈے کاٹ کے ساد ھو تب ہم بنے سپاہی
پانچوں[3] پکڑے کام دھام سے پکڑی ممتا مائی ۔۔۔ داس کبیر چڑھے گڑھ اُپر ابھی نشاں لہرائی

ایک روز ارشاد فرمایا کہ سالک، راہ رو کو کہتے ہیں اور سلوک یہ ہے کہ جو کچھ مقسوم میں ہے بزرگوں کی تعلیم و تلقین سے آہستہ آہستہ حاصل ہو جاتا ہے جیسے رہ رو چلتا چلتا اپنی منزل مقصود کو پہونچتا ہے اور یہ جو دفعۃً کسی کو کچھ ملا ہے، یہ بات اور ہے، سلوک کے خلاف ہے۔ بعض طالب جو اسی امر کے خواہاں رہتے ہیں کہ دفعۃً مل جائے، سو یہ بات ہر شخص کے واسطے نہیں ہو سکتی ہے۔ لاکھوں کروڑوں میں خدا نے کسی کے لیے یہ بات مقرر کر دی تو ہوئی ورنہ سالک کا یہی کام ہے کہ بزرگوں سے جو کچھ اُن کو پہونچا ہے طالب کو بتا دیا۔ آگے ہونا نہ ہونا اُس کے مقسوم پر منحصر ہے، اس میں کسی کا اختیار نہیں۔ اور خدا کو جب کسی پر رحمت منظور ہوتی ہے تو جس طور سے چاہتا ہے کر دیتا ہے۔ چنانچہ ایک شخص تھا اُس کے خیال میں یہ سمائی کہ ایسے پیر کا مرید ہوں گا جو ذات کا شریف صورت کا اچھا، عالم باعمل و صاحب کمال ہو اور جملہ اوصافِ حمیدہ سے موصوف ہو پس ایسے شخص کا ملنا دشوار تھا۔ مدت تک تلاش میں رہا۔ جب کوئی نہ ملا تو ایک دن ناچار دل میں ٹھانی کہ آج صبح کو جو راہ میں مل جائے اُسی کو پیر بنانا چاہیے۔ اتفاقاً ایک چور ملا، اُس نے ارادت ظاہر کی۔ چور نے کہا بھائی میں تو نہ پیری سے واقف نہ مریدی سے آگاہ ہوں

صلاحِ کار کجا و منِ خراب کجا ۔۔۔ ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

جتنا اُس کو انکار تھا اُتنا ہی اس کو اصرار تھا۔ غرض یہ ہے کہ بے پیر ایسا دامنگیر ہوا کہ چور غریب کو پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔ دیکھا کہ کسی ڈھب سے باز نہیں آتا تو کہا کہ فلاں پہاڑ پر جا اور دو رکعت

---

[1] صلاحیت یعنی حق پرستی ہونے کا نیزہ اور محنت کی تلوار صبر کی ڈھال دے کے ان ہتھیاروں سے کیا کام کیا اول تو مورچہ ماسوا اللہ کا مارلیا اور شک کو مار کر مٹا دیا ۱۲ [2] پھر اپنے آپ کو مار دیا جب اپنے آپ کو مارلیا تو سارا جہان مارا گیا اور ایک تلوار میں رام کا کام بھی تمام کر دیا اور انانیت کی گردن کاٹ کے اب ہم ہوئے سپاہی ۱۲ [3] پانچوں یعنی حواس خمسہ جو دشمن تھے ان کو بھی پکڑ لیا اور خواہشیں جو قوی دشمن تھیں اُن کو بھی گرفتار کر لیا اب کبیر داس نے قلعہ کے نشان کو لہرا دیا ہے ۱۲۔

نماز کی نیت باندھ جب دوسری رکعت کے سجدہ کی نوبت آئے تو جب تک تجھ کو الہام نہ ہو سَر نہ اُٹھانا۔ اُس نے ایسا ہی کیا آخر بحکم خداوندی خضر آئے اور کہا سَر تو اُٹھا۔ پوچھا تو کون ہے۔ جواب دیا کہ میں خضر ہوں اور تیری تعلیم کے لیے آیا ہوں۔ تو نے تو جس کو پیر بنایا تھا وہ ایک چور تھا۔ طالب نے جواب دیا کہ حضرت پہلے تو کبھی آپ بھی تشریف نہ لائے۔ جب وہ چور پیر ملا تو آپ بھی ملے۔ میں آپ کا کہنا ہرگز نہ مانوں گا۔ تب حضرت خضر کو جنابِ باری سے حکم ہوا کہ جاؤ اوّل اُس چور کو تعلیم کرو۔ خضر جا پہونچے اُس کو سرکاری سبق پڑھا دیا۔

خضرؑ نے گم گشتہ رہ کو آلیا حاصل مطلب کا مطلب پا لیا

پوتھی سب تھوتھی بھئی پنڈت بھیا نہ کوئے ڈھائی انچھر پریم کے پڑھے سو پنڈت ہوئے

تب اس پیر غارت گر کو خیال آیا کہ آہا! ایک شخص ہمارا مُرید ہوا تھا دیکھیں اُس کا کیا حال ہے۔ آئے اور اُس کو تعلیم دی۔ اب یہ اُس کے قدم لیتے ہیں اور وہ ان کے قدم لیتا ہے۔ کیونکہ پیر نے مُرید کی بدولت ہدایت پائی اور مُرید نے پیر کے توسل سے مراد حاصل کی۔ اس کے بعد جناب وقبلہ نے ارشاد کیا کہ اُن کی تقدیر میں اسی طرح تھا۔ اب اگر ہر شخص اسی طور سے چاہے تو نہیں ہو سکتا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ نوابی لکھنؤ میں ایک شخص ناظمِ پرگنہ تھا۔ اتفاقاً ایک کسبی سے اُس کو تعشق ہو گیا، جو کماتا اُس کو کھلاتا۔ یہاں تک کہ سرکاری روپیہ بھی اُڑا دیا جب نوّاب کو خبر ہوئی تو موقوف کیے گئے۔ جو کچھ اندوختہ تھا وہ بھی کھلا چکے تو کسبی سے کہا کہ اب ہمارے پاس صرف ایک صندوق رہ گیا ہے۔ اُس میں جو کچھ ہے وہ بھی لے اور رات کو مجرا کر۔ اُس نے سمجھا کہ صندوق میں بہت کچھ مال ہو گا۔ تمام شب ناچی اور صبح کو صندوق لے گئی۔ وہ امیر بھی ہمراہ گئے۔ جب اُس نے گھر جا کر صندوق کھولا تو ایک تہ بند نکلا، ایک ٹوپی، ایک کرتہ اور ایک رنگین رومال۔ کسبی کو حیرت ہوئی کہ یہ کیا تماشا ہے! اُس وقت امیر خانہ خراب نے کہا اب تم مجھ کو اپنا مُرید کر دو اور یہ خرقہ پہنا دو۔ وہ بولی میاں اللہ اللہ کرو۔ اگر تم کو اپنے مال و دولت کا قلق ہے تو جو کچھ میرے گھر موجود ہے

سب لے جاؤ۔ وہ بولا کہ نہیں نہیں میں تو مال و متاع تیری نذر کر چکا۔ ایک جان ہے سو یہ بھی حاضر ہے لیکن خدا کے لیے مجھ کو اپنا مُرید کر لے۔ ہر چند اُس نے سمجھایا مگر دیوانہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ ناچار کسبی نے اپنی تمام برادری کو جمع کیا اور یہ کہا کہ اس سڑی کو سمجھاؤ اگر دونا مال لے کر بھی پیچھا چھوڑے تو میں راضی ہوں۔ ہر ایک نے سمجھایا کسی کی نہ سنی۔ آخر سب نے کسبی کو یہ صلاح دی کہ تیرا کیا بگڑتا ہے۔ اسی کی خوشی کر۔ مرید بنا کپڑے پہنا کر رخصت کر۔ غرض پیرِ دلبر نے خود بھی غسل و وضو کیا اور مریدِ مستقل کو بھی کرایا۔ پہلے خود دو رکعت نماز پڑھی اور رو رو کر جنابِ باری میں دُعا کی کہ بارِ خدایا تو ہمارے اعمال و افعال سے خوب واقف ہے مجھ گنہگار میں اس کام کی قابلیت کہاں۔ اب شرم تیرے ہاتھ ہے بیعت کر کے کفنی گلے میں ڈال دی۔ یکایک رحمتِ الٰہی کا دریا جوش زن ہوا اور فیضانِ غیر متناہی کا طوفان اُمڈا۔ پھر تو کچھ اور ہی رنگ پیدا ہوا۔ وہ امیر چل دیا عورت کو بھی جذبِ دل نے کھینچا اسی کے ساتھ ہو لی۔ اب مرید آگے آگے اور پیر پیچھے پیچھے۔ پھرتے پھراتے دونوں گنگوہ میں پہونچے۔ حضرت عبدالقدوس گنگوہی کا عرس ہو رہا تھا۔ مشائخینِ کبار کا مجمع اور قوالی کی مجلس گرم تھی۔ یہ دونوں بھی آ بیٹھے۔ ذرا دیر بعد اس امیر کو ذوق و شوق پیدا ہوا۔ وجد کی حالت میں الا اللہ کا نعرہ لگایا اور دھم سے ایک کنوئیں میں جا گرا۔ لوگ سہم گئے۔ نکالنے کو دوڑے۔ عورت بولی کہ تم کیسے مشائخ ہو ڈر گئے۔ اگر اس کا وجد و حال صحیح ہے تو خود نکل آئے گا کچھ جائے اندیشہ نہیں۔ ورنہ ایسے کا ڈوب مرنا بھلا ہے۔ ہاں! قوالی ہونے دو، اور وہی غزل جاری رہے۔ غرض کہ کنوئیں کے کنارے پھر غزل شروع ہوئی۔ صاحبِ وجد نے پھر جوش و خروش کیا اور پانی اُمنڈ کر لبِ چاہ تک آ گیا۔ وہ شخص سطحِ آب پر رقص کرتا ہُوا باہر نکل آیا۔ ایک شخص جو حضرت شاہ عبدالقدوس رح کے مزار پر مدت سے معتکف تھے ان کو رشک پیدا ہوا، اور سوچے کہ لو یہ رنڈی کا مُرید نہ زہد نہ عبادت، نہ آگا نہ پیچھا، نہ جدّ و جہد اور یہ زور و شور کی حالت۔ ہم کو خراب ہوتے اِتنی مدت گزری، جوارِ حضرت میں عمر گزاری اور کچھ بھی اثر و تاثیر نہ پیدا ہوئی۔ یہ سوچ کر اپنا جُبہ و دستار اُتار قبر پر ٹپک دیا اور کہا کہ حضرت! بس ہمارا اسلام ہے! اس مشائخی کو۔

آسن[۱] مارے کیا ہوئے جو گئے نہ من کی آس — جوں تیلی کے بیل کو گھر گھر کوس پچاس
مالا[۲] پھیرے جگ گیو اور گیا نہ من کا پھیر — کر کا منکا چھوڑ کے من کا منکا پھیر
مونڈ[۳] منڈائے کیا ہوا جو گیا کھوٹم کھوٹ — منوا تو منڈا نہیں جس کا سگرا کھوٹ

اس شخص کو ندا آئی کہ تم اس امیر کی حرص مت کرو اس کے لیے یہی مقدر تھا اور یہ نادرات سے ہے ؎

کیمیا گر بغصہ مردہ و رنج — ابلہ اندر خرابہ یافتہ گنج

اپنا کام کرتے رہو جو خدا کو منظور ہے وہ ہو جائے گا کیوں گھبراتے ہو ع

ہے اپنا اپنا مقدر جدا نصیب جدا

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت لقمان حکیم سے کسی شخص نے کچھ زر و دینار قرض حسنہ لیے ایک مدت کے بعد اُس شخص نے لکھا کہ صاحب مجھے فرصت نہیں، معتبر آدمی ملتا نہیں، صاحبزادہ کو بھیج دیجیے تاکہ قرض لے جائیں۔ حضرت لقمان نے اپنے فرزند کو تین نصیحتیں فرما کر روانہ کیا۔ ایک یہ کہ پہلی منزل میں ایک برٹھ کا درخت آتا ہے۔ اُس کے تلے نہ سونا۔ دوسری منزل میں ایک بڑا شہر واقع ہوگا اُس کے اندر قیام نہ کرنا۔ کھانا کھا پی کر جنگل میں جا رہنا۔ تیسری یہ کہ اُس مقروض کے گھر نہ ٹھہرنا اس کے بعد یہ بھی اجازت دی کہ راہ میں اگر کوئی واقفِ راہ و تجربہ کار ملے اور ہماری نصیحت کے برخلاف ارشاد کرے تو کچھ مضائقہ نہیں، ویسا ہی عمل میں لانا۔ جب پسر لقمان نے کچھ راہ طے کی تو ایک بوڑھا مسافر ملا۔ پوچھا کہ میاں لڑکے کہاں جاتے ہو سب حال کہہ سنایا۔ بڑے میاں بولے خیر مجھ کو بھی اُسی شہر میں پہونچنا ہے، خوب ہوا کہ ہمارا تمھارا ساتھ ہو گیا۔ جب پہلی منزل میں وارد ہوئے تو بڑے میاں نے کہا کہ اس درخت کے نیچے رہیں گے تاکہ شبنم

---

[۱] آسن طریق نشست من دل اُس حرص یعنی اُس نشست عبادت سے کیا حاصل ہوا جو حرص دل نہ گیا گویا تیلی کے بیل کی طرح اپنے گھر ہی گھر میں پچاسوں کوس کا سفر ہے ۱۲ [۲] مالا تسبیح جگ مدت من دل پھیر کجی۔ کر ہاتھ یعنی تسبیح کو پھراتے ہوئے ایک مدت گذر گئی لیکن دل کی کجی دور نہ ہوئی ہاتھ کا منکا یعنی ریاکاری کو چھوڑ کر دل سے خدا کو یاد کرے ۱۲ [۳] یعنے ظاہری صورت بنانے سے کچھ حاصل نہیں کیونکہ نفس تو سیدھا ہوا ہی نہیں جس کا یہ سارا فساد ہے ۱۲ منہ۔

سے بچیں۔ لڑکا بولا کہ صاحب مجھ کو والد نے منع کیا ہے۔ کہا کہ بھلا کچھ اور بھی کہہ دیا تھا۔ بولا کہ ہاں! یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر کوئی اس راہ کا واقف تر ملے تو اُس کا کہنا مانیو۔ کہا کہ ہم اس راہ سے خوب واقف و آگاہ ہیں، ہمارا کہنا مانو۔

بمے سجّادہ رنگیں کُن گرت پیرِ مُغاں گوید   کہ سالک بے خبر نہ بود ز راہ و رسمِ منزلہا

غرض دونوں نے درخت کے نیچے بستر کیا۔ آدھی رات گئے ایک سانپ درخت پر سے اُترا۔ بڑے میاں نے سانپ کو مار ڈھال تلے ڈھانک دیا۔ جب صبح ہوئی تو کوچ کی ٹھہری۔ لڑکے کے دل میں یہ خیال آیا کہ جنابِ والدِ ماجد نے خواہ مخواہ منع فرمایا تھا۔ یہ درخت تو بڑے آرام کا مقام ہے پیرِ روشن ضمیر نے معلوم کیا کہ لڑکا باپ سے بدظن ہُوا جاتا ہے۔ رات کا ماجرا سنایا اور ڈھال کے نیچے سے نکال کر سانپ دکھا دیا۔ اُس وقت لڑکے کی تشفی ہوگئی۔ پھر بڑے میاں نے ارشاد کیا کہ صاحب زادے سانپ کا سر کاٹ کر اپنے پاس رکھو داشتہ آید بکار گرچہ بود سرِ مار۔ اُس نے فوراً تعمیل کی اور چل نکلے۔ دوسرے دن ایک بادشاہی شہر میں پہونچے۔ بڑے میاں نے کہا کہ اسی شہر میں رات کو رہیں گے۔ لڑکے نے کہا کہ بہت اچھا میں تو آپ کے فرمانے کی تعمیل کروں گا۔ دونوں ایک مسافر خانہ میں جا ٹھہرے۔ اُس شہر کا یہ دستور تھا کہ جب کوئی جوان مسافر آجاتا تو بادشاہ اپنی بیٹی کی شادی اُس کے ساتھ کر دیتا اور صبح کو وہ مسافر مُردہ نکلتا۔ حسبِ دستور بادشاہ کو خبر پہونچی اور نوجوان مسافر کی طلبی ہوئی۔ نکاح ہوگیا، جب لڑکا دُلھن کے پاس جانے لگا تو پیرِ دانا نے فرمایا کہ پہلے اُس سانپ کے سر کو جو تمھارے پاس ہے آگ میں رکھ کر اپنی بیوی کو اس کی دھونی دیجیو۔ اُس لڑکے نے ایسا ہی کیا۔ عورت کے رحم میں ایک مرض تھا جو مرد اُس کے پاس جاتا جیتا نہ آتا۔ اس دھونی کی تاثیر سے وہ مرض جاتا رہا اور صبح کو وہ لڑکا صحیح و سلامت محل سے باہر آیا۔ بادشاہ کو بڑی خوشی حاصل ہوئی۔ دو چار دن کے بعد روانہ ہوئے۔ تیسری منزل طے کی اب بڑے میاں بولے کہ اسی مقروض کے گھر ٹھہریں گے۔ چنانچہ شب کو وہیں قیام کیا۔ میزبان کی نیت بگڑی کہ رات کے وقت اِن دونوں کو مار ڈالو تاکہ روپیہ بچ جائے۔ مہمانوں سے پوچھا کہ صاحبو! اندر سوؤ گے یا باہر؟ بڑے میاں بولے کہ گرمی ہے ہم تو باہر سوئیں گے۔ چنانچہ یہ دونوں باہر رہے

اور اندر صاحب خانہ کے دولڑکے سوئے۔ جب آدھی رات گذری تو بڑے میاں نے پسر لقمان کو جگایا کہ اب سردی لگتی ہے اندر چلو۔ یہ دونوں تو اندر پہونچے اور میزبان کے لڑکوں کو جگا کر کہا کہ بھائی تم ہماری جگہ جا لیٹو ہم کو یہاں سونے دو۔ جب تیسرا پہر رات کا ہوا تو مالکِ مکان آیا اور باہر کے سونے والوں کو قتل کر دیا۔ صبح کو دیکھا تو اپنے لڑکوں کو مردہ پایا۔ نہایت صدمہ ہوا مگر چپ رہ گیا کہ خود کردہ را چہ علاج۔ چار وناچار مہمانوں کو روپیہ دے کر رخصت کیا۔ دونوں صاحب منزل بمنزل واپس ہوئے۔ جب اُس مقام پر پہونچے کہ جہاں بڑے میاں سے ملاقات ہوئی تھی پیرِ بزرگوار نے کہا کہ لو صاحب! خدا حافظ! اب ہم تو جاتے ہیں، اپنے والد سے ہمارا اسلام کہنا۔ لڑکے نے نام پوچھا کہا کہ تمھارے باپ خوب جانتے ہیں ــ غرض کہ باپ کی خدمت میں پہونچے اور ماجرائے سفر گذارش کیا اور پوچھا کہ حضرت یہ بزرگوار کون تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ یہ خضر علیہ السّلام تھے۔

نوٹ:۔ غرض بیان سے یہ ہے کہ لقمان تو اصل اصول ہے۔ کل شیٔ یرجع الی اصلہ۔ اور مسافر سالک اور منازل راہ منازل سلوک۔ بڑے میاں پیر کامل، سانپ نفس و شیطان۔ شاہزادی دُنیا۔ خانہ مقروض جہان۔ دنیا، مقروض انسان وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا اور پسرانِ مقروض اہل دنیا اور روپیہ محبت و عشق الٰہی ہے ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

دوسری غرض اس نقل سے یہ ہے کہ جو پیر کامل ہوتے ہیں وہ طالب خدا کو دوسرے شخص کامل کی خدمت میں جانے سے مانع نہیں ہوتے، بلکہ اوروں کی خدمت میں جانے اور ان سے استفادہ حاصل کرنے کی ہدایت فرماتے ہیں ــ چنانچہ جناب قبلہ بھی طالبانِ راہِ خدا کو ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ جو کوئی مردِ کامل مسلمان یا ہندو، سالک یا مجذوب ملے اُس سے بے تکلف ملو اور جو کچھ از راہ توجہ یا القا یا اور کسی طرح سے فیض و فائدہ پہونچائے اور تعلیم و تلقین کرے اُس کو مت چھوڑو۔ یہ مرتبۂ نبوت نہیں ہے کہ جو ختم ہو چکا۔ مرتبۂ لایعد ہے ایک سے ایک افضل و اعلیٰ پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ اور جو کوئی مُرید کسی طرف کو جاتا یعنے سفر کرتا تو اُس کو یہ ارشاد ہوتا ؎

گفت حق اندر سفر ہر جا روی . باید اوّل طالبِ مردے شوی

ایک روز ارشاد ہوا کہ خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں جو اکابر تھے خواجہ صاحب اپنے معتقدوں اور مریدوں کو اُن کی خدمت میں بھیج دیا کرتے۔ اس میں یہ حکمت تھی کہ مبتدی کو شیخ کی تعلیم و تلقین کا ابتدا میں علم نہیں ہوتا۔ جو اکابر جوہر شناس تھے وہ چشم باطن سے جوہر کو پہچان کر فرماتے تھے کہ کسی نے خوب جوہر بھرے ہیں یعنی خوب تعلیم کی ہے تو اُن کی جوہر شناسی سے طالب کی تسلی ہوتی تھی۔ اور شیخ کا کمال معلوم ہوتا تھا۔ اور اس زمانہ میں اگر کوئی طالبِ خدا کسی فقیر کی خدمت میں چلا بھی جائے تو حضراتِ مشائخ اُس مرید کو فوراً مردود کر دیتے ہیں۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ خلیفۂ بغداد حضرت شبلی علیہ الرحمہ کا مرید تھا۔ اور از راہِ حسنِ ارادت اپنے ملازمین کو حکم دیا تھا کہ اگر کسی مجرم کی نسبت ہزار بار حکم قتل صادر ہو اور حضرت پیر و مرشد اُس کی رہائی کے لیے ایما فرمائیں تو بلا اطلاع سلطانی فوراً رہا کر دو۔ چنانچہ ایک بار ایک چور کے حق میں سزائے موت کا حکم صادر ہوا۔ حسب الحکم سلطانی اُس کو قتل گاہ میں لے گئے۔ اتفاقاً حضرت کا بھی اس راہ سے گذر ہوا۔ کیفیت واقعہ دریافت فرمائی۔ مجرم سے اقرار لیا کہ پھر ایسا کام نہ کرے گا، اور رہا کرا دیا۔ چند روز کے بعد وہ شخص پھر چوری کی علت میں ماخوذ ہوا اور حکم قتل صادر ہوا۔ حضرت کو پھر خبر ہوئی اور رہا کرا دیا۔ چند بار یہی کیفیت گذری کہ وہ چوری سے باز نہ آتا اور حضرت براہِ ترحم رہا کرا دیتے ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ ... گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست ... صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

غرض کہ پھر ایک بار اُس چور کے لیے قتل کا حکم ہوا۔ ملازمین سلطانی نے سوچا کہ یہ باز نہیں آتا اور حضرت پھر چھڑا دیں گے۔ ایک اور مقام پر لے گئے جہاں کہ حضرت کی راہ گذر نہ تھی، اور اُس کو دار پر کھینچ دیا۔ جب حضرت کو اُس کی خبر ہوئی تو لاش پر تشریف لائے، اُس کو بوسہ دیا اور فرمایا کہ شاباش! ؎

طالبِ راہ را ادب دادی ... جانِ خود را دریں طلب دادی
مرے پیچھے مت ملو کہے کبیرا رام ... لوہا ناٹی ہو گیا پھر پارس کس کام

جو بن گئے تر یا ملے جو تینوں دیو جلائے | بھوک گئی بھوجن ملے اور جاڑا گئے رقبائے
جل گیا جب کھیت، مینھ برسا تو پھر کس کام کا | وقت پر قطرہ بہت ہے، ابرِ خوش ہنگام کا!

ایک روز ارشاد ہوا کہ منشی **امیر علی** صاحب کو کیمیا کا شوق بدرجۂ غایت تھا۔ چنانچہ مرض الموت میں حاجی فرید الدین صاحب کو بلا کر وصیت کی کہ یہ دوا سینتیس دن تو کھرل ہو چکی ہے۔ تین روز اور بچوں کے پیشاب میں کھرل کر کے پانچ سیر اُپلوں کی آگ دے دینا اکسیرِ اعظم بن جائے گی۔ خیر! یہ تمھارے نصیب میں تھی ہم تو محروم ہی چلے ؎

امید بستہ بر آمد ولے چہ فائدہ زانکہ | امید نیست کہ عمرِ گذشتہ باز آید

اس کے بعد کچھ اور ترکیب بتائی اور اسی حالت میں جاں بحق ہو گئے۔ دمِ آخر تک اپنے مطلوب کا خیال نہ چھوڑا۔ اُسی کے دھیان میں جان گئی۔ بھلا طالب کو خدا کے ساتھ اتنی تو محبت ہو، ورنہ کاذب ہے ؎

گوئی گشتن بہر او اولیٰ بود | عشقِ مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود

ایک روز ارشاد ہوا کہ اگر شاہ منصور حلاج پہلے خیر علی نساج سے بیعت تھے اور بعد میں حضرت بغدادی سے ہوئے تو یہ کچھ بات نہیں ہے۔ چنانچہ مولانا روم فرماتے ہیں ؎

بایداول طالبِ مردے شوی | گفت حق اندر سفر ہر جا روی
تا بیابد خضرِ وقتِ خود کسے | بایزید اندر سفر جستی بسے
بود در وے فر و گفتارِ رجال | دید پیرے باقدے ہم چوں ہلال
ہم چو پیلے دیدہ ہندوستاں بخواب | دیدہ نابینا و دل چوں آفتاب
مسکنت بنمود و در خدمت شتافت | بایزید او را چو از اقطاب یافت

پھر فرمایا کہ حضرت بایزید نے اوّل امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی تھی۔ چونکہ ہمت بلند اور حوصلہ فراخ رکھتے تھے تسلّی نہ ہوئی۔ بہت سے کاملین کی خدمت میں گئے اور فائدہ اُٹھایا۔ پھر بھی تسکین نہ ہوئی۔ آخر اُس نابینا سے تشفی ہوئی کہ جس کا ذکر مثنوی میں موجود ہے۔ میر عباس علی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت بعض بزرگوں نے

لکھا ہے کہ شاہ منصور کی حالت انا الحق کے وقت اگر ہم ہوتے تو اُن کو اس منزل سے نکال دیتے لیکن مجھ کو بوجوہات تامّل ہے۔ اوّل یہ کہ خود حضرت جنید موجود تھے۔ دوسرے اور بہت سے اکابر ایک سے ایک اعلیٰ اُس زمانہ میں تھے۔ کیا ان کو اس قدر تصرف نہ تھا۔ اس پر جناب قبلہ نے فرمایا کہ ہاں! حضرت غوث الاعظم نے ایسا لکھا ہے، لیکن یہ صرف کہنا ہی کہنا ہے۔ جو حالت شاہ منصور کی تھی خود حضرت جنید کو نہ تھی۔ جب حضرت جنید کو قریب مرگ حالت توحید طاری ہوئی ہے تو روتے اور کہتے تھے کہ افسوس تمام عمر قیل و قال میں گذری۔ یہ حال کھلتا تو عمر ضائع نہ کرتے۔ شاہ منصور نے مجاہدہ بھی نہایت سخت کیا تھا کہیں روم، کہیں شام، کہیں چین۔ جابجا چلہ کشی کرتے رہے۔ جس وقت آپ کے لیے سولی تیار ہوئی اور جب جبہ اُتار اگیا تو جبہ کی بغل میں سے ایک بچھو بقدر دس مثقال برآمد ہوا۔ لوگ مارنے لگے تو آپ نے منع فرمایا کہ یہ ہمارا بیس برس کا رفیق ہے۔ اس کو مت مارو۔ پھر جب شاہ منصور کو دار پر کھینچ دیا، جسم کو جلا دیا، خاکستر کو دریائے دجلہ میں بہا دیا تو دریا جوش میں آگیا۔ لوگوں نے امام محمد کو خبر دی۔ امام صاحب دجلہ کے کنارہ آئے اور کہا کہ سُن! منصور ہم جانتے ہیں کہ تو طریقت میں سچا تھا، لیکن ہمارا قلم اگر خلاف شرع چلا ہو تو شہر غارت کر، ورنہ تجھ سے کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ اُسی وقت دریا کا جوش فرو ہو گیا۔ غرض کہ منصور ہرگز مردود دوست نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مردودِ دوست وہ شخص ہوتا ہے جو پیر سے انکار کرے اور پیر اُس کو مردود کر کے نکال دے۔ اُنھوں نے نہ پیر سے انکار کیا نہ پیر نے انھیں مردود کیا۔ اور جو باصفا پیر ہوتا ہے بعد تعلیم کے اپنے مُرید کو اجازت دیتا ہے کہ اگر زیادہ حوصلہ ہو تو اور بزرگوں کی خدمت میں جاؤ۔ ایسا شخص مردود نہیں کہلاتا۔ اور جو حالت منصور پر طاری ہوئی تھی اُس نے منصور کو مِن کُلّ الوجوہ فنا کر دیا تھا۔ اگر منصور کچھ باقی رہتا تو کوئی اس حالت سے نکالتا اور خود حضرت جنید موجود تھے اُن سے بھی کچھ نہ ہوا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب منصورِ حلاج کی خاکستر میں سے صدائے انا الحق آتی تھی اُس وقت ایک عاشق آیا اور کہا کہ اب تو حق ہی حق ہے پھر انا الحق کہنا کیا ضرور ہے؎

عاشقے آمد مگر چوبے بدست ۔ بر سرِ آں مشتِ خاکستر نشست
پس زباں بکشاد ہمچوں آتشے ۔ باز می شورید خاکستر خوشے

وآنکہ میگفت برگویم راست | کانکہ میزدا و' انا الحق او کجاست
آنچہ گفتی آنچہ بشنیدی ہمہ | آنچہ دانستی تو وُ دیدی ہمہ
آں ہمہ جز اول افسانہ نیست | محو شد جانت دریں ویرانہ نیست
اصل باید اصل مستغنی و پاک | گر بود فرع و اگر نہ بود چہ باک
ہست خورشیدِ حقیقی بر دوام | گو نہ ذرہ مان نہ سایہ والسّلام

کہتے ہیں کہ بعد اس کے آواز نہ آئی۔ اس کے بعد جناب و قبلہ نے یہ شعر فرمایا ؎

آں شعلہ رو بغمزہ دلم را کباب کرد | مارا چہ کرد خانۂ خود را خراب کرد

ایک روز ارشاد ہوا کہ فقیری ایک بات ہے کان میں کہنے کی۔ یا تو انسان ادھر تھا یا اُدھر ہو گیا۔ گویا کہ آگ میں پھونک مار دی۔ نہ اس کے لیے وقت و زمانہ درکار ہے نہ نماز و روزہ نہ ورد و وظائف کی شرط ؎

داد او را قابلیت شرط نیست | بلکہ شرطِ قابلیت دادِ اوست

کسی شخص نے سوال کیا کہ حضور جب فقیری ایسی آسان ہے تو پھر مشقت و مجاہدہ کیوں کراتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ہم کو ایک نقل یاد آئی۔ ایک شخص کے پاس تیل کے دو ہنڈے تھے۔ نہایت میلے کچیلے اور تیل میں چکٹے ہوئے۔ ایک ہنڈا ایک کاریگر کو دیا اور پوچھا کہ اس کو کتنے عرصہ میں صاف کر دوگے۔ کہا کہ پورے چالیس روز میں۔ دوسرا ہنڈا ایک اور کو دیا۔ اُس نے کہا کہ لو میں آج ہی صاف کیے دیتا ہوں۔ پہلے شخص نے کیا کیا۔ کبھی تو اُس ہنڈے کو کھرچتا اور کبھی کھاری سے کر دھوتا۔ کبھی نرم آنچ میں اُس کو گرم کرتا۔ اسی طرح چالیس روز میں صاف و شفاف کر دیا اور ٹھوک بجا کر حوالے کیا۔ دوسرے شخص نے کیا ترکیب کی کہ ہنڈے کے چاروں طرف اُپلوں کا انبار چنا اور آگ لگا دی۔ ہنڈا جھٹ پٹ صاف ہو گیا لیکن کسی کام کا نہ رہا۔ جہاں ذرا ٹھیس لگی اور چور چور ہو گیا۔ بے شک صاف تو دونوں ہو گئے مگر ایک کارآمد رہا اور دوسرا نکما ہو گیا۔ چنانچہ نقل ہے کہ خواجہ باقی باللہ صاحب کی خدمت میں ایک نان بائی ہمیشہ حاضر ہوا کرتا تھا۔ ایک روز خواجہ صاحب کے پاس چند مہمانِ عزیز آئے۔ کھانا کچھ موجود نہ تھا۔ آپ متفکر ہوئے۔ یہ دیکھ کر نان بائی اپنی دُکان سے چند قسم کا کھانا

لے آیا اور حضرت کے مہمانوں کو کھلایا۔ آپ خوش ہوئے اور فرمایا کہ اچھا مانگ کیا مانگتا ہے اُس نے عرض کی کہ حضور مجھ کو اپنا جیسا بنا دیجیے۔ خواجہ صاحب اُس کو حُجرے کے اندر لے گئے اور ایک نگاہ کی جس کو اتحادی توجہ کہتے ہیں۔ اُسی وقت بالقوت والعلم ایک ہوگیا۔ جب حجرے سے برآمد ہوئے تو کسی کو تمیز نہ ہوتی تھی کہ خواجہ صاحب کون سے ہیں اور نان بائی کون سا ہے۔ صرف اتنا فرق تھا کہ خواجہ صاحب ہوشیار تھے اور وہ مدہوش۔ لیکن تین روز کے بعد وہ شخص مرگیا کیونکہ دفعۃً تعلیم ہوئی تھی ؎

تیرِ نگاہ بے نشست، مسکنِ خود جاں گذاشت طاقتِ مہماں نداشت خانہ بمہماں گذاشت

بس اسی واسطے دفعۃً تعلیم نہیں دیتے اور محنت و مجاہدہ کراتے ہیں کہ حوصلہ بڑھ جائے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ رام پور میں ایک امیر کے مکان پر کوئی کیمیا گر آئے۔ اُس امیر نے فقیر سمجھ کر خوب خدمت کی۔ چھ مہینے بعد جانے لگے تو کہا کہ ہم کو اکسیر یاد ہے۔ جی چاہے تو سیکھ لو۔ امیر نے کہا کہ صاحب مجھ کو حاجت نہیں۔ فقیر نے کہا کہ خیر تم کیمیا نہیں سیکھتے تو ہمارے ہاتھ کی پکی ہوئی ایک چیز چالیس روز کھالو۔ امیر نے کہا بہت اچھا۔ چالیس روز تک کھلا کر رخصت ہوا۔ اور بولا کہ لو تم نے کیمیا تو نہیں سیکھی مگر ہم نے خود تم کو اکسیر بنا دیا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد انقلاب روزگار نے ایسی خانہ خرابی کی کہ اُس امیر کو فقیر بنا دیا۔ فاقہ کشی کی نوبت پہونچی ایک پرانی دیگچی بازار میں بیچنے گیا۔ خوبیٔ قسمت سے وہ بھی نہ بکی دوپہر کا وقت، گرمی کے دن، نہایت حیران و پریشان ہو کر ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ گیا اور افسوس کرنے لگا کہ اگر اس فقیر سے کیمیا سیکھ لیتے تو آج کام آتی۔ اُسی وقت خیال آیا کہ فقیر نے یہ بھی تو کہا تھا کہ میں تم کو اکسیر بنا چلا ہوں۔ فوراً اپنا پسینہ لے کر اُس دیگچی کو مل دیا اور جنگل میں اُپلے جمع کر، اُس کو آگ دے دی۔ دیگچی کندن ہوگئی لیکن اُس پر ایک ایسی حالتِ حیرت طاری ہوئی کہ تین روز تک متحیر بیٹھا رہا۔ آخر چوتھے روز غائب ہوگیا۔ چونکہ دفعۃً اپنی تاثیر اُس پر ظاہر ہوئی متحمل نہ ہو سکا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ شاہ بھیک صاحب نے بابا ستل پوری کی خدمت میں جو کہ حضرت شاہ کمال قادری رحمۃ اللہ علیہ سے فیض یاب تھے یہ شعر لکھ کر ارسال کیا ؎

چلتے چلتے جُگ گیو اور بھیک دواری دور خرچی نبڑی پگ تھکے جا کوئی کہے حضور

اس کے جواب میں باباسیتل پوری نے یہ شعر تحریر کیا ؎

جن سیتن تم جات ہو اُن سیتن ہیں دور ست نام سیتل پوری جو سُن مکھ ہے حضور

مطلب یہ ہے کہ راہ سلوک تو ایک نہایت[1] دور دراز راہ ہے۔ جو ن کی چال چلنا، راہ و رستہ کا اتار چڑھاؤ بھگتنا اور گانوں گانوں میں منزل و مقام کرنا، صعوباتِ سفر اور عقباتِ رہ گذر اور عجائباتِ منازل اور طلسماتِ راہ کی سیر دیکھنا، اس طور سے سفر طویل اور منزلِ مقصود بعیدہ ہو جاتی ہے، جیسے کوئی شخص دہلی سے کلکتہ کا سفر پیادہ یا قطع کرے۔ مگر راہ قلندری میں سیر منازل اور تماشائے مراحل کچھ نہیں جیسے کوئی آدمی ریل میں سوار ہو کر جھٹ پٹ کلکتہ میں جا اترے ؎

صنارہِ قلندر سزوار بمن نمائی کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

اُن دونوں میں ہر طرح بڑا فرق ہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ میر پنجہ کش صاحب دہلوی سے ہم نے بھی مشق خط کی تھی اِس وقت اُن کی نقل یاد آئی ہے۔ میر صاحب کا دستور تھا کہ جب کوئی لڑکا اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا تو اوّل روز اُس کے ہاتھ سے ایک وصلی لکھواتے اور اپنے پاس رکھ لیتے۔ جب کوئی شاگرد شکایت کرتا کہ حضرت اتنی مدت گذری لیکن میرا خط درست نہیں ہوا تو اُس کی پہلی لکھی ہوئی وصلی نکال کر سامنے رکھ دیتے کہ اس سے مقابلہ کرو، کتنا فرق ہوا ہے جب وہ پہلی تحریر دیکھتا تو فرق بیّن معلوم ہوتا اور شاگرد کی تسکین ہو جاتی۔ ایسا ہی حال طالبانِ طریق کا ہے کہ جب تعلیم بتدریج حاصل ہوتی ہے تو امتیاز حال نہیں ہوتا اور طالب کو تشنگیٔ طلب بدستور رہتی ہے، اور خیال کرتا ہے کہ ابھی کچھ حاصل نہیں ہوا حالانکہ مرد کامل کی صحبت اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ اگر اس میں بھی وصلی لکھی جاتی تو ہم بھی لکھوا رکھتے، آج مقابلہ ہو جاتا۔ لیکن تبدیلِ خیالات میں کچھ فرق ہوا یا نہیں۔ پہلے کی نسبت خود ہی کمی بیشی معلوم ہوتی ہوگی۔ رہا انکشاف اگر اس کو منظور ہے تو وہ بھی ہو جائے گا ؎

---

[1] کسی طالب نے شکایت کی کہ حضور آج تک ہم کو کچھ حصول نہیں ہوا ہنوز روز اول ہے اس پر آپ نے یہ ارشاد فرمایا ۱۲۔

در بلا صبرے بباید مرد را صبر خود کے باشد اہل درد را

ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک شہزادہ بام محل پر ہر طرف سیر کر رہا تھا۔ ناگاہ اُس کی خالہ کی بیٹی بھی اپنے بالاخانہ پر جلوہ افروز ہوئی۔ شہزادہ اُس کو دیکھتے ہی بے ہوش ہو گیا ؎

انہیں دکھیاں انکھیں کو سکھ سر جو بے ناہیں دیکھت بنی نہ دیکھئیں بن دیکھے اکلائیں

غلام و کنیز اس کو اُٹھا کر محل سرائے میں لائے۔ جب لخلخہ سنگھایا تو ہوش میں آیا لیکن مرضِ عشق اپنا اثر کر چکا تھا۔ روز بروز دل ہی دل میں گھلنے لگا۔ ہر چند علاج و معالجہ کیا شفا نہ پائی۔ آخر ایک حاذق طبیب معالج ہوئے۔ رازِ مخفی ان پر منکشف ہوا۔ بادشاہ کو اطلاع کی بادشاہ نے فوراً شادی کا پیام دیا منظوری کے بعد دھوم دھام شروع ہوئی۔ اُس وقت طبیبِ روشن ضمیر نے بادشاہ سے کہا کہ ابھی شادی میں توقف کرو کہ جس کو دیدار کی تاب نہیں وہ وصال کا کب متحمل ہو سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک بہتر یہ ہے کہ پہلے دو مکان بنوائے جائیں جن میں ایک دیوار حائل ہو اور روزن کھڑکی جھروکے کے لیے رکھے جائیں اور دونوں جدا جدا مکان میں رہیں۔ شہزادی کبھی کبھی اپنے دیدار کی جھلک دکھادیا کرے۔ جب شہزادہ متحمل ہو جائے پھر مضائقہ نہیں۔ اُس وقت شادی کرنی چاہیے۔ یہ بات سب نے پسند کی کیونکہ دفعتہً وصال ہوتا تو شہزادہ شادی مرگ ہو جاتا۔ غرض تجویز کے موافق مکان تیار ہوا۔ دونوں جدا جدا رہنے لگے۔ شہزادہ ہر وقت شوقِ دیدار میں بے قرار ہو کر تاک جھانک کرتا۔ اور شہزادی نے یہ انداز اختیار کیا کہ کبھی روزنِ دیوار سے ذرا انگلی دکھائی کسی روز انگوٹھا، کبھی پنجۂ نگارین۔ کبھی ساعدِ سیمیں چمکا دیا۔ کبھی چشمِ مخمور کے جام سے مست کیا۔ کبھی شمعِ رخسار و صبحِ جبین کی جھلک دکھائی، کبھی گیسوئے عنبر بار کا لخلخہ سنگھایا۔ کبھی سرو قامت کے خرام سے قیامت برپا کی۔ کبھی آوازِ جاں نواز سنا کر جلا دیا۔ القصہ رفتہ رفتہ شہزادہ کے دل بے قرار کو یہاں تک تحمل ہونے لگا کہ دیر دیر تک معشوقہ کے دیدار کی بہار دیکھا کرتا اور جلوۂ حسن سے بے خود نہ ہوتا اُس وقت وصال کی ٹھہری۔ ایسے ہی پیرِ دانا طالب کے ظرف کا اندازہ کر کے اُس کی استعداد کے مناسب تعلیم و تلقین بتدریج فرماتے ہیں۔ ورنہ طالب و مبتدی اور کم حوصلہ کو دفعتہً تعلیم کرنا موجب زیانِ جان ہوتا ہے۔

---

[۱] یعنی ان دکھی آنکھوں کو کسی طرح چین نہیں دیکھنے کے وقت تاب نہیں بغیر دیکھے قرار نہیں ۱۲ منہ۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ شاہ جہاں پور میں ایک خاں صاحب تھے اُن کی بیوی نہایت حسینہ و جمیلہ تھی ؎

پتری ہی تت پائے وا گھر کے جو پاس　　نت پرت پونو ہے رہت آنن اوپ چاس

جب خاں صاحب سفر میں ہوتے تو وہ بیوی خط لکھنے پڑھنے کے واسطے محلہ کی مسجد کے امام کو بلا لیتی تھی۔ چنانچہ ایک بار وہ نیک بخت پسِ پردہ بیٹھی تھی اور امام صاحب خط لکھنے کو تیار ہوئے پوچھا کہ کیا لکھوں۔ اتنے میں ہوا نے پردہ اُٹھا دیا اور اتفاقاً مولوی صاحب کی نگاہ اُس پردہ نشین سے دوچار ہو گئی۔ ہوش و حواس جاتے رہے۔ اس کے بعد عورت نے مضمون بتانا شروع کیا۔ مولوی صاحب لکھنا تو بھول گئے، بار بار یہی کہتے تھے کہ کیا لکھوں۔ اب عورت جو کچھ کہتی ہے اُس کے جواب میں مولوی صاحب کی زبان پر یہی جاری ہے کہ کیا لکھوں۔ آخر وہ عورت سمجھ گئی کہ مُلّا غریب آفتابِ حُسن کی تاب نہ لاسکا ایک ہی جلوہ میں چکاچوند ہو گئی۔ شہبازِ عشق نے طائرِ عقل کے پر نوچ لیے ؎

در دلِ عاشق چو عشق آتش فروخت　　ہر چہ جز معشوق بود آنرا بسوخت

اپنی کنیز کو اشارہ کیا کہ جا مولوی صاحب کو جلدی سے مسجد میں پہونچا دے۔ کنیز اُن کو مسجد میں چھوڑ آئی۔ لیکن خور و خواب، آرام و قرار، سب فراموش ہوا اس لفظ کے سوا کچھ یاد نہ رہا۔ ہر وقت یہی وظیفہ تھا کہ کیا لکھوں۔ آخر راز فاش ہوا۔ چند روز کے بعد خاں صاحب بھی آپہونچے۔ مولوی صاحب کا احوال سُن کر بہت افسوس کیا۔ ایک روز اپنی بیوی سے کہہ گئے کہ تم اس وقت اچھا لباس اور عمدہ زیور پہن کر آراستہ ہو جاؤ کہ مولوی صاحب کی آج دعوت ہے۔ عصر کے وقت اس دیوانۂ عشق کو اپنے گھر میں لائے اور کھانا سامنے رکھا۔ مولوی صاحب کو تو وہی ایک بات یاد تھی۔ بولے کیا لکھوں۔ اُس وقت خاں صاحب نے بیوی کو اشارہ کیا کہ پردہ سے باہر آجاؤ۔ اس کا سامنے آنا اور نگاہ کا دوچار ہونا تھا کہ دونوں بغل گیر ہو کر فنا ہو گئے ؎

۱؎ پتر جنتری تت تاریخ، نت پرت، پونو شبِ چہاردہم یعنی وہ معشوق کہ مانند چاند چودھویں کے ہے اور ... پاس رونق روشنی چودھویں رات کی سی ہے تو شاعر کہتا ہے کہ اگر کوئی شخص اُس کے گھر کے پاس جاوے تو تاریخ بھول جائے گا تاریخ اُس کو جنتری میں کی کیونکہ وہاں تو ہر وقت روشنی چودھویں رات کی سی رہتی ہے ۱۲ منہ۔

عشق یوسف را ازاں سازد غلام ۔۔۔ تاکہ آرد مرز لیخا را بدام
عشق موسیٰ را بکوہِ طور برد ۔۔۔ بہر دیدِ دوست سوئے نور برد
عشق احمد را بود معراجِ دین ۔۔۔ تا مقامِ او شود حق الیقین
عشق چہ بود قطرہ دریا ساختن ۔۔۔ از دو عالم با خدا پرداختن
عشق از ہستی خود وارستن ست ۔۔۔ در مقامِ سرمدی پیوستن ست

غرض دونوں شہیدِ خنجرِ عشق اسی طرح ہم کنار دفن کیے گئے۔ لوگوں نے چاہا بھی کہ جدا کریں لیکن خاں صاحب نے منع کیا کہ جن کو خدا نے ملایا اُن کو ہم کیوں جدا کریں ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی ۔۔۔ تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

چونکہ حسن پردہ در اور عاشق کم حوصلہ تھا اور وصال یک بیک ہو گیا نہ عشق رہا نہ عاشق نہ معشوق یہ بھی نہ رہا اور وہ بھی نہ رہا فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَہٗ دَکًّا وَّخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا ؎

زبسکہ حسن فزودی غمش گداخت مرا ۔۔۔ نہ من شناختم او را نہ او شناخت مرا

ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک فقیر دل خستہ کسی شہر میں وارد ہوا اور نان بائی کی دکان پر جو بادشاہی محل کے قریب تھی روٹی خریدنے کے لیے گیا۔ اتفاقاً شہزادی صاحبِ جمال حور تمثال سیرِ بازار میں مصروف تھی۔ فقیر کی اُس پر نگاہ جا پڑی۔ شہزادی شوخی و ناز سے انگوٹھا دکھا کر ہنستی ہوئی چل دی۔ اُس آن و ادا کو دیکھ کر فقیر بے چارہ کا دل قابو میں نہ رہا۔

نوٹ:۔ ایک بار مولوی محمد عبد الحکیم صاحب و محمد اسمٰعیل صاحب میرٹھ سے اور سید غلام محمد صاحب وکیل لودھیانہ سے واسطے قدم بوسی جناب قبلہ کے حاضر ہوئے تھے سب صاحبوں نے مولانا گل حسن سے کہا کہ حضرت کے کلام کے ہم بہت مشتاق ہیں آج کسی طور سے تحریک کرو چنانچہ بعد نماز عشاء ہم سب حاضر خدمت مبارک ہوئے اور تسلیم بجا لا کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد مولانا گل حسن نے یہ شعر عرض کیا ؎

باز گو از نجد و از یارانِ نجد ۔۔۔ تا در و دیوار را آری بوجد

اُس وقت جناب قبلہ اُٹھ بیٹھے اور فرمایا ؎

ارے او میکدہ کے جانے والے ۔۔۔ ذرا کہہ دیجیو پیر مغاں کو
شرابِ شوق کا کم ہو گیا کیف ۔۔۔ پلا ایسی کہ بھولے دو جہاں کو

تیرِ نگاہ سینۂ بے کینہ کے پار، اور تیغِ ابرو سے جگر فگار ہو گیا۔

دل بسوئے آں مہ غرفہ نشیں حیراں بماند — شمع در فانوس شد پروانہ سرگرداں بماند
تا بہ گلشن سروِ سیمیں را خراماں ساختی — رونق از گل رفت و بلبل را پریشاں ساختی
تا سمندِ ناز را سرگرم جولاں ساختی — شورِ محشر بر سرِ گورِ غریباں ساختی
پریم کہانی بس بھری مت سُنیو کوئی آئے — باتوں باتوں بس چڑھا، دیکھت ہی ڈس جائے
نین پیادے پھنس رہے پریم پیچ کے بیچ — من گو بنہ گاڑھن گئے وہ بھی رہ گئے بیچ

جب ہوش آیا تو محل شاہی کے نیچے دھونی رما کر بیٹھ گیا۔ رفتہ رفتہ تمام شہر میں اُس کے عشق کا شہرہ ہوا اور یہ خبر بادشاہ کے کان تک بھی پہونچ گئی۔ وزیروں سے پوچھا اب کیا تدبیر ہے۔ انھوں نے نے عرض کیا کہ حضور والا کسی شخص کو کہہ دینا چاہیے کہ اس فقیر کو قتل کر ڈالے۔ یہ مشورہ شہزادی نے بھی سُنا رات کے وقت اُس عاشقِ زار کو بُلوایا اور پسِ پردہ آکے اُس سے کہا کہ سُن فقیر! تیرے قتل کا سامان ہو رہا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تو یہاں سے نکل جا ورنہ مارا جائے گا۔ فقیر بولا کہ اے شاہزادی! میں تو اُسی دن مر چکا تھا۔ جب تم نے ناز و انداز سے انگوٹھا دکھایا۔ اب مردہ کو جو چاہیں سو کریں۔ میری جان تو پہلے ہی تم پر قربان ہو چکی ہے۔ ہم کو رنج و راحت دونوں برابر ہیں۔ ع

زندہ کُنی عطائے تو ور بکُشی رضائے تو

آپ کسی طرح کی فکر نہ کریں میں تو اپنی جان آپ کے قدموں پر پہلے ہی تصدق کر چکا۔ اگر یہ بات صحیح ہے اس سے زیادہ میرے لیے سعادت کون سی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ رنج و راحت دونوں ہمارے واسطے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ راحت تو ہمارے لیے ہو اور رنج کوئی اور اُٹھائے۔ اگر یہ جان آپ پر قربان ہو جائے تو عاشقوں کا عین دین و ایمان ہے ؎

از محبت تلخہا شیریں شود — از محبت مسہا زریں شود
از محبت دردہا صافی شود — از محبت دردہا شافی شود
از محبت خارہا گُل می شود — از محبت سرکہا مُل می شود
از محبت دار تختی می شود — از محبت بار بختی می شود

از محبت سجن گلشن می شود
بے محبت روضہ گلخن می شود

از محبت حزن شادی می شود
از محبت غول ہادی می شود

از محبت نار نوری می شود
از محبت دیو حورے می شود

از محبت سنگ روغن می شود
از محبت موم آہن می شود

از محبت نیش نوشے می شود
از محبت شیر موشے می شود

از محبت سقم صحت می شود
از محبت قہر رحمت می شود

از محبت مردہ زندہ می شود
از محبت شاہ بندہ می شود

چوں خلیل از آسمانِ ہفتمیں
بگذرد کہ لا اُحِبُّ الآفلین

آب کم جو تشنگی آور بدست
تا بجوشد آب از بالا و پست

تا سقاہم ربہم آید خطاب
تشنہ باش اللہ اعلم بالصّواب

آب رحمت بایدت رو پست شو
وانگہاں خور خمرِ رحمت مست شو

رحمت اندر رحمت آید اے پسر
بر یکے رحمت فرو ما اے پسر

چرخ را در زیر او را اے شجاع
بشنو از فوق فلک بانگ سماع

پنبۂ وسواس بیروں کن زگوش
تا بگوشت آید آں بانگِ خروش

دفع کن از مغز و از بینی زکام
تاکہ ریح امید آید در مشام

پھر شہزادی نے کہا اچھا ہم تیرے ساتھ چلنے کو راضی ہیں تو بھی چل اور ہم کو بھی لے چل۔ فقیر نے کہا کہ ؎

من شمعِ جاں گہ ازم تو صبح دلگشائی
سوزم گرت نہ بینم، میرم چو رُخ نمائی

نزدیک ایں چنینم دور آں چناں کہ گفتم
نے تاب وصل دارم، نے طاقت جدائی

میں اس کی قابلیت نہیں رکھتا۔ کجا تم کہاں میں۔ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک۔ یہ بوجھ تو مجھ سے ہرگز نہ اٹھایا جائے گا۔ میری تاب و طاقت سے باہر ہے۔ جب فقیر اس بات پر بھی راضی نہ ہوا اور مرنا ہی اختیار کر لیا تو شہزادی نے پردہ اٹھا کر کہا کہ آؤ معانقہ ہی کر لو، زندگی کا کچھ اعتبار نہیں ؎

من از آں حسن روزافزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

دونوں معانقہ کرتے ہی جاں بحق ہو گئے

بیا ساقی کہ من مردم کفن از برگ تاکم کن
بجائے آب مے بدہ غسلم دریں میخانہ خاکم کن

پئے فاتحہ بدہ روحم دگر گورم ازیں ترکن
کہ روزے عاقبت را ایک جرعہ نجاتم کن

سالکاں دانند در میدانِ درد
تا فنائے عشق با مرداں چہ کرد

تا نہ باشی بدتے زیر و زبر
کے توانی یافت ز آسایش خبر

سالہا بُردند مرداں انتظار
تا یکے را بار شد از صد ہزار

اگر انسان کو اتنی بھی محبت خدا سے نہ ہو تو وہ انسان کیا حیوان ہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک بادشاہ کو وزیر زادے سے ایسی محبت پیدا ہوئی کہ بغیر اُس کے ایک دم چین نہ تھا اتفاق سے کچھ مُدت کے بعد وہ وزیر زادہ کسی عورت پر عاشق ہو گیا ہر وقت اُسی کے ذکر و فکر اور اسی کی تاک جھانک میں رہنے لگا۔ بادشاہ کے پاس آنا جانا کم ہو گیا۔ ہر چند بادشاہ خفا ہوتا مگر وہ کب سنتا تھا ؎

نہ میری سنے وہ نہ میں ناصحوں کی
نہیں مانتا کوئی کہنا کسی کا

ایک شب وزیر زادہ بادشاہ کے پاس تھا۔ جب دیکھا کہ بادشاہ کی آنکھ لگ گئی جھٹ وہاں سے اُڑا اور اپنی معشوقہ کے پاس پہونچا۔ بادشاہ اتنے میں جاگ اُٹھا۔ دیکھا تو محبوب ندارد۔ گھبرا کے بے قراری اور غصہ کی حالت میں جستجو شروع کی۔ آخر پتہ لگاتے لگاتے وہیں پہونچا، جہاں وہ دونوں دل دادہ عیش و نشاط میں مصروف تھے۔ دیکھتے ہی آتشِ غضب بھڑک اُٹھی اور کہا کہ اے وزیر زادہ! میں نے تجھ کو اس قدر ناز و نعمت سے پالا، تمام مُلک کی حکومت تجھ کو عطا کی۔ تمام خزانوں کی کُنجیاں تجھ کو دیں۔ جو تیرا جی چاہتا ہے سو کرتا ہے۔ ہر قسم کی عزت ہر طرح کا اقتدار تجھ کو حاصل ہے۔ پھر تو میرا مطلوب ہو کر غیر کی طرف کیوں مائل ہوا۔

یَآاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ یعنے اے انسان کس چیز نے تجھ کو فریفتہ کیا جو کافر ہوا تو ساتھ خداوند اپنے کے وہ خدائے تعالےٰ کہ تجھ کو پیدا کیا، پس درست کیے اعضا تیرے

اور تمیز کیا تجھ کو غیرے جس صورت میں چاہا۔ اس جوشِ غضب میں بادشاہ نے غلاموں کو حکم دیا کہ اس نابکار کی کھال کھینچ کر سولی پر چڑھادو تاکہ لوگ عبرت پکڑیں اور بہت جلد تعمیلِ حکم کرکے ہم کو خبردو۔ اتنے میں وزیر کو خبر پہونچی۔ وہ دوڑا ہوا آیا اور غلاموں کو بہت کچھ زر و جواہر دے کر کہا کہ تم جانتے ہو کہ بادشاہ کو اس سے کس قدر محبت ہے۔ یہ حکم شانِ غضب میں دے دیا ہے۔ جب غصّہ فرو ہو جائے گا تو پھر تم پر اُلٹا غضب نازل ہوگا۔ اُس وقت اُس کو کہاں سے لاؤگے اور اپنے بچنے کی کیا تدبیر کروگے۔ بہتر یہ ہے کہ اس کو چھپادو اور کسی واجب القتل مجرم کو سولی پر لٹکادو۔ غلاموں نے ایسا ہی کیا جیسے کہ وزیر نے صلاح دی۔ اگلے دن بادشاہ نے غلاموں سے حال دریافت کیا۔ سب نے عرض کیا کہ ہم کو جیسا حکم ملا تھا اس کی تعمیل کی گئی۔ چنانچہ ابھی تک وہ دار پر آویزاں ہے بادشاہ یہ سُن کر نہایت خوش ہوا اور سب کو خلعت و انعام دیا اور کہا کہ خوب کیا اُس کو اسی طرح رہنے دو تاکہ خلقت اس کے حال سے عبرت حاصل کرے۔ تمام شہر میں غوغا ہوگیا۔ ہر ایک شخص اُس کی نعش پر آتا اور اُس کی حالت پر غور کرکے روتا تھا۔ چند روز گذرے تو بادشاہ کی آتشِ خشم سرد ہوگئی اور عشق و محبّت کے سوز وگداز کا زور شروع ہوا۔ اپنے کیے سے نہایت پشیمان ہوا۔ اُس کی صورت اُس کی باتیں یاد کرکے زار زار رونے لگا۔ اُس کی عزاداری میں ماتمی لباس پہنا ؂

می کشد پنہاں و می پوشد کبود از فسونِ نرگسِ شہلا مپرس

رات کے وقت جب کہ دار اغیار سے خالی ہوتی تو وہاں جاتا اور صبح تک اُس کے فراق میں تنِ تنہا خاک و خون میں لوٹتا اور رو پیٹ کر واپس چلا آتا۔ چالیس روز تک بادشاہ پر یہی کیفیت گذری ؂

از پسِ چل روز آں بے خور و خواب آں پسر را دید یک ساعت بہ خواب
روئے ہمچوں ماہ او در مُشک غرق از قدم در خوں نشستہ تا بہ فرق
شاہ گفتش اے لطیفِ جاں فزا از چہ تو غرقے بخوں سر تا بہ پا
گفت در خونِ ز آشنائے تو ام ایں چنیں از بے وفائے تو ام

باز کردی پوست از من بے گناہ — از وفاداری نبود اے بادشاہ
یار خود با یار آخر ایں کند — کافرم گر ہیچ کافر ایں کند
من چہ کردم تا تو بر دارم کنی — سر بری وپس نگوں سارم کنی
روئے اکنوں می بگردانم ز تو — در قیامت داد بستانم ز تو
چوں شود دیوانِ داورآشکار — دادِ من از تو ستاند کردگار

جب بادشاہ نے یہ خواب دیکھا اور لڑکے سے بے وفائی کا دردناک کلمہ سُنا تو اور بھی زیادہ بے قرار ہوا آنکھ کھل گئی۔ دل کی بے چینی اور طبیعت کی بے تابی اس قدر بڑھی کہ بے ہوش ہوگیا۔ جب وزیر نے دیکھا کہ بادشاہ کی بُری حالت ہے تو لڑکے کو اشارہ کیا۔ وہ تیغ وکفن لے کر بادشاہ کے قدموں پر جا گرا اور دونوں بے خود ہوگئے ؎

شاہ چوں شد از فراقِ او خلاص — ہر دو خوش رفتند در ایوانِ خاص
بعد ازآں کس واقفِ اسرار نیست — زانکہ آں جا موضع اغیار نیست
آنچہ آں یک گفت آں دیگر شنید — کو رد یدآں حال گوش کر شنید

پھر فرمایا کہ خواب میں یہ شکایت بادشاہ سے کس نے کی۔ وزیر زادہ تو زندہ تھا۔ بات یہ تھی کہ بادشاہ کا جو تخیّل تھا وہی پیش آیا ؎

مپندار ایں کہ حسرت از دلِ عاشق رود ہرگز — چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد

اللہ تعالےٰ کا معاملہ بھی اپنے بندہ کے ساتھ ایسا ہی ہے۔ انسان کو لازم ہے کہ سوائے خدا کے غیر کو دل میں جگہ نہ دے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک شہزادی اپنے غلام پر عاشق ہوگئی۔ جب کہ جنونِ عشق کا غلبہ ہوا اور عصمت وحیا کا پردہ چاک ہونے لگا تو ناچار اپنی دس کنیزوں کو جو فن موسیقی میں کامل تھیں اور لحنِ داؤدی سے تاثیرِ سحر دکھاتی تھیں اپنے پاس بلایا اور رازِ دل ظاہر کیا کہ اب مجھ میں تابِ جدائی باقی نہیں، کوئی تدبیر کرو کہ اُس غلام پری پیکر کو خبر نہ ہو اور لطفِ وصال حسبِ دل خواہ میسّر آئے ورنہ میری جان اس غم میں گھل جائے گی۔ اُن سب نے عرض کیا کہ یہ کیا بڑی بات ہے۔ لو، آج ہی سہی۔ ایک عیّارہ اُن میں سے گئی اور غلام کو ایک جام

دارو ے بے ہوشی کا پلا دیا اور اس حالتِ بے خبری میں اُس کو لا کر شاہزادی کے پلنگ پر لٹا دیا۔ جب نصف شب کے بعد اس کو ہوش آیا تو اپنے تئیں بہشت میں پایا ؎

نیم شب چوں نیم مستے آں غلام   چشم نرگس بر کشود از غم تمام
دید قصرے ہمچو فردوس از نگار   تختِ زریں از کنارش تا کنار

اس بزم عیش و سامانِ نشاط کو دیکھ کر غلام متحیر اور شاہزادی کے حسن باکمال و جمالِ بے مثال میں محو ہو گیا ؎

انگ[1] انگ پرتی بنت پری درپن سے سگات   دوہرے تہرے چوہرے بھوگن جانے جات

کنیزانِ سحر فن گانے بجانے میں مصروف ہوئیں اور شہزادی مشاہدۂ جمال اور لطفِ وصال میں مشغول رات بھر وہ غلام یہ عجیب سانگ دیکھتا رہا۔ قریبِ صبح سو گیا تو شہزادی کی چالاک کنیزوں نے اُس کو اُٹھا کر پھر اسی جگہ جا ڈالا۔ جب آنکھ کھُلی تو نہ وہ محفل نہ وہ سامان، وہی جگہ وہی مکان، اب غلام حیرت کے دریا میں ڈوب گیا کہ یہ کیا حال تھا۔ خواب تھا یا خیال تھا۔ رونا پیٹنا اور آہ و زاری شروع کی۔ لوگوں نے حال دریافت کیا تو کہا کہ میں کچھ بیان نہیں کر سکتا۔ ایک خواب تھا بیداری سے بہتر، ایک بیداری تھی خواب سے پریشاں تر۔ نہ خواب تھا نہ بیداری ؎

من نہ دیدم گرچہ من دیدم ہمہ   ہیچ نشنیدم چو بشنیدم ہمہ

جب عارف دریاے توحید میں غوطہ لگا کر باہر آتا ہے تو اُس پر یہی حالت طاری ہوتی ہے ؎

حیرت اندر حیرت اندر حیرت است

ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک فقیر روشن ضمیر ایک شہزادے پر عاشق ہو گیا اور اُس کے عشق و محبت کا زور و شور شہرۂ آفاق ہوا۔ بادشاہ کو اطلاع ہوئی کہ ایک گداے بے نوا شہزادۂ مہ لقا کی محبت میں دیوانہ ہو گیا ہے۔ بادشاہ آتشِ غیرت میں سوختہ ہو گیا اور وزیر کو حکم دیا کہ اسی دم گداے شوخ چشم کو سولی دے دو۔ وزیر بموجب فرمانِ شاہی کے درویشِ دل ریش کو زیرِ دار لایا۔ اُس وقت اُس سوختہ جگر نے کہا کہ اگر تھوڑی مہلت دو تو دوگانہ پڑھ کر کچھ دعا

---

[1] انگ انگ ہر عضو۔ پرتی بنت عکس۔ درپن آئینہ وگات جسم بھوگن زیور یعنی جسم معشوق کا مانند آئینہ کے شفاف ہے زیور کا عکس جو اُس کے ہر عضو میں پڑتا ہے تو دوہرے تہرے چوہرے زیور معلوم ہونے ہیں ۱۲ منہ۔

کروں۔ چنانچہ وزیر نے اتنی مہلت دی اور فقیر نے نماز شروع کی ؎

پس میانِ سجدہ گفتا کاے الٰہ ۔۔۔ چوں بخواہد کُشت شاہم بے گناہ
پیش ازاں کز جاں برآیم بے خبر ۔۔۔ روزیم گرداں جمالِ آں پسر

تیر دعا نشانہ مدعا پر جا لگا۔ فقیر کی دعا نے وزیر کے دل پر اثر کیا۔ اُس نے فوراً بادشاہ سے اُس کے عشقِ صادق کا حال بیان کیا۔ بادشاہ کا بھی دل نرم ہوگیا۔ شہزادہ سے کہا کہ جاؤ اور نہایت خاطر و مدارات سے اُس دل دادہ کو ہمارے پاس لاؤ۔ شہزادہ گیا اور فقیر کا سر اپنے زانو پر رکھا۔ فقیرِ سوختہ نے دیکھا تو آپ کو کنارِ معشوق میں پایا جمالِ یار پر جان نثار کی ؎

سورج کے سامنے نہیں شبنم کو کچھ قرار ۔۔۔ ہم پاس تم جو آئے تو پھر ہم کہاں رہے
نعرہ زد جاں بہ بخشید و بمرد ۔۔۔ ہمچو شمعے باز خندید و بمرد
چوں وصالِ دلبرش معلوم شد ۔۔۔ فانی مطلق شد و معدوم شد
سالکاں دانند در میدانِ درد ۔۔۔ تا فنائے عشق با مرداں چہ کرد
جملگی مرداں فنائے رہ شدند ۔۔۔ در فنائے حق بحق آگہ شدند
تا نہ باشی مدتے زیر و زبر ۔۔۔ کے توانی یافت ز آسایش خبر
عاشقاں جاں باز ایں رہ آمدند ۔۔۔ وز دو عالم دست کوتاہ آمدند
کس دریں وادی بجز آتش مباد ۔۔۔ وانکہ آتش نیست عیشش خوش مباد
عاشق آں باشد کہ چوں آتش بود ۔۔۔ گرم رو سوزندہ و سرکش بود
مرد کار افتادہ باید عشق را ۔۔۔ مردم آزادہ باید عشق را
نے تو کار افتادۂ نے عاشقے ۔۔۔ مردۂ تو عشق را نے لائقے

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت نظام الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک دن قوالی سن رہے تھے۔ آپ کو جوش آیا اور جوش میں رومال ہلا کر فرمایا کہ افسوس ہم دھوبی کے لڑکے کے برابر بھی نہ ہوئے۔ اُس وقت تو کسی خادم کو تاب نہ ہوئی کہ دریافت کرے۔ لیکن دو تین دن کے بعد حضرت امیر خسرو نے وقتِ فرصت میں عرض کیا کہ اُس روز جو حضور کی زبانِ الہام بیان سے

یہ الفاظ صادر ہوئے تھے اس راز سے آگاہ فرمایئے۔ آپ نے فرمایا کہ بادشاہی دھوبی کا لڑکا بن دیکھے بھالے شہزادی پر شیفتہ ہو گیا ہے۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد　　بسا کین دولت از گفتار خیزد

وہ لڑکا تمام دن شہزادی کے کپڑے دھوتا اور طرح طرح سے اُن کو درست کرتا اور غائبانہ اُس کے حسن و جمال کی یاد میں نالہ و فریاد کرتا تھا۔

عشق چون زنبور در ہر خانہ منزل ساختہ　　رخنہ ہائے بعید و ہجر تو در دل ساختہ
برہ تپتا ہوئے کے چھین چھین گھر لین　　اَن[1] گن چھین کر بیچ میں جو پی بچھڑت دین

چند روز تو یہ راز پوشیدہ رہا آخر طشت از بام ہوا۔ لڑکے کے گھر والوں کو یہ بھید کھل گیا۔

گرچہ بود پردہ جہاں در جہاں　　عشق نہ آنست کہ ماند نہاں

اُس کے والدین کو فکر ہوئی اور اندیشہ پیدا ہوا کہ بڑی خرابی کی بات ہے۔ اگر شاہزادی کو خبر ہو گئی تو یہ مارا جائے گا۔ اور اگر یہ چپ چاپ اس غم و حسرت میں مبتلا رہا تو مر جائے گا ع

گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل

ایسی جگہ اس نے کمند ڈالی ہے کہ جہاں رسائی دشوار ہے۔ ہم دھوبی وہ شاہ۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ آخر یہ خیال آیا کہ کسی طور سے لڑکے کی طبیعت کو بدلنا اور اُس کے دل سے یہ خیال مٹانا چاہیے اُس کی ماں نے کیا سوانگ بھرا کہ ایک دن اُداس صورت اور غمگین چہرہ بنا کر بیٹے کے پاس جا بیٹھی اور سرد آہیں بھرنے لگی۔ اُس نے پوچھا کہ اے اماں! خیر تو ہے آج تمھارا کیا حال ہے۔ بہت اصرار کے بعد کہا کہ بیٹا کیا کہوں کہا نہیں جاتا، کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ یہ کہہ کر آنسو بہانے لگی اور بولی کہ جس شہزادی کے تو کپڑے دھویا کرتا تھا آج اُس کا سوم تھا اُس نے مضطرب ہو کر تین بار دریافت کیا کہ کیا وہ مر گئی۔ پھر نعرہ مار کر جاں بحق ہو گیا۔

عشق کی کون انتہا لایا　　ابتدا ہی میں اُٹھ گئے سب یار

---

[1] اَن گن بیشمار۔ چھین سوراخ۔ کر بیچ دل۔ پی محبوب۔ بچھڑت فراق۔ برہ عشق یعنے دل میں جو بے شمار سوراخ معشوق کے فراق میں ہو گئے ہیں تو عشق نے تپتاں بن کے ہر سوراخ کو اپنا گھر بنا لیا ہے ۱۲ منہ۔

اب تو جاتے ہیں میکدہ سے میر پھر ملیں گے اگر خدا لایا

سوچا کچھ تھا، ہو گیا کچھ۔ رونا پیٹنا شروع کیا اب کیا ہوتا تھا آخر رو دھو کے بیٹھ رہے۔ چوتھے روز دھوبن شہزادی کے کپڑے لے گئی۔ اُس نے دیکھ کر کہا یہ کپڑے کس نے دھوئے ہیں۔ پہلی سی صفائی نہیں۔ وہ تو کچھ محبت کی صفائی معلوم ہوتی تھی۔ یہ بات سن کر دھوبن غم زدہ زار و قطار رونے لگی۔ پہلے تو جھوٹا رونا تھا اب سچ مچ کا رونا ہو گیا ؎

جھٹ مٹ کھیلے سچ مچ ہوئے سچ مچ کھیلے بر لا کوئے

شہزادی نے پوچھا کم بخت بتا تو سہی روتی کیوں ہے۔ کچھ منھ سے بول۔ اُس نے تمام حال اپنے لخت جگر کی رحلت کا رو رو کے بیان کیا اور کہا کہ وہ نامراد جو تمھارے کپڑے دھوتا تھا اس طرح جہان سے اُٹھ گیا۔ یہ اُس کا پیغام ہے ؎

اتنا پیغام درد کا کہنا گر صبا کوئے یار میں گذرے
کون سی رات آن ملیے گا دن بہت انتظار میں گذرے

شہزادی بولی کہ اچھی دھوبن ہم کو بھی اپنے لڑکے کی قبر دکھا دے ؎

اے روغنئ طبع تو بر من بلا شدی مارا خراب کردی و خود مبتلا شدی

یہ بات کہہ کر کھڑی ہو گئی اور دھوبن کو ساتھ لے قبرستان کی طرف روانہ ہوئی ؎

وہ چلا جو آتا ہے دوستو! ذرا اُس سے بچیے رہا کرو کیا قتل جس نے نظیر کو یہ وہی تو خانہ خراب ہے
مرے پیچھے مت ملو کہے کبیرا رام تو ہا ہاٹ ہو گیا پھر پارس کس کام

چلتے چلتے قبر پر پہونچی اور اُس کو نہایت درد و حسرت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کیا فوراً قبر شق ہو گئی شہزادی نے کہا ؎

شق جا بجا ہے، آہ یہ کس کا مزار ہے شاید کہ اس میں دفن دلِ بے قرار ہے

پھر بے تاب ہو کر شہزادی اُسی قبر میں سما گئی ؎

اس چمن کی سیر میں آیا رہیو مل کے گل کیا بنائے صانعِ قدرت نے رنگیں گل کے گل
یہ نہ وہ دریا کہ جس سے گذرئے پُل باندھ کر موجِ چشمِ عاشقاں دے توڑ پل میں پل کے پُل

ایک شور مچ گیا بادشاہ کو خبر ہوئی۔ وہ بھی آیا قبر کھودی گئی تو دیکھا کہ جسم ایک ہے اور سر دو ؎

نکلے باہر وے موئے نکلے　　دونوں دست و بغل ہوئے نکلے
ربط چپیاں بہم ہویدا تھا　　مرگئے پر بھی شوق پیدا تھا
ایک کا ہاتھ ایک کے بالیں　　ایک کی لب سے ایک کو تسکیں
جو نظر اُن کو آن کرتے تھے　　ایک قالب گمان کرتے تھے

بعد اس قصہ کے سُلطان جی نے فرمایا کہ میاں ایسا عشق ہم کو نہ مرشد سے ہوا، نہ رسول سے، نہ خدا سے، ورنہ ہم کو بھی وصل نصیب ہو جاتا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب مجنوں عاشق ہوا اور عشق مشتہر، تو امتحان کے لیے لیلیٰ نے ایک آدمی بھیجا کہ مجنوں سے ایک پارۂ گوشت مانگ لاؤ۔ اُس نے مجنوں کو یہ پیغام سنایا۔ پوچھا کہ کہاں کا گوشت طلب کیا ہے۔ اُس نے لیلیٰ سے پوچھا۔ کہا کہ ابھی کچا ہے، مرتبۂ ناسوتی میں ہے۔ چند مدت کے بعد پھر ایک آدمی گوشت کی طلب میں بھیجا، تو مجنوں نے جواب دیا کہ کاٹ کر لے جاؤ۔ اُس نے آکر لیلےٰ سے بیان کیا کہا کہ ہاں! اب عشق میں آیا ہے اور یہ مرتبۂ ملکوتی ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد اَنَا لیلےٰ کہنے لگا، جس طرح شاہ منصور نے اَنَا الحق کہا تھا۔ یہ مرتبہ جبروتی ہے۔ اور فنا فی العشق ہے۔ چند روز کے بعد صرف لیلیٰ لیلیٰ کہنا شروع کیا۔ یہ مرتبۂ لاہوت و توحید ہے، بعد اس کے گم گشتگی پیدا ہوئی نہ لیلیٰ یاد رہی نہ مجنوں۔ یہ مرتبۂ ہاہوت ہے۔ نہ خود نہ خودی نہ خدا کچھ باقی نہ رہا نہ ذکر نہ ذاکر نہ مذکور ؎

دلدار طلب مکن کہ دلدار نماند　　بے یار بزی کہ در جہاں یار نماند
دامن در کش خوش بنشیں یک نفسے　　انگار کہ در زمانہ دیار نماند
سر برہنہ نیستم دارم کُلاہِ چار ترک　　ترکِ دنیا ترکِ عقبیٰ ترکِ مولیٰ ترکِ ترک

ایک روز ارشاد ہوا کہ عشق حقیقی ہو یا مجازی آثار و اطوارِ عشق بہر صورت یکساں ظہور کرتے ہیں۔ شاہ منصور کو بھی غلبۂ عشق تھا اور مجنوں کو بھی لیکن ان کو تو مرتبہ اَنَا الحق میں عشق کے زور و شور نے مار رکھا۔ مگر مجنوں اَنَا لیلےٰ سے گذر گیا۔ شاہ منصور کی حالت اس شعر کے مطابق تھی ؎

بعد از فنا بھی لے نہ گئی کوئے یار میں　　کیا بار تھا صبا میری مُشتِ غبار میں

اور مجنونِ صحرانورد و خانماں برباد کی کیفیت اس شعر کے موافق تھی ؎

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں مُشتِ غبار لے کے صبا نے اُڑا دیا

ایک روز ارشاد ہوا کہ خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ میں ایک سقا تھا ایک دن اُس کو آپ کی زیارت ہوئی۔ حضرت نے پوچھا کہ تو کیا چاہتا ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ دردِ محبت چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ بات تو خود ہمارے اختیار و حوصلہ سے باہر ہے۔ تجھ کو کیا تعلیم کریں۔ خیر ہم تجھ کو رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پیش کرتے ہیں۔ وہاں تو اپنا مدعا عرض کر۔ چنانچہ اُس نے مجلس شریفِ آنحضرت میں بار پایا اور اپنی آرزو گذارش کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے حوالہ کیا۔ آپ نے سقے سے ارشاد کیا کہ تو دردِ محبت کیوں چاہتا ہے تیرا ظرف اس کے قابل نہیں۔ اُس نے بمنت عرض کیا کہ خیر جو ہو سو ہو۔ اگرچہ میں قابلیت نہیں رکھتا۔ لیکن یہ آرزو تو آخر میرے دل میں کسی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ غرض اس کی تمنا کے موافق حضرت علیؓ نے اُس کو تعلیم فرمایا تو اُس کا جسم مثل مجذوموں کے جابجا سے شق ہوگیا۔ چنانچہ جناب وقبلہ سید اعظم علی شاہ صاحب باوردی نے ان کو دیکھا تھا اکثر اوقات زخموں پر خاکستر ڈالا کرتے تھے۔ دردِ محبت کا سوز و گداز بھی غضب ہے۔ آتشِ دوزخ بھی اُس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ جس کے ظرف و حوصلہ میں یہ استعداد رکھی گئی وہ ہی متحمل اس کا ہوتا ہے۔ چنانچہ عطار فرماتے ہیں ؎

من نہ خواہم مال وجاہ و طمطراق سوز خواہم درد خواہم اشتیاق

تا نباشی مردِ صاحب دردِ تو در صفِ مرداں نباشی مرد تو

قدسیاں را عشق ہست و درد نیست درد را جز آدمی درخور دنیست

ذرۂ دردِ خدا در دل ترا بہتر از ہر دو جہاں حاصل ترا

کفر کافر را و دیں دیندار را ذرۂ دردے دلِ عطار را

ذرۂ زدردم دہ اے درمانِ من زانکہ بے دردم بمیرد جانِ من

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۔ تحقیق ہم نے پیش کیا تھا

امانت کو آسمان اور زمینوں اور پہاڑوں پر۔ پس انکار کیا یہ کہ اُٹھائیں گے اس کو اور ڈر گئے اُس سے اور اُٹھالیا اُس کو انسان نے، البتہ تھا وہ ظلم کرنے والا، نادان۔ کہتے ہیں کہ وہ امانت عشق و محبتِ الٰہی تھی۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک بزرگ تھے مدّت تک مجاہدہ میں مصروف رہے۔ ایک دن اُن کو الہام ہوا کہ اچھا تم مانگو کیا مانگتے ہو۔ اُن کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا طلب کروں۔ عرض کیا کہ آٹھ دن کی مہلت ملے تاکہ میں کسی دانا سے مشورہ کروں وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ چنانچہ وہ ایک بزرگ شیخ کی خدمت میں گئے جو کہ اُس زمانہ میں مشہور معروف تھے اور تمام حال بیان کیا۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ میں اس قابل نہیں ہوں۔ ہاں! ایک مردِ خدا فلاں جگہ پڑا ہے۔ بھاڑ جھونکا کرتا ہے۔ اُس کی خدمت میں جاؤ یقین ہے کہ وہ تمھارے سوال کا جواب دے۔ سائل اُن کے پاس گیا اور کیفیت عرض کی۔ فرمایا کہ اچھا کل آؤ تو اس کا جواب دیں گے۔ دوسرے روز حسبِ وعدہ وہ بزرگ سائل وہاں گیا تو شور و غل کی آواز سنی۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ رات کے وقت کسی نے اُس کو قتل کر ڈالا۔ دھڑ ایک سنڈاس میں پڑا ہوا ملا۔ اور سر ایک کوڑی پر پایا۔ حاکم تک مقدمہ گیا۔ وہاں سے حکم ہوا کہ یہ بدمعاش تھا۔ پاؤں میں رسّی باندھ کر کشاں کشاں بیرونِ شہر پھینک دیا تاکہ کوّے کتّے اُس کی نعش کو کھا جائیں۔ یہ بزرگ اس تماشے کو دیکھ کر نہایت حیران ہوئے کہ اس بزرگ کے ساتھ یہ کیا معاملہ ہو رہا ہے اور مجھ سے اُس نے غلط وعدہ کیوں کیا تھا۔ آخر سوچا کہ مردوں کا وعدہ خلاف نہیں ہوتا۔ اُس سرِ بے تن سے جا کر سوال کیا کہ آج کا وعدہ تھا، اب جواب عنایت ہو۔ اَلْكَرِيْمُ اِذَا وَعَدَ وَفَا اُس سر میں سے آواز آئی کہ میاں صاحب! تمھارے سوال کا یہی تو جواب ہے جو تم نے تماشا دیکھا۔ ہمارے اوپر سرکار کی بڑی عنایت اور ہمارے ساتھ نہایت محبت اور بڑا پیار تھا لیکن ساری عمر نہ پیٹ بھر کے کھانا ملا نہ پہننے کو کپڑا نصیب ہوا۔ ہمیشہ لنگوٹی باندھی اور بھاڑ جھونکا۔ زندگی کی یہ صورت تھی موت کی کیفیت تم نے خود ہی دیکھ لی کہ کیا عمدہ گت ہوئی۔ نہ گور ملی نہ کفن میسّر ہوا۔ سر کہاں، دھڑ کہاں، عمر بھر کبھی غسل کرنا نصیب نہ ہوا، نماز و روزہ سے ہمیشہ محروم رہے۔ آخر غسلِ میّت اور نمازِ جنازہ بھی ہاتھ نہ آئی۔ باقی رہا ایمان اور عاقبت بہ خیر۔ اس کا بھی

پتہ نہیں ملا۔ نہ کوئی حساب کتاب کا فرشتہ آیا نہ کسی نے مردودیت و مقبولیت کی خبر دی۔ اشعار حضرت علیؓ

رَضِیْتُ بِمَا قَسَمَ اللّٰہُ لِیْ ۔۔۔ وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی خَالِقِیْ
لَقَدْ اَحْسَنَ اللّٰہُ فِیْ مَا مَضٰی ۔۔۔ کَذَا یُحْسِنُ اللّٰہُ فِیْ مَا بَقِیْ

الغرض اہل محبت و عشق کے ساتھ تو یہ سلوک ہوتا ہے جو کہ بیان کیا گیا پس اگر تم کو مانگنا ہے تو مراتب میں سے کوئی مرتبہ مثل ولایت و غوثیت و قطبیت وغیرہ مانگ لو۔ مزے میں رہو گے۔ محبت کا نام کبھی بھول کر بھی نہ لینا ؎

عشق را ہرگز نشاید ناتواں ۔۔۔ مرد کامل باید و آں پہلواں
پہلواں باید دریں راہِ شگرف ۔۔۔ نکتہ داں را گنگ باید شد ز حرف

یہ بات سن کر اس بزرگ کی آنکھیں کھلیں اور دل میں کہا کہ بھلا جب دینے والے کو کچھ دینا منظور ہوتا ہے تو کہیں پوچھ پوچھ کے دیا کرتا ہے۔ میں تو کچھ نہیں مانگتا جو اس کو دینا منظور ہوگا بغیر دریافت عطا کرے گا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر تشریف لے گئے اور جناب باری میں عرض کیا کہ الٰہی دوستِ خاص کا طلب گار ہوں۔ حکم ہوا کہ اے موسیٰ تجھ سے زیادہ خاص دوست کون ہوگا، تو بھی تو ہمارا خاص دوست ہے۔ پھر دوبارہ سہ بارہ عرض کیا۔ حکم ہوا کہ جاؤ فلاں پہاڑ میں ہمارا خاص دوست تم کو ملے گا۔ آپ پہاڑ میں پہونچے۔ ایک شخص نظر آیا۔ تمام بدن جذام سے گل سڑ گیا تھا اور بدبو کے مارے دماغ پھٹا جاتا تھا۔ حضرت موسیٰ کو نفرت ہوئی، واپس چلے۔ اس شخص نے پکارا کہ اے موسیٰ آئے تو ایسی گرم جوشی و محبت سے اور بھاگے ایسی سرد مہری و نفرت سے ؎

رام نام سے کشٹے بھلے جو ٹپ ٹپ ٹپکے چام ۔۔۔ وار دوں کنچن دیہ کو کہ جس مکھ ناہیں رام

لے یعنے راضی ہوں میں ساتھ اس چیز کے جو حصہ لگایا اللہ نے واسطے میرے میں نے اپنے کام سپرد کیے اپنے خالق کو تحقیق بہتر کیا اللہ نے جو کچھ کہ گذرا اسی طرح بہتر کرے گا اللہ اس میں جو کچھ کہ باقی ہے ۱۲ مہ

لے۲ یعنے با خدا جذامی جس کے بدن سے خون ٹپکے وہ بہتر ہے قربان کروں اس تندرست خوب صورت جسم کو کہ جو بے یاد خدا ہے ۱۲ منہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے معلوم کیا کہ وہ یہی شخص ہے ۔ ملاقات کی اور پوچھا کہ تم ایسے دوست خدا اور تمھارا یہ حال ۔ کہا کہ حضرت عاشقوں کا یہی حال ہوتا ہے اور ہم اسی میں خوش ہیں ۔ ع

راضی ہیں ہم اُسی میں جس میں تیری رضا ہے

پھر پوچھا کہ آپ کو کچھ طلب بھی ہے ۔ کہا کہ دو چیز کی آرزو تھی، سو ایک تو حاصل ہو گئی یعنی آپ کی ملاقات ۔ دوسری یہ ہے کہ ہم کو کہیں سے لاکر سرد پانی پلادو ۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام پانی کی تلاش میں گئے ۔ بعد میں ایک شیر آیا اور اُس نے فقیر کو پھاڑ ڈالا ۔ آپ پانی لے کر آئے تو یہ حال دیکھا ۔ بہت افسوس کیا اور اُس کو دفن کر دیا ۔ بعدِ فراغت کوہِ طور پر پہونچے اور درخواست کی کہ یہ بھید کیا تھا ۔ حکم ہوا کہ اُس شخص نے دو خطائیں کیں ۔ اول یہ کہ ہمارے عشق کا دم بھرا اور طلب غیر کی کی ۔ دوسرے یہ کہ ہمارے پاس کیا سرد پانی نہ تھا جو تم سے مانگا ۔ اگر ہم سے کہتا تو اسی دم دریا بہا دیتے ۔ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ۞ ترجمہ: ۔ اور نہیں یقین لاتے بہت لوگ اللہ پر مگر ساتھ شریک بھی کرتے ہیں ؎

تارہبر تست عادتِ خویش ۔۔۔ مردود منافقے نہ درویش
غیر را گر در دلت جائے بود ۔۔۔ عشق نبود ہرزہ سودائے بود

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ جب موحّد مقامِ توحید میں پہونچتا ہے تو وہاں نہ موحّد رہتا ہے نہ توحید، نہ واحد نہ بسیار، نہ خودی نہ خدا، نہ عابد نہ معبود، نہ ہستی نہ نیستی، نہ ذات نہ صفات، نہ جبریئل نہ قرآن، نہ ولی نہ ولایت، نہ صفت نہ موصوف، نہ اسم نہ مسمیٰ، نہ اوّل نہ آخر، نہ ظاہر نہ باطن، نہ بہشت نہ دوزخ، نہ روشنی نہ تاریکی، نہ نفی نہ اثبات، نہ آسمان نہ زمین، نہ منزل نہ مقام، نہ طلب نہ طالب نہ مطلوب، نہ عشق نہ عاشق نہ معشوق، نہ آدم نہ ابلیس، نہ کفر نہ اسلام، نہ کافر نہ مسلمان، نہ مومن نہ ایمان، نہ حلال نہ حرام، نہ وجود نہ عدم ۔ اَلتَّوْحِيْدُ تَرْكُ التَّوْحِيْدِ فِي التَّوْحِيْدِ ۞ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ یہ کلام حضرت کا درست ہے مگر اس مقام میں حضرت ٹھہرے نہیں ۔ چنانچہ نقل ہے کہ ایک بار حضرت غوث الاعظم پر ایک نورِ عظیم متجلّی ہوا اور اس میں سے ندا آئی کہ اے عبد القادر ہم نے تجھ کو نماز معاف کی ۔ چونکہ صاحبِ فضل تھے سمجھ گئے کہ یہ شیطان کا فریب ہے ۔ فوراً لاحول پڑھی وہ

نور غائب ہوگیا اور شیطان نے مبتسم ہوکر کہا کہ تم خوب بچے ورنہ میں نے بڑے بڑوں کو غارت کردیا ہے۔ اگر حضرت اس وقت شانِ جلال وجمال میں تمیز نہ فرماتے اور اُسکا کہنا مان لیتے تو موحد ہوجاتے لیکن بڑے ہوشیار تھے، بچ گئے۔ شرع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا، علم راہ نما ہوگیا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک مولوی صاحب طالب علموں کو حدیث کا درس دے رہے تھے اُس وقت یہ حدیث پڑھی گئی **عن** جَابِرٍ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلٰی سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ حِیْنَ تُوُفِّیَ فَلَمَّا صَلّٰی عَلَیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَوُضِعَ فِیْ قَبْرِہٖ وَسُوِّیَ عَلَیْہِ سَبَّحَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَسَبَّحْنَا طَوِیْلًا ثُمَّ کَبَّرَ فَکَبَّرْنَا فَقِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ لِمَ سَبَّحْتَ ثُمَّ کَبَّرْتَ قَالَ لَقَدْ تَضَایَقَ عَلٰی ہٰذَا الْعَبْدِ الصَّالِحِ قَبْرُہٗ حَتّٰی فَرَّجَہُ اللّٰہُ عَنْہُ رَوَاہُ اَحْمَدُ **وعن** ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ہٰذَا الَّذِیْ تَحَرَّکَ لَہُ الْعَرْشُ وَفُتِحَتْ لَہٗ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَشَہِدَہٗ سَبْعُوْنَ اَلْفًا مِّنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ لَقَدْ ضُمَّ ضَمَّۃً ثُمَّ فُرِّجَ عَنْہُ رَوَاہُ النَّسَائِیُّ انتھی۔ یعنی فرمایا ہے جابر رضی اللہ عنہ نے کہ نکلے ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ طرف سعد بن معاذ انصاری کے جبکہ فوت ہوئے۔ پس پڑھی آپ نے اُن پر نماز جنازہ اور رکھا قبر میں اور دفن کیا، تو آپ نے تسبیح پڑھی یعنی سُبْحَانَ اللّٰہِ وَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ پس ہم نے بھی تسبیح کہی دراز، پھر آپ نے تکبیر کہی یعنے اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ پس ہم نے بھی تکبیر کہی۔ پس بعض صحابیوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیوں آپ نے اوّل تسبیح کہی اور بعد میں تکبیر۔ فرمایا کہ تحقیق تنگ ہوگئی تھی اس بندۂ صالح پر قبر اُس کی حتیٰ کہ کشادہ کیا اللہ نے قبر اُن کی کو۔ روایت کیا ہے اس حدیث کو احمد نے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ فرمایا رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ سعد بن معاذ ایسا شخص تھا کہ جنبش میں آیا عرش اور کھل گئے دروازے آسمانوں کے اور ستر ہزار فرشتے واسطے نماز جنازہ کے حاضر ہوئے۔ تحقیق دبالیا قبر نے جو حق دبانے کا تھا۔ پھر فراخ ہوئی۔ روایت کیا ہے اس حدیث کو نسائی نے۔ اس حدیث شریف کو بیان فرماکر مولوی صاحب رونے لگے کہ بڑے خوف کا

مقام ہے۔ جب رسولِ خدا کے صحابی کا یہ حال ہو تو عوامِ امت کا کیا ٹھکانا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ جناب مولوی صاحب یہ تو رونے کا محل نہیں ہے بلکہ بڑی خوشی کا مقام ہے کہ اس خبرِ عبرت اثر سے اربابِ فہم کو نہایت عمدہ نصیحت حاصل ہوتی ہے۔ یہ جائے غور ہے کہ حضرت سعد ابن معاذ انصاری ایسے ذی رتبہ اور بزرگ صحابی کہ اُن کے جنازہ کی نماز رسولِ خدا نے پڑھی۔ ان کے لیے عرش کو جنبش ہوئی۔ آسمانوں کے دروازے کشادہ ہوگئے۔ ستّر ہزار فرشتوں نے نمازِ جنازہ پڑھی۔ پھر کیا سبب تھا کہ زمینِ قبر نے اُن کو تنگ کیا۔ ظاہر ہے کہ اُن کو حضرت رسالت پناہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شفقت و عنایت پر ناز تھا۔ اپنی مغفرت و نجات کا ذریعہ رسولؐ خدا کو سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ ہمارے ہادی و شفیع ہمارے ساتھ ہیں۔ پس یہی خیال اُن کا کہ خالصاً تکیہ رحمت الٰہی پر نہ تھا بلکہ رسولِ مقبول کی عنایت کا سہارا بھی لگا ہوا تھا۔ تنگی قبر کا باعث ہوا۔ غیرتِ کبریائی اور عظمتِ الٰہی نے ان کو دکھا دیا کہ تم نے ہماری ذات پر تو اعتماد نہ کیا۔ اب ایسا بڑا حامی تمھاری قبر پر کھڑا ہے دیکھیں تو وہ کیا مدد کرسکتا ہے اور کیونکر بچا سکتا ہے؟ مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَہٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ ؕ رسولؐ خدا نے راہِ خدا بتائی۔ خدا پرستی سکھائی توحیدِ ربانی کا نعرہ لبند کیا، خدا پر توکّل کرنا، ذاتِ حق پر بھروسہ رکھنا اور اس ذات کو فاعلِ مطلق اور لاشریک سمجھنا تعلیم فرمایا۔ پس جو کوئی خلاف ان ہدایات کے غیرِ خدا پر نظر رکھے خواہ نبی پر یا ولی پر، بے شک وہ مستحقِ عذاب و سزاوارِ عتاب ہے۔ اور جس قدر اس کے دل میں تعلق ماسوا اللہ سے اُسی قدر تنگیٔ قبر کا باعث ہے۔ جب کہ خداوند ذوالجلال نے اپنی قدرتِ کاملہ اور رحمتِ شاملہ سے انسان کو پیدا کیا، جان دی، جسم دیا، پالا، پرورش کیا، زن و فرزند مال و متاع کا مالک بنا دیا، ان سب کاموں میں کوئی نبی یا ولی خدا کے ساتھ شریک نہ تھا، سفارشی نہ تھا، کسی کی خاطر و مروّت سے اللہ تعالےٰ نے یہ عنایتیں نہیں کیں تھیں پھر حیف کی بات ہے کہ ایسی ذات کو چھوڑ کر نجات و مغفرت اور معاملۂ آخرت کے لیے کسی دوسرے کی حمایت اور سفارش پر آدمی نظر ڈالے اور کوئی وسیلہ اور واسطہ تلاش کرے۔ مَثَلُ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَوۡلِیَآءَ کَمَثَلِ الۡعَنۡکَبُوۡتِ ۚۖ اِتَّخَذَتۡ بَیۡتًا ؕ وَ اِنَّ اَوۡہَنَ الۡبُیُوۡتِ لَبَیۡتُ الۡعَنۡکَبُوۡتِ ۘ لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ ؕ

یعنی مثال اُن لوگوں کی جنھوں نے پکڑا سوائے خدا کے مددگار مانند مکڑی کے ہے کہ بناتی ہے گھر کو اور البتہ کمزور ترین گھر مکڑی کا ہے اگر جانو تم سے لہ

من نخواہم رحمتے جز رحم شاہ	من نخواہم غیر آں شہ را پناہ
غیر شہ را بہر آں لا کردہ ام	کہ بسوئے شہ تولا کردہ ام
من نخواہم آفرینِ ہیچ کس	مدحِ من دشنامِ لیلےٰ باد و بس
گر تُرا سنگے زند معشوق مست	بہ کہ از غیرے گہر آری بدست
حقا کہ با عقوبتِ دوزخ برابر ست	رفتن بپائے مردئ ہمسایہ در بہشت

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے جنابِ باری میں عرض کیا کہ الٰہی میری اُمت کے افعال میرے روبرو پیش ہوا کریں۔ حکم ہوا کہ یہ بات ہم کو ہی سزاوار ہے تم سے اس کا تحمل نہ ہو گا۔ تین بار درخواست کی اور یہی جواب ملا۔ آخر ہوا حکم کہ اچھا۔ اُس زمانہ میں رسول علیہ السلام کی یہ عادت تھی کہ جب کسی لڑائی پر جاتے تو دو صحابیوں کے درمیان بنائے اُخوت فرماتے۔ یعنی دینی بھائی بناتے۔ ایک صحابی کو لڑائی میں اپنے ہمراہ لے جاتے اور دوسرے صحابی کو گھر میں چھوڑ جاتے تاکہ وہ اپنے گھر اور اپنے دینی بھائی کے گھر کی خبرگیری کرتا رہے۔ غزوۂ تبوک میں درمیان ثعلبہ انصاری اور سعید بن عبدالرحمٰن کے بھائی چارہ ہوا سعید بن عبدالرحمٰن تو لڑائی میں گیا اور ثعلبہ کو گھر میں چھوڑا۔ ایک روز ثعلبہ نے اپنے بھائی کی بیوی کی آوازِ خوش الحان سُنی اور عاشق ہو گیا۔ دوسرے روز بے تحاشا بہ ارادۂ فاسد اپنے بھائی کے گھر میں چلا گیا۔ اُس پاک دامن بیوی نے کہا کہ اے ثعلبہ تجھ کو کیا ہوا خدا اور رسول سے شرم نہیں کرتا کہ اپنے بھائی کے گھر میں جو رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لڑائی میں ہے فاسد ارادہ سے آیا خدا اور رسول کو کیا جواب دے گا۔ اتنی بات کے سنتے ہی خوفِ خدا اُن کے دل پر غالب ہوا اور نعرہ مار کر بہ آہ و زاری جنگل کی راہ لی، یہاں تک کہ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لائے۔ اہلِ عرب کا یہ دستور تھا کہ جب قافلۂ تجارت یا لشکرِ فتح پیکر واپس آتا تو دوست و یگانے اپنے دوست و یگانوں کے استقبال کے لیے جاتے اور اُس قافلہ یا لشکر کو

لہ یہ قصہ تفسیر الجواہر میں ہے ۱۲۔

بعزت واکرام خوشی کے نعرے مارتے ہوئے لاتے۔ سب آدمیوں نے اپنے یگانوں کا استقبال کیا۔ اُن کی ملاقات سے مسرور ہوئے۔ لیکن سعید بن عبدالرحمٰن اپنے دینی بھائی ثعلبہ انصاری کا منتظر رہا اور بہت افسوس کیا اور کہا کہ خدا خیر کرے! بھائی ثعلبہ کیوں نہیں آیا۔ آخر گھر میں آکر اپنی بیوی سے دریافت کیا کہ بھائی ثعلبہ کہاں ہے۔ اُس نیک بخت نے تمام قصہ بیان کیا۔ یہ حال سن کر اُن کو نہایت رنج وقلق ہوا کہ ہائے! میرے بھائی کو کیا ہو گیا! القصہ اُس کی جستجو میں جنگل کی راہ لی۔ ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے دیکھتا کیا ہے کہ ایک صحرا میں نعرے مار کر روتا پھرتا ہے۔ سعید نے کہا کہ بھائی ثعلبہ تجھ کو کیا ہوا۔ چل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں۔ وہاں تیری تقصیر معاف ہو جائے گی۔ ثعلبہ نے کہا کہ اچھا میرے ہاتھ باندھ اور گردن میں رسی ڈال کر لے چل۔ اسی حیثیت سے سعید اُن کو مدینہ منورہ میں لایا۔ اول حضرت ابوبکرؓ کے گھر گیا۔ پھر حضرت عمرؓ کے گھر۔ پھر حضرت عثمانؓ کے گھر۔ پھر حضرت علیؓ کے گھر گیا اور کہا کہ میری کوئی نجات کی صورت ہے۔ چاروں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ تم نے گناہِ عظیم کیا ہے ہمارے سامنے سے چلے جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تمھارے سبب سے ہم کسی آفت میں گرفتار ہو جائیں۔ آخر رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بحالتِ زار پہونچا اور اپنا حال پُرملال وکیفیتِ ناگفتنی گذارش کر کے طالبِ شفاعت ومغفرت ہوا۔ رسولِ علیہ السلام نے فرمایا کہ تیرے لیے کوئی صورت بخشش کی نہیں۔ او خبیث! یہاں سے نکل جا۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارے شہر پر غضب الٰہی نازل ہو ؎

بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد   بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

آخر الامر تمام وسائل سے مایوس ہو کر پھر جنگل کی راہ لی اور جناب الٰہی میں نعرہ مار کر فریاد کرنے لگا کہ الٰہی تیرے محبوب پر بھروسا تھا اُنھوں نے صاف جواب دے کر شہر سے باہر نکال دیا۔ اب تیرا در چھوڑ کر کہاں جاؤں؟ ؎

راندۂ عالم دسوئے تو می آیم باز   می خورد کا غذِ باطل شدہ را کاغذ ساز

جب کہ اس کا درد حد سے زیادہ ہوا اور سب طرف سے اُس کا تعلق ٹوٹا، بجز خدا کے کسی کا بھروسا باقی نہ رہا۔ دلِ سوختہ کو یک سوئی حاصل ہوئی تو دریائے رحمت کا ملہ نے ایک

جوش مارا اور ایک ندا عالمِ غیب سے اُس کے گوشِ جاں میں وارد ہوئی کہ اے بندۂ عاصی میری رحمت سے نااُمید مت ہو۔ میں مالک ہوں جو چاہتا ہوں سو کرتا ہوں لیکن تو نے یہ بڑی بے وقوفی کی جو اپنے گناہ پر ایسے اولوالعزم رسول کو گواہ کرلیا۔ یا تو واقف تھا یا ہم دوسرے کو کیوں مطلع کیا۔ ہمارے سوا غفور الرحیم کون ہے ؎

باز آ باز آ ہر انچہ ہستی باز آ گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

یہاں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر یہ آیتِ استغفار نازل ہوئی وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَھُمْ ذَکَرُوا اللّٰہَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِھِمْ وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ وَلَمْ یُصِرُّوْا عَلٰی مَا فَعَلُوْا وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُھُمْ مَّغْفِرَۃٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ ؕ اور وہ لوگ جب کر بیٹھیں کچھ کھلا گناہ یا بُرا کریں اپنے حق میں تو یاد کریں اللہ کو اور بخشش مانگیں اپنے گناہوں کی اور کون ہے گناہ بخشتا سوائے اللہ کے اور اَڑ نہ رہیں اپنے کیے پر جانتے۔ اُن کی جزا بخشش اُن کے رب کی اور باغ جن کے نیچے بہتی نہریں۔ رہ پڑے اُن میں اور خوب مزدوری ہے کام کرنے والوں کی یعنی ہم نے اُس کا گناہ معاف کیا۔ بلاؤ اُس کو اور یہ خوش خبری دو۔ اس آیت کے نازل ہوتے ہی رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی اور حضرت سلمان فارسی کو بھیجا کہ ثعلبہ فلاں درخت کے تلے رات کے وقت فریاد کیا کرتا ہے، وہاں سے ڈھونڈھ لاؤ۔ دونوں صاحب اُن کی تلاش کو چلے اور عشا کے وقت اُس درخت کے تلے فریاد کرتے پایا۔ دونوں صاحبوں نے بہ آوازِ بلند فرمایا کہ مبارک باد! تمھاری خطا معاف ہوئی۔ چلو رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے تم کو بلایا ہے اور تمھارے لیے اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل وکرم سے آیتِ مغفرت نازل فرمائی ہے۔ اُٹھ کے ہمراہ ہوا۔ مسجدِ نبوی میں آیا اُس وقت نمازِ عشا ہورہی تھی اور سورۂ تکاثر شروع۔ تینوں صاحب شامل ہوئے۔ پہلی آیت میں ثعلبہ نے نعرہ مارا کہ تمام جماعت پر ایک اثر ظاہر ہوا۔ دوسری آیت میں بے ہوش اور تیسری آیت میں جاں بحق ہوا۔ اُن کے جنازہ کے ساتھ فرشتوں کی یہ کثرت تھی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم

پنجوں کے بل چلتے تھے۔ ثعلبہ کی ایک بیٹی تھی وہ رو کر کہنے لگی کہ اب میں باپ کس کو کہوں گی۔ آپ نے فرمایا کہ میں تیرا باپ ہوں اور فاطمہؓ تیری بہن ہے کسی طرح کا غم مت کر۔ غرض بُرے وقت میں بجز خدا کوئی ساتھی نہیں پھر کیوں ہم غیر اللہ کی طرف متوجہ ہوں اور وسیلہ اور واسطہ ڈھونڈھیں۔

ایک روز ارشادؓ ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ایک شہر میں پہونچے دیکھا کہ ایک بوڑھا ضعیف لکڑیوں کا گٹھا سر پر رکھے چلا آتا ہے اُس کے حالِ زار پر رحم آیا۔ نام دریافت فرمایا۔ کہا کہ سلیمان۔ حضرتؑ کو خیال آیا کہ سبحان اللہ! ایک میں سلیمان ہوں کہ تمام ملک زیرِ نگیں ہے اور ایک یہ سلیمان ہے کہ پیری میں ایسی سخت مصیبت جھیلتا ہے۔ فوراً اپنے تاج میں سے ایک لعل اُس کو حوالہ کیا اور کہا کہ یہ تجھے بلکہ تیری اولاد کو بھی کفایت کرے گا۔ مناسب ہے کہ آئندہ اس محنت کو چھوڑ دے اور آرام سے بسر کر۔ بڈھے نے لکڑیوں کا بار سر سے پھینک دیا اور لعل کو لے کر شاد و خرم گھر کو چلا۔ بار بار لعل کو دیکھتا اور حیران ہوتا کہ اللہ تعالےٰ نے کیا قدر و قیمت اس سنگریزہ کو عطا کی ہے۔ یکایک ایک چیل نے اُس کو گوشت سمجھ کر جھپٹا مارا اور صاف لے اُڑی۔ بڈھا ہاتھ ملتا رہ گیا۔ اب یہ فکر پڑی کہ آج زن و فرزند کو کیا کھلاؤں گا۔ چلو پھر اپنے گٹھے کو سنگواؤ اور بیچ کھوچ کے پیٹ پالو۔ وہاں جا کر دیکھا تو گٹھا بھی کوئی اُٹھائے گیا تھا۔ ناچار شرم کے مارے رات جنگل ہی میں کاٹی۔ صبح دم پھر لکڑیاں چننے لگا۔ اتنے میں حضرت سلیمانؑ کی سواری آئی۔ سوچے کہ یہ حریص بڈھا اب بھی اپنی معمولی مشقّت میں مصروف ہے۔ دریافت کیا تو اُس نے قصّہ سنایا حضرت کو پھر رحم آیا اور دوسرا لعل عنایت کیا۔ آج بڈھے نے نہایت احتیاط سے مٹھی میں بند کر گھر کی راہ لی۔ رستہ میں ایک ندی تھی جب منجدھار میں پہونچا تو پاؤں اُکھڑ گئے۔ دو چار ایسی ڈبکیاں کھائیں کہ ڈوبتے ڈوبتے بچا اور لعل ہاتھ سے نکل گیا۔ پھر حسرت و افسوس کے ساتھ واپس گیا اور لکڑیاں چننے لگا۔ حضرت سلیمانؑ کے لشکر کا کوچ ہوا تو پھر دیکھا کہ وہی بدقسمت بڈھا لکڑیوں کا پشتارہ باندھے چلا جاتا ہے پھر طلب فرمایا اور حال پوچھا اُس نے کیفیتِ واقعہ عرض کی اور کہا کہ آج تیسرا دن ہے خدا جانے زن و فرزند پر کیا گذری ہوگی۔ حضرت کو بہت ہی رحم آیا اور تیسرا لعل جو نہایت ہی گراں بہا تھا اُس کو دیا۔ اب کی دفعہ خوب کس کے پگڑی میں باندھا تھوڑی دور چلا تھا کہ ایک سوار نمودار ہوا۔

اُس نے تاڑ لیا کہ اس بڈھے کی پگڑی میں لعل چمکتا ہے۔ گھوڑا دوڑا کر قریب آیا اور پگڑی اُچک یہ جا وہ جا۔ جھٹ نظروں سے غائب ہو گیا۔ بڈھا روتا پیٹتا حضرت سلیمانؑ کے پاس حاضر ہوا اور یہ کہا کہ اے پیغمبر خدا آپ نے خوب میری راہ کھوٹی کی۔ خدا نے جو کچھ میرے نصیب میں لکھا تھا۔ میں اس پر راضی تھا آپ نے چاہا کہ مجھ کو فقر سے نجات ہو، سو یہ بات خدا کو منظور نہ تھی۔ آپ کے چاہے سے میں امیر تو نہ بنا البتہ اُس کے عوض میں مجھے اور میرے بال بچوں کو تین دن فاقہ کشی کرنی پڑی۔ حضرت نے فرمایا کہ سلیمانؑ کیا کرے جب خدا ہی نہ چاہے۔ غرض بڈھا بدستور لکڑیاں لاتا اور کُنبے کو پالتا۔ قضارا حضرت سلیمانؑ کی انگشتری گم ہو گئی ماہی گیر کے گھر جا کر رہے جب دوبارہ تختِ سلطنت ملا اور لشکر کا گذر اُس لکڑہارے کی بستی میں ہوا تو آدمی بھیج کر اُس کو طلب فرمایا۔ اُس نے جواب دیا کہ اب تو بغیر سواری کے ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ حضرت کو تعجّب ہوا۔ سواری بھیج کر بلوایا اور حال دریافت کیا اُس نے عرض کیا کہ جب آپ کے دیے ہوے لعل گم ہو گئے اور میری آس ٹوٹ گئی تو میں نے بے اختیار خداوند کریم کی جناب میں گریہ وزاری شروع کی کہ خدایا تیرے نبی نے بہت کوشش کی مگر تو نے نہ چاہا تو کچھ بھی فائدہ نہ ہوا۔ اب سوائے تیرے کسی کا آسرا نہیں تو ہی اپنے خزانۂ غیب سے وہ کھوے ہوے لعل عنایت کر۔ اتفاقاً ایک دن حسبِ عادت لکڑیاں توڑنے کو درخت پر چڑھا وہاں چیل کا گھونسلا تھا۔ دیکھا تو وہی تینوں لعل رکھے ہیں۔ اُن کو پا کر اب میں امیر کبیر بن گیا۔ جب تک سلیمان علیہ السلام پر بھروسہ تھا تو محروم رہا۔ جب خدا کی طرف خلوصِ دل سے متوجّہ ہوا تو مالا مال ہو گیا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت امام حسن رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے جب کہ آپ کی عمر بارہ برس کی تھی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ آپ کے دل میں کس کی محبت ہے فرمایا کہ تمھاری۔ پھر پوچھا کہ بھائی حسین کی۔ فرمایا کہ اُن کی بھی۔ پھر پوچھا کہ اماں جان کی۔ فرمایا کہ ہاں اُن کی بھی۔ پھر پوچھا کہ نانا جان کی۔ فرمایا کہ ہاں اُن کی بھی۔ پھر پوچھا کہ اللہ میاں کی۔ فرمایا کہ ہاں اُن کی بھی۔ تب حضرت امام حسن بولے کہ ابّا جان آپ کا دل ہے یا کوئی مسافر خانہ ہے۔ دل میں تو ایک ہی کی محبت رہ سکتی ہے، نہ ہزاروں کی۔ حضرت علی نے اُن کو چھاتی سے لگایا اور فرمایا کہ بیٹا تم سچ کہتے ہو۔ محبت تو ایک ہی کی رہے گی۔ سُبحان اللہ جب بچپن میں یہ سمجھ تھی

تو بڑے ہو کر کیا کیفیت ہوگی۔ سچ ہے ؎

بچۂ بط اگر چہ دینہ بود   آب دریاش تا بسینہ بود

حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے حضرت امام حسن کو جو تعلیم فرمائی ہے ہم کو نہایت ہی پسند ہے وہو ہذا:۔ یَا وَلَدِیْ فِکْرُکَ فِیْکَ یَکْفِیْکَ دَاءُکَ وَدَوَاءُکَ فِیْکَ لَیْسَ شَیْءٌ خَارِجًا مِنْکَ اَنْتَ اُمُّ الْکِتَابِ یَا وَلَدِیْ اَنْتَ جِسْمٌ صَغِیْرٌ وَفِیْکَ عَالَمٌ اَکْبَرُ۔ ترجمہ اے میرے فرزند تیرا فکر تجھ میں تیرے لیے کافی ہے۔ تیرا درد اور تیری دوا تجھ میں ہے کوئی چیز تجھ سے باہر نہیں۔ تو ام الکتاب ہے۔ اے میرے فرزند تو ایک چھوٹا جسم ہے اور تیرے اندر ایک بڑا جہان ہے ؎

تو بمعنی جانِ جملہ عالمے   ہر دو عالم خود توئی بنگر دمے

در حقیقت خود توئی اُمّ الکتاب   خود ز خود آیاتِ خود را باز یاب

صورتِ نقشِ الٰہی خود توئی   عارفِ اشیا کما ہی خود توئی

انچہ مطلوب جہاں شد در جہاں   ہم توئی و بازجو از خود نشاں

ہم ملک ہم نہ فلک بشناختے   گر بجسم خویشتن رہ یافتے

ایک روز ارشاد ہوا کہ اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَآءِ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایمان ایک تیسری چیز ہے درمیان میں خوف اور رجا کے یعنی نہ تو خوف ایمان ہے نہ رجا بلکہ ان کا وسط ایمان ہے۔ اور قلندر صاحب فرماتے ہیں ؎

آبِ رحمت چیست گو پاک از ہمہ   مردِ عارف کیست بیباک از ہمہ

اور یہ مرتبہ اولیاء اللہ کا ہے۔ کما قال اللہ تعالےٰ اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۔ یعنی سُن رکھ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم تحقیق اولیاء اللہ نہ خوف ہے اُن پر اور نہ وہ غم کھائیں۔ اور حضرت شمس تبریز نے رسالہ مرغوب القلوب میں فرمایا ہے ؎

لباس زہد و تقویٰ تا نہ پوشی   شرابِ معرفت را کے تو نوشی

سخن در معرفت چوں رفت اکنوں   بروں آرم ز دریا دُرِ مکنوں

میانِ کفر و ایماں راہِ فقر است   از آں رہ دور بودن ہم کفر است

نشاید خوف غالب نے رجا را — میانِ ہر دو باید بود ما را

ایک روز ارشاد ہوا کہ میاں سچ پوچھو تو توحید بھی شرک ہے۔ ایک یا احد تو محدود و معدود ہے اور وہ ذات بے نہایت و بے غایت حدّ و حصر اور عدد و شمار سے پاک و منزّہ ہے۔ بس ایک کہنا بھی درست نہیں۔ اور اگر یہ کہو کہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ؕ کیوں فرمایا۔ اس کا حال یہ ہے کہ کہنے اور کلام کرنے کے واسطے اَحَدٌ سے بہتر کوئی لفظ نہیں ہے۔ اگر سب کو چھوڑ چھاڑ کر آدمی ایک کے سر ہو رہے تو سبحان اللہ! اور اگر ایک سے بھی پاک صاف ہو جائے تو پھر کیا ہی کہنے ہیں۔ چنانچہ ہم کو ایک نقل یاد آئی ہے۔ دتاترہ فقیر سنیاسی جس نے چوبیس گرو کیے تھے منجملہ اُن کے ایک عورت بھڑبھوجن بھی تھی۔ جب وہ اپنی سُسرال میں آئی تو دھان کوٹنے کا اتفاق پڑا۔ ہاتھوں میں چوڑیاں تھیں۔ اُن کی جھنکار سے اُس کو شرم آئی کہ سُسرال کے مرد سنتے ہیں۔ یہ سوچ کر ایک ایک چوڑی توڑ دی۔ پھر بھی آواز قائم رہی۔ اور ایک ایک توڑ دی۔ آخر کار سب کو توڑ پھوڑ کے صرف ایک ایک چوڑی دونوں ہاتھوں میں باقی رہ گئی۔ اُس وقت آواز بالکل بند ہو گئی۔ فقیر سنیاسی نے اس کیفیت سے توحید کی تعلیم پائی اور اس عورت کو اپنا گرو مانا لیکن ہمارے نزدیک تو اگر یہ ایک بھی توڑ دی جائے تو بالکل کھیڑا پاک ہے اَلتَّوْحِيْدُ تَرْكُ التَّوْحِيْدِ فِي التَّوْحِيْدِ ؕ ؎

نیستم من ہر چہ ہستی پس توئی — چوں یکے نبود کجا باشد دوئی

ایک روز ارشاد ہوا کہ فرعون کی ایک عزیز چیز گم ہو گئی تھی۔ اپنے ہزاروں غلاموں کو حکم دیا کہ تم میں سے جو کوئی ڈھونڈھ لائے گا ہزار دینار انعام و خلعت پائے گا۔ اور آزاد بھی کیا جائے گا۔ سب نے کوشش کی۔ بڑی جستجو کے بعد وہ چیز ایک غلام کو ملی۔ سب غلام فرعون کے سامنے حاضر ہوئے۔ جس نے وہ چیز پائی تھی نہایت شاد و خنداں تھا۔ باقی مایوسی کی حالت میں کھڑے تھے۔ فرعون نے پوچھا کہ یہ لوگ ملول اور افسردہ کیوں ہیں۔ ہامان نے جو وزیر تھا کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ طلب شئے میں تو برابر تھے مگر یافت میں ناکام رہے۔ بادشاہ نے کہا کہ پہلے ان ہی کو انعام دے کر آزاد کر دو۔ وہ غلام جس نے چیز پائی تھی بولا کہ حضور مجھ میں اور ان سب میں فرق کیا رہا؟ فرعون نے جواب دیا کہ ہمارے نزدیک تو

کچھ فرق نہیں۔ غلامی میں سب تمھارے ہم رتبہ، طلب میں برابر، مگر چیز چوں کہ ایک تھی اس لیے ایک ہی کو ملی۔ سو اب ہم یہ فرق بھی اُٹھائے دیتے ہیں۔ یہ کہہ کر اُس چیز کو اُٹھا زمین پر دے مارا اور توڑ دیا اور کہا کہ لو، بس اب تم سب برابر ہو گئے۔ نہ کچھ اس کے کھوٹ جانے سے ہمارا نقصان تھا، نہ پانے سے کچھ فائدہ ہوا۔

عجب دربار ہے اللہ کا اے طوبیٰ میں صدقے ہنرمندوں سے پوچھے جائیں گے واں بے ہنر پہلے

ایک روز ارشاد ہوا کہ سلطان محمود کے پاس ایک جامِ بیش بہا تھا۔ اراکینِ دولت کو حکم دیا کہ اس کو توڑ دو۔ سب نے عذر کیا کہ حضور نایاب چیز کو توڑ ڈالنا مناسب نہیں۔ آخر ایاز کو اشارہ کیا اُس نے بے تامّل چورا کر دیا۔ اہلِ دربار نے اس کو ملامت کی کہ آہ! ایسی جنسِ عزیز تو نے ضائع کر دی۔

گفت فرماں بُردنِ ایں شہ مرا برتر از ماہی بود تا مہ مرا
تو بسوئے جام افگندی نگاہ من نیم جز بندۂ فرمانِ شاہ

لیکن ہم کو یہ بھید نہیں کھُلتا کہ نافرمان کون ہے اور فرماں بردار کون؟ يُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ تَشَاءُ۔

مستغنی از طاعتش پشتِ کس نہ بر حرف او جائے انگشتِ کس

ایک روز ارشاد ہوا کہ نوّاب لکھنؤ کا ایک دوست تھا اور اُن کی خدمت میں رہتا تھا۔ ایک دن نوّاب صاحب نے کہا کہ اگر کوئی عہدۂ جلیلہ یا منصب چکلہ داری وغیرہ چاہیے تو تم علی نقی خاں سے جا کر ملو۔ کیوں کہ اہلِ مناصب و مراتب کے تقرّر وغیرہ کا اختیار ہم نے اُس کو دے رکھا ہے۔ وہ وزیر ہے اور اس قسم کے کام وزیر ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اگر ہمارے پاس پڑے رہو گے تو خیر یہاں صرف دوستی ہی دوستی ہے اور کچھ فائدہ یہاں حاصل ہونا معلوم۔ اُس شخص نے جواب دیا کہ حضور میں کوئی جاہ و منصب علی نقی خاں کی وساطت سے نہیں چاہتا۔ اور مجھ کو وزیر کی اطاعت منظور نہیں۔ آپ کے دربار میں بیکار پڑا رہنا بھی منظور ہے۔ کیوں کہ آپ کا قرب اور آپ کی صحبت پھر کہاں میسّر ہو گی۔ نوّاب نے فرمایا کہ اچھا تمھاری خوشی۔ علی نقی خاں کو یہ بات ناگوار گزری اور چاہا کہ اس شخص کو نوّاب کے دربار سے نکلوا دے۔ نوّاب کو بھی قرینہ سے

یہ بات معلوم ہوگئی۔ کہلا بھیجا کہ یہ تمہارا ماتحت نہیں۔ تم سے کسی منصب و مرتبہ کا طالب نہیں۔ خاص ہماری صحبت کا آرزومند ہے۔ یہ تمہارے نکالنے سے نہیں نکل سکتا۔ تمہارے اختیارات ملازمان ملک پر ہیں۔ ہمارے خاص آدمیوں کے معاملہ میں تم کو کیا دخل۔ اگر پھر ایسا خیال کروگے تو تمہارے واسطے اچھا نہ ہوگا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ کلکتہ کے نواح میں ایک بزرگ تھے دس بیگہ زمین اُن کی وجہ معاش تھی۔ جب کہ بندوبستِ اراضی شروع ہوا تو حاکم نے اُس زمین کی ضبطی کا حکم نافذ کیا۔ فقیر صاحب نے بہت واویلا کی مگر کسی نے نہ سنی۔ تب حاکم کے لیے بددعا کی وہ مرگیا۔ دوسرا حاکم آیا تو اُس کے سامنے اپنا رونا رویا۔ اُس نے بھی کچھ نہ سنا۔ جو حکم ہوچکا تھا وہی بحال رہا۔ اُس کے واسطے بھی تیر دعا لگا یا وہ بھی مرگیا تیسرا حاکم آیا وہ بھی اُسی طرح بددعائے فقیر کا شکار ہوا۔ جب چوتھے حاکم کو کرسیٔ حکومت ملی تو اُس نے فہم و فراست سے معلوم کیا کہ جو حاکم آتا ہے وہ مرجاتا ہے کچھ اس کا سبب ہے۔ پوچھا تو کسی نے تمام حال فقیر کا سنا دیا۔ نئے حاکم نے فقیر کو بلایا اور کہا کہ سنو صاحب جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہوچکا۔ میں اُس حکمِ ضبطی کو منسوخ نہیں کرسکتا۔ لیکن تم صبر کرو میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اتنے عرصہ میں تمہارے لیے معافی کی سند منگا دوں گا۔ اس وعدہ سے فقیر کی تسلی ہوگئی۔ حاکم نے حسب وعدہ من جانب سرکار سند بہ نام فقیر منگائی اور جاکر اُس کے حوالہ کی کہ لیجیے اپنی زمین کی سند۔ لیکن مجھ کو اس بات کا جواب دیجیے کہ یہ تین خون جو دس بیگہ زمین کے واسطے آپ نے کیے یہ کس کے سر ہوے۔ گو عدالتِ ظاہری اُس کا مواخذہ نہ کرے لیکن خدائے غیب داں کے سامنے تو اس کی باز پرس ضرور ہوگی۔ اور آپ تو فقیر خدا پرست ہیں۔ خدا پر توکّل نہ ہوسکا۔ کیا اسی دس بیگہ زمین کو اپنا رزاق سمجھتے ہو۔ جس کے واسطے مخلوقِ خدا میں سے تین آدمیوں کو غارت کردیا۔ اُس وقت فقیر کی آنکھیں کھلیں۔ رونے لگا اور بولا کہ صاحب ہم سے بڑی خطا ہوئی کہ ہم نے خدا کو بھول کر اس زمین پر نظر رکھی اور درحقیقت تم تو ہمارے مرشد و رہنما ہی نکلے کہ ہم کو خوابِ غفلت سے بیدار کردیا۔

لہ دانشمند آدمی اس میں سے بہت سے مقاصد و مطالب نکال سکتے ہیں حاجتِ بیان نہیں ۱۲ منہ

ایک روز ارشاد ہوا کہ دنیا بھی شیخ چلی کا گھر ہے۔ جب بوجھ سر سے پھینک دیا پھر کچھ بھی نہیں۔ شیخ چلی سے ایک شخص نے کہا کہ یہ تیل کا مٹکا میرے گھر پہونچا دے تو میں تجھ کو ایک ٹکا دوں گا۔ اُس نے کہا کہ بہت اچھا۔ مٹکا سر پہ رکھا اور چلا۔ راستہ میں خیال آیا کہ اِس ٹکے کی مرغی لوں گا۔ وہ انڈے بچے دے گی۔ اُن کو بیچ کر ایک عمدہ نسل کی بکری خریدوں گا جو ایک بار میں دو دو تین تین بچے دے گی۔ چند روز میں بکریوں کا ایک ریوڑ میرے پاس ہو جائے گا۔ اُس وقت بکریاں بیچ کر ایک گائے نہایت اچھی خریدوں گا۔ جو بہت سا دودھ دے گی اور ہر سال بیاوے گی۔ کچھ عرصہ میں گائے بکریوں کی میرے گھر میں افراط ہو جائے گی اور میں ایک امیر اور خوش حال آدمی بن جاؤں گا اُس وقت شادی کروں گا۔ پھر میرے بیٹا ہوگا۔ پھر وہ چلنے پھرنے بات چیت کرنے لگے گا۔ جب میں باہر سے آیا کروں گا تو وہ پکارے گا۔ ابّا جان! ابّا جان! ہمارے لیے کیا لائے اُس وقت میں خفا ہو کر کہوں گا دُھت یہ کہنا تھا کہ تیل کا مٹکا سر پر سے گر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اب شیخ چلّی ہیں کہ رو رہے ہیں۔ مٹکے کے مالک نے کہا ارے! یہ کیا کیا؟ میرا تیل کا مٹکا کیوں پھوڑ دیا؟۔ خفا ہو کر بولا کہ واہ صاحب! تم کو اپنے مٹکے کی فکر ہے میرا تو سارا بنا بنایا گھر بگڑ گیا ؎

اے مصحفی میں روؤں کیا پچھلی صحبتوں کو — بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

اگر اس مثل میں غور کرو تو عرفان بھی ختم ہے۔ وہ ٹکا شیخ چلّی کا نامِ خدا ہے جو تعلیم شیخ سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کی بدولت تمام انڈے بچے گائے بکری پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی سالکِ راہ کو منازل و مقامات اور کشف و کرامات، ذکر و فکر، ذوق و شوق، سوز و گداز، علم و انکشاف، کیفیت و حالت یہ سب اُمور پیش آتے ہیں۔ انجامِ کار جہاں مٹکا پھوٹا یہ سب بکھیڑا تمام ہوا ؎

انت پھوٹ سب ماٹی ہوئے — لینا ایک نہ دینا دوئے

ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک دن حکیم احتشام الدین کا خط آیا جس کا مضمون یہ تھا کہ میری طبیعت حسنات سے نفور اور سیئات کی طرف راغب ہے کچھ اس کا علاج فرمایا جائے اس پر ارشاد ہوا کہ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ ۝ کبھی دریائے شیریں جوش میں آکر لہریں مارتا ہے کبھی دریائے شور کی طغیانی تلاطم برپا کرتی ہے۔ دونوں شانوں میں

ظہور ایک ہی ذات پاک کا ہے تُوْلِجُ اللَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَتُوْلِجُ النَّھَارَ فِی اللَّیْلِ ؕ سیاہی سفیدی دونوں رنگ سرکاری ہیں جب دہلی میں فوجی قواعد کا کمپ مقرر ہوا تو نصف فوج کا نام باغی رکھا گیا اور نصف فوج کا نام سرکاری اور دونوں کے باہم جنگ دیکھا ہوئی باغی فوج غالب آئی سرکاری فوج مصنوعی جنگ میں مغلوب ہوگئی باغیوں کی فتح سرکار کی شکست ہوئی لیکن درحقیقت ہر صورت میں سرکار ہی کی فتح تھی کیونکہ باغی کیا اور سرکاری کیا دونوں لشکر سرکار کے محکوم اور دونوں کو سرکار ہی سے رسد و مدد بہ یکجہتی تھی دونوں کے حال پر سرکاری الطاف و عنایت برابر تھی نہ باغی گروہ کے واسطے کچھ کمی تھی نہ سرکاری فریق کے لیے کچھ زیادتی ہر دو جانب یکساں معاملہ تھا کوئی جیتے کوئی ہارے نہ سرکار کو شکست کا غم نہ فتح کی خوشی سرکار ان دونوں باتوں سے پاک تھی اور دونوں طرف سرکاری کھیل تھا بغاوت و اطاعت حسنات و سیئات خیر و شر دونوں کی تعمیل حکم سرکاری کے مطابق ہو رہی تھی اور دونوں ملازم سرکار تھے ؎

گر در عملند خلق در گر معزول اند ۔۔۔ چوں در نگری جملہ بحق مشغولند
در مذہب تست بہ گزینی کردن ۔۔۔ اینجا کہ منم جملہ جہاں مقبولند

حسنات و سیئات ہدایت و ضلالت ایک شان جمال ہے ایک شان جلال ہے خَیْرِہٖ وَ شَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالیٰ سرکاری حکم کی تعمیل سے کوئی خارج نہیں مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ یعنی نہیں پیدا کیا میں نے جن اور انسان کو مگر واسطے عبادت کے ؎

ہرچہ آید در نظر از خیر و شر ۔۔۔ جملہ ذات حق بدان اے بے خبر

ایک روز ارشاد ہوا ؎

لَا اٰدَمٌ فِی الْکَوْنِ وَلَا اِبْلِیْسَ[۱] ۔۔۔ لَا مُلْکُ سُلَیْمَانَ وَلَا بِلْقِیْسَ
فَالْکُلُّ عِبَارَۃٌ وَاَنْتَ الْمَعْنیٰ ۔۔۔ یَا مَنْ ھُوَ لِلْقُلُوْبِ مَقْنَاطِیْسُ
آثار و تعینات چوں یافت حکے ۔۔۔ کثرت ہمہ وحدت ست بے شبہ و شکے
چوں نقطۂ صفر شد نہاں از تست ۔۔۔ بنگر کہ دہ و صد و ہزار است یکے

---

[۱] نہ آدم ہے جہاں میں نہ شیطان نہ ملک سلیمانؑ کا ہے نہ بلقیس کا ۱۲ [۲] پس تمام جہان عبارت ہے اور تو معنی ہے اے جو شخص کہ واسطے ہر دل کے مقناطیس ہے ۱۲ منہ۔

مسیؔ ایک جوانگ اینک ہوا بھن بھن سب ہن کار وپ ہے جی
بےؔ مات کوئی سنگ مات لیے مس سب ہی میں تد روپ ہے جی
ایسےؔ کہاں چروں چیدہ نند ہے میں چیدہ نند دیکھو سب ٹھوڑ ہے جی
کبیرؔ ببیگ سے جان لیجے نام روپ تو من کی دوڑ ہے جی

آپ لگانا آپ میں اور آپ ہی ڈھونڈن ہار اور ہووے تو پائے یہ تو آپ ہی آپ

اس مرتبۂ توحید میں عذاب و ثواب یا پاپ پُن کچھ باقی نہیں رہتا ہے

گیان دھیان سب اُٹھ گیو سبھا بھئی سب سُن اونچ نیچ انتر نہیں نہیں پاپ نہیں پُن

ایک شخص نے اُس وقت سُوال کیا کہ حضرت جب عذاب و ثواب نہیں تو بہشت و دوزخ کیوں ہے۔ فرمایا کہ ہے بھی اور نہیں بھی۔ اگر غیریت ہے تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں جیسا سمجھو گے ویسا پیش آئے گا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ مجھ کو والدہ ماجدہ نے خفا ہو کر فرمایا کہ جا یہاں سے کالا منہ کر۔ میں نے کہا کہ بہت اچھا۔ اُس زمانہ میں میری دس برس کی عمر تھی۔ چپکے سے چل دیا۔ وطن سے بیس کوس چل کر ایک مولوی صاحب کے پاس جو کہ ہمارے خاندان سے واقف تھے ٹھہر گیا۔ یہاں تمام بستی میں تلاش ہوئی پتہ نہ لگا۔ مہینہ بھر کے بعد گھر والوں کو خبر ملی کہ فلاں مقام پر قیام پذیر ہے۔ چچا صاحب تشریف لائے۔ میں نے کہا کہ صاحب میں تو گھر نہیں جاتا۔ یہیں پڑھوں گا۔ مولوی صاحب نے بھی کہا کہ کیا مضائقہ ہے۔ یہ بھی گھر ہے وہ بھی گھر ہے۔ یہاں پڑھنے دیجیے۔ غرض چچا صاحب واپس چلے گئے۔ چند روز کے بعد والدہ صاحبہ نے ایک میراثی بھیجا اور پیغام دیا کہ اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو بچہ چپکے سے چلے آؤ۔ ورنہ میں خود آکے تمام راستے جوتیاں مارتی لاؤں گی۔ جب پیغام وعید پہونچا تو چار و ناچار اُس کے ہمراہ ہو لیے۔ جب گھر پہونچے تو خوف کے مارے رو برو نہیں جاتے

ف۱ یعنی سیاہی ایک ہے اور حروف مختلف اور ہر ایک کی صورت جدا جدا ہے ۱۲ ف۲ کوئی حرف بغیر حرکت کے ہے اور کوئی حرکت والا لیکن سیاہی سب میں برابر ہے ۱۱ ف۳ اس چار طرح کی پیدائش میں یعنی اوّل انڈج جو بیضہ سے جانور پیدا ہوتے ہیں دوم جیرج جو مشیمہ سے پیدا ہوتے ہیں سوم اُدبج یعنی حشرات الارض چہارم شیویج یعنی جو پانی میں پیدا ہوتے ہیں ذات سب میں ایک ہے ۱۲ ف۴ اے کبیر عقل سے دریافت کر کہ یہ جو مختلف صورت سے نام ہر شے کا جدا جدا مقرر ہوا ہے یہ فقط دل کی بناوٹ ہے ورنہ ذات الٰہی سب میں یکساں ہے اُس میں کچھ کمی و بیشی نہیں ۱۲ منہ۔

آخر قہرِ درویش بہ جانِ درویش۔ جی سخت کرکے گئے اور جھٹ والدہ صاحبہ کے قدموں میں جا گرے اب غصہ تو بھول گئیں چھاتی سے لگا کر رونے لگیں اور بہت پیار کیا۔ غرض یہ ہے کہ جب محبتِ مجازی کی یہ نوبت ہو تو کیا خداوندِ حقیقی کو اتنی محبت بھی نہ ہوگی۔ نہیں بلکہ کروڑوں درجہ والدین کی محبت سے زیادہ ہے۔ کھلانا، پلانا، سُلانا، جگانا، اُٹھانا، بٹھانا، ہر طرح کی پرورش، ہر قسم کی خبرگیری، رنگارنگ کی نازبرداری ہر وقت کون کرتا ہے ؎

اے ترا باہر دلے رازے دگر — ہر گدا را بر درت نازے دگر
ور ربابِ عشق تارے بیش نیست — ہست ہر جا نغمہ و سازے دگر

ایک روز ارشاد ہوا کہ جس وقت حضرت نوح علیہ السلام نے کفار کے حق میں بددعا کی کہ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ؕ اے پروردگار میرے مت چھوڑ یو زمین پر کافروں میں سے بسنے والا۔ تو اللہ تعالےٰ جل شانہ نے فرمایا کہ اچھا ایک کشتی بنالے اور جو بیٹھے اُس کو بٹھالے۔ حضرت نوحؑ کا بیٹا کشتی میں سوار نہ ہوا اور ڈوب گیا۔ تو حضرت نے عرض کی الٰہی مجھ سے تو یہ وعدہ تھا کہ تیرے اہل کو نہیں ڈبوؤں گا ؎

وعدہ کردی مر مرا تو بارہا — کہ بیابد اہلت از طوفاں رہا
دل نہادم بر امیدت اے سلیم — پس چرا برد سیل از من گلیم

حکم ہوا کہ اے نوحؑ ہم نے تمھاری خاطر سے اپنی تمام مخلوق کو ڈبو دیا۔ ہماری بندگی سے تو خارج نہ تھے گو بُت پرستی کرتے تھے۔ ہمارا کیا حرج تھا۔ البتہ تمھارا کہنا نہیں مانتے تھے۔ سو ہم نے تمھاری دعا قبول کی اور سب کو غرق کر دیا۔ تم کو ذرا بھی خیال نہ ہوا۔ اپنے ایک بیٹے کے واسطے ایسا جی کڑھا۔ کیا ہم کو اپنی مخلوق کی جن کو پالا، پرورش کیا اتنی بھی محبت نہ تھی۔ اور ہمارا وعدہ تو ٹھیک ہے کیوں کہ وہ تمھارے اہل میں سے کب تھا ؎

گفت او از اہل و خویشانت نبود — خود نہ دیدی تو سپیدی از کبود

لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ؕ وہ نہیں تیرے گھر والوں میں سے اُس کے کام ہیں ناکارے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قارون کے لیے بددعا کی تو

وہ زمین میں دھنسنے لگا۔ مضطرب ہو کر تین بار پکارا کہ اے موسیٰؑ! مجھ کو بچاؤ۔ لیکن حضرت موسیٰ صاحبِ جلال تھے، ایک نہ سُنی۔ اُس وقت بارگاہِ خداوندی سے ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ! تم سے قارون نے اس قدر التجا کی اور تم نے کچھ رحم نہ کیا۔ اگر وہ ہم کو ایک بار بھی پکارتا تو ہم اُس کو فوراً بچا دیتے۔ مخلوق کی قدر تم کیا جانو۔ نہ تم نے پیدا کیا نہ پالا۔ یہ رتبہ ہمارے ہی واسطے زیبا ہے ؎

جہاں دار داند جہاں داشتن

پس جس کو اپنی مخلوق کی محبت انبیاء سے ماں باپ سے کر وڑ ہا مرتبہ زیادہ ہو پھر ہماری مجھ میں نہیں آتا کہ وہ عذاب کرے گا ؎

حق جہاں را از محبت آفرید　　ہر دو عالم از محبت شد پدید

ایک روز ارشادؒ ہوا کہ ہر ایک اپنی شکل و حوصلہ کے موافق کام کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں وارد ہے قُلْ کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ یعنی کہہ دے اے محمدؐ ہر ایک کام کرتا ہے اپنی شکل پر اور اللہ تعالےٰ فرماتا ہے سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ عَلٰی غَضَبِیْ یعنے بڑھ گئی میری رحمت میرے غضب سے۔ اور اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ میرا نام ارحم الرّاحمین ہے۔ پھر ہم کو کس طرح یقین آئے کہ اللہ تعالےٰ عذاب کرے گا۔ یہ بات اُس کی شان سے عیاں ہے لیکن شرع شریف کے موافق جو عذاب و ثواب ہے وہ ایک دوسرے کی نسبت اور اختلافِ حالت کے اعتبار سے جس کو جس حالت میں رکھے گا اُس کا وجود بھی اُسی کے مناسب بنا دے گا ایک کی حالت دوسرے کے لیے عذاب اور بجائے خود اپنی اپنی حالت ثواب ہو گی۔

بدریا نخواہد شدن بط غریق　　سمندر چہ داند عذاب الحریق

دریا والے خشکی سے ڈرتے ہیں اور خشکی والے دریا سے۔ ہوائی آگ سے اور آتشی ہوا سے۔ چنانچہ سفرِ حج میں ہم نے خود دیکھا کہ ایک روز دریائے شور کی مچھلی کے منہ میں جہاز والوں نے میٹھا پانی ڈالا۔ وہ فوراً مر گئی۔ ایسے ہی آبِ شیریں کی مچھلی دریائے شور کے اندر نہیں جی سکتی۔ ایک کا دوزخ آبِ شیریں ہے۔ ایک کا دوزخ آبِ شور۔ ایک بار جبرئیلؑ

علیہ السلام خوفِ عظمت و جبروت الٰہی سے رونے لگے اور ڈرے کہ مبادا دوزخ میں مجھ کو ڈال دے۔ حکم ہوا کہ جاؤ دوزخ کے سامنے سے سیر کرتے ہوئے گذرو۔ وہ گئے اور دوزخ کے مقابل پہونچے تو دیکھا کہ مالک دوزخ بیٹھے ہوئے زار زار رو رہے ہیں۔ اور شانِ بے نیازی کی ہیبت طاری ہے۔ حضرت جبرئیلؑ نے پوچھا کہ مالک تم کیوں روتے ہو۔ تم کو کس بات کا ڈر ہے۔ دوزخ جو مقامِ عذاب ہے وہاں تم خود رہتے ہو — اس سے زیادہ خوف کی چیز کیا ہے — وہ بولے کہ حضرت رونا تو یہ ہے کہ کہیں مجھ کو دوزخ سے نکال کر خُلد بریں میں نہ بھیج دے۔ ورنہ دوزخ تو ہمارا عشرت کدہ ہے۔ سبحان اللہ! ہر ایک کے دل میں کیا ڈر بٹھا رکھا ہے ؎

در حدیث آمد کہ مومن در دُعا — چوں اماں خواہد ز دوزخ از خُدا

دوزخ از وے ہم اماں جوید بجاں — کہ خدایا دور دارم از فلاں

ایک روز ارشاد ہوا کہ سلطان محمود غزنوی غزاے ہندوستان میں ایک ہندو بچہ کو گرفتار کرکے لے گیا۔ اُس کو نہایت شفقت و محبت سے رکھا۔ اور یہاں تک التفات اُس کے حال پر کیا کہ ایک حصہ لشکرِ سلطانی کا اُس کے جلو میں مقرر ہوا۔ اور وہ کسی مقام کا حاکم بنایا گیا۔ اُس وقت وہ نہایت غمگین ہو کر رو پڑا۔ سلطان نے دریافت کیا کہ یہ موقع تہنیت و انبساط کا تھا نہ گریہ وزاری کا۔ کیا سبب ہے کہ تو روتا ہے؟ وہ بولا جب بچہ تھا اور گھر میں شوخی کیا کرتا تھا تو میری ماں مجھ کو ڈرایا کرتی تھی کہ دیکھ تو جانتا نہ تجھ کو محمود لے جائے گا۔ میں یہ نام سُن کر سہم جاتا اور اپنے دل میں سوچتا کہ خدا جانے محمود کیا آفت ہے اور کیسی بُری بلا ہے، جس سے مجھ کو ماں ڈراتی ہے۔ لیکن اب مجھ کو محمود سے کام پڑا تو منکشف ہوا کہ محمود تو ماں سے زیادہ شفیق اور باپ سے زیادہ مہربان ہے۔ کاش اس وقت میری ماں ہوتی جو مجھ کو ڈرایا کرتی تھی اور اس لطف کو دیکھتی کہ محمود نے کیا کیا عنایتیں میرے حال پر کی ہیں۔ وہ حالت جو میری ماں کے نزدیک اسفل السافلین سے بدتر تھی اس وقت میرے واسطے اعلیٰ علیین سے بہتر ہے۔ الغرض بھلائی بُرائی کسی شے کی اپنی حالت کی مناسبت پر موقوف ہے۔ پس حقیقت میں اپنی حالت ہی بُری یا بھلی ہے۔ چنانچہ نقل ہے کہ ایک بزرگ نے

اپنے مرید کو حکم دیا کہ چلم بھر۔ اس نے کہا کہ آگ نہیں۔ اُس نے کہا کہ جا دوزخ میں سے لے آ۔ وہاں پہونچا تو دیکھا کہ ایک چٹیل میدان ہے۔ آگ کا پتہ بھی نہیں۔ مالکِ دوزخ سے پوچھا اُس نے جواب دیا کہ میاں یہاں تو کچھ بھی نہیں جو کوئی آتا ہے اپنا دوزخ اپنے ساتھ لاتا ہے۔ یعنی وہی اُس کی حالت اور اس کے خیالات آتشِ دوزخ ہیں۔ لیکن ہر ایک کی حالت چوں کہ اس کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔ اُس کے موجب راحت ہے اور دوسرے کی حالت کے اعتبار سے باعث کلفت ہے۔ سرد خطہ کے رہنے والے گرم ملک کو دوزخ جانتے ہیں۔ اور گرم مُلک والے سرد خطوں کو بلائے جاں سمجھتے ہیں۔ لیکن جو شخص گرمی وسردی کے بکھیڑے سے پاک ہو اُس کے لیے سب مقام برابر ہیں۔ اسی لیے توحید و یک رنگی کے عالم میں نہ عذاب ہے نہ ثواب ہے۔ کیوں کہ موحّد نہ بہ خوفِ دوزخ طاعت و عبادت کرتے ہیں نہ بہ امیدِ بہشت۔ جب تم یہ سمجھتے ہو کہ خدا جبّار و قہّار بھی ہے اور غفور و رحیم بھی ہے پس ان دونوں میں جس طرف تمھارا خیال و وہم پختہ ہوگا، وہی پیش آئے گا۔ اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ چنانچہ نقل ہے کہ دو بھائی تھے برہمن اُن کے گھر میں ایک بُت تھا ایک بھائی جو کہ متقی اور عابد تھا وہ ہمیشہ اُس کی پوجا کرتا۔ دوسرا رند تھا وہ ہر صبح کو اُس بُت کے سر پر پانچ جوتیاں لگاتا۔ ایک روز متقی برہمن نے سپنا دیکھا کہ ٹھاکر جی کہتے ہیں کہ یا تو اپنے بھائی کو اس فعل سے روک ورنہ ہم تیری گردن توڑ دیں گے۔ اُس نے کہا کہ مہاراج میں تو آپ کی پوجا کرتا ہوں میری گردن کیوں توڑتے ہو۔ اُسی کی گردن نہ توڑو جو بے ادبی کرتا ہے۔ کہا کہ وہ تو ہم کو مانتا ہی نہیں۔ اُس کی گردن نہیں توڑ سکتے۔ لیکن تو ہمیں مانتا ہے اس لیے تیری خبر ضرور لیں گے۔ حاصل یہ ہے کہ جس صفت کو کوئی شخص موجب نفع و نقصان خیال کرتا ہے۔ وہ اُس پر مؤثر ہوتی ہے۔ مانو تو دیو نہیں تو بھینٹ کا لیو۔ ایسی ہی مختلف مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کے بزرگانِ دین کو بُرا کہتے اور ایک دوسرے کے تبرّکات کی توہین کرتے ہیں۔ کچھ کسی پر اثر نہیں ہوتا۔ لیکن جن پر وہ یقین رکھتے ہیں اور جن کو مانتے ہیں اُن کی شان میں گستاخی کریں تو فوراً اثر ہوتا ہے۔ پس موحّدانِ خدا پرست جو قہّاری و رحمت یعنی ہر ایک شان میں ذات واحد کو سمجھتے ہیں نہ غیر کو اُن کے لیے عذاب ہے نہ ثواب۔

ایک روز ارشاد[۸۴] ہوا کہ ایک آنکھوں والا اندھے کو اپنے ساتھ باغ میں لے گیا۔ اُس کو کھڑا کیا اور اُس کے کندھے پر چڑھ کر سیب توڑے۔ خود بھی کھائے اور اُس کو بھی کھلائے اتنے میں مالکِ باغ کو آتے دیکھا۔ اُس اندھے کو وہیں چھوڑ چھاڑ آنکھوں والا چنپت ہو گیا۔ اب ہم شرعی مسئلہ پوچھتے ہیں کہ آیا اس اندھے کا کچھ قصور ہے اور اس کو از روئے شرع کچھ سزا ملنی چاہیے۔ ایسے ہی روح کے اعمال و افعال کے سبب جسم کیا آتش دوزخ میں جلایا جائے گا۔

ایک روز ارشاد[۸۵] ہوا کہ چار مسافر سفر کو چلے ایک نجار۔ ایک درزی۔ ایک سُنار۔ ایک فقیر۔ چلتے چلتے جب رات ہو گئی تو جنگل میں قیام کیا۔ باہم صلاح کی کہ ہر ایک آدمی ایک ایک پہر رات کو پہرہ دے تاکہ کوئی صحرائی جانور چوٹ نہ کرے اور خیریت سے رات کٹ جائے۔ پہلا پہرہ نجار کا تھا۔ تینوں یار سو گئے اور وہ جاگتا رہا۔ سوچا کہ خالی سے بیگار بھلی۔ کوئی شغل کرنا چاہیے۔ آپ نے اوزار نکال کر ایک درخت کاٹا اور اس کی لکڑی سے ایک نہایت نازنین شکل عورت کی گڑھی۔ دوسرا پہرہ درزی کا تھا اُس نے پہلے یار کی کاریگری دیکھ کر اپنی صناعی شروع کی اور ایک عمدہ پوشاک تیار کر کے اِس تصویر نازنیں کو پہنا دی۔ اور تیسرے پہرے پر سنار جاگا۔ اُس نے دیکھا کہ پہلے دو یاروں نے خوب کارستانی کی ہے۔ مجھ کو بھی کچھ کام کرنا چاہیے۔ سونے چاندی کے تاروں کا بہت خوشنما زیور بنایا اور اُس دلپذیر تصویر کو آراستہ کر دیا۔ چوتھے پہرہ پر فقیر اُٹھا اور دیکھا کہ سابقین حریفوں نے تو عجب فتنہ برپا کیا ہے۔ اب ہم کیا کریں۔ کوئی ہنر کوئی فن کوئی صنعت کوئی کرتب تو ہم کو آتا نہیں خیر کچھ تو کیا چاہیے۔ وضو کر کے قاضی الحاجات کی جناب میں التجا شروع کی کہ الٰہی ان تینوں یاروں نے تو اپنی اپنی ہنرمندی ظاہر کی۔ مجھ بے ہنر کو رفیقوں کی نظر میں حقیر نہ کر اور اس جسم بے جان میں اپنی قدرتِ کاملہ سے روح پھونک دے۔ اُس کی دعا مستجاب ہوئی۔ صبح کو اُٹھ کر سب یاروں نے دیکھا کہ ایک معشوقہ پری جمال حور تمثال آراستہ و پیراستہ بیٹھی ہے تیرِ غمزہ چاروں کے جگر سے پار ہوا اور ہر ایک اس کا دعوے دار ہوا۔ باہم بحث و تکرار ہونے لگی۔ آخر یہ ٹھہری کہ عدالت میں چلو۔ قاضی جو فیصلہ کر دے اُسی پر سب راضی ہو جائیں۔ عدالت میں

پہونچے اور قصہ بیان کیا۔ قاضی جی اُس کی صورت دیکھ کر پھسل پڑے۔ بولے کہ تم چاروں جھوٹ بولتے ہو۔ یہ تو ہماری لونڈی تھی چند روز ہوئے کہ گھر سے بھاگ گئی تھی۔ اب یہ پانچوں مدعی بن کر بادشاہ کے روبرو گئے۔ بادشاہ کی نیت بھی اُس کے حسن وجمال کو دیکھ کر بگڑ گئی اور کہا یہ تو ہماری حرم ہے تم پانچوں فریبی ہو ؎

ہم نے چاہا تھا کہ حاکم سے کریں گے فریاد   وہ بھی کمبخت تیرا چاہنے والا نکلا

ایک فقیر نے یہ حال سُنا، وہاں آیا اور کہا کہ تم سب ناحق جھگڑتے ہو۔ یہاں سے قریب جنگل میں ایک درخت ہے جس کو شجرۃ الحکم کہتے ہیں اُس کے پاس جاؤ اور اپنا اپنا دعوی بیان کرو۔ جو مستحق ہوگا اُس کو مل جائے گی۔ اس ہدایت کے بموجب چاروں مسافر اور بادشاہ اور قاضی سب جمع ہو کر مع اُس عورت کے شجرۃ الحکم کے پاس پہونچے اور سب نے اپنا اپنا دعوئی بیان کیا۔ یک بیک وہ درخت پھٹا اور وہ نازنین اُس میں سما گئی۔ ؎

صورت از بے صورتی آمد بروں   باز شد انا الیہ راجعون

صورتے از پردۂ آمد عیاں   باز اندر پردہ خواہد شد نہاں

یہی کیفیت انسانِ خاکی نژاد کی ہے کہ اس جہان میں قدم رکھتے ہی انواع اور اقسام کے دعوے دار اُس کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ماں باپ کو پرورش کا دعویٰ، اُستاد کو تربیت کا، پیر کو ہدایت کا آقا کو حقِ نمک کا، حاکم کو حفاظت کا، رشتہ داروں کو قرابت کا۔ دوستوں کو محبت کا صاحب اُمتِ کو ابلاغِ رسالت کا۔ مثلاً ہر مسلمان کو ضرور ہے کہ صبح وشام نبی علیہ السّلام پر درود بھیجے اور اُن کی آل واصحاب کی خیر منائے۔ یا ہندو ہے تو رام و کرشن کی آرتی کرے دیوتاؤں کے نام کی مالا جپے، لیکن ایک روز یہ تماشا قطع اور جملہ حقوق باطل اور سب دعوے رد ہو جاتے ہیں۔ کسی کو پتہ نہیں لگتا کہ کہاں سے آیا تھا اور کدھر گیا یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْہِ وَاُمِّہٖ وَاَبِیْہِ وَصَاحِبَتِہٖ وَبَنِیْہِ لِکُلِّ امْرِءٍ مِّنْھُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْہِ[1] اب فرمایئے کس کی فرماں برداری کریں ؎

---

[1] جس روز کہ بھاگیں گے مرد بھائی اپنے سے اور ماں اپنی سے اور باپ اپنے سے اور عورت اپنی سے اور فرزند اپنے سے ہر شخص کو اُن میں سے ایک فکر لگی ہے جو اُس کو بس ہے ۱۲ منہ۔

رہِ عقل جُز پیچ بر پیچ نیست　　بر عارفاں جُز خدا ہیچ نیست

ایک روز ارشاد ہوا کہ سات مسافر ہم سفر تھے راہ میں ایک ندی آئی۔ جب پار ہو گئے تو سب کو خیال ہوا کہ گنتی کر لینی چاہیے کوئی ہم میں سے گم تو نہیں ہوا۔ ایک شخص نے گنتی کی اپنے سوا باقیوں کو گنا تو چھ ہوئے۔ فکر ہوئی کہ کوئی ایک گم ہو گیا۔ دوسرے نے کہا میاں تم کو حساب نہیں آتا میں شمار کرتا ہوں۔ اُس نے بھی اپنے آپ کو نہ گنا تو وہی چھ ہوئے۔ اسی طرح ہر ایک نے حساب کیا وہی چھ کے چھ۔ جب تو یقین ہو گیا کہ بے شک ایک آدمی نہ رہا ہے۔ ضرور غرق ہو گیا۔ سب جمع ہو کر رونے لگے۔ اتنے میں ایک سوار آیا۔ پوچھا ارے تم پر کیا آفت نازل ہوئی۔ اُنھوں نے تمام قصہ بیان کیا سوار نے کہا اگر میں تمھارے سب آدمی جتنے تھے پورے کر دوں تو کیا دو گے۔ بولے کہ صاحب اگر ہم پورے سات ہو جائیں تو سات روپے آپ کی نذر کریں گے۔ اُس نے کوڑا سنبھالا اور کہا کہ گنتے جاؤ۔ ایک ایک کے کوڑا مارتا گیا اور الگ کھڑا کرتا گیا۔ ساتوں پورے ہو گئے۔ بہت خوش ہوئے اور شکر گزاری کر کے نذرانہ پیش کیا۔ اسی طرح انسان کا حال ہے کہ اِدھر اُدھر خیال دوڑاتا اور جا بجا ٹٹولتا ہے۔ در بدر مارا پھرتا ہے، اپنے آپ کو نہیں دیکھتا مَنۡ عَرَفَ نَفۡسَهٗ فَقَدۡ عَرَفَ رَبَّهٗ ۵

بید ہمارا بھید ہے ہم سب بھیدوں کے ماتھ　　بھید بتاوے اور کو ہمیں بتاویں ناتھ

لیکن یہ بات نہایت مشکل ہے۔ اس کے لیے بڑا جگرا اور حوصلہ درکار ہے کیونکہ یہ جہادِ اکبر ہے ۵

دہجا پھڑک کے سن میں اور باجیں انہد طور　　تکیہ بے میداں میں اور پہونچیں گے کوئی سور

پہونچیں[1] گے جد کہیں گے اور اب کچھ کہا نہ جائے　　اس من کا بیورہ نہیں لڑے کہ بھاگا جائے

سہل شیرے داں کہ صفہا بشکند　　شیر آں باشد کہ خود را بشکند

تلسی[2] رن میں جھوجنا گھڑی ایک کا کام　　نت اوٹھ من سے جھوجنا بن کھانڈے سنگرام

[1] یعنے جس وقت اُس میدان میں پہونچ جائیں گے اُس وقت کہیں گے اب کچھ کہہ نہیں سکتے کیونکہ اس من کا کچھ اعتبار نہیں لڑے یا بھاگ جائے ۱۲

[2] یعنی اے تلسی میدانِ جنگ میں قتل ہو جانا کچھ بڑی بات نہیں ایک گھڑی کا کام ہے لیکن ہر روز نفس سے جنگ کرنا بہت مشکل اور بے تلوار کے مرنا ہے ۱۲ منہ۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ یہ دنیائے بے بقا ایک خواب و خیال ہے اس میں دل لگانا عقل سے بعید ہے۔ ایک نقل یاد آئی کسی شہر میں ایک راجہ تھا اس نے اپنے کھانے پکانے والوں سے کہا کہ جلد کھانا تیار کرو۔ بھوک لگی ہے۔ غرض کھانے کی تیاری ہونے لگی اور راجہ کو نیند آگئی۔ سپنے میں دیکھا کہ شکار کے واسطے مع لشکر کے جنگل کو روانہ ہوا۔ ایک جانب سے ہرن نکلا راجہ نے اُس کے پیچھے گھوڑا ڈالا۔ لشکر سے جُدا ہو گیا۔ بہت دور پہنچ کر اُس کو شکار کیا اور واپس چلا۔ لیکن مارے پیاس کے بے تاب تھا۔ ادھر اُدھر پانی کی تلاش کی سہ

ہر کجا دردے دوا آنجا رود ہر کجا فقرے نوا آنجا رود
ہر کجا مشکل جواب آنجا رود ہر کجا پستی ست آب آنجا رود
آب کم جو تشنگی آور بدست تاکہ جوشد آبت از بالا و پست
تانگرید طفلک نازک گلو کے رواں گردد ز پستان شیر او
زرع جاں را کش چو ابر مضمر ست ابر رحمت پر ز آب کوثر ست
تاسقاہم ربہم آید خطاب فہم کن واللہ اعلم بالصواب

ناگہاں ایک گاؤں نظر آیا اور اُس کے قریب ایک کنواں دیکھا۔ ایک ناکتخدا لڑکی بھنگی کی پانی بھر رہی تھی۔ راجہ نے آتے ہی پانی مانگا۔ لڑکی نے اوکھ سے پانی پلا دیا۔ جب پی چکا تو پوچھا کہ تو کون ہے۔ اُس نے کہا کہ میں بھنگی کی لڑکی ہوں۔ راجہ کو بڑا افسوس ہوا اور کہا کہ ہائے میرا دھرم بھرشٹ ہو گیا۔ وہ لڑکی اپنا گھڑا لے کر گھر کو روانہ ہوئی۔ راجہ پیچھے ہو گیا۔ اُس کے گھر والوں نے پوچھا کہ مہاراج آپ کیسے تشریف لائے۔ راجہ نے کہا کہ میرا تو دھرم بھرشٹ ہو گیا۔ اس کے ہاتھ کا پانی پی لیا اب میں تم لوگوں میں رہوں گا۔ بھنگی نے تمام برادری جمع کی اور بھنگیوں میں داخل کر کے لڑکی کی شادی راجہ سے کر دی۔ اب راجہ بھنگی بن گئے۔ ٹوکرا اُٹھانا اور جھاڑو دینا اختیار کیا۔ اولاد بھی پیدا ہوئی۔ بارہ برس تک اسی حال میں گذرے۔ آخر بیمار پڑا۔ ہر چند علاج کیا کچھ سودمند نہ ہوا۔ اسی بیماری میں مر گیا۔ یہاں خواب میں تو مرا اور وہاں آنکھ کھل گئی۔ اب راجہ کو ایک جُنون پیدا ہوا اور حیث بھنگ ہو گیا یعنی متحیر کہ یہ کیا معاملہ تھا؟ پوچھا کہ ہم کتنی دیر سوئے لوگوں نے جواب دیا کہ صاحب ابھی تو آپ نے کھانے کی

تیاری کا حکم دیا ہے۔ کچھ یوں ہی آپ کی آنکھ جھپک گئی تھی۔ اب کھانا تیار ہوا چاہتا ہے۔ حکم دیا کہ خیر کھانا موقوف لشکر تیار ہو۔ ہم شکار کو چلیں گے۔ غرض اُسی طرح جیسا کہ خواب میں دیکھا تھا شکار کے لیے روانہ ہوئے۔ وہی صحرا وہی میدان، وہی کنواں آیا اور اُسی طور کی بستی دیکھی۔ بھنگیوں کے محلّہ میں پہونچا۔ وہاں رونے کی آواز سُنی۔ جا کے دیکھا تو اُس کی صورت کا ایک آدمی مرا پڑا ہے اور اُس کے جورو بچے رو پیٹ رہے ہیں۔ حال دریافت کیا بھنگیوں نے پچھلی سرگذشت وہی بیان کی جس طور سے راجہ نے خواب میں دیکھا تھا۔ یہ سُن کر اور بھی حیران ہوا کہ یہ تمام کیفیت تو مجھ پر گذری اور میں ہنوز زندہ ہوں پھر میں کون ہوں اور یہ مردہ کون ہے؟ بہت دیر تک سوچتا رہا۔ آخر یہ سمجھ میں آیا کہ یہ دنیائے فانی ایک خواب و خیال ہے۔ راج پاٹ چھوڑ کر فقر اختیار کیا اور باقی عمر گوشہ نشینی میں گذاری۔

این عمر کہ بے تاب بہ بینی آں را ۔۔۔ نقشے است کہ بر آب بہ بینی آں را
دنیا خوابست و زندگانی در وے ۔۔۔ خوابے ست کہ در خواب بہ بینی آں را
مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا ۔۔۔ ہم سبھی مہمان تھے ایک تو ہی صاحب خانہ تھا
وائے نادانی کہ بعد از مرگ یہ ثابت ہوا ۔۔۔ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
سُپن یہ سنسار بھائی رے سپن یہ سنسار ۔۔۔ سپن ماتا سپن پتا سُپن گرو دوار
سُپن گھوڑا سپن ہاتھی سُپن ست اور نار ۔۔۔ سپن راجا سپن پرجا سپن سب بیوپار
عالم دنیا کہ حلم نائم است ۔۔۔ خفتہ پندارد کہ این خود قائم است

ایک روز ارشاد ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے شیطان کی گردن میں طوقِ لعنت ڈال کر اپنا مقیّد کر لیا۔ دوسرے کی اطاعت و فرمانبرداری کے کام کا نہیں رکھا۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی ابن یامین کو سال بھر تک اپنے پاس رکھا تھا حضرت یوسفؑ کے بھائی بن یامین خرید غلّہ کے واسطے کنعان سے مصر میں آئے۔ چونکہ اُن کو بھائی کی محبت زیادہ تھی۔ اس لیے چاہا کہ کسی ڈھب سے اُن کو جانے نہ دوں۔ چنانچہ یہ تدبیر کی کہ بن یامین کے بار میں سرکاری پیمانہ پوشیدہ رکھوا دیا۔ جب پیمانہ کی جستجو ہوئی تو اُن کے اسباب میں سے برآمد ہوا۔ جرم اُن پر ثابت ہو گیا۔ اس لیے

اُس زمانہ کے قانونِ شریعت کے موافق سال بھر اُن کو حضرت یوسفؑ کی خدمت میں رہنا پڑا اسی طرح شیطان کو بھی سجدہ نہ کرنے سے اپنا قیدی کر لیا اور طوقِ لعنت اُس کے گلے میں ڈال دیا تاکہ لوگ اُس سے نفرت کریں جیسے کہ خوبصورت بچہ کی پیشانی پر نظرِ بد کے لیے اُس کی ماں سیاہی کا ٹیکا لگا دیتی ہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ مولانا روم نے اپنی مثنوی میں یہ قصہ لکھا ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ ایک دن ایسے سوئے کہ نماز صبح کا وقت تنگ ہو گیا۔ شیطان نے آکر بیدار و ہوشیار کیا۔ امیر نے پوچھا کہ تیرا کام تو گمراہ کرنا ہے نہ ہدایت۔ مجھ کو کیوں بیدار کیا اُس نے جواب دیا کہ ایسا نہ ہو آپ کی نماز قضا ہو جائے۔ آپ نے فرمایا کہ ہرگز میں تیرا کہنا نہ مانوں گا۔ سچ بتا۔ شیطان نے کہا کہ پہلے تمھاری ایک نماز قضا ہو گئی تھی۔ اُس کی فوت سے تم کو ایسا سوز و گداز پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کے عوض میں ستّر مقبول نمازوں کا ثواب عطا کیا۔ مجھ کو یہ امر گوارا نہ ہوا۔ اس لیے میں تم کو جگاتا ہوں۔ پھر آپ نے فرمایا تعجب ہے کہ مردود کو تو سب کا حال منکشف ہو جائے اور مقبول کو اپنی بھی خبر نہ ہو۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ یہ شعر جو کسی نے کہا ہے ؎

در مذہبِ عاشقانِ یک رنگ　　ابلیس و محمدؐ ست ہم سنگ

بدرجۂ غایت گستاخانہ کلام ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایسی بے باکی مناسب نہیں۔ اگرچہ اس کلام کی تاویل ہو سکتی ہے کہ اللہ جلّ جلالہٗ کی دو شانیں ہیں۔ جلال و جمال۔ ایک شان کا مظہر تو پیشوائے ضلالت یعنی ابلیسِ لعین ہے اور دوسری شان کے مظہر سرتاجِ ہدایت یعنی محمدِ مصطفٰے صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لیکن مقامِ توحید و یک رنگی میں یہ دونوں شانیں یعنی ابلیس لعین اور محمد صلعم ہم سنگ و ہم وزن ہیں۔ اور وہ ذاتِ واحد ہر ایک شان میں یکساں نمودار ہے۔ لیکن ایسا کہنا راہِ ادب سے بعید ہے ؎

با خدا دیوانہ و با مصطفٰے ہوشیار باش

کیونکہ ذاتِ احد و صمد بے نیاز و مستغنی عن الصّفات الآن کما کان ہے۔ وہاں نہ کفر و اسلام،

نہ ہدایت وضلالت، نہ طاعت وعصیان، نہ اعتبار و امتیاز ہے لیکن ظہورِ صفات میں فرقِ مراتب اور لحاظِ مدارج اور آداب و قواعد بہت ضروری ہیں۔ پس ایسے کلام سے کہ جو خلافِ ظاہر اور فہم سامعین سے بعید ہو کیا حاصل ؟ ؎

در عالمِ فقر بے نشانی اولی — در قصۂ عشق بے زبانی اولی
زانکس کہ نہ اہلِ ذوق واسرار بود — گفتن بہ طریقِ ترجمانی اولی

ایک روز ارشاد ہوا[۹۱] کہ حضرت سلطان بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں ایک بزرگ کامل تھے اُنھوں نے اپنے ایک خلیفہ سے ارشاد کیا کہ تم بایزید کی زیارت کو جایا کرو۔ وہ مُرید چپ ہو رہے لیکن اُن کے مرشد نے تین بار یہی اشارہ کیا۔ تب وہ بولے کہ حضرت میں ذات کا دیکھنے والا ہوں صفات کو کیا جا کر دیکھوں۔ شیخ نے فرمایا کہ جب تم صفات کا جلوہ دیکھو گے تو حقیقت معلوم ہو گی۔ آخر بہ تعمیلِ حکم اُس غار پر پہونچے جہاں حضرت بایزید رہتے تھے۔ وہ غار سے برآمد ہوئے اور ایک نگاہ ان کی طرف کی۔ فوراً قلب پھٹ گیا اور مر گئے۔ ایک شخص نے پوچھا کہ حضرت یہ کیا بات تھی کہ ذات کے دیکھنے والے اور صفات کے متحمّل نہ ہو سکے آپ نے فرمایا کہ اس کی ایسی مثال ہے کہ اگر آفتاب کو دیکھو تو دیکھ سکتے ہو چنانچہ بعض آدمی شغلِ آفتابی کیا کرتے ہیں۔ لیکن شیشۂ آتشی میں اگر کوئی آفتاب کو دیکھے تو آنکھیں پٹ ہو جائیں۔ صفات کا متحمّل ہونا ہر ایک کا کام نہیں۔ اس میں بڑے بڑے خراب ہو گئے ہیں۔ عام کا تو کیا حوصلہ ہے۔

ایک روز ارشاد ہوا[۹۲] کہ حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى یعنی خبردار ہو جاؤ نمازوں سے اور بیچ والی نماز سے۔ بعض علماء نے تو ہر نماز کو صلوٰۃ وسطیٰ کہا ہے مگر اکثر نے نمازِ عصر پر اتّفاق کیا ہے۔ اور فقراء کے نزدیک وسط مقامِ قلب ہے۔ نہ یہ قلب کہ ایک پارۂ گوشت ہے بلکہ ایک عالم ہے عوالمِ غیب سے۔

ایک روز ارشاد ہوا[۹۳] کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں تو اللہ تعالےٰ

یوں فرماتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ؕ یعنی اللہ اور اُس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں۔ اے مومنو! تم بھی اُس پر درود اور سلام بھیجو۔ اور شیطانِ لعین کے حق میں یوں ارشاد ہوا اِنَّ عَلَیْکَ لَعْنَتِیْٓ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ ؕ یعنی تجھ پر میری ہی لعنت ہے قیامت تک۔ یہاں کسی فرشتہ یا پیغمبر اور مومن کو اپنے ساتھ شامل نہیں کیا۔ اس میں یہ بھید ہے کہ ہم جو چاہیں سو کہیں لیکن عاشق کو کوئی اور چھیڑنے نہ پائے۔ اگر دشمن ہوتا تو سب کو اُس کے پیچھے لگا دیتے۔ صلوٰۃ اور لعنت دونوں سرکاری خطاب ہیں۔ ایک محبوب کے لیے۔ ایک عاشق کے لیے۔ ؎

عشق را با کافرے نسبت بود | عاشقاں را ایں چنیں قسمت بود
رحمت آنِ تست لعنت آنِ تو | من کیم فرماں ہمہ فرمانِ تو

ایک روز ارشاد ہوا کہ دیکھو قسمت کے دھنی حضرت موسیٰ علیہ السلام گئے آگ لینے مل گئی پیغمبری۔ قصہ یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ اپنی اہلیہ کو ساتھ لے کر وطن کو چلے تو اندھیری رات میں جنگل اور پہاڑ کے اندر راہ بھول گئے۔ ناگاہ ایک پہاڑی پر آگ جلتی نظر آئی۔ بیوی سے فرمایا کہ تم بیٹھو میں آگ لاتا ہوں۔ جب پہونچے تو ایک درخت روشن تھا۔ اُس میں سے آواز آئی یٰمُوْسٰٓی اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّکَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْکَ ۚ اِنَّکَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی ؕ اے موسیٰؑ! میں تیرا پروردگار ہوں، پس اُتار ڈال اپنی دونوں جوتیاں کہ تو وادیِ مقدس طویٰ میں ہے۔ یہاں نعلین سے ظاہری جوتیاں مراد نہیں بلکہ نعلین عبارت ہے دین و دنیا سے کیونکہ اکثر جوتی پیزار ان ہی دو کے لیے ہوا کرتی ہے۔ اور وادیِ مقدس سے عشق و محبت کا میدان مراد ہے۔ جس کے اندر دین و دنیا دونوں کو جوتیوں کی طرح اُتار کر پھینک دینا واجب ہے۔ یعنی اُس ذاتِ پاک کی محبت میں دین و دنیا دونوں کو ترک کرنا چاہیے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر تجلیِ الٰہی ہوئی اور بے ہوشی سے ہوش میں آئے تو شیطان نے کہا کہ پھر رَبِّ اَرِنِیْ کہو۔ حضرت نے کہا کہ

میں جل جاؤں گا۔ اُس نے کہا کہ اپنے عاشق کو کوئی نہیں جلاتا۔ اگر جلانا ہوتا تو پہلے ہی تجلّی میں جلا دیتے۔ لیکن ہیبتِ الٰہی سے ڈر گئے اور دوبارہ درخواست نہ کی۔ آخر یہ بھی تو حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ اُنھوں نے بھی رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا کہہ کے جان چھڑائی تھی۔ یہ حوصلہ ہر ایک کا نہیں۔ گستاخی تو شیطانِ لعین ہی پر ختم ہے۔ یہ بات دوسرے کو کہاں نصیب ہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جنابِ باری میں عرض کیا کہ تیری بارگاہ میں میرا کون سا فعل پسند ہے تاکہ میں اُس کو زیادہ کروں۔ حکم ہوا کہ یہ فعل ہم کو پسند آیا کہ زمانۂ طفلی میں جب تمھاری ماں مارا کرتی تھی تو تم مار کھا کر بھی اُسی کی طرف دوڑتے تھے۔ پس طالبِ خدا کو بھی یہی لازم ہے کہ گو کیسی ہی مصیبت و سختی، ذلّت و خواری پیش آئے لیکن بہر حال خدا کی طرف متوجہ رہے۔ ؎

غم نہ کیجے غم کا اور شادی نہ کیجے عیش کی ۔۔۔ دونوں حالت دیکھیے منھ سے نہ کچھ فرمائیے
قومے بہ تمنائے زر و مال خوش اند ۔۔۔ قومے بتماشائے خط و خال خوش اند
اینہا ہمہ اسبابِ خرابی دارند ۔۔۔ خوش حال کسانے کہ بہر حال خوش اند

اور یہ بات تو شیطان ہی پر ختم ہے کہ اتنی ذلّت و خواری اُٹھائی، طوقِ لعنت پہن لیا مگر بھول کر بھی غیر کا نام نہیں لیتا۔ رباعی

سرمد تو حدیثِ کعبہ و دیر مگن ۔۔۔ در وادیِ شک چو گمرہاں سیر مکن
رو شیوۂ بندگی ز شیطاں آموز ۔۔۔ یک قبلہ گزین و سجدہ بر غیر مکن

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور کو جاتے تھے۔ راہ میں شیطان ملا۔ کہا کہ اے موسیٰ! میری طرف سے بھی عرض کرنا کہ الٰہی سب لوگ گمراہی کا اتہام مجھ پر لگاتے ہیں لیکن میں کس کا نام لوں۔ مجھ کو کس نے گمراہ کیا ہے۔ جب کلیم اللہ اپنی گزارش سے فارغ ہوئے تو پیامِ شیطان بھی عرض کیا۔ حکم ہوا کہ وہ سڑی ہے۔ اس کی بکواس پر خیال مت کرو۔ پھر جنابِ قبلہ نے فرمایا کہ ہاں! یہ تو اپنے گھر کو لگتی تھی۔ اس کا جواب ہی کیا دیتے۔ ؎

کہتے ہو یوں کہ ہے وہی ہادی وہی مضل تو راہ پر ہیں سب کوئی گمراہ ہی نہیں

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شیطان ملا۔ آپ نے فرمایا کہ او ابلیس! تونے کیوں حکم نہ مانا اور حضرت آدم کو کیوں سجدہ نہ کیا؟ ؎

گفتا سخن تو حل کنم من خود قبلہ چرا بدل کنم من

یہ تو فرمائیے کہ آدم کے سجدہ سے کیا حاصل ہوتا۔ بہت ہوتا تو تم جیسا ہو جاتا۔ فرمایا کیوں، ہم کیسے ہیں؟ دیکھ تو ہم کو نبوت عطا ہوئی۔ کہا کہ ہاں! نبوت تو ہوئی لیکن فتوت تو آپ کو چھو بھی نہیں گئی ورنہ پہاڑ کی طرف نہ دیکھتے ؎

دعوائے تو گر تمام بودے بر کُہ نظرت حرام بودے

صد بار ندا بر آمد آں دم مائل نہ شدم بسوئے آدم

حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ تو نے اپنی سرکشی کا مزہ بھی تو خوب چکھا۔ وہ بولا کہ واہ حضرت! جو بھید کی بات یاروں کو معلوم ہوئی اُس کی تو کسی کو ہوا بھی نہیں لگی۔ میں تو جیسا تھا ویسا ہی ہوں۔ لوگوں کو دھوکہ میں ڈال دیا، ورنہ میرے نزدیک جہاں سے حکم تھا وہیں سے انکار و سرکشی بھی تھی ؎

بسیار کساں کہ رہ سپردند یک نکتہ ازیں بسر نہ بردند

پھر حضرت موسیٰ نے سوال کیا کہ تو خدا کو اب بھی یاد کرتا ہے؟ کہا کہ بھلا جس نے مجھ سے یہ دھوم دھام اور شور و غل مچوایا ہے اُس کو کسی لحظہ اور کسی دم بھول سکتا ہوں ؎

ایں جا نہ طمع نہ علّت آمد نے مذہب و کیش و ملّت آمد

در راہِ حقیقی و مجازی این ست کمالِ عشق بازی

در فقر مزن دم اے مزّوّق این ست سواد وجہ مطلق

طاؤسِ تو پر بریزد ایں جا سرچشمۂ کفر خیزد ایں جا

اے رہ روِ تیز گام چالاک ایں مرتبہ ایست بس خطرناک

ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک مردِ خدا جذامی بے دست و پا مضغۂ گوشت تھا۔ اُس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیغام دیا کہ میری طرف سے جناب باری میں

عرض کرنا کہ میں تو محض بیکار ہوں بھلا مجھ کو کس لیے پیدا کیا۔ حضرت نے یہ بات عرض کی۔ حکم ہوا کہ اُس سے کہہ دو کہ دوزخ کے دَرکِ اَسفل میں ایک بدرو ہوگی جس سے تمام طبقاتِ دوزخ کا پیپ اور خون جاری ہوگا۔ اُس موری میں تجھ کو ٹھونسیں گے اور اُس کی ڈاٹ تجھ کو بنائیں گے۔ حضرت موسیٰ نے یہ جواب سنا دیا۔ متعجب ہو کر بولا، او ہو! میں ایسے بڑے کام کے لیے پیدا ہوا ہوں۔ آہا! میں تو بڑے کام کی چیز ہوں! اس خوشی اور مسرت میں ایسا بے تاب ہوا کہ لوٹ گیا اور تڑپ تڑپ کے شادی مرگ ہوگیا؎

چاشنیٔ دردِ عشق قابلِ ہر سِفلہ نیست ۔۔۔ زہر ز خوانِ شہاں ناموے راد ہند

یکے پیش شوریدہ حالے نبشت ۔۔۔ کہ دوزخ تمنّا کنی یا بہشت

بگفتا مپرس از من ایں ماجرا ۔۔۔ پسندیدم آنچہ او پسند د مرا

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہم کو ایک[1] نقل یاد آئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک مکان میں بیٹھے تھے۔ اوپر سے کچھ قطرے حضرت کے کپڑوں پر گرے۔ دیکھا تو چھپکلی تھی۔ جناب باری میں عرض کی کہ خدایا اس کو کیوں پیدا کیا؟ یہ کس مرض کی دوا ہے؟ اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ! یہ چھپکلی بھی ہر روز یہی سوال کرتی ہے کہ خدایا موسیٰ کو کیوں پیدا کیا؟ اُس سے کیا فائدہ ہے؟ ؎

نے ز آدم ہرگزت سودے رسد ۔۔۔ نے ز ابلیست زیاں بودے رسد

نز براہم ہرگزت سودے رسد ۔۔۔ نے ز نمرودت زیاں بودے رسد

نے ز موسیٰ ہرگزت سودے رسد ۔۔۔ نے ز فرعونت زیاں بودے رسد

نے ز احمد ہرگزت سودے رسد ۔۔۔ نے ز بوجہلت زیاں بودے رسد

مومن و کافر بخوں آغشتہ اند ۔۔۔ یا ہمہ سرگشتہ و برگشتہ اند

گر بخوانی ایں بود سرگشتگی ۔۔۔ در برانی ایں بود برگشتگی

---

[1] ایک روز ایک امیر آدمی حاضر خدمتِ بابرکت تھا اسی وقت ایک بیچارہ غریب شکستہ حال بھی اسی امیر کے برابر آبیٹھا وہ امیر اپنے کپڑے سمیٹ کر علیحدہ ہوگیا حضرت نے یہ تماشا دیکھ کر نقل مرقومۂ بالا ارشاد فرمائی ۱۲ منہ ۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک شخص نے شیطان سے دوستی پیدا کی اور پوچھا کہ یار تم کو لوگ کیوں بدنام کرتے ہیں؟ اُس نے کہا کہ میرا تو کچھ بھی قصور نہیں۔ صرف دشمنی سے لوگ بُرا بھلا کہتے ہیں ؎

برانداختم بیخ شاں از بہشت کنونم بکیں مے نگارند زشت

آؤ! میں تم کو ایک تماشا دکھاؤں۔ مگر خاموش دیکھتے رہنا۔ کچھ دم نہ مارنا۔ ایک شہر میں لے گیا۔ اور کہا کہ آج اس کی بربادی کا حکم ہے۔ اب دیکھو کیا ہوتا ہے۔ حلوائی کی دُکان میں چاشنی پک رہی تھی۔ شیطان نے اُس میں سے انگلی بھر کر دیوار سے لگا دی۔ فوراً مکھیوں کا جمگھٹ ہو گیا۔ چھپکلی نے ان کی تاک لگائی۔ حلوائی کی بلی نے چھپکلی پر داؤں لگایا کہ جھپٹا مارے۔ ناگہاں ایک فوج کا سپاہی اُدھر سے گذرا۔ اس کے ساتھ نہایت تیز شکاری کتا تھا۔ اُس نے جو بلی دیکھی جھٹ اُس کو جا دبوچا۔ بلی چاشنی کے اندر گری اور پھنس گئی۔ حلوائی کو غصہ آگیا، کتے کے سر میں ایسا کفچہ مارا کہ وہیں لوٹ گیا۔ پھر سپاہی کو کہاں تاب رہی بگڑ گیا اور حلوائی کا مارتے مارتے خون کر دیا۔ حلوائیوں نے جمع ہو کر سپاہی پر یورش کی وہ بھی وہیں کھیت رہا۔ لشکر میں جو سپاہی کی خبر پہونچی تو لگا کے توپ خانہ تمام شہر کو اُڑا دیا۔ جب یہ ماجرا گذر چکا تو شیطان اُس شخص کی طرف متوجہ ہوا کہ کہو دوست؟ اب اس میں میرا کیا قصور ہے! صرف ایک انگلی چاشنی میں نے لگا دی تھی۔ باقی بکھیڑا کس نے کیا۔ لیکن کرنے والے کا نام کوئی نہیں لیتا۔ مجھ ہی کو نشانا بنا رکھا ہے ؎

آپ کے ہاتھوں میں سارا کام ہے آپ کرتے ہیں جہاں کا نام ہے

مجھ کو کچھ اختیار نہیں۔ جو کام ہونے والا ہوتا ہے اُسی کو میں کرتا ہوں۔ ورنہ میری کیا مجال ہے ؎

او بہ صنعت آذرست و من صنم آلتے کو سازدم من آں شوم
گر مرا ساغر کند ساغر شوم ور مرا خنجر کند خنجر شوم
گر مرا چشمہ کند آبے دہم ور مرا نارے کند تابے دہم
گر مرا باراں کند خرمن دہم ور مرا ناوک کند در تن جہم
گر مرا مارے کند زہر افگنم ور مرا یارے کند مہر آگنم

گر مرا شکر کند شیریں شوم ۔ ور مرا حنظل کند پر کیں شوم
گر مرا شیطاں کند سرکش شوم ۔ ور مرا سوزاں کند آتش شوم
من چو کلکم در میانِ اصبعین ۔ نیستم در صفِ طاعت بین بین

غرض کہ سوائے اللہ کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ لَا تَتَحَرَّكُ ذَرَّةٌ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؎

گرچہ تیر از کماں ہمی گذرد ۔ از کماں دار بیند اہلِ خرد

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام ایک دفعہ شیطان کو دیکھ کر بہ نظرِ حقارت ہنسے۔ اُس نے رنجیدہ ہو کر جنابِ باری میں شکایت پیش کی۔ اُس وقت حضرت پر عتاب نازل ہوا کہ اے آدم! ہمارے فعل پر ہنستا ہے ؎

بانگ بر زد غیرتِ حق کاے صفی ۔ تو نمی دانی ز اسرارِ خفی
پوستیں را باز گونہ گر کنم ۔ کوہ را از بیخ و از بن بر کنم
پردۂ صد آدم آں دم بر درم ۔ صد بلیس نو مسلماں آورم
گفت آدم توبہ کردم زیں نظر ۔ ایں چنیں گستاخی نندیشم دگر

شیطان بھی بڑا بہادر ہے۔ ہر نبی ولی کے مقابلہ میں خم ٹھونک کر ڈٹا رہتا ہے۔ اپنے فن میں بے ہمتا ہے بہتوں نے اس رتبہ کی خواہش کی، مگر یہ منصبِ خاص کسی کو نصیب نہ ہوا۔ چنانچہ وقتِ آخر حضرت شبلی نے بھی بہت خاک اُڑائی اور روئے کہ افسوس لعنت کا خطاب ابلیس کو ہوا ہم کو نہ ہوا ؎

وقتِ مردن بود شبلی بے قرار ۔ چشم پوشیدہ ولے پُر انتظار
بر میاں زُنّارِ حیرت بستہ بود ۔ بر سرِ خاکسترے بنشستہ بود
بر گرفتے اشک بر خاکستر او ۔ گاہ خاکستر فشاندی بر سر او
سائلے گفتش چنیں وقتے کہ ہست ۔ دیدہ کس را کہ او زنار بست
گفت می سوزم چہ سازم چوں کنم ۔ جاں ز غیرت می گدازم چوں کنم
جانِ من کز ہر دو عالم چشم دوخت ۔ ایں زماں از غیرتِ ابلیس سوخت
چوں خطابِ لعنتی او راست بس ۔ زیں اضافت آید افسوسم بکس

ماند شبلیؔ تشنہ و تفتہ جگر اوبہ دیگر کس دہ ہر چیزے دگر

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب بارگاہِ کبریائی سے فرشتوں کو حضرت آدمؑ کے سجدہ کا حکم ہوا، تو سب نے تعمیل کی مگر ابلیس نے نہ مانا اور غیر کو سجدہ کرنا شرک جانا۔ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ۝ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ اِسْتَكْبَرَ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ۝ اس پر خطاب ہوا۔ اِنَّ عَلَیْكَ لَعْنَتِیْۤ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ ۝ کہتے ہیں کہ اس ندائے دل رُبا کو سنتے ہی بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ جب ہوش میں آیا تو پھر وہی خطاب گوش زد ہوا۔ پھر ہوش جاتے رہے اور چیخ مار کر گر پڑا۔ تیسری دفعہ حواس ٹھکانے ہوئے تو اُسی آوازِ جان نواز پر کان لگائے کہ پھر سنائی دے۔ اُس وقت حکم ہوا کہ تجھ سے کام لینا ہے اگر تیسری بار سنے گا تو کام سے جاتا رہے گا ؎

مست مے بیدار گردد نیم شب مستِ ساقی روزِ محشر بامداد

نہیں معلوم کہ اُس آواز میں کیا کیفیت تھی کہ اپنے فعل پر نادم تو نہ ہوا بلکہ خوشی کے مارے بے ہوش ہو گیا۔ شاید کوئی راز ہوگا ؎

میانِ عاشق و معشوق رمزیست کراماً کاتبیں را ہم خبر نیست

اگر کچھ بُری بات ہوتی تو حضرت آدم کی طرح چلا اُٹھتا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا اور اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ میں اِلٰی کے لفظ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ غایتِ رحمت و لعنت قیامت ہی ہے اس کے بعد نہ لعنت نہ رحمت ؎

نیست کس را از حقیقت آگہی جملہ مے میرند بادستِ تہی
کس نمی داند دریں بحرِ عمیق سنگریزہ قدر دارد یا عقیق

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب حضرت سلیمان علیہ السّلام کو سریرِ سلطنت ملا اور جن و انس وحش و طیور اُن کے تابع کیے گئے تو حضرتِ عزّت میں عرض کیا کہ شیطان کو بھی میرا مطیع کر دیجیے۔

۱؎ جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو میں بناتا ہوں ایک انسان مٹی کا پھر جب ٹھیک بنا چکوں اور پھونکوں اُس میں ایک اپنی جان تو تم گر پڑو اُس کے آگے سجدہ میں پھر سجدہ کیا فرشتوں نے سارے مگر ابلیس نے تکبر کیا اور تھا وہ منکروں میں سے ۱۲ منہ۔

حکم ہوا کہ یہ فتنۂ عالم ہے اس کو اپنے پاس مت بلاؤ، ورنہ تمھاری ملک واری میں خلل واقع ہوگا لیکن حضرت سلیمانؑ نے بہ اصرار یہی التجا کی، تو شیطان کو حکم ہوا کہ جا سلیمان کی فرمانبرداری کرنا چار حاضر ہوا اور پایۂ تخت کے پاس بیٹھ کر رونے لگا۔ حضرت نے پوچھا روتا کیوں ہے؟ بولا کہ میں بھلا تھا یا بُرا، ملعون تھا یا مرحوم، مقبول تھا یا مردود، جیسا تھا اُسی در کا بندہ تھا۔ مگر اب فی الحقیقت میرے گلے میں طوقِ لعنت پڑگیا اور سچ مچ کا مردود ہوگیا کیونکہ غیر کا تابع کیا گیا۔ حضرت نے تسلی دی کہ میرا تو یہ ارادہ تھا کہ قیامت کے دن بہشت میں تجھ کو ہمراہ لے چلوں گا۔ بھلا شیطان اس لالچ میں کب آتا تھا۔ کہا کہ واہ حضرت! ایسی بہشت کہ غیر کے توسل سے ملے ہزار دوزخ سے بڑھ کر عذابِ الیم ہے۔ اور جس دوزخ کے لیے خاص سرکاری حکم ہو اُس پر ہزار نعیم بہشت قربان ہیں ؎

حقا کہ با عقوبتِ دوزخ برابر است　　رفتن بہ پائے مردیٔ ہمسایہ در بہشت

تین دن تک شیطان روتا رہا۔ آخر اس کی گریہ وزاری اور آہ و بے قراری نے اثر دکھایا ؎

زابرِ گریاں شاخ سبز و تر شود　　زانکہ شمع از گریہ روشن تر شود
تا نہ گرید ابر کے خندد چمن　　تا نہ گرید طفل کے جوشد لبن
کامِ تو موقوفِ زاریٔ دل ست　　بے تضرّع کامیابی مشکل ست

حضرت سلیمان علیہ السلام کو حکم تھا کہ اپنی مزدوری سے قوتِ لایموت حاصل کریں۔ چنانچہ زنبیل بافی کیا کرتے تھے۔ ان تین دن کے عرصہ میں کوئی زنبیل نہ بکی اور حضرتؑ کو روٹی نصیب نہ ہوئی۔ ناچار التجا کی کہ اب کیونکر بسر کروں۔ خزانہ سے کھانے کا حکم نہیں اور زنبیل کے دام نہیں اُٹھتے۔ حکم ہوا کہ زنبیل بکے تو کیونکر بکے۔ دلّال تو تمھارے پاس مقید ہے۔ عرض کیا کہ الٰہی تو اپنی بَلا کو اپنے ہی پاس رکھ۔ میں اس کی اطاعت سے باز آیا۔ غرض چوتھے دن اس دلّال و پہلوان نے قید سے رہائی پائی اور اطرافِ جہان میں پھر وہی دھوم دھام مچائی ؎

سرمد تو حدیثِ کعبہ و دیر مکن　　در وادیٔ شک چو گمرہاں سیر مکن
رو شیوۂ بندگی ز شیطاں آموز　　یک قبلہ گزین و سجدہ بر غیر مکن

پریت تو کیجیے ایک سے جا سے جی پتیائے　　ٹھوڑ ٹھوڑ کی پریت میں مت کلنک چڑھ جائے

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب فرعون نے اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی کا دم بھرا تو ابلیسِ لعین نے مجسّم ہو کر اُس سے درخواست کی کہ مجھ کو اپنا پیغمبر بنا لے۔ فرعون نے کہا کہ اچھا، آج سے تو ہمارا پیغمبر ہے۔ اتفاقاً خشک سالی ہوئی اور خلقت تنگ آ گئی۔ سب نے جمع ہو کر فرعون کے سامنے دہائی دی کہ تو تو خدا ہے مینھ کیوں نہیں برساتا۔ اُس نے شیطان کو اشارہ کیا کہ ہاں پیغمبر! کوئی ترکیب مینھ کی نکال، ورنہ اس خدائی اور پیغمبری کی قلعی کھل جائے گی اور مخلوق منحرف ہو جائے گی۔ شیطان بولا آہ، یہ کیا بڑی بات ہے۔ اِن لوگوں سے کہد یجیے کہ آج رات کو ہم مینھ برسا دیں گے۔ لوگ یہ مژدہ سُن کر چلے گئے۔ شیطان نے اپنی تمام ذرّیات کو بُلا کر حکم دیا کہ آج رات بھر اس شہر پر خوب پیشاب کرو۔ اُنھوں نے ایسا ہی کیا۔ صبح کو لوگ اُٹھے تو دیکھا کہ مینھ تو برسا ہے مگر مارے بدبو کے دماغ پھٹا جاتا ہے۔ الٰہی! یہ کیسا مینھ ہے!!! کھیتوں کو جا کر دیکھتے ہیں تو رہی سہی کھیتی بھی جل گئی۔ پھر لوگ دوڑے اور فرعون سے جا کر فریاد کی کہ یہ خوب مینھ برسا! فرعون نے متعجّب ہو کر شیطان سے پوچھا کہ او پیغمبر! یہ کیا کام کیا؟ وہ بولا کہ ارے احمق! سمجھ تو سہی جہاں تجھ سا نابکار خدا اور مجھ سا مردود پیغمبر ہو گا وہاں بارانِ رحمت بھی ایسا ہی نازل ہو گا ؎

وزیرے چنیں شہریارے چناں　　جہاں چوں نگیرد قرارے چناں

تجھ کو شرم نہیں آتی۔ اسی برتے پر خدائی کرتا ہے کہ پیغمبر سے مدد کا طالب ہوا۔ تُف ہے تیری خدائی پر۔ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ یہی حال ظاہری صوفیوں کا ہے کہ توحید میں دم مارتے ہیں۔ انا الحق کہتے اور خدا بننے کو تیار ہیں لیکن خدمت مریدوں سے لیتے ہیں اور ان کی امداد پر نظر رکھتے ہیں۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ فرعون کے گھر میں انار کا درخت تھا شیطان نے ایک انار توڑ کر اُس کی دو قاشیں کیں اور فرعون سے کہا کہ اگر تو سچّا خدا ہے تو اس انار کو جیسا تھا ویسا ہی بنا دے۔ اس سے کیا ہو سکتا تھا۔ اپنا سا منھ لے کر رہ گیا۔ پھر شیطان نے انار کو بدستور شاخ میں لگا دیا اور کہا کہ اسی پر خدا بنا ہے کہ ٹوٹا ہوا انار بھی نہ جوڑ سکا، بھلا پیدا تو کیا کر سکے گا۔ دیکھ مجھ کو اتنی قدرت و طاقت ہے لیکن آج تک خدا بننے کا خیال بھی نہیں آیا۔

ارے احمق ہم کو تو بندگی ہی زیب دیتی ہے نہ خدائی۔

ایک روز ارشاد ہوا ؎

ہر کسے را بہرِ کارے ساختند میلِ آں اندر دلش انداختند

اللہ تعالےٰ کا بھی عجیب معاملہ ہے۔ کسی کے دل میں کچھ ڈال دیا کسی کے دماغ میں کچھ بسا دیا۔ فرعون کو تو یہ سجھائی کہ اَنَا رَبُّکُمُ الاَعلیٰ پکار اُٹھا۔ حضرت موسیٰ کو یوں راہ بتائی کہ جاؤ تم اس مردود سے لڑو کیونکہ بندہ ہو کر خدائی کا دعویٰ کرتا ہے۔ ادھر حضرت موسیٰ کو فتح و نصرت کی بشارت دی اُدھر فرعون نے خفیہ آہ و زاری کی تو اُس کی دعا بھی رد نہ کی۔ سبحان اللہ! کیا شانِ کبریائی ہے ؎

کفر و ایماں عاشقِ آں کبریا مس و نقرہ بندۂ آں کیمیا
روز موسیٰ پیشِ حق نالاں شدی نیم شب فرعون ہم گریاں شدی
چونکہ بے رنگے اسیرِ رنگ شد موسیٰ با موسیٰ در جنگ شد
چوں بہ بے رنگے رسی کاں داشتی موسیٰ و فرعون دارند آشتی
اے عجب کایں رنگ از بے رنگ خاست رنگ با بے رنگ چوں در جنگ خاست
چوں گل از خار است و خار از گل چرا ہر دو در جنگ اند و اندر ماجرا
یا نہ جنگ ست ایں برائے حکمت ست ہم چو جنگ خر فروشاں صنعت ست

حضرت آدمؑ کو ابلیس سے، حضرت نوحؑ کو اُن کی قوم سے، حضرت ابراہیمؑ کو نمرود سے، حضرت موسیٰؑ کو فرعون سے، حضرت عیسیٰؑ کو یہود سے، حضرت محمد مصطفےٰ صلعم کو قریش سے بھڑا دیا ؎

جب بے رنگی رنگ نے کھایو موسیٰؑ فرعون لڑنے آیو

کسی کو مومن کا لقب عنایت کیا۔ کسی کو کافر کا خطاب دیا۔ دونوں کو لڑا کر خوب تماشا دیکھا نہ مومن سے کچھ منفعت پائی نہ کافر سے کچھ مضرت اُٹھائی ؎

لہ ایک روز مولانا گل حسنؒ نے حسب عادت عرض کیا ؎

باز گو از نجد و از یارانِ نجد تا در و دیوار را آرے بوجد

اُس وقت آپ لیٹے ہوئے تھے اُٹھ بیٹھے اور یہ فرمایا ۱۲ منہ

نے زمومئی ہر گزرت سودے رسد نے زفرعونت زیاں بودے رسد

آخر کار نہ یہ رہے نہ وہ، مومن باقی نہ کافر موجود، نہ مقبول رہے نہ مردود، خدا کی شان میں کچھ فرق نہ پڑا۔ اَلآنَ کَمَا کَانَ۔ ؎

حق زایجادِ جہاں افزوں نہ شد | آنچہ اوّل آں نہ بود اکنوں نہ شد
در اثر افزوں شد وہ در ذات نے | ذات را افزونی و آفات نے

جب یہ جہاں نہ تھا تب بھی خدا تھا اور جب جہاں نہ ہوگا تب بھی خدا ہوگا ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا | ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

پس کل موجودات ایک تماشا کٹھ پتلی کا سا ہے۔ اپنے اپنے وقت پر پتلیاں آتی اور تماشا دکھا جاتی ہیں۔ وقت معہود پر پردۂ عدم میں جا چھپتی ہیں ؎

ما لعبتگانیم و فلک لعبت باز | از روئے حقیقت ست نہ از روئے مجاز
یک چند دریں سراچہ بازی کردیم | رفتیم بصندوقِ عدم یک یک باز

بازی گر جو کام چاہتا ہے پتلیوں سے لیتا ہے۔ ارادہ کے تار نے جو اشارہ کیا پتلی نے وہی کام دیا۔ جو ناچ نچاتا ہے ناچتی ہیں۔ پس سب کام منشائے اَزَلی سے ظہور پکڑتے ہیں۔ لیکن یہ طرفہ ماجرا ہے کہ شیطان کا خوف ہر انسان کے دل میں بٹھا دیا ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام بآوازِ بلند پکارتے چلے آئے کہ بچیو! بچیو! اس ملعون سے بچیو! کہ انسان کے رگ و ریشہ میں سمای اور گمراہ کنندہ و ناری ہے۔ پھر خود ہی جا بجا یوں ارشاد فرمایا کہ کوئی سوائے میرے ہادی اور مضل نہیں۔ مَنۡ یَّھۡدِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ ؎[1]

سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے کوئی بات ذوق اُس کی | کوئی جانے تو کیا جانے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

عاجز ہے خیال اور تفکر حیراں | بے سود یقیں ہے اور بیہودہ گماں
کھلتا نہیں عقدہ کھولنے سے کوئی | بنتی نہیں بات بنائے سے یہاں (اسمٰعیل)

ہم کو تو یوں ارشاد ہوا کہ شیطان مردود ہے، ملعون ہے، گمراہ کنندہ ہے، رہزن ہے، اس کی راہ پر مت چلو۔ اُس کی پیروی ہرگز مت کرو۔ اور موسیٰ علیہ السلام نے جب علم کی درخواست کی

[1] جس کو اللہ ہدایت کرتا ہے پس کوئی اس کا گمراہ کرنے والا نہیں اور جس کو اللہ گمراہ کرے پس کوئی اُس کا ہادی نہیں ۱۲ منہ۔

توحکم ہوا کہ رمز کی بات پوچھتے ہو تو جاؤ شیطان سے پوچھو۔ بھلا جو ایسا مُعلّم ہو کہ پیغمبر اُس کے پاس بھیجے جائیں تو اُس کی گمراہی بھی عجیب و غریب ہے۔ جب حضرت موسیٰ اُس کے پاس پہونچے تو کیسی برجستہ تعلیم توحید کی دی ہے۔ چنانچہ شیخ عطارؔ نے لکھا ہے ؎

من مگو تا تو ہم چو من نہ شوی — ایں سخن را زمن بہ خاطر دار
یعنی اول چو من شوائے سرہ مرد — زخم او را سپر بہ سینہ میار
گر شوی ہمچو من بر ویس از آں — ہر چہ خواہی بگو و باک مدار

شیطان کی یہ تعلیم اور اُس کا نام گمراہ کرنے والا! اس غریب کو ناحق کیوں بدنام کیا؟ فاعلِ حقیقی تو ایک ہے نہ دو۔ وہی ہادی ہے وہی مضل مثل ہے سچ کہوں تو ماں ماری جائے جھوٹ کہوں تو باپ کتا کھائے ؎

رحمن و رحیم و رحمت اللہ مائیم — شیطانِ رجیم و لعنت اللہ مائیم
ہر نیک و بدے کہ در جہاں میگذرد — باللہ مائیم و ثم باللہ مائیم

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جنگل میں کسی درخت کے تلے لیٹ گئے اور ایک اینٹ اُٹھا کر سر کے نیچے رکھ لی۔ اُسی دم شیطان پہونچا اور کہا کہ اے ابنِ مریم! اب میری ملک میں بھی دخل دینے لگا ؎

گفت اے ملعون چرا استادۂ — گفت خشتم زیر سر بنہادۂ
جملۂ دنیا چو اقطاعِ منست — ہست ایں خشت آں من ایں روشنست
تو تصرف می کنی در ملک من — خویشتن آوردۂ در سلک من

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فوراً وہ اینٹ اُٹھا کر پھینک دی۔ شیطان بولا کہ بس اب پڑے رہو۔ ہم سے تم سے کچھ واسطہ نہیں۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بڑے ترک و تجرید کی حالت میں رہے ہیں۔ تمام عمر کہیں گھر نہیں بنایا۔ ہمیشہ قلندر وار پھرتے رہے نقل ہے کہ ایک روز آپ کہیں تشریف لے جاتے تھے۔ اثناء راہ میں بارش ہونے لگی۔ ناچار ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں دیکھتے کیا ہیں کہ ایک لومڑی دوڑ کر اپنے بھٹ میں گھس گئی۔ آپ کو

خیال آیا کہ سبحان اللہ! جانوروں کے لیے تو ٹھکانا اور ہیں خانہ بدوش۔ خیال آتے ہی ایک مکان جواہر نگار نمودار ہوا۔ اور ندا آئی کہ اے دوست! اگر مکان درکار ہو تو یہ موجود ہے۔ ہمارے پاس کسی شے کی کمی نہیں، لیکن تمھارے واسطے یہ رُتبۂ قلندری اس مکان سے اعلیٰ ہے۔ آپ نے عرض کیا کہ الٰہی میں اسی حال میں خوش ہوں۔ مجھ کو اور کچھ درکار نہیں۔

یہاں جناب وقبلہ نے فرمایا کہ سرکار نے تو اُن کی تقدیر میں یوں ہی لکھ دیا تھا کہ یہ ہمیشہ خانہ بدوش پھریں گے۔ پھر مکان کیوں کر لیتے۔ آخر اُنھیں کی زبان سے اقرار لے لیا کہ میں کچھ نہیں چاہتا۔ غرض یہ ہے کہ مقدر سے زیادہ کسی کو کچھ نہیں ملتا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب حضرت نوحؑ کی دعا سے طوفان برپا ہوا اور وہ کشتی پر سوار ہوئے تو شیطان بھی آموجود ہوا اور بولا کہ آپ نے خوب ہی کیا جو دعا مانگ کر خلقت کو غارت کرا دیا۔ آپ ہدایت کرتے کرتے میں بہکاتے بہکاتے دِق ہو گیا دونوں خرابی میں مبتلا تھے۔ اب خوب پاؤں پھیلا کے چین سے سوئیں گے، نہ ہدایت کا کھڑاگ رہا نہ گمراہی کا بکھیڑا۔ یہ بات سُن کر حضرت نوحؑ تا زیست روتے رہے ؎

جہاں دار داند جہاں داشتن — یکے را بُریدن یکے کاشتن

نہ با ایں ست مہر و نہ باآں ست کیں — تو دانا تری، اے جہاں آفریں

ایک روز ارشاد ہوا کہ شیطان نے تو یہ نافرمانی کی کہ حضرت آدم کو سجدہ نہ کیا۔ اور حضرت آدم سے یہ تقصیر ہوئی کہ دانۂ گندم باوجودِ ممانعت کھا لیا۔ حکم سرکاری سے عدول کرنے میں دونوں مساوی تھے۔ لیکن جب عتاب ہوا تو شیطان نے بے دھڑک جواب دیا کہ فَبِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ[1] اور حضرت آدم نے شرما کر فریاد کی کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ[2] اُس وقت حضرت آدم سے پوچھا گیا کہ تم نے یہ جھوٹ کیوں بولا کہ اس فعل کو اپنے نفس کی طرف منسوب کیا۔ آیا ہم فاعلِ حقیقی نہیں ہیں؟ حضرت آدمؑ نے عرض کیا کہ بارِ خدایا! بلا شک میں تجھے ہی فاعلِ حقیقی جانتا ہوں، لیکن معصیت کو

---

[1] پس جیسا تو نے مجھے بدراہ کیا ہے ۱۲ [2] اے رب ہمارے ہم نے خراب کیا اپنی جان کو اور اگر تو نہ بخشے ہم کو اور رحم پر رحم نہ کرے تو ہم ہو جائیں نامراد ۱۲ منہ۔

کو تیری ذاتِ پاک کی طرف نسبت کرنے سے مجھے شرم آئی اور مقتضائے ادب یہی معلوم ہوا ؎
گناہ گرچہ نہ بود اختیارِ ما حافظ   تو در طریقِ ادب کوش و گو گناہ من است
یہ ادب اُن کا پسندِ بارگاہِ کبریائی ہوا، مقبول ٹھہرے اور شیطان مردود۔ خیر ردّ و قبول تو دوسری بات ہے مگر اُن کا جھوٹ اور اس کا سچ خدا پر دونوں روشن تھے۔

ایک روز[۱۲] ارشاد ہوا کہ جب رام پور میں مولوی فضل حق صاحب سے دوبارہ ملاقات ہوئی تو فرمانے لگے کہ افسوس ہے تمہاری کتب درسیہ تھوڑی ناتمام رہ گئیں۔ اگر چندے یہ شغل اور رہتا تو تحصیل تمام ہو جاتی۔ میں نے کہا کہ جناب مولوی صاحب ایک نقل یاد آئی۔ ایک بار موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور کی جانب جاتے تھے۔ راہ میں شیطان مل گیا۔ آپ نے اُس سے کہا کہ سن تو ابلیس! اگر تو آدم کو سجدہ کر لیتا تو کیا اچھا ہوتا۔ اُس نے کہا کہ اچھا کیا خاک ہوتا! بہت ہوتا تو آپ جیسا ہو جاتا۔ فرمایا کیوں ہم کیسے ہیں کہا کہ ہاں نبوت تو بے شک آپ کو ہے لیکن نشانِ فتوت تو آپ میں ہے نہیں۔ ہم جب جانتے کہ دوبارہ رب ارنی کہتے سو مولوی صاحب کتبِ درسیہ کی غایتِ تکمیل یہ تھی کہ آپ جیسا فاضل ہو جاتا۔ یہ بات سن کر مولوی صاحب آب دیدہ ہوئے اور فرمایا کہ میاں صاحب سچ ہے ہم کو تو علم حجابِ اکبر ہو گیا۔

ایک روز[۱۳] ارشاد ہوا کہ قصیدۂ حضرت شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کا مطالعہ طالبین کے حق میں نہایت مفید ہے۔ آپ کو بھی یہ تمام قصیدہ حفظ تھا۔ اکثر موقع پر

نوٹ:۔ ایک بار جناب قبلہ نے بذریعۂ کرامت نامہ کے منشی فضل رسول صاحب کو یہ شعر قلندر صاحب کا تحریر فرمایا ؎

در گذر از گفتگو اے نامراد   بے مرادی نامراداں را مراد

بعد چندے جب کہ منشی صاحب خدمت مبارک میں حاضر ہوئے تو عرض کیا کہ اس شعر میں جو مضمون قلندر صاحب نے بیان فرمایا ہے کیا یہ رتبہ اُن کو حاصل تھا۔ ارشاد ہوا کہ یہ رتبۂ نامرادی تو ابلیس ہی پر ختم ہو گیا جیسے آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہو گئی۔ اب نہ کوئی ابلیس بنے گا نہ یہ رتبہ پائے گا اور جیسا ابلیس شاداں اور فرحاں رہتا ہے ایسا نہ کوئی ولی خوش ہے نہ نبی ؎

رندے دیدم نشستہ بر خنگِ زمیں   نے کفر و نہ اسلام نہ دنیا و نہ دیں
نے حق نہ حقیقت نہ شریعت نہ یقیں   اندر دو جہاں کرا بود زہرۂ ایں

اس کے اشعار پڑھا کرتے تھے اب میں اس مقام پر تتمہ اُس قصیدہ کو لکھتا ہوں تاکہ شائقین اُس سے بہرہ ور ہوں۔ قصیدہ

می نگارم قصیدۂ عطار — کہ مرا نیست جز نگارش کار
چشم بکشا کہ جلوۂ دلدار — منجلی ست از در و دیوار
نحن اقرب الیہ آمدہ است — دور اُفتادۂ تو از پندار
کل شی محیط می بینم — آں کہ می بنیش بہ نقش و نگار
تو ز کوتاہ بینی اے احمق — می سرائے بہ لحن موسیقار
تا بہ کے در صفاتِ حیوانی — ہم چو یک چند احمقے بہ عار
او بہ پیشِ تو ایستادہ چو سرو — سر فرو بردۂ تو نرگس وار
سرمۂ گر ز نورِ بی یُبصِرُ — در کشی در دو چشمِ پر زنگار
از درون و بروں نشیب و فراز — از پس و پیش و ز یمین و یسار
شاہدِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ — پیشِ تو پردہ گیر واز رخسار
ثَمَّ وَجہُ اللہ آیدت بہ نظر — وَھُوَ مَعَکُم نمایدت دیدار
کاروانِ نَفَختُ مِن رُّوحِی — بسرائے تو بر کشاید بار
ایں تماشا چو بنگرے گوئی — لَیسَ فِی الدَّارِ غیرنا دیار
احدست او اگر تو بہ شماری — واحدیت رساندت بہ ہزار
ہمہ یک قطرہ است ایں دریا — ہمہ یک دانہ است ایں خروار
اسپ و فیل و پیادہ و فرزیں — بہ تن واحد آں سپہ سالار
می نماید بہ چشمِ احول تو — شتر و اسپ و فیل و گاو و حمار
زاغ و طاؤس مار و مور و مگس — بلبل و قمری و چکاوک سار
کافر و گبر و ملحد و مومن — متقی و شقی و بد کردار
گر تو علم الیقیں بدست آری — سوے عین الیقین بیابی بار
روئے حق الیقین عیاں بینی — شوی از کائنات برخوردار

بہ ہمیں دیدہ بنگری ظاہر — صورتِ خویش را بصورت یار
پس ز خود گوئی وز خود شنوئی — لِمَنِ الْمُلْكُ وَاحِدِ الْقَهَّار
تو بدیں پایہ کے رسی ہیہات — کہ خرد باز ماندہ از رفتار
مَنْ طَلَبَنِيْ وَجَدَنِيْ آمدہ است — عاشقاں را بدستِ اوست قرار
مَنْ رَآنِيْ فَقَدْ رَاٰءَ الْحَقَّ — زیں سبب گفت احمدِ مختار
مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ نمی فرمود — گر نمی دید حیدرِ کرّار
رمزِ مَنْ كَانَ هٰذِهٖ اَعْمٰى — بشنوید اے خران کودن سار
ہر کہ ایں جا نہ دید محروم است — در قیامت ز لذّت دیدار
کار کن کارِ پیش ازاں کہ اجل — بدر آرد ز ہستی تو دیار
منزلِ تو نہ دور نزدیک است — پائے مردی بکن قدم بردار
قاطعانِ طریق در رہ اند — شتر مست تو گسستہ مہار
انا لیلٰے بگو اگر مردے — ورنہ چوں ابلہاں سری میخار
بہ چہ معنی انانیت کفر است — ہیچ فہمیدی اے نکو کردار
خویشتن را مگو منم یعنی — من رانی بگو ہمیں بروار
قل ہو اللہ وصف احدداں — از میانش ولیک میم برآر
ایں سخن در تو کے کند تاثیر — دارد آئینہ دلت زنگار
روزے از روز ہا کلیم اللہ — خواست مرشد ز ایزد دوّار
وحی آمد برائے او کہ برو — پیشِ ابلیس مفسداں سالار
راہ طے کرد و سر بحکم نہاد — رفت در پیشِ آں لعیں ناچار
گفت خواہم من از تو ارشادے — اے تو در راہِ عشق پاک عیار
یعنی ایزد برائے ارشادم — بر سرِ تو نہاد تاج مدار
زیں سخن ہمچو شعلہ سر پیچید — جست و برجا نشست ہمچو شرار
گفت من از دمِ ازل دارم — طوقِ لعنت بگردنِ ادبار

تو ندیم الٰہی نہ داری ننگ　　تو کلیم الٰہی نہ داری عار
من کجا و طریقِ ایں احکام　　من کجا و سبیلِ ایں اطوار
گر ز من چشم داری ایں معنی　　در بمن بر تو کیستی ایں طومار
من نہنگم نہنگ عصمت خوار　　من پلنگم پلنگ دیں او بار
راه و رسم بداعت از من پرس　　مفسداں را منم سپہ سالار
بر زبانِ کیا زبازش گفت　　اے تو در راهِ عشق خوش رفتار
درِیں گرد بیاں تو می گفتی　　نکتۂ ہم برائے من بگمار
در تکلم در آمد و بکشود　　لبِ گوہر فشاں و شکّر بار
من مگو گفت تا چو من نشوی　　ایں سخن را ز من بخاطر دار
یعنے اول چو من شوا سره مرد　　زخم او را سپر بسینہ میار
چوں شدی ہمچو من بر و پس ازاں　　ہر چہ خواہی بگو و باک مدار
چوں شنید ایں سخن از و موسیٰ　　گفت از روئے عجز والانکسار
ہر چہ گفتی برفت بر انصاف　　ایں سخن از تو اے ملک عیّار
عین آبیم ما و او با ما　　بہم آمیختہ شکر کردار
عین آبیم گرچہ در ظاہر　　می نمائیم لولوے شہوار
نام خود را کنوں چو آب بریم　　ز آنکہ ما شربتیم شکّر وار
آب را تو تمام ژالہ نگر　　ژالہ را عینِ آب می پندار
خویشتن را تو در میانہ مبیں　　سرِّ اسکندر از میاں بردار
لیک اندر قمار خانۂ عشق　　بر ز منصور کس نہ باخت قمار
تا تو ہستی خدائے در خواب ست　　چوں بمیری تو او شود بیدار
فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ　　صَادِقِيْنَ ۃ آمده است و در اخبار
گر بمیری تو پیشتر ز اجل　　نکند بر تو تیر و خنجر کار
یعنے ایں ہستی عناصر خود　　باعلومش ز جانِ خویش برار

صید عنقا کجا تواند کرد — بو الفضولے اگر رود بہ شکار
ملک الموت را شود بہ یقیں — ہمچو سیماب کشتنت دشوار
تو بہ خوف و رجا ازیں درگاہ — باز می مانی اے خجستہ شعار
عشق گر دولت فروزد شمع — روز روشن نمایدت شبِ تار
محو گردی چناں تو از مستی — نہ شناسی کلاہ از دستار
از زبانت کہ می کند مَنْ مَنْ — جان من یک زمانگی ہشدار
وز صفت سر زند ازیں مستی — بطرازم بہ صفحۂ اظہار
یا بہ کل اللساں شود خاموش — یا بہ طال اللساں کند گفتار
لیک طال اللساں ہلاک شود — سر و پا گم کند و ہر دستار
وانکہ کل اللساں بود چہ شود — با سلامت بایستد ہموار
کم نہ گردد ز کاکلش یک موے — کم نہ گردد نہ خرقہ اش یک تار
آں کہ او سر دہد زہے سرمست — و آں کہ او سر برد زہے ہشیار
گاہ طال اللساں بود خاموش — گاہ کل اللساں زہے مکّار
می زند موج اندریں معنی — مطلعے ہم چو مطلع الانوار

مطلع

او خروشاں چو بلبلانِ بہار — او خموشاں چو طبلۂ عطّار
خود انا الحق زد از لبِ منصور — خود بر آمد ز شوق بر سر دار
گفت انا احمد بلا میم — از زبانِ محمّدِ مختار
رب ارنی بگوش خود خود ریخت — خود ز خود کرد حیرتِ دیدار
باز خود گفت لن ترانی را — بہ ہر چہ بہر گرمی بازار
غیر او کیست کو سخن گوید — یا خمش بر نشیند اے دلدار
ناظر خود خود است و خود منظور — خود تماشائی خود تماشاکار
خود پیمبر شد و پیام آورد — گشت خود معترف نمود اقرار

عاشق خود خود ست و خود معشوق — خود طبیب خود ست خود بیمار
از برائے فریب خود خود گشت — جلوه در قد و در قدم رفتار
تاب بر زلف و وسمه بر ابرو — سرمه در چشم و غازه بر رخسار
رنگ در آب و آب در یاقوت — بوئے در مشک و مشک در تاتار
هست خود فعل فاعل و مفعول — هست خود قبض و بسط در هر کار
خود شده طوطی و خود آئینه — خود شده پیش طوطی آئینه‌دار
خود کند ساز هر گناه که هست — خود زند باز بابِ استغفار
حمد خود از زبان خود خود گفت — تاکه بر خود شود پری رفتار
من نیم او خود ست قافیه سنج — من نیم او خود ست در گفتار
هست آں یک حیات صرف مدام — با همه خیر و شر خود دوّار
روز آدینه بر سرِ منبر — گشت شبلی برائے خطبه سوار
کرد توحیدِ ایزدی آغاز — که یکے ست او چه ده چه صد چه هزار
مگر آں جا جنید حاضر بود — گفت اے پاک باز پاک عیار
آنچه من با تو گفته ام به نهفت — تو عیانش همی کنی اظهار
گفت هیهات اے یگانهٔ عصر — سخنِ مشرکانه را بگذار
من همی گویم و همی شنوم — نیست کس غیرِ من بهر دو دیار
قُمْ بِاِذْنِیْ وَ قُمْ بِاِذْنِ اللهِ — هر دو یک نغمه ایست از لبِ یار
خواه قربِ نوافلش برخواں — خواه قربِ فرائضش به شمار
نیست جز نام فرقِ زیر و بم — زیر و بم می زند سر از یک تار
لوحِ دل را ز نقشِ غیر بشوی — خویشتن را خدائے خود انگار
نورِ چشمِ من از خودی بگذر — زانکه باشد خودی ز جمله خوار
گر بدیں بال و پر کنی پرواز — شاهبازی تو جبرئیل شکار
وانچه غیر تو چیست هستی تو — خویشتن را کنار گیر کنار

ورنہ گر با خودی خدا گوئی　　مشرک باشی و خدا آزار
شرک دو ہست ہم خفی و جلی　　ہر دو را پیش تو کنم تکرار
اے پسر لا الٰہ الا اللہ　　خود ز شرکِ خفی ست آئینہ دار
ہست شرکِ جلی رسول اللہ　　خویشتن را ازیں دو شرک برآر
چوں ازیں شرک ہا خلاص شوی　　شوی آں وقت صوفی ستّار

یہاں حضرت فرمایا کرتے تھے سنو ہمارے بزرگ حضرت شبلی رح کیا فرماتے ہیں: ـ

آں یکے وقت نزع شبلی را　　گفت اے قدوۂ صغار وکبار
کہ بگو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ　　مغفرت خواہ زایزد غفّار
بہ تبسم در آمد و بشگفت　　ہمچو روئے بہار و چہرۂ یار
گفت معشوقِ من ز استغنا　　نہ کشاید ز روئے رشوت کار
بعد ازیں ما و ساقی و لب جو　　بعد ازیں ما و یار و بوس و کنار
بعد ازیں ما و نغمہ و مطرب　　بعد ازیں ما و خانۂ خمّار

یہاں ارشاد ہوتا تھا کہ چھوٹے میاں سو چھوٹے میاں بڑے میاں سبحان اللہ۔ اب سید الطائفہ حضرت جنید رح کا ارشاد سنو:ـ

سالکے مر جنید را پرسید　　کاے ز سر تا قدم ہمہ اسرار
بہ تکلّم درآ کہ مشرک کیست　　گفت کاے ہرزہ گوئی گودن سار
ہر کہ نادیدہ نام او گوید　　مشرک ست آں فضول ناہموار
دع نفسک تعال را بشنو　　اے برادر ز گوش پنبہ برآر
ہر کہ از وے نزد انا الحق سر　　ہست او از جماعتِ کفّار
ہر کہ منکر شود بود مشرک　　من از و چوں خدائے او بیزار
تا نہ کارے یگانگی را تخم　　کے دہد شاخ آشنائی بار
چوں دوئی از میانہ بر داری　　تو نمائی من او کند اقرار
یعنے ایں طبع چار را یک کن　　تا نہ گردد مخالف ہر چار

دینِ احمد گزیں مسلماں شو	بگزر از خویش بگسل ایں زنار
ایں بت ار بشکنی چو ابراہیمؑ	گر در آتش روی شود گلزار
شو بہر قول و فعل تابع سلف	غیر باطن بظاہرت بسیار
شو بہ باطن ربوبیت پرداز	کن بظاہر عبودیت اقرار
ظاہرِ خویش پاک کن بہ وضو	باطنِ خویش را نماز گذار
پس وضو چیست پاک کردنِ دل	صافی دل چو شستن از اغیار
مسجدِ تو مقام تسلیم ست	قبلہ گاہِ تو طاقِ ابروے یار
در عبادت کسے شریک مکن	زانکہ لا یشرک است حکم نگار
اے پسر در رہِ شریعت فرض	عشر دہ یک بود بدنیا دار
در طریقت گذشتن از لذات	در حقیقت گذشتن از افکار
تو اگر مرد ایں خجستہ رہے	دامن از کائنات خود بفشار
ہستیٔ خویش را زکوٰۃ بدہ	بر سر دوستی بکن ایثار
روزہ حفظ دل ست از خطرات	پس بود از مشاہدہ افطار
دل بود طعمہ خور ز چار خطر	مرد باید کہ بگذرد زیں چار
گر بود خاطرِ تو مائلِ حق	خطرۂ آسمانیش پندار
در بسوے عبادتت بکشد	خطراتِ ملائکش بشمار
در بیابیش در تردد و جاہ	کہ چنین و چناں برآرم کار
یا فلاں را دہم کلاہ و کمر	یا فلاں را کنم سپہ سالار
یا کنم خوض آسماں بہنا	یا بہ کیواں برم سیر دیوار
جانِ من ایں خطر ز شیطان ست	ایں خطر اژدریست مردم خوار
در شود ایں تنِ تو مائلِ خور	مستیٔ تن بدل شود بہ خمار
ایں کشاکش ز نفسِ بدکیش است	شترت را بدستِ اوست مہار
از خطر ہا معطلے کردی	گرچہ ہستی ز جعفرِ طیارؓ

از خطرہا اگر بروں آئی — نہ خزاں ماند و نہ فصلِ بہار
ورنہ گردد دل فرشتہ خویت — ہیچ گہ مائل اندریں ہر چار
نام ایں منزل تو او ادنیٰ — ہست جائے شکیب و جائے قرار
لیک ایں جا ستادنت مشکل — بلکہ زایں جا گذشتنت دشوار
چیست توبہ گذشتن از جملہ — چہ خدا و رسول و جنت و نار
حج چہ باشد ز خود سفر کردن — بر کجا جانب ہدایت کار
ہست قربانیت پس از حجت — قطع احکام طبعہا یک بار
فرضِ یزداں گراں تر از کوہ است — کوہ بر گردنِ فرشتہ مدار
شد جنابت تمام شرک و دوئی — غسل فرض است ازاں بہر ہشیار
غسل چہ بود بورطۂ توحید — غوطہ خوردن نیامدن بہ کنار
چیست تجرید گشتنت آزاد — از ہزاراں ہزار یار و دیار
بعد ازاں از برادر و خواہر — بعد ازاں از تمام خویش و تبار
غمِ ایں ہا بہ ہیچ نوع مخور — بگذر از جملۂ و بحق بسپار
زاں کہ داریم ما ہمہ خود او — لطفِ او ہست بر ہمہ غمخوار
ماہ و خورشید زہرہ و برجیس — ابر نیسان و دی مہ آذار
ہمہ بہر تو در مشقّت و رنج — تو ز بہر کہ می کشی آزار
ہفت چار اند حاکمِ ظاہر — باطنت ہست جملۂ اسرار
بعد تجرید بایدت تفرید — یعنی از آخرت شدن بیزار

---

۱ اس شعر پر حضرت فرمایا کرتے کہ یہ مضمون بخار کا سا جوش و خروش ہے جب انسان کو بخار چڑھتا ہے تو بحران میں جو چاہتا ہے کہتا ہے ۱۲ ۔ ۲ اس شعر پر جناب وقبلہ فرمایا کرتے تھے کہ ؎

در یں ورطہ کشتی فرو شد ہزار — کہ پیدا نہ شد تختۂ بر کنار
بترسد خردمند ازیں بحرِ خوں — کہ زو کس نبرد ست کشتی بروں

خردمند مراد ہے انبیاء علیہم السلام سے اور بحر خون توحید ذاتی ہے ۱۲ منہ ۔

فارغ الدین و تارک الدنیا　　فکند فرق افسر از افسار
دین و دنیا و دوزخ و فردوس　　تو رہا کن بہ این خران بگذار
آں کہ زانہا گذشت گشت فقیر　　مال او راست دوست در حصار
در شریعت بود ہر آنچہ حلال　　در طریقت بود ہماں مردار
چوں حقیقت نقاب برگیرد　　ہر دو یک گردد اے نکو کردار
روئے بیگانہ کہ می نگری　　آشنا وا نماید ت ہر بار
صفتِ طبع را چو نفی کنی　　روئے حق بینی از در و دیوار
گر ز شرکِ خفی خلاص شوی　　خویش را از خفی خلاص شمار
ذوق و شوقِ چناں عیاں بینی　　گر شوی مثل من ز خود بیزار
یک شبے بایزید را در خواب　　دید شخصے کہ بود از ابرار
گفت اے شاہبازِ عالم قدس　　گفت اے قدوہ اولی الابصار
بگو از سرگذشتِ اوّل شب　　کہ چہ بشنیدی از یمین و یسار
گفت آمدند از عالمِ قدس　　کہ چہ آوردۂ بیا و بیار
گفتم آوردہ ام گناہ کہ ہست　　نام تو ہم غفور و ہم غفّار
لیک از من نہ رفت در توحید　　شرک اے کردگارِ لیل و نہار

یہاں جناب وقبلہ فرمایا کرتے تھے کہ جب حضرت بایزیدؒ نے دعوئے توحید کیا تو دودھ کی رات یاد دلائی گئی یعنی ایک رات حضرت بایزیدؒ کے پیٹ میں درد ہوا تھا مریدوں نے دریافت کیا تو فرمایا کہ دودھ پینے سے درد ہوا پس دعویٰ باعثِ گرفتاری ہوا۔

اذکر اللیلۃ اللبن فرمود　　خوردہ بودی ازو شدی بیزار
گفتم این بد خلاف در توحید　　وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّارِ
چند خواہی چو شاخ گل بالید　　کایں مراد لبرست و آں دلدار
زود باشد کہ بے مناقشۂ　　بینی از خویشتن شدہ بیزار
او ز تو گندہ خوردہ ہم چو خدنگ　　تو و من باز ماندہ چوں سوفار

هرچہ بے او بہ نوشی و بخوری — زہرِ تست ارچہ ہست نوش وگوار
هرچہ بے یادِ او بیند و زی — مار ہست ارچہ ہست مہرۂ مار
شہد و شکر مثال باشد پاک — گرچہ در یادِ او خوری مردار
چند ماضی و چند مستقبل — بزلہ سنجی کنی لب افکار
جانِ من وقت آں غنیمت داں — کہ ابوالوقت خواندت احرار
سال آئندہ را گزشتہ شمر — ہمچو پیرار سال وہمچوں پار
خویشتن را بایں ہمہ عالم — مثل باورِ داں وخاک شمار
اَنْتَ اَعْمٰی عصائے تو وہم است — کہ ہمی اُفتی از سرِ دیوار
ورنہ ہنگامِ رفتنِ تو زمیں — زیرِ پا آیدت ہماں مقدار
اے چو کردی تو نامِ من عاصی — رفتہ ام راہِ معصیت بسیار
نامِ خود بر صحیفۂ لاریب — خود رقم کردۂ اَنَا الْغَفَّار
کیسۂ من پر از گناہان ست — تو خریدار واپسیں بازار
ہرچہ داری ز جنسِ بخشایش — تو بہ ہل من مزید لطف بیار
ایں قصیدہ است وحی ہاتفِ غیب — طبعِ والاپسند آئینہ دار
وحی چہ بود ہر آنچہ در دل تو — سر زند از نتائجِ اسرار
ہست الہام ایں کہ خاطرِ تو — برود سوئے خیر از بدکار
یا ز وسواس دیو ہست کہ تو — بروی سوئے بد ز نیک شعار
ایں نہ شعریست بلکہ معجزہ است — گرچہ ماند بہ صورتِ اشعار
ہمہ عشق است اندریں مصحف — ہمہ وصل ست اندریں گفتار
ہمہ شوق ست اندریں صفحہ — ہمہ ذوق است اندریں طومار
ایں کلامم کلام مردان است — نہ کلام مخنّث بازار
قلم از راستی بدست آور — بر ورقہائے جان ودل بنگار
روز و شب وردِ خویش کن ایں را — تا رہد جانت از ہمہ آزار

لیک باید کہ کار فرمائی | ورنہ خون خوردن و ملم بچکار
این قدر بس بود نصایح و بند | در سلوکِ فریدِ دین عطار

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت سلطان نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت قلندر صاحب پانی پتی کی خدمت میں یہ سوال تحریر کیا۔ منکہ ہیچ بن ہیچ بن ہزاراں ہزار ہیچ من خود را ہیچ می پندارم و حق می فرماید کہ من در توام و شریعت می گوید کہ ادب کن پس جواب ایں ہر کلمہ قلمی فرمایند۔ قلندر صاحب نے جواب میں یہ رباعی ارسال فرمائی

اسرارِ ازل را نہ تو دانی و نہ من | ایں حرفِ معما نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پسِ پردہ گفتگوئے من و تو | چوں پردہ برافتد نہ تو مانی و نہ من

ایک روز ارشاد ہوا کہ کسی شخص نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے معرفتِ خدا میں سوال کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اَلْعَجْزُ عَنْ دَرْکِ الْاِدْرَاکِ اِدْرَاکٌ یعنے ادراک کا عاجز ہونا ادراک کے دریافت سے، یہی معرفت ہے۔ ایک شخص نے حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے معرفت میں سوال کیا۔ فرمایا عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ یعنے میں نے خدا کو پہچان لیا۔ بسبب ٹوٹ جانے ارادوں کے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ نے یہ رباعی حضرت شاہ شرف الدین بو علی قلندرؒ کی خدمت میں تحریر کی

اے راہ برِ خلق مرا راہ نما | در مشکل ایں بیت جوابم فرما
گویند خدا بود و فلک ہیچ نبود | گر ہیچ نبود ست کجا بود خدا

قلندر صاحب نے اس کے جواب میں یہ رباعی رقم فرمائی

در ملت و مذہب خبرے نیست مرا | میداں بہ یقیں کہ لامکان ست خدا
خواہی کہ ترا کشف شود ایں مخفی | جاں در تنِ خود بیں کہ کجا دارد جا

ایک روز ارشاد ہوا کہ داراشکوہ نے میاں میر صاحب لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں یہ سوال تحریر کرکے بہ طلب جواب ارسال کیا۔ سوال ہر روز ارادہ می کنم کہ بخدمت شریف برسم لیکن میسر نمی شود اگر من منم خلافِ من چرا۔ و اگر من نیستم چہ تقصیر ما۔ و قتل امام حسین

علیہ السلام اگر برحق است پس یزید پلید درمیان کیست واگر خلافِ مشیت ست یَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَاءُ وَیَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ ؕ چیست۔ احمدِ مختار علیہ التحیۃ والسلام در جنگِ کفار رفت شکست بلشکرِ اسلام افتاد۔ علماء ظاہری فرمایند کہ تعلیم صبر است۔ وحدیث شریف ناطق است کہ کُنْتُ نَبِیًّا وَّادَمُ بَیْنَ الْمَاءِ وَالطِّیْنِ ؕ میں نبی تھا اور آدم درمیان خمیر کے۔ ایں رتبہ وآں شکست۔ پس جواب ایں ہر سہ کلمہ قلمی فرمایند۔ میاں میر صاحب نے یہ جواب ارسال کیا۔ **جواب** بچۂ شیر خوارہ را حلوا خوردن نباید۔ اے شاہزادہ تا از شاہ زادگی بیروں نیائی ہرگز شاہ نہ شوی۔ باقی مَنْ سَکَتَ سَلِمَ وَمَنْ سَلِمَ نَجَا **ترجمہ** جو شخص خاموش رہا اُس کو سلامتی ملی اور جس کو سلامتی ملی اس نے نجات پائی۔ اس کے بعد جناب وقبلہ نے فرمایا کہ میاں میر صاحب نے جان بچائی اور ٹال دیا کیوں کہ جواب بہت مشکل تھا۔

ایک روز ارشاد فرمایا [۱۱۹] کہ عالمگیر بادشاہ نے سرمد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ سوال کیا ؎

اے عارف رند بود نابود ت کو — آتش زدۂ بہ خویشتن دود ت کو
دل دادی و جان دادی و ایمان دادی — اینک ہمہ سود است بگو سود ت کو

حضرت سرمد نے اس کا جواب یوں ارشاد فرمایا ؎

نابود شدم بود نمی دانم چیست — اخگر شدہ ام دود نمی دانم چیست
دل دادم وجاں دادم و ایمان دادم — سود است دگر سود نمی دانم چیست

ایک روز ارشاد ہوا [۱۲۰] کہ جب کبیر نے یہ دوہا پڑھا

تن مٹکے ہے من دہی سُرت بلوئن ہار — کبرا ماکھن کھا گیو چھاچھ پیۓ سنسار

یعنے کمالِ معرفت کبیر کو حاصل ہوگیا۔ اس کے جواب میں کمال ابنِ کبیر نے ایک دوہا کہا اور باپ کو ہوشیار کیا کہ یہ آپ کا وہم ہے۔ بطون کسی پر ختم نہیں ہو سکتا ؎

مصری کا پربت بھیو اور چیونٹی کسی آئے — اُن گھ اپنا بھر لیو پربت کا کیا جائے

یہ بات سُن کر کبیر چونکا اور ہوش میں آیا کہ حقیقت میں دھوکا لگا۔ کمال نے خوب سمجھائی۔ قُلْ لَّوْ کَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّکَلِمٰتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ کَلِمٰتُ رَبِّیْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِہٖ مَدَدًا ؕ ترجمہ کہہ دے اے محمد اگر ہو جائے پانی دریاؤں کا سیاہی واسطے

لکھنے آیات اور انعام پروردگار میرے کے البتہ خشک ہو جائیں گے دریا پہلے اس سے کہ کچھ لکھے میرے پروردگار کے علوم میں سے اور اگر آئیں ایسے کروڑ ہا سمندر مدد اس سیاہی کے ؎

علمہا از بحرِ علمش قطرہ ایست　　آں چوں خورشید ست اینہا ذرہ ایست

گر کسے در علم صد لقماں بود　　پیشِ علم کاملش ناداں بود

ایک روز[۱] ارشاد ہوا کہ کبیر بڑا مرد موحّد تھا۔ جب اس کی توحید کا شہرہ ریداس تک پہونچا تو اُس نے یہ شعر لکھا کیوں کہ ریداس سرگنی تھا۔ یعنی اہل صفات اور کبیر نرگنی یعنی اہل ذات تھے ؎

مائی[۱] ترگنی باپ جولہے پوت بھئے برہم گیانی　　آدانت کی جانے ناہیں اپنے من کی ٹھانی

جولہے نہیں نین ہست موری رے

اُس کے جواب میں کبیر نے اس طرح رقم کیا ؎

برہم[۲] گیان بن برہم تت بنکا پاشد نہ ہوئی　　پورن برہم سکل گھٹ بیاپک دوجے اور نہ کوئی

چمری نہیں نین ہست موری رے

آخر ایک روز اتفاقِ ملاقات ہوا۔ اور دونوں میں گیان چرچا کی ٹھہری۔ کبیر نے کہا کہ میری بھگتی اچھی ہے۔ ریداس نے دعوے کیا کہ میری۔ اب فیصلہ ہو تو کیوں کر ہو۔ ریداس نے رام چندر جی کو یاد کیا۔ فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر دھنش بان یعنی تیر کمان ہاتھ میں لیے ہوے آموجود ہوے اور کہا کہ اے کبیر! ریداس کو کیوں نہیں مانتا۔ اُسی کی بھگتی اچھی ہے۔ کبیر نے کہا کہ مہاراج آپ سیتا جی کی چوکسی کریں۔ اس معاملے میں دخل نہ دیجیے۔ گفتگو میری اس کی ہے۔ ہم دونوں بھگت لیں گے۔ چپ ہو کے دور کھڑے ہو گئے۔ تب ریداس نے کرشن جی کو یاد کیا۔ وہ بھی گرڑ پر سوار سر پر مکٹ لگائے مکھ مُرلی دھرے

۱؎ یعنی ماں غیر قوم اور باپ جولاہہ اور بیٹے ہوے صاحب معرفت۔ آگے پیچھے کی خبر نہیں اپنے دل میں ٹھان لی کہ میں عارف ہوں۔ اے جولاہے اگر تو میرے سامنے ہوتا تو میں تم کو سمجھا دیتا ۱۲ منہ ۲؎ یعنی بغیر معرفت خدا او نفس کے جسم صاف نہیں ہوتا وہ ذات تمام شے میں سمائی ہوئی ہے سوائے اس کے دوسرا کچھ نہیں۔ اے چمار اگر تو میرے سامنے ہوتا تو میں تجھ کو سمجھا دیتا ۱۲ منہ۔

سامنے آگئے اور کبیر کو سمجھایا اُس نے کہا کہ مہاراج آپ گوپیوں سے کلول کیجیے۔ میرا اس کا جھگڑا ہے چک جائے گا۔ وہ بھی الگ ہو گئے۔ پھر اس نے مہادیو جی کا دھیان کیا۔ فوراً بیل پر سوار ترسول ہاتھ میں لے کر آئے اور درشن دیئے۔ کبیر نے اُن کا کہنا بھی نہ مانا اور جواب دیا کہ مہاراج تم پاربتی جی کے پاس جاؤ اس کی خیر مناؤ۔ اس بات سے آپ کو کیا مطلب۔ مہادیو جی کو غصہ آیا اور کبیر کے مارنے کو ترسول اُٹھایا۔ کبیر رم یعنی لا کہہ کر غائب ہو گیا۔ اُس وقت ریداس کے تمام دیوتا بولے کہ اس دریائے توحید و یگانگی میں جہاں کبیر نے غوطہ لگایا ہے۔ ہم اور وہ سب برابر ہیں۔ یہاں ہمارا ابھی کچھ بس نہیں چلتا۔ ریداس نے کہا کہ مہاراج میں نے جب اتنی مدت تمھاری سیوا اور پوجا کی اور اس وقت کچھ نہ ہو سکا تو آئندہ آپ لوگوں سے کیا توقع رکھوں۔ بس میرا سلام ہے۔ اس کے بعد ریداس نے سب کو دُھتا بتائی اور مسلک توحید اختیار کیا۔ اور کبیر کا چیلہ ہو گیا ؎

ٹھاکر پتھر مالا لکڑ تیرتھ ہیں سب پانی رام کرشنا مر گئے دیکھے چاروں وید کہانی
راما مر گئے کرشنا مر گئے مرگئی لکھو بائی اُس کو سادھو کیوں نہیں پوجو جس کو موت نہ آئی

دل گفت مرا علمِ لدنیؔ ہوس است تعلیمے کن اگر ترا دست رس است
گفتم کہ الف گفت دگر گفتم ہیچ در خانہ اگر کس ست یک حرف بس است

ایک ۱۳۲ روز ارشاد ہوا کہ ہم نے ایک عالم سے یہ بات دریافت کی تھی کہ کلمۂ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ میں لانفی جنس کا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اور بھی خدا ہیں۔ جن میں سے ایک کو ہم نے مستثنیٰ کیا اوروں کو چھوڑ دیا۔ اس میں تو بڑا ہی شرک بھرا ہوا ہے۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ اکثر لوگوں نے اور خدا بھی تو مان رکھے ہیں۔ ہم نے کہا کہ حضرت پہلے تو یہ فرمائیے کہ قرآن شریف، لوحِ محفوظ پر کب لکھا گیا تھا۔ جب کہ یہ کلمہ اور قرآن لوح پر لکھا گیا اُس وقت تھا کون جو دوسرا خدا مانتا۔ انھوں نے کہا کہ تم وہابی معلوم ہوتے ہو۔ ہم نے کہا کہ درست ہے۔ جب ہم سے سچی بات کہی اور آپ جواب نہ دے سکے تو ہم وہابی ہو گئے ؎

لا و اِلّا ہر دو لفظے ساختند خلق را در دامِ وہم انداختند

اس کے بعد فرمایا کہ خدائے تعالےٰ نے روزِ ازل ہی سے یہ رنگ آمیزی کر رکھی ہے۔

اس کا بھید نہ کسی کو کھلا ہے اور نہ کھلے۔

ایک روز [۱۲۳] **ارشاد ہوا** کہ جب حضرت مرتضیٰ علیؓ اور امیر معاویہؓ میں مجادلہ ہوتا تھا تو حضرت ابوہریرہؓ ایک ٹیلہ پر جا بیٹھتے۔ اور دونوں لشکروں کے جنگ و جدال کا تماشا دیکھتے اور فرماتے کہ بھایو دونوں فریق حق پر ہیں اور جب کھانے کا وقت آتا تو امیر معاویہؓ کے دستر خوان پر شریک ہوتے، لیکن نماز ہمیشہ **حضرت علیؓ** کے پیچھے پڑھتے۔ کسی نے اُن سے پوچھا کہ حضرت یہ کیا؛ کھانا وہاں اور نماز یہاں۔ فرمایا کہ میاں سچ تو یوں ہے کہ روٹی کا مزا امیر معاویہؓ کے دستر خوان پر ہے اور لطفِ نماز حضرت علیؓ کی امامت میں۔

ایک روز [۱۲۴] **ارشاد ہوا** کہ جب ہم دہلی کی زینت المساجد میں مقیم تھے تو باقر شاہ نے کمبل پوش سے سوال کیا کہ تمھارے نزدیک کفر و اسلام میں کچھ فرق ہے یا نہیں۔ جواب دیا کہ کچھ بھی نہیں۔ دونوں شانیں سرکاری ہیں۔ اندھیرے اُجالے کا سا حال ہے ؎

کفر و اسلام در رہش پویان   وحدہٗ لاشریک لہٗ گویان

پھر پوچھا کہ تم کس طریقہ میں ہو۔ کہا کہ کسی میں بھی نہیں۔ سردی میں دھوپ بھلی معلوم ہوتی ہے اور گرمی میں چھاؤں۔ دن کو اُجالا اچھا لگتا ہے اور رات کو اندھیرا۔ پھر باقر شاہ ہماری طرف متوجہ ہوئے کہ تم کس طریقہ میں ہو۔ ہم نے کہا کہ صاحب ظاہر میں تو ہم لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ میں شریک ہیں۔ باطن کا حال معلوم نہیں کہ کیا ہیں اور کون ہیں۔ اگر حالِ باطن معلوم ہوتا تو کچھ بیان کیا جاتا۔ کوئی کہتا ہے کہ اس کے اندر خدا ہے کوئی کہتا ہے کہ ایک نفس ایک شیطان بھی اس میں گھسا ہوا ہے۔ پس اگر اس میں خدا ہے تو ان سب کا گذارا کب ہو سکتا ہے۔ ہاں بطور خدمت گاروں کے رہیں تو مضائقہ نہیں۔ ع

ہر جا کہ سلطان خیمہ زد غوغا نماند عام را

یہ بات سُن کر باقر شاہ خاموش ہو رہے۔

ایک روز [۱۲۵] **ارشاد ہوا** کہ زینت المساجد میں ایک روز کمبل پوش سے مولوی محبوب علی صاحب کی گفتگو ہونے لگی۔ اس آیت کے معنی میں فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ الَّذِیْ مولوی صاحب تو کہتے تھے کہ بیت سے مراد کعبہ ہے اور کمبل پوش کا قول تھا کہ بیت سے عبارت قلب انسانی ہے۔

یہاں تک بحث ہوئی کہ نوبت بہ جدال و قتال پہونچی ۔ اتنے میں مولوی فضل حق صاحب تشریف لائے ۔ دونوں صاحبوں کی تقریر سُنی اور میری طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے کہ صاحب آپ خاموش بیٹھے سنتے ہیں، فیصلہ کیوں نہیں کر دیتے ۔ میں نے کہا کہ مولوی صاحب مجھ کو ایک نقل یاد آئی ہے ۔ میرٹھ میں لالہ بانکے رائے کے مکان پر میں مقیم تھا ۔ جہاں ایک چھوٹا سا درخت پیپل کا لگا ہوا تھا ۔ اتفاقاً گائے اُس درخت کو ایک روز کھانے لگی ۔ میں نے اُس کو ہٹا دینے کے لیے کہا، تو لالہ بانکے رائے بولے کہ میاں چپکے ہو رہو ۔ یہ دونوں ہمارے دیوتا ہیں ۔ آپس میں خود ہی سمجھ لیں گے ۔ دونوں کے درمیان ہم کیوں دخل دیں ۔ سو جناب عالی یہ دونوں صاحب ہمارے دیوتا ہیں اور اُن کا معاملہ خضر و موسیٰ علیہما السلام کا سا ہے ۔ شریعت و طریقت کی جنگ ہے ابھی هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ کہہ اُٹھیں گے ۔ بھلا میں اُن کو کیا سمجھاؤں ؎

من زقرآں مغز را بر داشتم — استخواں پیش سگاں انداختم

آپ تشریف رکھیے اور ان دونوں صاحبوں کو لڑنے دیجیے ۔ یہ بات سُن کر دونوں صاحب ہنس پڑے اور کہا کہ واہ صاحب آپ نے ہم دونوں کو کتا بنایا ۔

ایک روز[۱۲۶] ارشاد ہوا کہ حضرت منصور کو سولی دینے کی وجہ یہ تھی کہ حق کے ساتھ انا لگا دیا ورنہ حق حق تمام دُنیا پکارتی ہے اور کوئی کسی پر معترض نہیں ہوتا ۔ پھر کسی شخص نے عرض کیا کہ حضرت میں نے سُنا ہے کہ اہلِ خدمت سوائے مسلمانوں کے اور کسی قوم میں نہیں ہوتے ۔ آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کے نزدیک تو یہی بات ہے مگر اور قومیں کہتی ہیں کہ ہمارے ہی طریقہ میں ہوتے ہیں، مسلمانوں میں نہیں ہوتے ۔ اصل یہ ہے کہ سب قوموں میں ہوتے ہیں ۔ خدا کے کام کسی خاص قوم پر محدود و منحصر نہیں ہیں ۔

ایک روز[۱۲۷] ارشاد ہوا کہ بلا واسطۂ پیر و پیغمبر کے بھی صاحبِ عرفت ہو سکتا ہے لیکن شاذ و نادر ۔ اور جو کوئی ایسا ہوا ہے اُس نے خدا کے سوا کسی اور کو نہیں سمجھا ۔ یہ ایسی بات ہے کہ جب عطر کھینچتے ہیں تو زمین صندل کی ضرور ہوتی ہے ۔ پس انبیا اور اولیا زمینِ عطر ہیں ۔ جن کے واسطے سے عطر تیار ہوتا ہے ۔ اگر بغیر کسی زمین کے عطر تیار کیا جائے تو ممکن ہے مگر صد ہا من پھول خراب ہوں تب تھوڑا سا عطر نکلے ۔ جیسے انبیا علیہم السلام کہ ہزار ہا

خلقت تباہ ہوئی تو ایک رسول سرآور دۂ روزگار ہوا۔ اور یہ عطرِ خالص ہیں ؎

صد ہزاراں سبزہ پوش از غم بسوخت　　تاکہ آدم را چراغے بر فروخت
صد ہزاراں جسم خالی شد ز روح　　تا دریں حضرت درِ دگر گشت نوح
صد ہزاراں پشّہ در لشکر فتاد　　تا براہیم از میاں سر بر نہاد
صد ہزاراں خلق سر ببریدہ گشت　　تا کلیم اللہ صاحب دیدہ گشت
صد ہزاراں خلق در زنّار شد　　تاکہ عیسےٰ محرمِ اسرار شد
صد ہزاراں خلق در تاراج یافت　　تا محمدؐ یک شبے معراج یافت

ایک روز[128] **ارشاد ہوا** کہ ایک کنجڑا[1]، ایک رند، ایک حافظ، ایک صوفی، ایک برہمن، ہم دم و ہم سفر تھے۔ جنگل میں سیاہ تیتر بولا۔ ایک شخص نے کہا کہ یار د! یہ کہتا ہے "قاضی تیری فطرت" حافظ جی بولے "اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ" صوفیٔ باصفا نے کہا "سُبحان تیری قدرت"، برہمن دیوتا بولے "رام لچھمن جسرت"۔ غرض کہ ہر ایک نے اپنے مذاق اور اپنے اپنے خیال پر تیتر کی بولی کو محمول کیا، لیکن یہ نہ معلوم ہوا کہ تیتر در حقیقت کیا کہتا ہے ؎

زاہد بہ نماز و روزہ ضبطے دارد　　عاشق بمے دو سالہ ربطے دارد
معلوم نہ شد کہ یار مشغول بکیست　　ہر کس بخیالِ خویش خبطے دارد

ایک روز[129] **ارشاد ہوا** کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام پیغمبرِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی لائے۔ حضرت نے دریافت فرمایا کہ اے جبرئیلؑ تم جانتے ہو کہ وحی کہاں سے آتی ہے۔ اُنھوں نے عرض کیا کہ حضرت میری رسائی سدرۃ المنتھیٰ سے آگے نہیں۔ اس مقامِ معلوم پر ایک ندائے غیب وارد ہوتی ہے۔ اُس کو آپ تک پہونچا دینا میرا کام ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔ آپ نے فرمایا اب کی بار اگر ندا وارد ہو تو اُسی پردہ کو رفع کر کے دیکھو کہ یہ ندا کہاں سے آتی ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ایسا ہی کیا۔ اور ایک طول طویل مسافت طے کرنے کے بعد دیکھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم خود ندائے وحی کر رہے ہیں۔ پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام زمین کی طرف متوجہ ہوئے تو دیکھا کہ آں حضرت صلعم اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ اس کے بعد جناب وقبلہ نے ارشاد فرمایا کہ اس بات کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آنحضرت صلعم خدا تھے۔

بلکہ اس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ ایک آنِ واحد کے اندر آنحضرت صلعم نے اپنے تئیں اس عالم اور اُس عالم میں دکھادیا ؎

حدیث از مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو		کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

ایک ۱۳۰ روز ارشاد ہوا کہ ایک شہر اندھوں کا تھا۔ اُس میں ہاتھی آیا۔ چار، پانچ اندھے بڑے شوق سے دوڑے ہوئے گئے کہ دیکھیں ہاتھی کیسا ہوتا ہے۔ ٹٹولنا شروع کیا۔ کسی نے کان کو ہاتھ لگایا۔ کسی نے دم کو، کسی نے پاؤں ٹٹولے، کسی نے پُشت، کسی نے سونڈ، جب اپنی اپنی جگہ پر واپس آئے تو عارفانِ فیل نے حقائق و معارف بیان کرنے شروع کیے۔ ایک نے کہا کہ سبحان اللہ! ہاتھی بعینہٖ چھاج ہے۔ دوسرے نے بیان کیا کہ اللہ اکبر! مثل ستون ہے۔ تیسرے نے کہا کہ میں نے خوب تحقیق کیا بالکل دیوار ہے۔ چوتھے نے کہا کہ مجھ کو مُنکشف ہوا کہ ہاتھی ایک لاٹھی ہے۔ غرض سب نے اپنا علم و عرفان جو جس کو حاصل ہوتھا ظاہر کیا۔ اگرچہ سب کا مشاہدہ اور سب کی تحقیق بجائے خود درست تھی اور ان کو درحقیقت یہی مُنکشف ہوا تھا لیکن حقیقتِ فیل سے سب ناآشنا اور نابینا تھے۔ پس معرفتِ خدا بھی اندھوں کا ہاتھی ہے۔ اسی لیے مُخبر صادق سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ یہ بات صرف اپنی ہی نسبت نہیں ارشاد فرمائی بلکہ سب کو شامل کرلیا۔ کیوں کہ عرفنا میں ضمیر جمع کی ہے یعنی کسی نبی یا ولی کو معرفتِ کُلّی حاصل نہیں ہوئی ؎

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم		وز ہر چہ گفتہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عُمر		ماہمچناں در اوّلِ وصفِ تو ماندہ ایم

ایک ۱۳۱ روز ارشاد ہوا کہ حضرت مولانا روم و شیخ فریدالدین عطّار و شاہ بوعلی قلندر کی توحید میں ایسا فرق ہے کہ تین مسافر چلے جاتے تھے۔ سرِراہ کنواں نظر آیا۔ ایک عورت پانی بھرتی تھی مسافر نے کہا کہ مائی صاحبہ! پانی پلا دیجیے۔ اُس نے نہایت مہربانی سے پلادیا۔ دوسرے مسافر نے کہا کہ میرے باپ کی جورو پانی پلا دے۔ وہ عورت گالیاں دینے لگی۔ لیکن پانی پلادیا۔ تیسرے مسافر نے بالکل صاف صاف کہہ دیا۔ وہ اینٹ پتھر لے کر اُس کے پیچھے دوڑی۔ ہرچند کہ از روے معنی مطلب تینوں شخصوں کا ایک تھا مگر طرزِ بیان اور تاثیر الفاظ

ہر ایک کی جدا تھی۔ ایک میں پاس ادب تھا دوسرے میں بے حجابی تیسرا بالکل ہی پھکڑ تھا یہی کیفیت مولانا روم اور شیخ عطار اور شاہ بو علی قلندر کی توحید کی ہے مطلب یہ ہے کہ حضرت مولانا روم کا کلام چونکہ مطابق شریعت ہے اس لئے اہل ظاہر کے نزدیک بھی مقبول و مسلم ہے اور شیخ عطار کا کلام ایسا ہے کہ اہل ظاہر اس کو دیکھ کر چپ ہو رہتے ہیں لیکن قلندر صاحب کا کلام تو توحید میں ایسا صاف و بے باکانہ ہے کہ اہل ظاہر اس پر لاحول و استغفار پڑھتے ہیں۔ حقیقت میں سچ بات کہنا بہت مشکل کام ہے۔ اَلحَقُّ مُرٌّ۔

ایک ۱۳۲ روز ارشاد ہوا کہ ایک لڑکا تھا اُس کو لوگ اکثر مارا پیٹا کرتے۔ ایک بار اس کی ماں نے پوچھا کہ بیٹا تم کو لوگ کیوں مارتے ہیں۔ اُس نے جواب دیا کہ میں سچ بات کہہ دیتا ہوں اس لیے مجھ کو لوگ چین نہیں لینے دیتے۔ ماں بولی کہ بھلا سچ کہنے پر بھی کوئی مارتا ہے، تو ضرور جھوٹ بولتا ہے۔ اُس نے کہا اگر تمھارے سامنے بھی سچی بات کہہ دوں تو تم بھی مارنے لگو گی۔ اُس نے کہا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ لڑکا بولا کہ اچھا میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ باپ تو میرا مدت ہوئی مر گیا۔ اب تم کنگھی پٹی کاجل سرمہ کس کے واسطے کرتی ہو۔ اُس نے لے کے جوتی خوب پیٹا۔ لڑکے نے کہا کہ دیکھو سچ بات کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔

ایک ۱۳۳ روز ارشاد ہوا کہ راجہ پرچھیت ایک دن شکار کے لیے جنگل میں گیا جہاں سمیکہ[1] رشی یادِ الٰہی میں مراقب بیٹھا تھا۔ راجہ نے ایک سانپ رشی کے گلے میں ڈال دیا۔ وہ تو بے خبر تھا۔ اُس کے بیٹے سُرنگی رشی نے اس حرکت سے خفا ہو کر سراپ[2] دیا کہ یہی سانپ آٹھویں دن راجہ کو ڈسے گا۔ راجہ یہ بات سن کر ڈرا اور سمیکہ کی خدمت میں عذرِ تقصیر کے لیے حاضر ہوا اُس نے کہا کہ اب کیا ہو سکتا ہے۔ تیر نشانہ پر پہونچ گیا۔ پھر اپنے لڑکے کو بلایا اور کہا کہ راجہ کو تو نے کیوں بد دعا کی۔ فقیروں کا یہ کام نہیں ہے۔ اُس نے کہا کہ اب تو میری زبان سے نکل گیا، راجہ کو یہ حرکت کب زیبا تھی ؎

جا[3] کی جیسی سبھاؤ جائے نہ جیسے نیم نہ میٹھی ہو سینچے گڑ گھی سے

---

[1] نام ہندو فقیر کا ہے ۱۲ [2] بد دعا ۱۲ [3] یعنے جس کی عادت ہے وہ ہرگز نہیں جاتی۔ درخت نیب کا میٹھا نہیں ہوتا اگرچہ گڑ گھی سے پرورش پائے ۱۲ منہ۔

جیسی کرنی دیو کو دیسی اُپجے بُدھ ۔۔۔ ہون ہار ہردے بسے بسر جات سب سُدھ
سیکہ رشی نے راجہ سے کہا کہ جو تقدیر میں تھا وہ ہُوا۔ اب مناسب ہے کہ کتھا سنو تاکہ تم کو گیان ہو جائے اور موت و حیات دونوں سے پاک ہو جاؤ ؎

چوتھے کھنڈ چڑھ کرے جو باسا ۔۔۔ مرن جیون کا رہے نہ ساںسا
ہُد بُد کرتے سب گیو اور انہد گیو نہ کوئے ۔۔۔ انہد کے میدان میں رہے کبیرا سوئے
انہد باجے باجن لاگے ۔۔۔ چور نگر یا تج بھاگے

راجہ مایوس ہو کر اپنے مکان کو چلا آیا۔ اور سکھدیو جی کو کتھا سُننے کے واسطے بُلایا۔ راجہ کتھا سننے بیٹھے اور دھنتر بید کے پاس ایک قاصد روانہ کیا گیا کہ سُرنگی کی سُراپ کے موافق راجہ کو سانپ کاٹے گا۔ تو چل اور اُس کو اچھا کر۔ دھنتر بید اپنے تین سو چیلے اپنے ہمراہ لے کر اچھا کرنے چلا۔ مگر اپنی خبر نہ تھی ؎

تو بر اوجِ فلک چہ دانی چیست ۔۔۔ چوں نہ دانی کہ در سرائے تو کیست

راہ میں وہ سانپ انسان کی صورت بن کر دھنتر بید کے سامنے آیا اور پوچھا کہ مہاراج تم کہاں جاتے ہو۔ جواب دیا کہ میں راجہ پرِیھت کو اچھا کرنے جاتا ہوں۔ اُس نے کہا کہ بھلا تم کس طور سے اچھا کروگے۔ دھنتر بولا کہ میری نظر کو خدا تعالےٰ نے یہ تاثیر دی ہے کہ مارگزیدہ کے زخم پر پڑتے ہی وہ اچھا ہو جاتا ہے۔ سانپ نے کہا کہ بھلا میں سانپ بن کر اس درخت میں کاٹتا ہوں تم نظر ڈالو۔ دھنتر نے کہا [illegible] وہ سانپ بن گیا اور درخت کو کاٹا! فوراً اُس درخت میں آگ لگ گئی ا[illegible] [illegible]ت دھنتر بید نے نظر ڈالی۔ بدستور اپنی ہیئت اصلی پر آگیا۔ وہ سانپ پھر آدمی کی صورت میں آیا اور کہا کہ جہاں آپ کی نظر نہ پہونچے وہاں کیا کر سکتے ہو

۱؎ یعنے جو کام اللہ کو کرنا منظور رہوتا ہے انسان کی سمجھ میں بھی ویسی ہی کر دیتا ہے ہونے والا کام دل میں بس جاتا ہے اور ہوش و حواس جاتے رہتے ہیں ۱۲ ۲؎ وعظ ۱۲ ۳؎ چوتھے کھنڈ سے مراد منزل توحید ہے یعنے جو شخص توحید میں قیام کرتا ہے تو اُس کو موت و حیات کا خوف نہیں رہتا ۱۲ ۴؎ ہد ہد مقام محدود۔ انہد میدان غیر محدود مراد توحید سے ہے یعنے سب لوگ مقام محدود میں رہے اور کبیرا میدان توحید در الورا میں پہونچا ۱۲ ۵؎ یعنے جب منزلِ توحید میں آواز سرمدی کھلتی ہے تو سب چوروں کی طرح بھاگ جاتے ہیں ۱۲ منہ ۔

اُس نے کہا کہ پھر ہم سے کچھ نہیں ہوسکتا۔ یہ بات چیت کرکے سانپ صورتِ انسان چل دیا۔ اور آگے جاکر ایک اچھی سی بیراگن یعنے خم دار لکڑی بن کر راہ میں پڑگیا۔ اُس کو ایک چیلہ گرو کے پاس اُٹھا لایا۔ اُنھوں نے پسند کیا اور اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ وہ فوراً سانپ بن گئی اور دھنتر کے دونوں شانوں کے درمیان کاٹ کھایا۔ اُس وقت دھنترؔ نے معلوم کیا کہ یہ وہی سانپ ہے اب میں نہیں بچوں گا کیوں کہ اُس نے ایسا موقع تاکا ہے جہاں نظر نہیں پہونچ سکتی۔ چیلوں کو جمع کیا اور کہا کہ جس وقت میں مرجاؤں تو مجھ کو کاٹ کے کھا جانا۔ تم سب دھنتر بن جاؤ گے۔ پھر تم راجہ کو اچھا کیجیو۔ ایک بستی کے قریب پہونچ کر دھنترؔ نے انتقال کیا۔ چیلوں نے حسبِ وصیّت اُس کا گوشت کاٹ کر پکانا شروع کیا۔ وہی سانپ آدمی بن کے گاؤں میں گیا اور لوگوں سے کہا کہ تمھاری بستی کے پاس آدم خور آگئے ہیں اور ایک آدمی کو کاٹ کے پکا رہے ہیں۔ دوڑو اور جلد ان کی خبر لو۔ گاؤں والے لٹھ لے کے چڑھ آئے اور سب کو مار پیٹ کے وہاں سے نکال دیا۔ اور وہ گوشت دریا میں بہا دیا۔ دھنترؔ بید راجۂ اجل رسیدہ کو بچانے چلے تھے خود ہی طعمۂ اجل ہوے ؎

شد غلامے کہ آب جو آرد آب جو آمد و غلام ببرد
مرغکے اندر شکارے کرم بود گربہ آمد ناگہاں او را ربود

اب راجہ پریچھت کا حال سُنو کہ سات شبانہ روز سکھدیو جی نے کتھا سُنائی لیکن راجہ کی سمجھ میں کچھ نہ آئی ؎

فائدہ کیا کرے صحبت جو نہ ہو استعداد باغ میں جاکے کبھی زاغ خوش الحان نہ ہوا

آٹھویں دن سکھدیو جی نے پوچھا کہ راجہ صاحب کچھ سمجھے کہا کہ مہاراج میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا۔ اتنے میں سکھدیو جی قضائے حاجت کے لیے گئے اور وہاں سے بہت دیر کے بعد آئے۔ راجہ نے دیر کا سبب دریافت کیا تو کہا کہ میں ایک عجیب تماشا دیکھ رہا تھا گوہ میں ایک کیڑا تھا ہر چند میں نے اُس کو وہاں سے جدا کیا مگر وہ پھر پھرا کے جب جاتا تھا گوہ ہی میں جاتا تھا۔ اُس وقت راجہ نے کہا کہ مہاراج بس اب میں سمجھ گیا اور موت و حیات مجھ کو برابر ہوگئی۔ اس کے بعد جناب قبلہ نے ارشاد کیا کہ اسی لیے رسول خدا صلعم نے فرمایا ہے

کَلِّمُوا النَّاسَ عَلیٰ قَدْرِ عُقُوْلِہِمْ۔ ہر ایک شخص سے اُس کی سمجھ اور حوصلے کے موافق گفتگو کرنی چاہیے تاکہ وہ سمجھے اور مستفید ہو۔ چناں چہ راجہ پر کتھا کے مضامین کا تو کچھ اثر نہ ہوا اور سمجھے تو ایسی سڑیل مثال سے سمجھے۔ چوں کہ دنیا دار تھا عالی مضامین کی طرف طبیعت نے صعود نہ کیا۔ اسفل کی جانب گرے اور اس مثال سے تسلّی ہوئی ؎

کرگساں را مردہ، طوطی را شکر　　قسمتِ ہر کس بود نوعِ دگر

نقل ہے کہ ایک بادشاہی خاک روب کی قرابت گانوں میں تھی اُس کا داماد گاؤں سے آیا اور اپنی سسرال میں رہا۔ اُس کی بیوی نے کہا کہ جاؤ بادشاہی پاخانہ صاف کرو۔ وہاں جو گیا تو پاخانہ اقسامِ عطریات اور خوشبویوں سے معطّر ہو رہا تھا۔ اُس کا دماغ خوشبو کا متحمل نہ ہوا فوراً بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اُس کی بیوی نہایت ہوشیار تھی، وجہ غشی سمجھ گئی۔ اور کتّے کا گوہ لا کر جھٹ پٹ اُس کو سنگھایا۔ تھوڑی دیر میں ہوش آگیا۔ اب دیکھو کہ بھنگی عطر کی خوشبو سے تو بے ہوش ہوگیا اور کتّے کے گوہ سے ہوشیار۔ پس ہر ایک کی طبیعت لطافت و کثافت میں مختلف ہے۔ آخر الامر راجہ کو سانپ نے کاٹا اور وہ موافق سراپ کے مرگیا۔

ایک [۱۳۱] روز ارشاد ہوا کہ سکھدیو جی نے اپنے باپ بیدابیاس سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ مجھ کو گیان حاصل ہو جائے اور جیون مکت کا مرتبہ میسّر ہو۔ باپ نے ہدایت کی کہ تم راجہ جنک کے پاس جاؤ۔ چوں کہ طالبِ صادق تھا طے منازل کر کے راجہ کے دروازے پر پہونچا۔ اور دربانوں سے کہا کہ راجہ صاحب کو میرے آنے کی اطلاع کردو۔ چناں چہ اطلاع ہوئی کہ سکھدیو جی بیدابیاس کا پتر آیا ہے۔ راجہ نے کہا کہ اچھا کھڑا رہنے دو۔ سات روز کے بعد پھر اطلاع کی۔ تو کہا اچھا دوسرے دروازے پر لاؤ۔ وہاں بھی سات روز کھڑا رہا تیسری بار کہا کہ آنے دو۔ سکھدیو اندر گیا تو دیکھا کہ تمام ٹھاٹ دنیا داری کا موجود ہے۔ دل میں خیال کیا کہ یہ تو خود جگت بیوہاری ہے مجھ کو کیا تعلیم کرے گا ؎

عالمے کہ کامرانی و تن پروری کند　　او خویشتن گم ست کرا رہبری کند

راجہ کو یہ وسوسہ منکشف ہوگیا۔ اُس کو ٹھہرایا اور دوسرے دن شہر کے تمام اطراف اور گلی کوچوں میں ناچ رنگ کرا دیا۔ پھر سکھدیو جی کو طلب کیا۔ ایک کٹورا دودھ سے لبریز اُس کے ہاتھ پر رکھا۔

اور کہا کہ جاؤ شہر جنک پوری کی پرکرما کرو، مگر خبردار دودھ نہ گرنے پائے۔ اور دو سپاہی شمشیر برہنہ اس کے ہمراہ کیے کہ اگر ایک قطرہ بھی اس میں سے گرے تو سکھ دیو کے پرزے اڑادو۔ اسی طور سے جیسا حکم ہوا تھا وہ دونوں مؤکل سکھ دیو کو شہر کے گرد پھرا کر لے آئے۔ راجہ نے پوچھا کہ دودھ تو نہیں گرا۔ سپاہیوں نے عرض کیا کہ حضور ایسا ہوتا تو یہ آپ کے پاس سلامت کیسے پہونچتے۔ پھر راجہ سکھدیو جی کی جانب متوجہ ہوئے اور دریافت کیا کہ آج تم نے تماشا تو خوب دیکھا ہوگا۔ جا بجا ناچ کی دھوم دھام تھی اُس نے جواب دیا کہ مہاراج مجھ کو تو اس کٹورے کی حفاظت بلائے جان ہورہی تھی۔ خوف تھا کہ گرا اور مارا پڑا۔ بھلا اس حالت میں تماشا کیا خاک دیکھتا۔ مجھ کو تو بجز اس کے اور کوئی شئے نظر نہیں آئی۔ اُس وقت راجہ نے فرمایا کہ جس طرح تم پر یہ ایک ساعت گذری ہے۔ ہمارا ہر وقت یہی حال رہتا ہے۔ اس دولت و حشمت کی طمطراق اور مال و جاہ کی کرّوفر ہماری نگاہوں میں سب ہیچ ہے۔ ہماری توجہ کسی کی طرف نہیں ؎

چیست دنیا از خدا غافل بُدن ۔۔۔ نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

تم نے ظاہری سلطنت و حکومت اور دولت و ثروت دیکھ کر ہماری حالت کو قیاس کیا ؎

حالِ پاکاں را قیاس از خود مگیر ۔۔۔ گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

اے سکھ دیو! اسی واقعہ سے جو تم پر گذرا سمجھ لو کہ سپاہی ملک الموت ہے۔ تن کٹورا اور من دودھ اور راگ و رنگ جو راہ میں ہو رہا تھا وہ دنیائے فانی کا سیر و تماشا تھا۔ اسی طرح ہم بھی دنیا کے دھندے میں مشغول نہیں ہوتے کہ ایسا نہ ہو دودھ گر جائے یعنی دل یادِ الٰہی سے چوکے اور مارا جائے ؎

جب کوئی ایسے من کو لگادے ۔۔۔ من کے لگائیوں سے ہر یاد ے
جیسے کاؤں بھرت کو پ چل کر چھوڑ ٹٹکادے ۔۔۔ اپنا پریم سکھی سے باکھی سرتی گگر میں لادے

؎ من دل بہ خدا کاؤں عورت کوپ کنواں۔ جل پانی کر ہاتھ پریم محبت سکھی سہیلی باکھی بیان کرے سُرتی خیال گگر گھڑا یعنی جیسی عورت گھڑا پانی کا بھرا ہوا سر پر رکھ کر ہاتھ چھوڑے ہوئے اپنی سہیلی سے شوق کی باتیں کرتی جاتی ہے اور خیال اسکا گھڑے میں لگا ہوا ہوتا ہے اور نٹنی کا خیال بانس میں ہوتا ہے اسی طرح خدا کے ساتھ دل لگائے یعنے دست باکار دل بایار ۱۲ منہ۔

جیسے نٹنی چڑھت بانس پر نٹوا ڈھول بجاوے اپنا بھار نہ تول وہی کا سُرتی بانس میں لادے

اس کے بعد راجہ جنک نے سکھ دیوجی کو اُس کے حوصلہ کے موافق تعلیم کرکے رخصت کیا۔

ایک[۱۲۵] روز ارشاد ہوا کہ جب راجہ جنک کے دل میں دردِ طلب پیدا ہوا تو تمام فُقرا کو جمع کیا اور کہا کہ کوئی ایسا ہے جو مجھ کو تعلیم کرے لیکن شرط یہ ہے کہ اسی وقت گیان ہو جائے۔ سب نے انکار کیا اور کہا کہ یہ قدرت ہم میں نہیں، البتہ جو طریقہ سلوک کا ہے وہ ہم تعلیم کرسکتے ہیں۔ یہ حال اشٹا[۱] بکر منی نے سُنا اور راجہ سے کہا کہ میں تم کو تعلیم کروں گا بہ شرطے کہ جو چیزیں تم سے طلب کروں مجھ کو دے دو۔ راجہ نے یہ شرط منظور کی۔ اوّل اشٹا بکر منی نے کہا کہ جتنا تمھارا راج پاٹ ہے سب مجھ کو دے دو۔ راجہ نے کہا میں نے دیا۔ پھر کہا کہ جس قدر تمھارا مال واسباب اور گھر بار ہے سب میرے حوالہ دو۔ راجہ بولا کہ یہ بھی لو۔ پھر اشٹا بکر نے کہا کہ اچھا اپنی جورو و بچے بھی میری نذر کرو۔ راجہ نے کہا کہ بہت خوب حاضر ہیں۔ پھر اشٹا بکر نے فرمایا کہ اپنا جسم اور اپنی جان بھی ہم کو دے ڈالو۔ راجہ نے کہا کہ یہ بھی لیجیے۔ پھر اشٹا بکر نے تین بار یہی اقرار راجہ سے کرایا کہ یہ سب چیزیں میں آپ کو دے چکا۔ اُس وقت اشٹا بکر نے کہا کہ اے راجہ جنک جب تمھاری کوئی چیز نہ رہی یہاں تک کہ جسم و جان بھی، تو سوچو کہ اب تم کون ہو اور تمھارا کیا ہے؟ راجہ نے غور کیا اور سمجھا کہ درحقیقت میرا تو نہ پہلے کچھ تھا نہ اب ہے صرف ایک جھوٹا دعویٰ تھا۔ سر اُٹھایا اور بولا کہ (جنک جنک اکچنہ) یعنی نہ جنک ہے نہ جنک کا کچھ ہے اگر ہے تو جنک ہی سب کچھ ہے ؎

مرا گنج ست اندر دل گدائی خوش نہ می آید
شہنشاہِ جہاں را بادشاہی خوش نہ می آید

خودی را از میاں برداشتم خود گشتہ ام لیکن
خدا خود را چہ گویم خود نمائی خوش نہ می آید

گنجہا داری چرائی بے نوا
بادشاہی از چہ می مانی گدا

عینِ آبے آب می جوئی عجب
نقدِ خود را نسیہ می گوئی عجب

---

[۱] ہنود فقیر کا نام ہے اور اس کے جسم میں آٹھ خم تھے اس واسطے اس کا نام اشٹ بکر ہوا۔ اشٹ کہتے ہیں آٹھ کو۔ ۱۲ منہ۔

بھولتوں بھولتوں بھول ایسی پڑی اپنا روپ نہیں نیک جانا
گیان بچار بیک بن بھولیاں سنگھ کا روپ لے بھیڑ مانا
سنگھ سے سنگھ جب سنگھ ستگر ملے ٹیر کی اپنی نکٹے آنا
دیکھ تو بوجھ تو روپ ہے اپنا کون سی آنکی نینھ ٹھانا
جیو ہے برم ہے برم سے جیو ہے نیر اور چھیر لے ملا چھانا
کہے کبیر گر گیان بن بھولیاں وار کو چین اور پار جانا

ایک[۱۳۶] روز ارشاد ہوا کہ ہم نے سنبھل میں یہ دیکھا کہ ایک ہندو عورت آٹے کا ٹھاکر بنا کر پوجا کرتی تھی۔ کتا آیا اور ٹھاکر جی کو اٹھا کر چنپت ہوا عورت ہائے ہائے کرتی رہ گئی۔ ناچار ہوئی تو کیا کہتی ہے کہ اے مہاراج ٹھاکر جی! تم تو بڑے ہی رحم دل اور دریا دل ہو جو کتے کو بھی نہ دھتکارا۔ غرض یہ ہے کہ ہر شخص اپنے خیال میں خوش ہے
كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ٥

ایک[۱۳۷] روز ارشاد ہوا کہ ہم مراد آباد سے سنبھل کو آتے تھے راہ میں دو کہار ملے۔ اُن کے پاس کچھ بوجھ نہ تھا، اس لیے چلنا دوبھر ہوا۔ ہم سے کہا کہ میاں صاحب! اپنا اسباب اس بہنگی میں رکھ دو۔ ہم نے سوچا کہ اگر یہ لوگ ہمارا اسباب لے کر اُڑ گئے تو کہاں ان کے پیچھے دوڑتے پھریں گے۔ ان کا اعتبار کیا۔ ہم نے کہا لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ (میں اپنا بوجھ دوسرے پر نہیں رکھتا) ناچار اُنھوں نے چند اینٹ پتھر بہنگی میں رکھے

---

[۱] یہ اشعار قصہ طلب ہیں کسی چرواہے نے ایک بچہ شیر کا بھیڑوں میں پالا جب وہ بڑا ہو گیا تو بھیڑوں کے ہمراہ رہا کرے۔ اس نے سمجھ لیا کہ میں بھی بھیڑ ہوں ایک روز جنگل میں سے شیر نکلا اور دیکھا کہ بھیڑوں میں شیر پھرتا ہے اُس نے معلوم کیا کہ اس نے اپنے آپ کو بھیڑ مان رکھا ہے جنگلی شیر جھٹ پٹ ایک بھیڑ کو پھاڑ کر کھانے لگا اور کہا کہ ذرا تو بھی تو اپنے آپ کو دیکھ کہ تو کون ہے اب شاعر کہتا ہے کہ بھول نے انسان پر ایسا غلبہ کیا ہے کہ اپنے آپ کو بھول گیا اور عقل پر ایسا پردہ پڑا ہے کہ شیر ہو کر بھیڑ بن گیا شیر کو جب شیر ہی ست گرو ملے تو ایک للکار میں باہر آجاوے ذرا غور سے اپنی شکل کو دیکھ کہ تو کون ہے اور کہاں سے آیا اور کہاں آ کر محبت لگائی۔ روح اور ذات میں کچھ فرق نہیں اور یہ بات بیری وہ سمجھے گا جو پانی اور دودھ کو جدا جدا کرے گا کبیر کہتا ہے کہ بغیر عنایت گرو کے اس دریا سے پار اُترنا مشکل ہے ۱۲ منہ۔

اور اسی تیزی سے چلنے لگے جیسی اُن کی عادت تھی۔ یہی کیفیت سالکانِ طریقت کی ہے کہ جب تک زہد و ریاضت اور مشقت و عبادت کا بارِ گراں نصیب نہ ہو ۔ عمر بسر کرنی دشوار معلوم ہوتی ہے تمام جہان کسی نہ کسی قید میں مقید ہے۔ غرض وہی کہار دوپہر کے وقت رستہ میں کنواں اور درخت کا سایہ دیکھ کر ٹھہر گئے اور روٹیاں پکانی شروع کیں۔ ہمارے پاس روٹیاں موجود تھیں کھا پی کے ایک درخت کے سایہ میں لیٹ گئے۔ جب کہار روٹی پکا چکے تو ایک کہار جو بھگت تھا سالگ رام کی پوجا میں مشغول ہوا۔ اور دوسرا اقتضائے حاجت کے لیے گیا۔ کتا موقع پاکر سب روٹیاں لے گیا اور وہ بھگت پوجا کے سبب سے بول نہ سکا۔ جب فارغ ہوا اور دوسرا ساتھی پاخانہ سے واپس آیا تو دونوں میں جنگ شروع ہوئی۔ ایک تو کہتا تھا کہ میں رفع حاجت کے لیے گیا تھا تو نے کُتے کو کیوں نہ مارا۔ دوسرا کہتا تھا کہ مارتا کیسے میں تو سالگ رام کی (...) کر رہا تھا۔ ہم نے کہا کہ میاں تو نے ہم سے روٹیوں کی نگہبانی کے لیے کہہ دیا ہوتا اور رباطینان سالک رام کی (...) خدمت کی ہوتی ۔ یہ سُن کر وہ ہنس پڑا ؎

بتے می گفت روزے با برہمن خدائے من توئی اے بندۂ من

مرا بر صورتِ خود آفریدی ولیکن خویشتن را خود نہ دیدی

ایک[۱۳۱] روز ارشاد ہوا کہ ایک مجذوب تھے ننگے مادر زاد۔ دو چار دُنیا دار معتقد ہو گئے، خدمت کرنے لگے۔ چند روز کے بعد اُن سے کہا کہ میاں صاحب، برہنہ رہنا خلافِ شریعت ہے لنگوٹی باندھ لو۔ خیر انھوں نے حسب درخواست لنگوٹی باندھ لی۔ اتفاقاً ایک دن لنگوٹی سن گئی، چوہے جو آئے تو لنگوٹی کتر ڈالی اور جسم کو زخمی کیا ۔ صبح کو معتقدین آئے۔ میاں صاحب کا حال دیکھا کہا کہ حضرت بہتر یہ ہے کہ بلّی پالی جائے تاکہ موذی چوہوں کو کھا جائے۔ غرض ایک بلّی لائے۔ دو چار روز اُس کے واسطے دودھ لاتے رہے۔ ایک دن عرض کیا کہ میاں صاحب! اس روز کے جھگڑے سے تو یہی بہتر ہے کہ ایک بکری لے آئیں اُس کے دودھ سے بلّی پلتی رہے گی۔ غرض بکری بھی لا باندھی۔ چند روز تو بکری کے واسطے چارہ لاتے رہے پھر اپنے اپنے دھندے میں لگے۔ ہر روز کی

خدمت کون کرتا کیوں کہ دُنیاداروں کا اعتقاد ایسا ہی ہوتا ہے ابھی تو اتنا بڑا اور ذرا دیر میں بالکل غائب ۔قہرِ درویش بہ جانِ درویش ۔اب میاں صاحب خود جاتے اور جنگل سے بکری کا چارہ لاتے ۔ایک روز درخت پر چڑھ گئے تاکہ پتّے توڑیں ۔پانوں جو پھسلا دھم سے نیچے آگرے ۔ایسی چوٹ لگی کہ بازو ٹوٹ گیا ۔مکان پر پہونچ کے مرہم پٹّی کی ۔مریدانِ سُست اعتقاد بھی جمع ہوکر عیادت کے واسطے آئے ۔پوچھا کہ حضرت یہ کیا ہوا۔اس کے جواب میں مجذوب نے کھول لنگوٹی اُن کے منھ پر ماری کہ لو سارا اسی کا فساد ہے خبردار! جو آیندہ تم میرے پاس آئے ۔

ایک[۱۲۱] روز ارشاد ہوا کہ ایک گرو تھا اور ایک چیلہ شہرِ بیداد نگری میں پہونچے ۔ وہاں تمام اشیا خوردنی کا بھاؤ ٹکے سیر تھا ۔گرو نے چیلہ سے کہا کہ میاں یہاں سے بھاگو کیوں کہ یہاں حفظِ مراتب کا کچھ لحاظ نہیں ہے ۔چیلا بولا حضور یہاں تو سب چیزیں ارزاں ہیں ،بڑے چین سے زندگی بسر ہوگی ۔گرو نے کہا کہ خیر تمھاری خوشی ،ہمارا کام تو رہنمائی ہے وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ ۔ چیلے کو جو ٹکے سیر حلوا پوری ملا چند روز میں کھاپی کے خوب موٹا تازہ ہوگیا۔ اتفاقًا اس شہر میں ایک مجرم بہ جرم قتل ماخوذ ہوا ۔راجہ نے حکم دیا کہ اس کو سولی دے دو ۔ وزیر بولا کہ مہاراج یہ تو دُبلا بہت ہے ۔راجہ نے بھی ملاحظہ کیا اور کہا کہ فی الحقیقت یہ بہت ضعیف و ناتواں ہے ۔اچھا کسی اور موٹے تازے آدمی کو پکڑ لاؤ اور اس کے عوض میں سولی پر چڑھادو ۔چوں کہ چیلا ان دنوں خوب ہٹّا کٹّا اور چکنا چپڑا بنا ہوا تھا راجہ کے سپاہی گرفتار کر کے لے گئے ۔راجہ نے بھی پسند کیا اور کہا کہ ہاں! یہ شخص پھانسی کے قابل ہے ۔چیلے نے دُہائی دی کہ صاحب! میرا قصور کیا ہے ؟ راجہ نے کہا کہ قصور تو کچھ بھی نہیں لیکن تو خوب موٹا ہے ۔اُس وقت گرو پہونچے اور چیلے سے آہستہ کہا کہ اور کھاؤ ٹکے سیر کا حلوا پوری ۔ابے تجھ سے کہا نہ تھا کہ یہ شہر بیداد نگری ہے ۔یہاں سے بھاگ ۔تو نے نہ مانا اب اپنے کیے کو بھگت ؎

آنچہ تو در آئینہ بینی عیاں　　پیر اندر خشت بیند بیش از آں

چیلہ نے عاجزی کی کہ بس اب میری توبہ ہے ۔آیندہ کبھی خلافِ مرضیٔ مبارک نہ کروں گا ؎

مانہ بودیم و تقاضا ما نہ بود لطفِ تو بے گفتۂ ما می شنود

گرو نے فرمایا کہ خیر اب میں یہ کہوں گا کہ پہلے مجھ کو پھانسی دے دو۔ تو کہنا کہ نہیں پہلے مجھ کو دے دو۔ دونوں نے یہ مشورہ کرکے راجہ کے روبرو اپنا اشتیاق پھانسی کے لئے ظاہر کیا۔ راجہ نے متعجب ہوکر پوچھا کہ لوگ تو پھانسی کے نام سے ڈرتے ہیں۔ یہ کیا بات ہے کہ تم اس کی تمنا کرتے ہو؟ گروجی نے کہا کہ خوش قسمتی سے آج وہ ساعت آئی ہے کہ اس میں جو پھانسی پائے گا سیدھا بیکنٹھ کو چلا جائے گا۔ راجہ نے یہ سن کر کہا کہ یہ بات ہے تو پہلے ہم کو ہی پھانسی دو۔ چناں چہ راجہ کو پھانسی لگی اور یہ دونوں بھاگ نکلے۔ غرض کہ حفظِ مراتب کا چھوڑنا اور بے قیدی کے ترلقموں سے خواہشوں کو تروتازہ کرنا موجبِ ہلاکت ہے۔ پس ہمیشہ مرشدِ کامل کی ہدایت و رہنمائی کے موافق کاربند ہونا چاہیے ؎

گفت پیغمبر علی را کاے علیؓ شیرِ حقّی پہلوا نے پُر دلی
لیک بر شیرے مکن ہم اعتمید اندر آ در سایۂ نخلِ امید
ہر کسے گر طاعتے پیش آورند بہرِ قربِ حضرت بیچون و چند
تو تقرب جو بعقل و سرِّ خویش نے چو ایشاں بر کمالِ وِرِّ خویش
اندر آ در سایۂ آں عاقلے کس نتاند برد از رہ ناقلے
پس تقرب جو بدا و سوے الٰہ سر مپیچ از طاعتِ او ہیچ گاہ
زاں کہ او ہر خار را گلشن کند دیدۂ ہر کور را روشن کند
ظلِّ او اندر زمیں چوں کوہِ قاف روحِ او سیمرغ بس عالی طواف
دستگیر و بندۂ خاصِ الٰہ طالباں را می برد از پیش گاہ
گر بگویم تا قیامت نعتِ او ہیچ آں را غایت و مقطع مجو
یا علی از جملۂ طاعاتِ راہ بر گزیں تو سایۂ خاصِ الٰہ
ہر کسے در طاعتے بگریختند خویشتن را مخلصے انگیختند
تو برو در سایۂ عاقل گریز تا رہی زاں دشمنِ پنہاں ستیز
چوں گرفتی پیر ہن تسلیم شو ہم چو موسیٰ زیرِ حکمِ خضر رو

صبر کن بر کارِ خضر اے بے نفاق | تانگوید خضر رو ہٰذا فراق
گرچہ کشتی بشکند تو دم مزن | گرچہ طفلی را کشد تو مو مکن
دست او را حق چو دست خویش خواند | تایَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ[ع] براند
دست حق میراندش زندش کند | زندہ چہ بود جان پایندش کند

ایک روز[سلہ] ارشاد ہوا کہ

علمی[۲ہ] ہو کے دھرے دھیان | گرہے ہو کے کتھے گیان
جوگی ہو کے کوٹے بھگ | کہیں کبیر یہ تینوں ٹھگ

ایک روز[۱۴۱] ارشاد ہوا کہ جب تیمور صاحب قراں نے خواجہ حافظ علیہ الرحمہ کا یہ شعر سُنا

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ مارا | بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

تو حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں نے تو سمرقند و بخارا کو سخت جنگ اور خوں ریزی کے بعد حاصل کیا ہے آپ نے ایک خال پر نثار کر دیا۔ خواجہ حافظ نے فرمایا کہ اسی دریا دلی اور بخشش نے تو ہمیں ایسا مفلس بنادیا کہ تن پر کپڑا نہیں رہا۔ یہ کہہ کر خواجہ صاحب نے امیر کی بڑی تعظیم و تکریم کی۔ وہ عذر معذرت کرنے لگا کہ میں اس قابل نہیں۔ آپ بڑے بزرگ و تارک ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ نہیں صاحب ہم سے بڑھ کر آپ تارک ہیں۔ امیر بولا بھلا حضرت میں نے کیا ترک کیا ہے۔ آپ تو دنیا کے تمام تعلقات و مکروہات کو ترک کر کے آزاد ہو بیٹھے ہیں۔ خواجہ صاحب نے کہا کہ یہی تو فرق ہے کہ ہم ایک دنیائے دوں کو جس کی کچھ اصل حقیقت نہیں نعمائے عقبیٰ کے عوض چھوڑ بیٹھے۔ لیکن تم ہم سے بڑھ کر تارک ہو کہ اس دنیا کے واسطے عقبیٰ جیسی اعلیٰ چیز کو ترک کیا۔ پس تم قابلِ تعظیم ہو۔ اس بات نے امیر کے دل پر ایسا اثر کیا کہ وہ سب جاہ و حشم سے

سلہ ایک روز ایک دنیادار حاضر خدمت ہوے اور جناب قبلہ سے گفتگوئے معرفت شروع کی اُس وقت آپ نے یہ اشعار ارشاد فرمائے تھے ۱۲

۲ہ علمی نشہ باز گرہے دنیادار گیان معرفت جوگی آزاد قلندر بھگ ستر عورت یعنی جو نشہ باز ہو کر مراقبہ کرے اور دنیا دار ہو کر معرفت میں گفتگو کرے اور آزاد قلندر ہو کے عورت سے ہم صحبت ہو۔ کبیر کہتا ہے کہ تینوں ٹھگ ہیں ۱۲ منہ۔

عہ یعنی اُن کے ہاتھ کے اوپر اللہ تعالےٰ کا ہاتھ ہے ۱۲ منہ۔

الگ ہو ایک پہاڑ کی کھو میں جا بیٹھا۔ تیسرے روز جناب علی مرتضیٰ کرّم اللہ وجہہ کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں تیمور اُٹھ اور تلوار باندھ۔ مُلکوں کو فتح کر اللہ تعالیٰ نے تجھ کو اسی کام پر مقرر کیا ہے۔ اُس دیوانہ کی بات کا کچھ خیال مت کر ؎

ہر کسے را بہرِ کارے ساختند
میلِ آں اندر دلش انداختند

چونکہ مشیتِ ایزدی میں تیمور کے لیے لشکر کشی اور ملک گیری تھی نہ کہ گوشہ نشینی اور فقیری اس واسطے اُس کو ایسی ہی ہدایت کی گئی اور جس کام کے واسطے پیدا کیا گیا تھا اُسی کی طرف راغب کیا گیا۔

۱۴۲ ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک شخص بٹالہ میں تھے۔ پہلے تو اُن کا نام صبغۃ اللہ تھا پھر اُنھوں نے پیشانی پر قشقہ لگایا اور گلے میں زُنّار ڈالا پنڈتوں کی سی وضع بنائی اور رنگیں رام نام رکھا۔ ایک دن ایک شخص شیخ کریم الدین دہریہ بڑھانوی کے مُریدوں میں سے اُن کی ملاقات کو آیا اور پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے بولے کہ صبغۃ کے معنی ہیں رنگ اور اللہ کے بجائے ہم نے رام بدل دیا ہے یعنی رنگیں رام ہمارا نام ہے۔ اُس نے سُن کر یہ شعر پڑھا ؎

کس لیے قشقہ لگایا مہ جبیں پر نازنیں
کفر اور اسلام کیا ایک فرق ہے فہمید کا

پھر اس نے رنگیں رام کے منھ پر تھوک دیا اور کہا کہ تو نے کفر و اسلام میں کیا فرق دیکھا جو ایک قید سے نکل کر دوسری قید میں جا پھنسا۔ ع

آخر چہ بدی شد ز خدا و ز رسول

اگر نکلنا تھا تو دونوں سے نکلا ہوتا۔ ہم تو سمجھے تھے کہ تو موحّد ہے تو تو ابھی کفر و اسلام ہی کی قید میں مبتلا ہے۔ یہ کہہ کر چل دیے اور اُس کے پاس نہ ٹھہرے۔

۱۴۳ ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک وہمی آدمی نے پہچان کے لیے اپنے گلے میں سرخ دھجی ڈالی تاکہ میں لوگوں میں گم نہ ہو جاؤں۔ ایک شخص کو اُس کا یہ خبط معلوم ہو گیا اُس نے بہ وقتِ خواب وہ دھجی اُس کے گلے میں سے نکال کر اپنے گلے میں ڈال لی اور اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔ جب وہ نیند سے چونکا اور آنکھ کھلی تو دیکھا کہ علامتِ شناخت دوسرے کے گلے میں ہے۔ اُس سے کہا کہ میاں تو میں ہے، پھر میں کون ہوں۔ یا میں تو ہوں اور تو میں ہے یا تو تو ہے اور میں میں ہوں بتا میں کون ہوں؟ سو یہی حال عارف کا ہے کہ جب منزلِ عرفاں میں پہونچتا ہے تو متحیر ہو کے

کہتا ہے کہ میں کون ہوں۔

ایک[۱۴۴] روز ارشاد ہوا کہ شہر لکھنؤ میں ایک سنّی شیعوں کی محفل میں پہونچا اور کہا کہ رات میں نے عجیب و غریب خواب دیکھا ہے کہ زباں کو یارائے بیاں نہیں۔ تمام اہلِ محفل مشتاق ہوئے کہ قبلہ کچھ تو ارشاد کیجیے۔ اُس نے کہا کہ رات میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سواری نہایت شان و تجمّل اور دھوم دھام سے چلی آتی ہے۔ ایک زرق برق لشکر ہم راہ ہے۔ ہاتھی گھوڑے اونٹ ہر طرح کے ساز و سامان سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔ لشکر کے جھنڈوں پر زردوزی پھریرے اُڑتے ہیں۔ میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام سید الشہدا شہیدِ کربلا کی سواری ہے۔ اس کے بعد ایک اور سواری نمودار ہوئی ساز و سامان تو سب کچھ تھا مگر پہلی سواری کی سی کرّ و فر اور زیب و آرائش نہ تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ سواری حضرت امام حسنؓ کی ہے۔ اُس کے بعد ایک تیسری سواری نمودار ہوئی صرف سوار و پیادہ ہم راہ تھے۔ اور کوئی بات شان و شوکت کی نہ تھی۔ سُنا کہ یہ حضرت علی مرتضیٰ شیرِ خدا تشریف لیے جاتے ہیں اُس کے پیچھے ایک اور گرد اُٹھی اُس میں سے ایک اور بزرگ مع چند سواروں کے ظاہر ہوئے۔ جن کے گھوڑے بے سر و سامان اور دُبلے پتلے تھے سُنا کہ یہ حضرت محمدؐ مصطفٰے رسولِ خدا ہیں۔ میں یہ کیفیت دیکھ ہی رہا تھا کہ دور سے ایک ٹٹو نظر آیا اُس پر ایک پیرِ کہن سال سَر جھکائے بڑی افسردگی کی حالت میں بیٹھے ہیں نہ تو ٹٹو کا چار جامہ دُرست، نہ پوزی دُمچی سلامت۔ ایک رکاب اونچی ایک نیچی، قدم رکھتا کہیں ہے پڑتا کہیں ہے۔ بڑے میاں کے کپڑے بھی میلے کچیلے پاؤں میں پھٹی جوتیاں نہ کوئی خدمتگار ہے نہ سائیس۔ میں نے بعدِ آداب اُن سے پوچھا کہ حضرت آپ کون ہیں۔ اُنھوں نے فرمایا کہ اے میرے بندے! خالقِ موجودات، موجدِ کائنات میں ہی تو ہوں۔ تم لوگ نہ میری خبر لیتے ہو، نہ میرے نام پر کوڑی دیتے ہو۔ رسُول کی فاتحہ بھی سال میں ایک بار کہیں ہو جاتی ہے۔ علیؓ کے نام پر بھی محبانِ علی کسی قدر خیرات کرتے ہیں۔ حسنؓ کی محفلیں بھی کم و بیش ہوتی ہیں۔ حسینؓ کے تو بڑے بڑے امام باڑے اور لنگر خانے جاری ہیں۔ اِن سب کے پاس ساز و سامان بہت کچھ ہیں۔ ہمارے پاس کیا خاک ہو۔ ہم کو تو کوئی بھی نہیں پوچھتا۔ اتنے میں آنکھ کھُل گئی۔ یہ بات شیعہ لوگ سُن کر بہت خفا ہوئے اور کہا کہ میاں تم کیسے بہتان لگاتے ہو اور جھوٹے خواب

بیان کرتے ہو۔ اُس نے کہا کہ صاحبو! تمھارے نزدیک تو امام حسین کے مقابلہ میں خدا کچھ چیز ہی نہیں۔ آپ صاحبوں کو کبھی خدا کا نام لیتے نہ سُنا! سو یہی حال ہے تمام جہان کا کہ خدا کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ ہر ایک نے اپنے اپنے مقاصد و مطالب کو معبود بنا رکھا ہے۔

ایک ۱۴۵ روز ارشاد ہوا کہ خلیفہ ہارون رشید نے ایک بار جشنِ شاہانہ کیا۔ ہر قسم کی اشیاء بیش بہا جمع کیں اور حکم دیا کہ جو شخص جس چیز کو ہاتھ لگا دے وہ اُسی کو ملے گی۔ اس حکم کے سنتے ہی ہر شخص اپنی پسند کے موافق چیزوں کی لوٹ پر جُھک پڑا۔ ایک کنیز تھی اُس نے پھر پوچھا کہ حضور جو جس کو ہاتھ لگائے وہ اس کے لیے ہے کہا کہ ہاں۔ اُس نے فوراً خلیفۂ وقت پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا کہ اصل کو چھوڑ کر فرع کی طرف کیوں جاؤں۔ خلیفہ نے کہا کہ تو نے ہم کو اختیار کیا تو اب تمام سلطنت تیری ہے۔ واہ ری کنیز ہزاروں مردوں پر فوق لے گئی۔ اس ہمت اور سمجھ پر قربان جائیے ؎

نہ ہر زن زن ست و نہ ہر مرد مرد　　خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

حقیقت میں یہ بڑے بلند ہمت وہ جواں مرد کا کام ہے کہ فرع کو چھوڑ کر اصل کی طرف دوڑے ؎

من غلامِ آں مسِ ہمت پرست　　کو بغیر کیمیا نارد شکست

سب سے بیگانہ ہے اے یار شناسا تیرا　　حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا

ایک ۱۴۶ روز ارشاد ہوا کہ لکھنؤ میں ایک ہندو رسالدار تھا فضول خرچی کی وجہ سے قرض دار ہو گیا نالش کی نوبت پہونچی۔ عدالت سے حکم گرفتاری جاری ہوا۔ جب یہ خبر ملی تو بھاگ کر نوّاب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ حضور میں مومن ہوتا ہوں نوّاب بہت خوش ہوئے اور اُس کا تمام قرض ادا کر دیا۔ خیر مومن تو ہو گیا مگر دیوالی دسہرہ شبِ برات محرم گیارھویں سب کچھ کرتا۔ سنّیوں کے وعظ میں شیعوں کی مجالس میں ہندوؤں کی کتھا میں بیراگیوں کی سبھا میں سب جگہ شریک ہوتا، یہاں تک کہ بھنگیوں کے لال گرو کی نذر و نیاز بھی دیتا۔ کسی غمّاز نے نوّاب صاحب کو خبر دی کہ حضور یہ رسالدار تو لامذہب ہو گیا ہے۔ سارے کرم کرتا ہے۔ نوّاب صاحب نے بُلا کر کہا کہ تم مومن ہو کر یہ پاکھنڈ کرتے ہو ؎

دو رنگی چھوڑ کر یک رنگ ہو جا سراسر موم ہو یا سنگ ہو جا

اُس نے جواب دیا کہ حضور آپ ہی کے مذہب کا یہ مسئلہ ہے کہ انجام کار خاتمہ پر موقوف ہے بالفرض اگر آپ کے مذہب کے موافق میرا انجام بہ خیر نہ ہوا تو لامحالہ کسی دوسرے فریق میں شامل کیا جاؤں گا۔ اس واسطے سب کی نذر بھیٹ ادا کرتا ہوں کہ جس طرف جاؤں گا وہیں میری خاطر ہوگی۔ ورنہ سب مذہبوں کے رہنما میرے کیا رشتہ دار ہیں جن کے واسطے بلا وجہ اتنا صرف گوارا کرتا ہوں۔ غرض یہ ہے کہ جس آدمی کو یک سوئی حاصل نہیں ہوتی وہ اسی طرح ہر طرف سہارا ڈھونڈھتا ہے اور مارا مارا پھرتا ہے کہ کوئی تو میری مدد کرے گا حالانکہ سوائے خدا کے کوئی کسی کے کام نہیں آتا ؎

گہ جانبِ کعبہ می دوانی مارا گہ بر درِ دیر می نشانی مارا
ایں ہر دو صفت لازمہ ہستی ماست آں بہ کہ زخویش وارہانی مارا

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہم نے مولوی مظفر حسین صاحب سے پوچھا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک غریب کے بچّہ کو قتل کیا اور انگریزوں نے غدر میں اکثر آدمی پھانسی دیئے ان دونوں سے مواخذہ ہوگا یا نہیں۔ مولوی صاحب نے جواب دیا کہ حضرت خضرؑ سے مواخذہ نہ ہوگا کیوں کہ اُنھوں نے بہ حکمِ خدا مارا تھا۔ لیکن انگریزوں سے باز پرس ہوگی۔ ہم نے کہا یہ تو فرمائیے کہ انگریزوں نے کس کے حکم سے مارا تھا۔ اس کے جواب میں مولوی صاحب نے کہا کہ اس باب میں ہم زیادہ گفتگو نہیں کر سکتے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک مولوی صاحب کتاب لوائح میں جو مولانا جامی علیہ الرحمہ کی تصنیف ہے اپنے طالبعلم کو یہ مقام پڑھا رہے تھے "انسان جوہرِ لطیف است بہ ہر چہ روئے آرد رنگ آں گیرد و باہر کہ نشیند خوئے آں پزیرد" ؎

گر در دلِ تو گُل گذرد گُل باشی ور بلبلِ بے قرار بلبل باشی
تو جزوی و حق کُل است گر روزے چند اندیشۂ کُل پیشہ کُنی کُل باشی

ہم نے عرض کیا کہ مولوی صاحب یہ جزو و کُل اور گُل و بلبل بننا تو اپنا ہی تصوّر ہے، جو چاہا سو بن گئے۔ پس کیوں اس بکھیڑے میں پڑے۔ اصل میں جو کچھ ہے وہی کیوں نہ بنا رہے۔

یہ سُن کر مولوی صاحب چُپ ہو رہے - کچھ جواب نہ دیا۔

ایک روز ارشاد ہوا ۱۴۹ کہ شاہ ابو سعید صاحب دہلوی جب کسی کی زبان سے کلماتِ توحید سنتے تو خاموش ہو رہتے اور کچھ نہ کہتے مگر میاں غلام علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے روبرو اگر کوئی ذکرِ توحید کرتا تو اُس کو اپنی خانقاہ سے نکلوا دیا کرتے اور فرماتے کہ اس مقام میں آدمی گمراہ ہو جاتا ہے۔

ایک روز ارشاد ہوا ۱۵۰ کہ حضرت دانیال علیہ السلام بہ سبب عدمِ اتباعِ امت خفا ہو کر پہاڑ پر جا بیٹھے مُلک میں قحط سالی ہوئی لوگوں نے اُن کو تلاش کیا مگر کہیں پتہ نہ لگا پیغمبرِ خدا کو دو روٹی صبح اور دو شام فرشتے پہونچا جاتے اور مخلوق ہلاک ہوئی جاتی تھی - لوگوں نے نہایت عجز و انکسار سے دُعا مانگی، کچھ اثر نہ ہوا - کیوں کہ بارش کا ہونا پیغمبرِ خدا کی دعا پر منحصر تھا۔ تب اللہ تعالیٰ نے ان کی روٹی موقوف کر دی - دو چار روز تو صبر و ثبات سے بیٹھے رہے - آخر پہاڑ سے اُتر کر کسی بستی میں گئے - اور ایک عورت سے روٹی مانگی اُس نے جواب دیا کہ ہمارے گھر میں جتنے آدمی ہیں ہر ایک کے حصہ کی ایک ایک ہلکی چپاتی رکھی ہے اگر تم کو دی جائے تو ہم مرجائیں گے - معاف فرمائیے - اُنھوں نے بہت اصرار کیا ناچار اُس عورت نے ہر ایک کی روٹی میں سے ایک ایک ٹکڑا توڑ کر حضرت کو دے دیا اس کا چھوٹا لڑکا جو آیا تو دیکھا کہ میری روٹی توڑ کر اس فقیر کو دے دی - وہ رونے لگا اور پیٹ پیٹ کے مر گیا - اُس کی ماں رونے لگی - حضرت پیغمبر صاحب بھی گھبرائے - اُن لوگوں سے کہا اچھا میں دعا کرتا ہوں - آپ نے دعا کی تو وہ لڑکا زندہ ہو گیا - لوگ جان گئے کہ یہی پیغمبرِ وقت ہیں، جو روپوش ہو گئے تھے - فوراً پکڑ لیا اور کہا کہ تم بارش کے واسطے دعا کرو اُنھوں نے انکار کیا - لوگوں نے ایک کوٹھری میں بند کر کے بھُس کی دھونی کر دی - جب دھوئیں کے مارے دم گھبرایا تو فرمایا کہ اچھا مجھ کو چھوڑ دو اب میں دعا کروں گا - لوگوں نے نہ مانا اور کہا کہ پہلے دعا کرو پھر رہائی ہو گی - آخر تنگ آ کر دعا فرمائی - بارش ہونے لگی اُس وقت لوگوں نے اپنا قصور معاف کرایا - اس پر منشی فضل رسول صاحب نے سوال کیا کہ حضرت یہ کیا بات تھی - اُسی کی مخلوق، اُسی کی بارش، رسول کا واسطہ کیا ضرور تھا - ارشاد ہوا

کہ رسول کی عظمت اور مرتبت منظور تھی ورنہ اس کا فعل کسی واسطے پر موقوف نہیں۔

ایک روز[151] ارشاد ہوا کہ ابتدا میں حضرت بایزید بسطامی نے ایک دیگ کھانے کی پکائی۔ صلائے عام دیا کہ جس کو جو کھانا مرغوب و مطلوب ہو اُس میں سے نکالے اور کھالے۔ چناں چہ تمام شہری اور مسافر لوگ ٹوٹ پڑے اور کھانے لگے، لیکن دیگ تمام نہ ہوتی تھی۔ اتفاقاً اُسی روز ایک مسافر سرائے میں وارد ہوا۔ حضرت نے مُرید کو بھیج کر اُس کی دعوت کی۔ ہر چند اصرار کیا مگر اُس نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں یہ کھانا ہرگز نہیں کھاؤں گا، یہاں تک کہ خود حضرت تشریف لے گئے اور کھانے کی تواضع کی۔ اُس نے کہا اچھا میں تو آدمی کا گوشت کھاؤں گا۔ یہ بات سن کر حضرت بایزیدؒ چکرائے اور فرمایا: خیر، میرا گوشت جہاں سے چاہو کاٹ لو اور نوش کرو۔ مسافر بولا کہ واہ! آپ بھی آدمی بن گئے۔ ذرا اپنی جانب غور تو کیجیے۔ اُنھوں نے بہ نظرِ بطون اپنی شکل کو ملاحظہ کیا تو دیکھا کہ بصورت طاؤس ہیں۔ اُس وقت مُسافر نے کہا کہ ابھی تو خدا خدا کر کے مور کی صورت بنے ہو۔ جب آدمی کی صورت نصیب ہو گی اُس وقت دعوی کرنا۔ بھلا ابھی سے کس برتے پر مخلوقِ خدا کو کھانا کھلاتے ہو۔ یہ بات کہہ کر غائب ہو گیا۔ حضرت بایزید روئے اور فوراً دیگ توڑ پھوڑ کر پھینک دی۔ غرض مردانِ خدا کے نزدیک کرامت بھی غایتِ کمال نہیں ہے ؎

اے برادر بے نہایت درگہیست ہر چہ بروے می رسی بروے مایست

ایک روز[152] ارشاد ہوا کہ راجہ کیتھل کو تعصب مذہبی بہت تھا۔ ایک دفعہ اُس نے وہاں کے شاہ مخدوم سید ابراہیم کیتھلی کی قبر کے اوپر چو کی لگا کر اشنان کیا۔ اُسی وقت مادّۂ فالج گرا۔ بہت گھبرایا اور نواب کنج پورہ کو چوں کہ رسمِ دوستی تھی پیام بھیجا کہ آپ کے شہر میں مسمّی رام سنہی ایک گرو کیمیا گر رہتا ہے اُس سے چاول بھر اکسیر لے کر بھجوائیے تاکہ میں اس مرض سے نجات پاؤں۔ نواب نے بہ صد مشکل اُس فقیر سے قدرے اکسیر لے کر بھجوائی۔ راجہ کو وہم پیدا ہوا کہ نہیں معلوم یہ اکسیر اصلی ہے یا نہیں۔ پہلے امتحان کرنا چاہیے۔ چناں چہ تانبے پر وہ مقدارِ اکسیر موافق ترکیب ڈالی گئی تو سونا بن گیا، تب اُس کو یقین ہوا اور دوبارہ نوّاب سے درخواست کی۔ یہاں کیمیا گر کو عالمِ خواب میں مخدوم صاحب نے متنبّہ کیا کہ راجہ کو سزائے بے ادبی

ملی ہے تم ہرگز اکسیر نہ دینا۔ نواب صاحب نے اُس فقیر سے پھر سوال کیا۔ اُس نے کہا کہ راجہ غضبِ الٰہی میں مبتلا ہے میں اُس کو ہرگز دوا نہ دوں گا۔ اگر آپ کو اپنی زمین کا گھمنڈ ہو تو میں آج ہی یہاں سے جاتا ہوں۔ نواب نے اُس کی تسلّی کی اور کہا کہ اگر یہ بات ہے تو مت دو ہم کو کیا غرض۔ راجہ ہے تو اپنے گھر کا ہے۔ اس کے بعد جناب وقبلہ نے فرمایا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام پر کیسے کیسے ظلم ہوئے لیکن لشکرِ یزید کو کچھ سزا نہ دی۔ اور مخدوم صاحب نے راجہ کو فوراً گستاخی کا مزا چکھا دیا۔ کیا یہ اُن سے کامل تھے۔ پھر فرمایا کہ نہیں حضرتِ امام مردِ میدانِ رضا اور تسلیم تیرِ قضا تھے اور یہ بزرگ رضا و تسلیم میں ناقص ؎

عارف کہ برنجد تنک آب ست ہنوز　　دریائے فراواں نہ شود تیرہ بہ سنگ

ایک [۱۵۳] روز ارشاد ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا لشکر ایک راہ سے گذرا کسی غریب ماہی گیر کی لڑکی جو نہایت بدشکل و بدقوارہ تھی بڑے ہی شوق اور اُمنگ سے اُس لشکر کی سیر دیکھنے کو دوڑی۔ اُس کی ہم جولیوں نے طعن کیا اور چھیڑا کہ یہ تو نور بھری صورت اور یہ اشتیاق۔ تو تو ایسی گھبرا کے لپکی کہ گویا سلیمانؑ کی بیوی ہی بن جائے گی۔ اس غریب نے کچھ نہ کہا اور جل بھُن کے چپ ہو رہی۔ خدا کی قدرت کچھ دنوں بعد وہ انگشتری کہ جس پر اسمِ اعظم کندہ تھا حضرت سلیمانؑ کے پاس سے دیو نے چُرالی اور سلطنت اُن کے قبض و تصرّف سے نکل گئی اتفاقاً اسی ماہی گیر کے گھر میں آکر رہے جس کی وہ لڑکی تھی اور ماہی گیر کا پیشہ اُس کے ساتھ میں یہ بھی کرنے لگے۔ وہ ہر روز ایک مچھلی ان کو دیا کرتا اُن کی خصلت ماہی گیر کو ایسی پسند آئی کہ اپنی لڑکی کا نکاح اُن سے کر دیا۔ ایک دن اسی ماہی گیر کے جال میں تین مچھلیاں لگیں۔ اپنی لڑکی کو صاف کرنے کے واسطے دیں اُس نے مچھلی کا پیٹ چاک کیا تو ایک انگشتری برآمد ہوئی۔ سوچی کہ باپ کو دوں یا شوہر کو۔ آخر سوچ بچار کر شوہر کی نذر کی۔ حضرت نے اُس کو لے لیا اور کہا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ پھر وہی سلطنت تھی اور وہی کارخانہ۔ اور وہ دخترِ ماہی گیر جس کو ہمجولیوں نے طعنہ دیا تھا مشیّتِ ایزدی سے سلیمان علیہ السلام کی بیوی بن گئی۔ اب چھیڑنے والیاں شرمندہ ہوئیں اور اپنا قصور معاف کرایا ؎

کسے در عمرِ خود نشنید ازیں سنجیدہ تر سخنے　　کہ در میخانہ گفتے رندِ بےخود بےسروپائے

بزن جام و مرنجان ہیچ چیزے را مشو منکر — کہ ہر مورے سلیمان ست و ہر جنبدے ست عنقائے

کہتے ہیں کہ جس وقت حضرت سلیمانؑ کی خاتم گم ہوئی تھی تو اُس وقت بھی آپ نے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہا تھا۔ کسی نے دریافت کیا کہ گم ہونے پر بھی اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اور پانے پر بھی اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ۔ اس میں کیا حکمت تھی۔ آپ نے فرمایا کہ جب انگشتری گم ہوئی اور سلطنت جاتی رہی تو ہم نے اپنے دل کی جانب غور کیا۔ کچھ اندوہ و قلق نہ پایا۔ اس لیے شکر ادا کیا۔ اور جس وقت انگشتری ملی تو ہم نے دل کی حالت پر نظر کی کچھ خوشی اور مسرت نہ دیکھی۔ ہم نے شکر ادا کیا کہ اس کھونے اور پانے کا کچھ اثر نہ ہوا اور استقلال میں فرق نہ آیا۔

نہ شادی داد سامانے نہ غم آورد نقصانے — بہ پیشِ ہمّت ما ہر کہ آمد بود دہمانے

غم نہ کیجے غم کا اور شادی نہ کیجے عیش کی — دونوں حالت دیکھیے منھ سے نہ کچھ فرمایئے

ایک روز[۱۵۴] ارشاد ہوا کہ کماتا کوئی ہے اور کھاتا کوئی۔ جس کے مقدّر میں جو کچھ ہوتا ہے اسی کو ملتا ہے۔ ایک پیر جی کو کُھوسی کی دھت تھی۔ ہزاروں نسخہ جمع کر لیے اور برسوں پھونکا پھاں کی کرتے رہے۔ اکسیر نہ بنی۔ اتفاقاً ایک نئے مرید نے پیر سے استدعا کی کہ کوئی ترکیب کیمیا کی ارشاد ہو جائے۔ اُنھوں نے بے تکلف اپنی بیاض اُس کے سامنے رکھ دی کہ جس نسخہ کو تیرا جی چاہے نقل کر لے۔ اُس نے ایک نسخہ انتخاب کر لیا اور اُس کو آزمایا تو ٹھیک نکلا۔ سونا بنا کر پیر جی کو بھی دکھایا اور اُن کے کمال کا نہایت اعتقاد اُس کے دل میں پیدا ہوا۔ سونا دیکھ کر پیر جی کی آنکھیں کُھل گئیں۔ مُرید سے پوچھا کہ یہ کون سا نسخہ تھا۔ اُس نے بجز اس بات کے کچھ نہ بتایا کہ آپ ہی کی کتاب کا نسخہ ہے۔ پیر جی نے بہت التجا کی لیکن پتہ نہ دیا۔

کیمیاگر بہ غصّہ مردہ و رنج — ابلہ اندر خرابہ یافتہ گنج

ایک روز[۱۵۵] ارشاد ہوا کہ ایک گرو نے اپنے چیلہ سے بعد تعلیم کے کہا کہ فلاں پہاڑ میں ایک تالاب ہے۔ اس کے اندر سے ایک رنگیں ہاتھ کسی معشوقۂ حور تمثال کا چیت کے مہینے کی پہلی تاریخ کو نکلتا ہے۔ اُس کی ہتھیلی پر ایک زمرّدیں انگور رکھا ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی کے ہاتھ لگ جائے تو کیا کہنے۔ اُس کی خاصیت یہ ہے کہ اُس کو کھا کر جہاں چاہے اُڑتا پھرے۔ روئے زمین کے تمام خزانے اُس پر عیاں ہو جاتے ہیں اور دل مثل آفتاب منوّر ہو جاتا ہے۔

لیکن اُس کا ہاتھ آنا نہایت مشکل ہے۔ جب اُس کو کوئی لینا چاہے تو وہ نازنین لینے والے کا ہاتھ ایسا زور سے پکڑتی ہے کہ پھر چھوٹ نہیں سکتا۔ پانی میں کھینچ کر اُس شخص کو لے جاتی ہے۔ مگر ہاں! کوئی صاحب ہمت ہو تو کچھ دشوار نہیں۔ ہمتِ مرداں مددِ خدا اَلْھِمَّۃُ اِسْمُ الْاَعْظَمِ جب اُس گرو کا انتقال ہو گیا تو وہ شخص اِس جستجو میں تالاب پر پہونچا۔ وقتِ مقررّہ پر وہی ہاتھ جو گرو نے بتایا تھا نکلا لیکن اُٹھانے کی ہمّت نہ بندھی۔ سوچا کہ کسی پہلوان کو لاؤں۔ چنانچہ ایک بڑا شہ زور پہلوان نوکر رکھا سال بھر تک خوب اُس کو کھلایا پلایا۔ جب وقتِ معینہ قریب آیا تو اُس کو تالاب کے کنارہ لے گیا ایک شخص تماشائی بھی اُن کے ساتھ ہولیا۔ جب ہاتھ نکلا تو پہلوان سے کہا کہ اسی کام کے لیے تجھ کو نوکر رکھا ہے۔ یہ انگور جس طرح بنے اُٹھالے پہلوان نے ہاتھ ڈالا جھٹ اُس معشوقہ کے ہاتھ نے پہلوان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بہت دیر تک زور آزمائی ہوتی رہی آخر وہ معشوقہ پہلوان کو کھینچتی ہوئی تہ کو لے گئی۔ یہ دونوں کفِ افسوس ملتے رہ گئے۔ تماشائی نے فقیر سے اس انگور کے اوصاف دریافت کیے۔ غرض فقیر تو مایوس ہو کر چل دیا مگر تماشائی دھونی رما کر وہیں بیٹھ گیا۔ جب وہ تاریخ آئی تو ہاتھ برآمد ہوا۔ یہ شخص کنارہ پر آیا اور کہا کہ یہ ایک طلسم ہے۔ دور سے انگور نظر آتا ہے۔ اگر سچ ہے تو ہمارے قریب لاؤ تاکہ خوب دیکھ بھال کے اس کے اُٹھانے کو ہاتھ ڈالیں۔ وہ ہاتھ قریب تر آگیا۔ اس شخص نے خوب دیکھ بھال کے اور تاک لگا کے اُس معشوقہ کے ہاتھ کے نیچے اپنا ہاتھ لے جاکر ایک ایسی تھپکی دی کہ انگور اُچھل کر باہر آپڑا اور جھٹ دوڑ کر اُٹھالیا تالاب کے اندر سے آواز آئی کہ او دغاباز تو نے بڑا فریب کیا۔ اب میرے ہاتھ سے بچ کر کہاں جائے گا۔ اُس نے فوراً انگور کھالیا اور اُڑ کر چل دیا۔ غرض یہ ہے کہ جن کی قسمت میں نہ تھا وہ تو ڈوب کر مر گئے اور جس کے نصیب میں تھا اُس نے ایسی آسانی سے حاصل کر لیا ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ سات مسافر چلے جاتے تھے۔ یکایک گھٹا اُٹھی اور آسمان پر چھا گئی۔ بجلی کوندنے لگی، بادل گرجنے لگا۔ ترشح شروع ہو گیا۔ ناچار مسافروں نے پہاڑ کی ایک کھو میں پناہ لی۔ لیکن بجلی دم بدم اُس غار میں آتی اور واپس چلی جاتی تھی۔ سب نے

خیال کیا کہ بھائی ہم میں سے کسی نہ کسی کی قضا آئی ہے، ایسا نہ ہو کہ ایک کے بدلے سب ہلاک ہو جائیں۔ مناسب ہے کہ ایک ایک آدمی غار سے باہر نکلے جس کی قضا ہے اُس کو بجلی مارے گی چنانچہ ایک نکلا، دوسرا نکلا، غرض چھ آدمی غار سے باہر آگئے۔ ساتویں کو غار کے اندر ہی بجلی نے جلا دیا۔ غرض یہ ہے کہ جو کچھ ہونے والا ہے وہ تو بہر حال ہو کر رہتا ہے ؎

لاکھ سیاں پیت کو ڑھ بڑھ کر دیکھے جوکوئے ان ہونی ہونی نہیں ہونی ہو سو ہوئے

دو چیز محالِ عقل است خوردن بیش از رزقِ مقسوم و مُردن پیش از وقتِ معلوم۔

فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ[1]

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت امام حسن رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا بڑا لنگرخانہ تھا۔ انواع واقسام کے کھانے پکتے اور غربا و مساکین کھاتے۔ ایک دن ایک مہمان آپ کے دسترخوان پر کھانا کھا کر مسجد میں گیا۔ وہاں دیکھا کہ ایک مردِ خدا خوش صورت و خوش سیرت جَو کے ستو سے روزہ افطار کر رہے تھے اُس شخص نے کہا کہ حضرت یہاں ایک امیر کا لنگرخانہ جاری ہے مسافروں کے لیے صلائے عام ہے۔ آپ بھی چلیے اور کھانا تناول فرمائیے۔ انھوں نے جواب دیا کہ میاں ہماری قسمت میں تو یہی ستّو لکھے ہیں۔ پھر وہ مہمان حضرت امام حسن علیہ السّلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور مسافرِ مسجد کا حال سنایا اور کہا کہ آپ اُن بزرگ کے لیے مسجد میں کھانا بھجوا دیں۔ حضرت امام آب دیدہ ہوئے اور فرمایا کہ وہ میرے والدِ ماجد ہیں۔ یہ سب اُن کے دم قدم کی برکت ہے لیکن وہ سلطانِ تسلیم و رضا اور مردِ میدانِ فقر و غنا ہیں۔ دنیا کا عیش اُن کی نظر میں ہیچ ہے۔

غمگیں مشو کہ دولت شد شد نہ شد نہ شد ایں پنج روزہ حشمت شد شد نہ شد نہ شد

ہمت بلند گرداں اقبال دیں بجو ؏ دنیا برائے شوکت شد شد نہ شد نہ شد

حضرت امام حسن علیہ السلام کے ہاں تو یہ فراخی اور وسعت تھی اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے ہاں ہمیشہ فقر و فاقہ اور تنگ دستی رہتی تھی۔ لیکن حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام نے کبھی نہ اُن کو وسعتِ لباس و طعام کی ممانعت فرمائی نہ اُن کو ناز و نعم کی رغبت دلائی۔ کیوں کہ

---

[1] یعنے پھر جب پہونچا اُن کا وعدہ نہ دیر کریں گے ایک گھڑی ۱۲۔

آپ مرضیِ الٰہی سے آگاہ تھے کہ اُن کے لیے تقدیرِ ازلی میں یہی ہے کہ عیش و عشرت سے بسر کریں اور اِن کے حق میں منشائے الٰہی یوں ہے کہ تنگی و عسرت کے عالم میں صبور و شکور رہیں۔

ایک[158] روز ارشاد ہوا کہ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کو لوگوں نے چین نہیں لینے دیا۔ اگر حضرت کے زمانہ میں تزلزل واقع نہ ہوتا تو لوگوں کے سینے معرفت سے پھاڑ دیتے۔ ایک شخص مکان کا قبالہ لکھانے آیا تو آپ نے یوں تحریر فرمایا۔ هٰذَا مَا اشْتَرَىٰ مَيِّتٌ مِنْ مَيِّتٍ دَارًا فِي بَلْدَةِ الْمُذْنِبِيْنَ وَسِكَّةِ الْغَافِلِيْنَ۔ اَلْحَدُّ الْاَوَّلُ مِنْهَا مُنْتَهِيْ اِلَى الْمَوْتِ وَالثَّانِيْ اِلَى الْقَبْرِ وَالثَّالِثُ اِلَى الْحِسَابِ وَالرَّابِعُ اِمَّا اِلَى الْجَنَّةِ وَاِمَّا اِلَى النَّارِ۔ بھلا جب یہ سمجھ ہو تو سلطنت کا کام کیسے چلے اور سلطنت کے لیے رعب و سطوت بھی امرِ ضروری ہے۔ آپ کے دل میں تو شانِ رحم غالب تھی۔ اسی جہت سے سلطنت میں فتور پڑا۔ جب جانتے کہ امیر معاویہؓ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں کان ہلاتے۔ ایک بار حضرت عمرؓ نے تکلف و تزئین کی باز پُرس کے لیے اُن کو طلب کیا تھا۔ خوف کے مارے تھرا گئے۔ بدن کانپنے لگا عذر و معذرت کر کے جان بچائی، ورنہ بیخ و بُن تک اُکھاڑ ڈالتے۔ حضرت علی مرتضیٰ کی یہ کیفیت تھی کہ جب امیر معاویہؓ نے جنگ کی اور کنارۂ دریا پر قبضہ کیا تو آپ کے لشکریوں کا پانی بند کر دیا۔ لشکر والوں نے حملہ کیا اور اُس مقام سے غنیم کو ہٹا دیا۔ آپ نے اہلِ لشکر سے ارشاد کیا کہ جیسے تم پر پانی بند کیا تھا تم اُن کا پانی نہ بند کرو اَخْوَانُنَا بَغَوْا عَلَيْنَا لَيْسُوْا بِكَفَرَةٍ وَلَا بِفَسَقَةٍ[159]۔ کسی شخص نے حضرت علی مرتضیٰ سے سوال کیا کہ کیا سبب ہے کہ خلفاء ثلاثہ کے زمانہ میں نظم و نسق بہ خوبی رہا اور آپ کے عہد میں یہ تزلزل واقع ہوا۔ آپ نے جواب دیا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے مشیر ہم تھے اور ہمارے مشیر تم ہو۔

ایک[159] روز ارشاد ہوا کہ ایک شیعہ تھے کہنے لگے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[158] یہ خریدنے والا میت ہے میت سے ایک مکان کہ ہے وہ مذنبین اور غافلین کے شہر میں حدِ اول اُس کی پہونچتی ہے موت تک دوسری حد اُس کی قبر تک تیسری حد حساب تک چوتھی حد اُس کی طرف جنت کے ہے یا طرف دوزخ کے ۱۲ منہ۔

[159] ہمارے بھائی ہیں بغاوت کی ہم پر نہ وہ کافر ہیں نہ فاسق ۱۲ منہ۔

کے پاس جبرئیل علیہ السلام ایک بار آتے تھے تو حضرت علیؓ کے پاس دو بار آتے تھے۔ میں نے کہا کہ ہاں درست ہے۔ خود رسولِ خدا نے فرمایا ہے اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا۔ جب کہ شہر میں کوئی ایک بار آئے گا۔ تو بالضرور دروازہ سے دو بار گذرے گا۔ لیکن اس سے دروازہ کو شہر پر کچھ فضیلت نہیں ہو سکتی۔ یہ بات سُن کر وہ خاموش ہو رہے۔

ایک[۱۶۰] بار ارشاد ہوا کہ جس زمانہ میں شجاع الدولہ ایران سے چل کر دہلی میں پہونچا ہے تو اُس کے پاس سوائے ایک خنجر کے اور کچھ نہ تھا۔ چوک کے بازار میں چلا جاتا تھا کہ ایک دیوانہ سا فقیر بولا:۔ ایک ٹکے میں وزارت اور دو ٹکے میں بادشاہی بکتی ہے جس کو لینا ہو لے لو۔ شجاع الدولہ یہ صدا سن کر اپنا خنجر ایک بنیے کے پاس لے گیا اور کہا کہ ایک ٹکے میں گرو رکھ لے۔ اُس نے کہا کہ صاحب میں ایسی بیش قیمت چیز ایک ٹکہ میں نہیں رکھ سکتا۔ آپ یوں ہی لے جائیے۔ ایک ٹکا اُٹھا کر حوالے کیا۔ اُس نے لا کر فقیر کو دیا۔ وہ بولا کہ وزارت مبارک مبارک۔ یہاں سے جاتے ہی شاہی ملازمت میں داخل ہوا۔ اور کچھ عرصہ کے بعد منصب وزارت پر پہونچ گیا۔ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ بھلا ہم پوچھتے ہیں اُس فقیر نے سوائے شجاع الدولہ کے اور کوئی دس بارہ آدمی بھی وزیر یا بادشاہ بنا دیے اصل بات یہ ہے کہ جس کے مقدر میں وزارت تھی اُس کے واسطے فقیر کی زبان بھی ہلی۔ اگر کسی دوسرے کے لیے دُعا کرتے بھی تو کیا ہوتا۔ ابوجہل کی قسمت میں کفر تھا ہر چند کوشش ہوئی لیکن استدعائے رسول بھی مقرون بہ اجابت نہ ہوئی ؎

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں کرنا رفو   سوزنِ تدبیر ساری عمر گر سیتی رہے

ایک[۱۶۱] روز ارشاد ہوا کہ ایک خواجہ سرا بادشاہِ دہلی کی طرف سے پانی پت کا عامل مقرر ہوا۔ کسی وجہ سے اُس نے مبارز خاں کو جو کہ قلندر صاحب کے محبوب تھے طمانچہ مارا۔ یہ خبر قلندر صاحب کو پہونچی۔ آپ نے ناراض ہو کر شاہِ دہلی کو یہ رقعہ لکھا:۔

"شحنۂ دہلی را اعلام آں کہ۔ پس دریدہ بیش بُریدہ ناحق طمانچہ بر روئے درویش کشیدہ۔ چنانچہ فریادش بہ آسماں رسیدہ یا بہ جایش دیگرے بفرست ورنہ بہ جائے تو دیگرے رسیدہ۔"

بادشاہ یہ رقعہ پڑھ کر ڈر گیا اور فوراً اس کی بجائے دوسرا عامل تبدیل کر دیا۔ لیکن جو مرضیِ الٰہی ہوتی ہے اُس میں کوئی پیر یا پیغمبر دم نہیں مار سکتا۔ جب نادر شاہ واردِ پانی پت ہوا تو اُس نے سنا کہ قلندر صاحب کے مزار پر کئی من چاندی کا کٹہرا لگا ہوا ہے۔ زیارت کے بہانے سے آیا اور کٹہرا اکھڑوا کر لے گیا۔ اُس کو گمان گذرا کہ شاید قبر شریف بھی چاندی کی ہے۔ ایک ہاتھ تلوار کا مارا۔ غلاف کٹ گیا قبر پر خط پڑا چنانچہ اب تک نشان موجود ہے۔ اس غارت گری کے بعد نادر شاہ نے کہا کہ قلندر پہلے تو قلندر نہ تھا مگر اب میں نے قلندر بنا دیا۔ اس بات کو سُن کر حاضرینِ مجلس میں سے ایک شخص بولا کہ حضرت اِس گستاخی کی سزا قلندر صاحب نے نادر شاہ کو کچھ نہ دی۔ آپ نے فرمایا کہ خلافِ مشیتِ یزدی کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ دیکھو کربلا میں کیا معرکہ گذرا پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم اور علیؓ مرتضیٰ کے نورِ چشم ولختِ جگر کا گلا کاٹا گیا، مگر تقدیرِ الٰہی میں کچھ دخل نہ دے سکے۔ پھر قلندر صاحب نادر شاہ کو کیا سزا دیتے۔ حکمِ الٰہی اسی طور سے صادر ہو چکا تھا۔ اگر مرضیِ خدا نہ ہوتی تو جس بادشاہ کے نام رقعہ لکھا تھا اس کے حق میں بھی کچھ نہ کر سکتے۔ یَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَیَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ ؀

اوست مرہر پادشہ را پادشا   حکم اورا یفعل اللہ مایشاء

ایک[۱۶۲] روز ارشاد ہوا کہ کسی مقام میں ایک درخت پیپل کا تھا۔ اکثر لوگ اس کی پرستش کیا کرتے تھے۔ ایک مردِ متقی کو بُرا معلوم ہوا۔ رات کے وقت کلھاڑا لے کر کاٹنے کو جا چڑھا۔ اُس نے ایک دو ہاتھ مارے تھے کہ ایک خوب صورت عورت نظر آئی اور کہا کہ تو یہ خیال چھوڑ دے اور ایک اشرفی روز لے لیا کر۔ وہ متقی دامِ طمع میں پھنس گیا اور ایک اشرفی گرہ میں باندھ کر وہاں سے چل دیا۔ دوسرے دن اشرفی لینے آیا تو وہاں کچھ نہ پایا۔ پھر کلھاڑا سنبھالا اور کاٹنے کا ارادہ کیا تو آواز آئی کہ خبردار تیری گردن توڑ دی جائے گی اگر پتا بھی توڑا۔ پوچھا کیوں؟ کہا کہ جب تو تیری نیت خالصاً للہ تھی اور اب اشرفی کے لالچ سے تو نے یہ ارادہ کیا ہے۔ جا اپنی راہ لے۔ ورنہ مارا جائے گا ؀

طمع را سہ حرف است وہر سہ تہی   ازآں نیست مرطمعاں را بہی

ایک[۱۶۳] روز ارشاد ہوا کہ لاہور میں ایک مسلمان راجہ رنجیت سنگھ کا ملازم تھا وہ

حضرت غوث الاعظم کی گیارھویں کیا کرتا تھا۔ ایک سال ایسا اتفاق ہوا کہ اُس کو کچھ میسّر نہ آیا۔ ناچار گائے جو اُس نے پال رکھی تھی ذبح کر ڈالی اور فاتحہ کے لیے کھانا پکایا۔ ایک ہمسایہ برہمن چیل کوّوں کا ہجوم دیکھ کر تاڑ گیا اور اُس کو آکر دھمکایا کہ تو نے گائے ذبح کی ہے، راجہ کو خبر دیتا ہوں۔ اُس نے بہت منّت سماجت کی کہ میں نے عالمِ مجبوری میں یہ کام کیا ہے، اور خیر اب تو مجھ سے خطا ہو گئی تو معاف کر کچھ تو حق ہمسائگی کا لحاظ کر۔ تیرے ہاتھ کیا آئے گا، میں مفت مارا جاؤں گا۔ اُس برہمن نے ایک نہ سُنی اور کہا کہ میں ضرور تجھ کو سزا دلاؤں گا، اب دربار میں جا کر دُہائی دیتا ہوں۔ جب اُس نے دیکھا کہ دشمن کسی طرح نرم ہوتا ہی نہیں۔ بقول شخصے مرتا کیا نہ کرتا کسی بہانہ سے اُس کو الگ لے گیا اور ایک ہاتھ تلوار کا ایسا چھوڑا کہ برہمن کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ جب آدھی رات ڈھلی تو اُس کی نعش کو گٹھری میں باندھ دریائے راوی میں پھینکنے کے لیے چلا اتفاق سے رات بہت تھی دروازۂ شہر پر پہرہ والوں نے روکا کہ کون جاتا ہے۔ جواب دیا کہ دھوبی ہوں۔ اُن کو شک ہوا گٹھری ٹٹولی تو آدمی کی نعش معلوم ہوئی۔ فوراً گرفتار کر لیا۔ صبح کو راجہ کے سامنے پیش کیا۔ اظہار کے وقت راجہ نے کہا کہ ہم کو سچ پسند ہے جو سچّی بات ہے بیان کرو اُس نے کہا کہ صاحب خیر جو ہو سو ہو میں بھی سچ سچ کہے دیتا ہوں۔ آئندہ آپ کو اختیار ہے۔ جو سزا چاہے دیجیے۔ یہ کہہ کر تمام ماجرا راست راست بیان کر دیا۔ راجہ بولا کہ اس کیفیت کے سُننے سے ہمارے دل کو یقین حاصل ہو گیا اور حقیقت میں تیرا اظہار ٹھیک ہے۔ تو نے سچ بات ظاہر کر دی اور ہم بھی سچ ہی کے طالب ہیں۔ جا تیرا قصور معاف کیا۔ یہ برہمن اسی قابل تھا کیونکہ اس نے حق ہمسائگی اور تیری منّت و عاجزی کا کچھ پاس و لحاظ نہ کیا۔ اَلصِّدْقُ یُنْجِیْ وَالْکِذْبُ یُھْلِکُ[1]۔

ایک[۱۶۴] روز ارشاد ہوا کہ ایک سیّد صاحب راجہ بھرت پور کے ہاں سواروں میں نوکر تھے۔ عید اضحیٰ کے روز سیّد نے گائے کی قربانی کی۔ کسی مخبر نے راجہ کو خبر دی۔ پکڑے گئے۔ حکم ہوا کہ کل صبح کو توپ سے باندھ کر اُڑا دو۔ غریب سیّد نے حوالات میں دیوانِ حافظ

---

[1] یعنے سچ نجات دیتا ہے اور دروغ ہلاک کرتا ہے ۱۲ منہ۔

منگا کر فال دیکھی، تو یہ مصرع برآمد ہوا۔ ؎

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

خیال کیا ایسا کون غیب سے آئے گا جو مجھ کو موت کے پنجہ سے چھڑائے گا۔ خدا کی شان کہ نصف شب کے بعد راجہ کے گھر لڑکا پیدا ہوا۔ صبح دم سید کے قتل کی خبر مشہور ہوئی۔ شدہ شدہ رانی کے کان میں بھی اس کی بھنک پڑی۔ اُس نے جلدی سے راجہ صاحب کو بلوا کر کہا کہ خدا نے اپنے فضل و کرم سے یہ ایسا مبارک دن ہم کو دکھایا ہے کہ جس کا شکر ہم سے ادا نہیں ہو سکتا۔ اگر آج تمام خزانہ خالی کردیں اور سارے قیدیوں کو اس خوشی میں رہائی دیں تو بھی کم ہے۔ لیکن بڑے حیف کی بات ہے کہ آج کے دن آدمی کی بنتیا اور اشرف المخلوقات ایک حیوان کے بدلے میں مارا جائے۔ یہ بدشگونی اور ناشکری تو ہرگز مناسب نہیں۔ راجہ نے اُسی دم سوار دوڑا دیئے اور سید کو بلا کر فہمائش کی کہ جاؤ پھر ایسا کام نہ کرنا۔ جب اگلے برس عید اضحیٰ آئی تو سید صاحب نے پھر گائے ذبح کی۔ پکڑے گئے اور مثل سابق حکم قتل صادر ہوا۔ پھر فال دیکھی وہی مصرعہ برآمد ہوا۔ اب سید کو انتظار ہوا کہ دیکھیے اب کی دفعہ کون آتا ہے اور ہم کو رہائی دلاتا ہے۔ قدرتِ خدا اُسی صبح کو نواب لکھنؤ بھرت پور میں داخل ہوئے۔ یہ ماجرا سُنا اور راجہ سے کہلا بھیجا کہ یہ بات مناسب نہیں کہ حیوان کے بدلے انسان کا قتل ہو۔ خیر تمہارے سواروں میں ایک گستاخ بھی سہی، مگر یہ شخص بڑا بہادر معلوم ہوتا ہے اس کی قدر کرو شاید کسی وقت کام آئے اور اس کے جوہر کھلیں۔ راجہ نے خون معاف کیا اور سید سے کہا کہ جاؤ تم کو عید کے دن کی قربانی معاف ہے۔ پھر جو عید آئی تو سید صاحب نے گائے کی قربانی نہ کی۔ راجہ نے بلا کر سبب پوچھا۔ کہا کہ جب آپ نے نفسانیت اور ضد چھوڑ دی تو میں نے بھی انسانیت اختیار کرلی۔ یہ بات راجہ کو پسند آئی۔ اُس کو اپنے محلات کا داروغہ مقرر کیا اور معتمدین میں داخل فرمایا۔ جب بھرت پور پر جنگ ہوئی تو وہ سید بھی ایک حصۂ لشکر کا سردار تھا۔ نہایت جواں مردی سے لڑا اور جب تک زندہ رہا بھرت پور کو فتح نہ ہونے دیا۔ آخر کار جب توپ کے گولے سے اُڑ گیا تو قلعہ بھی فتح ہو گیا۔ حقیقت میں بڑا بہادر آدمی تھا۔

ایک[۱۶۵] روز ارشاد ہوا کہ کسی شخص نے ہم سے کہا کہ حضرت جب یہ قاعدہ مسلّم ٹھہرا کہ ہر امر وابستۂ تقدیر الٰہی ہے تو پیر و مرشد کی کیا ضرورت ہے اور وہ معاملاتِ مقدّریں کیا تصرف کر سکتا ہے۔ ہم نے کہا کہ یہ تو بجا اور درست ہے کہ پیر تقدیر میں کچھ تغیر نہیں کر سکتا لیکن پیرِ باخبر کی تدبیر بھی موافقِ تقدیر ہوتی ہے اور وہ طالب کو غایتِ تقدیر تک پہونچا دیتا ہے۔ چنانچہ نقل ہے کہ کسی شہر میں ایک بڑا امیر کبیر تھا۔ اُس کے مکان پر ایک بزرگ رہا کرتے تھے امیر کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اُس بزرگ نے فرشتۂ تقدیر سے اس لڑکے کا مقدر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک گھوڑا ہمیشہ اس کے تھان پر رہا کرے گا۔ پھر اُس امیر کے گھر دوسرا لڑکا پیدا ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ چڑی مار ہوگا۔ پھر اُس کے گھر ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اُس کا حال منکشف ہوا کہ یہ بیوہ ہوگی۔ بازار میں بیٹھے گی اور ہر شب ایک مرد اس کے پاس رہا کرے گا۔ وہ فقیر وہاں سے چلا گیا۔ ایک مدّت کے بعد اُس شہر میں آیا اور اُس امیر کا حال دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ امیر کا سب کارخانہ درہم برہم ہو گیا ہے۔ ایک لڑکا تو سواروں میں پانچ روپیہ ماہوار کا نوکر ہے۔ دوسرا لڑکا چڑی مار کا پیشہ کرتا ہے۔ اور اُس کی لڑکی بازار میں بیٹھ گئی ہے۔ وہ فقیر یہ حال سن کر بڑے لڑکے کے پاس گیا۔ اگرچہ خود محتاج تھا مگر فقیر کی خدمت نانِ خشک سے کرتا رہا۔ چند روز کے بعد فقیر نے ہدایت کی کہ تو نوکری چھوڑ دے اور گھوڑا اپنا بیچ ڈال۔ اس کو طرح طرح کے خیال پیدا ہوئے۔ لیکن فقیر کا معتقد ہو گیا تھا۔ ایسا ہی کیا۔ گھوڑا اچھے داموں کو بکا۔ اگلے دن بہ اجازتِ درویش ایک کم قیمت ٹٹو خریدا اور بیچ ڈالا۔ یہی کام کرتا رہا۔ چند روز میں مالا مال ہو گیا۔ فقیر نے کہا بس تم یہی کام کیا کرو، تمھارا تھان گھوڑے سے خالی نہ رہے گا۔ روز خریدو اور بیچو۔ اب ہم جاتے ہیں۔ پھر دوسرے لڑکے یعنے چڑی مار کے گھر گیا۔ اس کی کیفیت دریافت کی اور کہا کہ جب شکار کے لیے جاؤ ہم کو ساتھ لے چلو۔ دوسرے روز دونوں جنگل میں پہونچے اور جال لگا دیا۔ فقیر نے کہا کہ جب تک شاہ باز تیرے جال میں نہ آئے کھینچیو مت۔ وہ بولا کہ حضرت بھلا میری تقدیر ایسی کہاں۔ دو آنے روز بھی مل جائیں تو غنیمت ہیں۔ فقیر نے سمجھایا، خیر تو دیکھو تو سہی۔ غرض بہت سے جانور آئے اور نکل گئے، وہ چپ بیٹھا رہا۔ آخر شام کے وقت ایک شہباز جال میں آ ہی پھنسا۔ چڑی مار نہایت خوش ہوا اور سو روپیہ کو وہ جانور بیچا۔ فقیر نے

کہا کہ یہ میری بات یاد رکھ جب تک شہباز ہی تیرے دام میں نہ پھنسے دوسرے جانور کو نہ پکڑنا۔ چند روز میں وہ بھی اس طریقہ سے خوش حال اور دولت مند ہوگیا۔ اس کے بعد وہ فقیر بیسوا عورت کے پاس گیا اور اُس سے کہا کہ آج یہ کام کر کہ جب تک کوئی سو روپیہ ایک شب کے تجھ کو نہ دے اُس کے پاس مت جا۔ وہ بولی میاں صاحب میری دو آنہ کی اوقات، تیبو کا منھ بڑی بات، بھلا مجھ کو سو روپیہ والا کیوں پوچھے گا؟ فقیر نے کہا کہ خیر اس کا تجربہ کر دیکھ۔ اس نے تعمیلِ حکم کی اور جو خواہش مند آیا اُس سے سو روپیہ مانگے۔ لوگوں نے کہا کہ تیری عقل ماری گئی ہے۔ آخر آدھی رات کے قریب کوئی امیر آنکھوں کا اندھا گانٹھ کا پورا آ ہی پھنسا۔ سچ ہے ؎

مردِ مفلس را خدا زر می دہد قحبہ زن را ہر شبے زر می دہد
بے مگس ہرگز نماند عنکبوت رزق را روزی رساں پر می دہد

چند روز میں وہ عورت بھی مال دار ہوگئی۔ فقیر نے وصیت کی کہ سو روپیہ سے کم قبول نہ کیا کر۔ تجھ کو کوئی نہ کوئی مل ہی جایا کرے گا۔ وہ بولی کہ آپ تو بزرگ آدمی ہیں کچھ ایسی ہمّت اور دعا کیوں نہیں فرماتے کہ میں ان افعالِ شنیعہ کی علّت سے پاک ہو جاؤں۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ سنو صاحب! ہم تقدیر شکن نہیں ہیں۔ یہ تو جو کچھ ہو رہا ہے مٹ نہیں سکتا۔ اگر خدا کی طرف توجّہ ہے تو اسی حال میں وہ بھی سہی۔ یہ کہہ کر رخصت ہوگئے۔ الغرض پیرِ باخبر نے ہر ایک کو تحصیلِ دولت و مال کی ہدایت اُسی راہ سے کی جو اُس کے لیے مقدر تھا۔ پس تقدیر کا بدل دینا پیر کا کام نہیں۔ بلکہ پیرِ دانا طالب کو اُسی راہ سے منزلِ مقصود کی رہنمائی کرتا ہے جو اُس کے لیے مقدر و مقسوم ہے۔

ایک[۱۹۶] روز ارشاد ہوا کہ ؎

حیاتِ خوش مماتِ خوش کسے راست کہ دنیا را بہ دنیادار بسپرد
تکلف گر نباشد خوش تواں زیست تعلق گر نباشد خوش تواں مُرد

بے تعلق زیستن خود زیستن با تعلق زیستن نگریستن
بگیر رسمِ تعلق ولا چو مرغابی بود در آب چو برخاست خشک بر خاست

۱۹۶ - ... تا گل حسن حاضرِ خدمت تھے آزادی و بے تکلفی کا تذکرہ تھا اُس وقت یہ ارشاد زبان مبارک پر آیا تھا ۱۲-

گیرم کہ سریست از بلور و پشم است — سنگش داند ہر آں کہ او را چشم است
ایں مسند قاقم و سمور و سنجاب — در دیدۂ بوریا نشیناں پشم است

میاں سرمد صاحب اور بھرے بھرے صاحب دونوں ایک جگہ بیٹھے تھے۔ سرمد صاحب نے یہ شعر پڑھا ؎

شد کلاہِ نمدی صندلِ دردِ سرِ ما — بود دردِ سرِ ما افسرِ ما

اس کے جواب میں میاں ہرے بھرے صاحب نے فرمایا ؎

ہست موئے سرِ ما بر سرِ ما افسرِ ما — کے کشد بارِ کلاہِ نمدی را سرِ ما

سچ ہے جو لوگ بے تعلق ہوتے ہیں، بڑے مزے سے زندگی بسر کرتے ہیں ؎

زیر بار اند درختاں کہ تعلق دارند — اے خوشا سرو کہ از بارِ غم آزاد آمد

ایک[۲۷] روز ارشاد ہوا کہ ؎

کسے در عمرِ خود نشنید ازیں سنجیدہ تر سخنے — کہ در میخانہ گفتے رندِ بے خود بے سر و پائے
بزن جام و مرنجاں ہیچ چیزے را مشو منکر — کہ ہر موئے سلیمان است و ہر عیدے ست عنقائے

پھر فرمایا کہ ہم اجمیر شریف میں عرس دیکھنے گئے تو باؤلوں کا گروہ ماہی مراتب لے کر نکلا۔ ان کی گفتگو ہم کو بہت پسند آئی۔ ایک عجیب کیفیت تھی۔ سرگروہ کے آگے پیچھے دائیں بائیں چار آدمی ہیں پچھلا آدمی کہتا ہے ؎

دل بدست آور کہ حجِ اکبر ست — از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر ست

اگلا آدمی بولتا ہے: ؎

کعبہ بنگاہِ خلیلِ آذر است — دل گذرگاہِ جلیلِ اکبر است

بائیں طرف والا آواز لگاتا ہے: ؎

کعبہ ہر چندے کہ خانہ برِّ اوست — دل، اگر ایں نیز، خانہ سِرِّ اوست

داہنی طرف والا ندا کرتا ہے: ؎

تا بکردآں خانہ را او روئے نہ رفت — واندریں خانہ بجز آں حے نہ رفت

سب کے بعد سرگروہ صاحب فرماتے ہیں: ؎

گر ہمی دانی کہ در ہر دل خدا است پس ترا تعظیم ہر دل بد عا است

ایک روز ارشاد ہوا[168] کہ ایک دن حافظ سعد اکبر صاحب مخدوم زادہ پانی پتی نے ہم سے کہا کہ حضور دہلی میں دربارِ قیصری منعقد ہوا ہے ایک مجمع کثیر اور تماشائے بے نظیر ہوگا۔ بہت لوگ جاتے ہیں۔ میرا بھی ارادہ ہے کہ جاؤں۔ کیا حضور کا جی اس سیر کو نہیں چاہتا؟ اس بات کے جواب میں ہم نے کہا کہ میاں سعد اکبر آپ نے دربارِ قیصری کا تماشا بڑا اچھا ہوگا۔ ذرا دربارِ الٰہی کا جلسہ تو دیکھو کیا ہو رہا ہے۔ قولہٗ تعالےٰ[1]:۔

تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ اگر یہ تماشا کم ہو تو وہاں چلیں ؎

عمر بھر وحشت میں گر صحرا نوردی کی تو کیا سیر کے قابل جو تھا دل کا بیاباں رہ گیا

وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ[52] ۝ کتاب مبین سے مراد جسم انسان ہے۔ اللہ تعالےٰ نے جسم انسان میں دونوں جہان پیدا کر دیے ہیں۔ یہ کیا کم ہے جو دوسری جگہ جائیں۔

ایک روز ارشاد ہوا[169] کہ ؎

فائدہ کیا کرے صحبت جو نہ ہو استعداد باغ میں جا کے کبھی زاغ خوش الحاں نہ ہوا

مگر صحبت کی تاثیر ضرور ہوتی ہے ؎

پسر نوحؑ با بداں بنشست خاندانِ نبوتش گم شد

صحبتِ صالح ترا صالح کند صحبتِ طالح ترا طالح کند

وَمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّجْلِسَ مَعَ اللّٰهِ فَلْيَجْلِسْ مَعَ الْفُقَرَاۗءِ یعنے صحبتِ فقرا عین مجلسِ الٰہی ہے

ترجمہ: اور جس نے ارادہ کیا یہ کہ بیٹھے اللہ کے ساتھ پس وہ بیٹھے ساتھ فقیروں کے ۱۲ منہ۔

[1] تو لائے رات کو دن میں اور تو لائے دن کو رات میں اور تو نکالے جیتا مردے سے اور تو نکالے مردہ جیتے سے اور تو رزق دے جس کو چاہتا ہے بے شمار ۱۲ منہ [52] پر اسے سو لکھا جو کھلی کتاب میں نہیں ۱۲ منہ۔

[53] ایک روز کسی نے صحبت فقرا کا انکار کیا تھا اس کے جواب میں زبان مبارک سے یہ ارشاد فرمایا تھا ۱۲ منہ۔

ہم نے بابری میں دیکھا کہ ایک کُتّے کو ہڑک اُبھری۔ مالک نے آم کے درخت سے باندھ دیا۔ جب ہڑک کا زور ہوتا تو وہ درخت کو بھنبھوڑتا۔ آخر تین دن میں کُتا مر گیا اور مہینہ بھر کے بعد وہ درخت بھی خشک ہو گیا۔ اُس شخص نے درخت کاٹا اور جلانے کے لیے گھر لے آیا۔ جس کو اُس کی لکڑی کا دھواں لگا اُس کو بھی ہڑک اُبھری۔ بھلا جب باؤلے کُتّے کی یہ تاثیر ہے تو کیا فقیروں میں اتنا اثر نہیں۔ پیر کامل کی تعلیم کبھی ضائع نہیں جاتی۔ کبھی نہ کبھی اُس کا ظہور ہوتا ہے۔ ؎

مردانِ خدا خدا نہ باشند لیکن ز خدا جدا نہ باشند

ایک روز[1] ارشاد ہوا کہ جن کے نزدیک دنیا میں کوئی کامل اور مردِ خدا نہیں ہے وہ سچ کہتے ہیں۔ اگر کوئی ہندوستان کا باشندہ کہے کہ دنیا میں کوئی مسلمان بادشاہ نہیں تو وہ سچا ہے۔ اس لیے کہ اُس نے اپنے مُلک میں کبھی نہیں دیکھا۔ لیکن جو لوگ ملک روم میں رہتے ہیں اور سلطانِ روم کو دیکھتے ہیں بھلا وہ اس بات کو کب تسلیم کریں گے کہ کوئی مسلمان بادشاہ نہیں ہے۔

ایک روز[1] ارشاد ہوا کہ ہم کو ایک نقل یاد آئی۔ دکن میں ایک فاحشہ عورت مر گئی تھی۔ جنگل میں دفن کی گئی۔ اُس جانب کو جو شخص تنہا جاتا وہ چھلاوہ بن کر خواہش پوری کراتی۔ تعجب ہے کہ ایک فاحشہ تو اپنے فحش میں ایسی کامل ہو اور اولیاء اللہ سے کچھ بھی فیض نہ ہو۔ عظیم آباد پٹنہ میں پن ڈبوں کا ماجرا معروف و مشہور ہے۔ یعنی پن ڈبّے از قسمِ بھوت مشہور ہیں۔ دریائے گنگ میں مُردے جھلس کر بہائے جاتے ہیں اور وہ بھوت بن جاتے ہیں۔ اُن کا وطیرہ یہ ہے کہ اگر رات کے وقت کوئی تنہا کنارۂ دریا پر چلا جاتا ہے تو وہ پن ڈبّے اُس کو زبردستی دریا میں کھینچ لے جاتے ہیں اور آپ جیسا بنا لیتے ہیں۔ جس زمانہ میں ہم حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے پڑھتے تھے تو ایک طالب علم تھا نہایت پاکیزہ صورت اُس کے پاس ایک چڑیل خوب صورت عورت بن کر آیا کرتی اور دو روپیہ ہر شب کو دے جاتی اور تمام رات اُس کے پاس رہتی۔ ایک رات دونوں ایک چارپائی پر تھے اور چراغ دس گز کے فاصلہ پر جل رہا تھا۔ طالب علم نے اُس سے کہا کہ جا چراغ گل کر دے۔ اُس نے وہیں سے

---

[1] ایک روز کسی شخص نے کہا کہ اولیاء اللہ سے کچھ فیض نہیں ہو سکتا اور مردوں مثل جماد ہو جاتے ہیں اس وقت زبان فیض ترجمان سے یہ ارشاد فرمایا ۱۲۔

ہاتھ بڑھا کر چراغ بجھا دیا ۔ یہ کیفیت دیکھ کر طالب علم سہم گیا ۔ عورت بھی تاڑ گئی ۔ بہت کچھ اُس کی تسلی و تشفی کی اور کہا کہ میں تجھ پر عاشق ہوں تو کسی قسم کا اندیشہ مت کر ۔ خیر بصد مشکل رات بسر کی اور صبح کو یہ ماجرا شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کیا ۔ حضرت نے ایک تعویذ لکھ کر بازو پر باندھ دیا ۔ رات ہوئی تو وہ عورت حسب عادت آئی ، مگر دور کھڑی رہی اور اُس سے کہا کہ میں نے تیرے ساتھ کیا بُرائی کی تھی جو تو ایسا ظلم مجھ پر کرتا ہے ۔ یہ تعویذ کھول ڈال ۔ اب میں بچارے روپیہ روز دیا کروں گی ۔ لیکن اُس نے تعویذ نہ کھولا ۔ آخر وہ چلی گئی ۔ بھلا جب بھوت اور چڑیلوں کو ایسی طاقت ہوتی ہے تو کیا اولیاء اللہ ان سے بھی گئے گذرے ہیں کہ وہ بعدِ مردن جماد ہو جاتے ہیں ۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ سید حسن رسول نما صاحب علیہ الرحمہ کی بی بی صاحبہ نے ایک روز کہا کہ لوگوں کو تم حضرت رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرا دیتے ہو ۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ سعادت مجھ کو بھی نصیب ہو ۔ فرمایا کہ آج تم نہاؤ اور اچھی پوشاک پہن کر دُلھن کی طرح خوب بناؤ سنگار کرو ۔ اُنھوں نے حسبِ ایما تعمیل کی ۔ اتنے میں اُس نیک بخت بی بی کے بھائی تشریف لائے ۔ سید حسن صاحب نے کہا کہ میاں ذرا اپنی بہن کو سمجھاؤ دیکھو بڑھاپے میں کیا بناؤ سنگار کیا ہے ۔ میں تو بوڑھا ہو گیا ، اب کیا دوسرا خصم کرے گی ۔ وہ جا کر دیکھتے ہیں تو فی الحقیقت نہایت سج دھج سے دُلھن بنی بیٹھی ہیں ۔ بھائی نے کہا اے بہن ! تم پر کیا پتھر پڑ گئے ! یہ کیا سوانگ بنایا ہے ! بھائی سچ فرماتے ہیں کیا تم کو اس بڑھاپے میں دوسرے خاوند کی ہوس ہے ؟ ۔ یہ بات سنتے ہی اُس نیک بخت بی بی نے چوڑیاں توڑ دیں ، کپڑے پھاڑ ڈالے اور رو رو کے اپنا بُرا حال کیا ۔ کہتی تھیں کہ اس بڈھے نے مجھ سے تو کیا کہا اور بھائی سے کیا کہہ دیا ۔ اُسی روتے پیٹنے اور غم و غصہ کی حالت میں آنکھ لگ گئی ۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئیں ۔ اُٹھیں تو نہایت بشاش و بشاش اُٹھیں ۔ سید صاحب سے پوچھا کہ یہ کیا بھید تھا ۔ آپ نے فرمایا کہ تیرے دل میں غرور تھا ۔ تو مجھ کو حقیر جانتی تھی ۔ جب وہ جاتا رہا اور سوز و گداز تیرے دل میں پیدا ہوا تو زیارت ہو گئی ۔ غرض یہ ہے کہ طالب جب تک انانیت سے نہیں گذرتا واصل مطلوب نہیں ہوتا ۔

نیست از خود شو کہ تا یابی نجات　　　چوں تو بر خیزی نشیند حق بجات

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت ابو بکر شبلی علیہ الرحمہ کی خدمت میں دو شخص بہ ارادۂ بیعت حاضر ہوئے۔ اُن میں سے ایک کو فرمایا کہ کہو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ شِبْلِیْ رَسُوْلُ اللہِ۔ اس نے کہا لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ۔ آپ نے بھی یہی کلمہ پڑھا۔ اُس نے پوچھا آپ نے لاحول کیوں پڑھی۔ آپ نے استفسار کیا کہ تم نے کیوں پڑھی۔ بولا کہ میں نے تو اس واسطے پڑھی کہ کہ ایسے بے شرع کے پاس مُرید ہونے آیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہم نے اس لیے پڑھی کہ ایسے جاہل کے سامنے راز کی بات کہہ دی۔ اس کے بعد دوسرے شخص کو بلایا اور وہی فرمایا کہ کہو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ شِبْلِیْ رَسُوْلُ اللہِ اُس نے جواب دیا کہ حضرت میں تو آپ کو کچھ اور ہی سمجھ کے آیا تھا۔ آپ تو ورے ہی گر پڑے، رسالت ہی پر قناعت کی آپ نے ہنس کر فرمایا کہ اچھا تم کو تعلیم کریں گے۔ پس ہر شخص کا فہم و حوصلہ جُدا ہوتا ہے۔ ورنہ بات ایک ہی تھی جو ایک کے دل میں نہ سمائی اور رانکار پیدا کیا، دوسرے کا حوصلہ اس بات سے بھی اعلیٰ تھا۔ حضرت شبلی کا یہ مطلب نہ تھا جو شخص ظاہر بیں نے سمجھا۔ بات یہ تھی کہ جو شخص تعلیم و تلقین اور ہدایت و ارشاد کرتا ہے، طالب کے لیے وہی رسول ہے۔ اور رسالتِ الٰہی کا کام انجام دیتا ہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ؎

اوّلِ ما آخرِ ہر منتہی　　　آخرِ ما جیب تمنا تہی

ہم کو ایک بات یاد آئی۔ بہ مقام پیران کلیر مخدوم صاحب کے مزار پر ہم مقیم تھے۔ ایک دفعہ نماز مغرب کے وقت چند آدمی جمع ہوئے۔ حسبِ اتفاق ایک خاں صاحب نے ایک جُلاہے کو جو بڑا سا عمامہ باندھے کھڑا تھا امام بنا دیا۔ اُس کے اوسان کچھ ایسے خطا ہوئے کہ بغیر ختم فاتحہ اوّل ہی سے قل ہو اللہ شروع کر دی۔ پٹھان کو جو غصہ آیا تو نیت توڑ کر بولے کہ ابے جولاہے! قل ہو اللہ تو تو نے پہلے ہی پڑھ دی۔ اب آگے اپنی دایسی تیسی، ختم کرے گا۔ جب کہ ابتدا ہی سے

لہ جس وقت حضرت قبلہ نے یہ شعر خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد فرمایا تو مولانا گل حسنؒ نے بہ اجازت عرض کیا کہ حضرت یہ شعر تو آپ ہی کی شان میں فرمایا ہے کیونکہ آپ کے یہاں ابتدا توحید سے ہوتی ہے۔ اُس وقت پیران کلیر کا واقعہ ارشاد فرمایا ۱۲۔

تعلیم توحید ہوئی تو اب آگے یہاں کیا دھرا ہے، جس کو سالک طے کرے۔ نہ کوئی منزل ہے نہ مقام۔ نہ کشف، نہ کرامت، نہ آثار نہ اطوار، نہ ذکر نہ فکر، توحید ہے باِفنا۔ اگرچہ طالب کے لیے توحید نبر ہے مگر ہم کو تو اور سب بکھیڑا معلوم ہوتا ہے۔ ہرچہ بر خود نہ پسندی بر دیگراں مپسند۔ غرض تو ہر منتہی و مبتدی کی تَطۡهِيۡرُ الۡقَلۡبِ عَنۡ مَاسِوَى اللّٰهِ ہے پھر کیا ضرورت ہے کہ پس پشت ہاتھ گھما کر بڑے ہیر پھیر سے ناک کو ہاتھ لگائے۔ سیدھا ناک ہی پر ہاتھ کیوں نہ رکھیے۔ اور مقامِ توحید اصطلاحِ صوفیہ میں اُجاڑ گاؤں کہلاتا ہے، چناں چہ مولانا روم فرماتے ہیں ؎

عاشقاں را ہر نفس سوزیدنی است ‎ ‎ ‎ بر دِہِ ویراں خراج و عشر نیست

پس کوئی برلا مسافر ہوتا ہے جو اُجاڑ گاؤں میں ٹھہرے ورنہ یہاں کس کا جی لگتا ہے ہرچند کہ بحسب تفاوتِ مراتب تمام کاملین پر حالتِ توحید گذری ہے مگر ایسے بہت کم ہیں جنھوں نے یہاں ہی جھونپڑی ڈال دی ہو ؎

سب سے بیگانہ ہے، اے یار شناسا تیرا ‎ ‎ ‎ جو پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا

ایک تذکرہ ارشاد ہوا کہ آدمی جس خیال میں مرے گا اُسی خیال میں قیامت کے روز اُٹھے گا ؎

پندار اینکہ حسرت از دلِ عاشق رود ہرگز ‎ ‎ ‎ چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد

جو بعد از مرگِ من بینی گیہ بر گورِ من رُستہ ‎ ‎ ‎ نوشتہ نام آں جاناں بہ ہر برگ گیہ خیزد

ایک بہروپیا تھا ہمیشہ نیا بہروپ بنا کر بادشاہ کے روبرو جاتا کہ دھوکا دے کر انعام لے۔ لیکن بادشاہ کبھی اُس کے داؤں میں نہ آتا ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش ‎ ‎ ‎ من از رفتارِ پایت می شناسم

ناچار ہو کر بہروپیا ایک جوگی کے پاس گیا اور کپالی چڑھانی سیکھی یعنی حبسِ دم۔ پھر جوگی بن کر اپنے شہر کے سواد میں آکر ٹھہرا ایک مختصر سا گنبد بنایا اور چند چیلے جمع کیے اور حسبِ معمولِ جوگیہ حبسِ دم کرکے بیٹھ گیا۔ گنبد کا دروازہ تیغا کرا دیا۔ اس خیال سے کہ بادشاہ وقت یہ خبر سُن کر کہ ایک فقیر اتنی مدت سے مکان میں بند ہے یہاں آئے گا اور مکان کھلوائے گا۔

لہ اس کا پاک کرنا دل کا ہے غیر اللہ سے ۱۲

تو میں پھر زندہ ہو جاؤں گا اور اُس سے انعام لوں گا۔ خدا کی قدرت، چند روز میں ایک انقلابِ عظیم واقع ہوا۔ نہ وہ بادشاہ رہا نہ وہ سلطنت۔ شہر بھی تاراج و برباد ہو گیا۔ جوگی کے چیلے بھی بھاگ گئے اور گنبد ویسا ہی دربند پڑا رہا۔ دو صدی کے بعد جب اُس شہر میں پھر رونق اور آبادی ہوئی تو کسی شخص نے اُس گنبد کو مسمار کرایا۔ دیکھا کہ ایک آدمی صحیح و سالم مُراقب بیٹھا ہے۔ لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ اتنے میں ایک جوگی آگیا۔ اُس نے پہچان لیا اور اپنے قاعدے کے موافق اُس کا علاج کیا۔ روح نے تمام بدن میں سرایت کی۔ ہوش و حواس درست ہو گئے۔ اُٹھ بیٹھا اور بولا کہ لاؤ میرا گھوڑا جوڑا۔ لوگ متحیر ہوئے کہ الٰہی اس شخص کو یہ ہذیان ہے یا خفقان ہے۔ خدا جانے کیا بکتا ہے۔ اُس سے کیفیت دریافت کی تو تمام ماجرا اپنا بیان کیا کہ صرف گھوڑے جوڑے کی غرض سے میں نے یہ عمل فلاں بادشاہ کے عہد میں کیا تھا۔ اب بیدار و ہوشیار ہوا تو وہی خیال رہا کہ بادشاہ نے مجھ کو اُٹھایا ہے۔ غرض یہ ہے کہ جو اعمال و اشغال و ورد و وظائف یا ریاضت و محنت طالب و سالک کرتا ہے اُس کا اثر بے شک مُترتب ہوتا ہے لیکن جب تک تصفیہ ماسوی اللہ نہیں، سب بے سود ہیں۔ کیوں کہ ان آثار و اطوار میں بھی وہی سوجھے گا جو دل میں بسا ہوا ہے۔ گناہوں کے خوف زدہ نجات طلب کریں گے اور ثواب کے اُمیدوار بہشت کا دم بھریں گے۔ غرض جو جس کا خیال ہے وہی رہے گا۔ سب خواہشِ نفس اور معبودِ باطلہ میں گرفتار ہیں۔ خدا کا طالب تو کوئی بِرلا ہی نکلے گا۔

مردِ عاشق را نہ باشد علّتے ۔۔۔ عاشقاں را مذہبے نے مِلّتے
مذہبِ عشق از ہمہ دیں ہا جُدا است ۔۔۔ عاشقاں را مذہب و مِلّت خدا است

ایک روز ارشاد ہوا[۱۷] کہ ایک بادشاہ نے نقاشانِ چین و مصورانِ روم جمع کیے اور حکم دیا کہ ایوانِ شاہی میں وہ نقاشی کرے جو زیادہ صناع ہو۔ دونوں گروہوں نے اپنی ہنرمندی کا دعویٰ کیا۔ آخر یوں ٹھہرا کہ مکان کے اندر ایک دیوار پر چینی کام کریں اور دوسری پر رومی۔ اور ایک پردہ دونوں کے درمیان حائل رہے تاکہ پردہ اُٹھانے کے بعد دونوں کی صنعت کا مقابلہ کیا جا سکے۔ غرض چینیوں نے طرح طرح کی گُل کاری اور

رنگ آمیزی کی۔ رومیوں نے اپنی دیوار کو مسالا دے کر ایسا صاف وشفاف بنایا کہ آئینہ ہوگئی۔ آخرکار پردہ اُٹھایا گیا تو دونوں جانب یک ساں بہار تھی اور مانیٔ چین کی نقاشی آئینہ سکندر میں نمودار۔ دونوں فریق اپنے کمال میں یکتا نکلے، لیکن رومیوں کی صفائی فوقیت رکھتی تھی کیوں کہ جو رنگ یا جو گلکاری اُس کے مقابل آئے گی وہ بالضرور اُس کے اندر جلوہ گر ہوگی۔ اور اگر سامنے سے اُٹھالی جائے تو صاف آئینہ ہے ؎

اے مانیِ نقاش چیں رو صورتِ یارم ببیں ۔۔۔ یا نقش کن برایں چنیں یا ترک کن صورت گری

اسی طرح فقرا کے دو فرقے ہیں۔ ایک رنگِ صفات میں دوسرا بے رنگیِ ذات میں اپنا کمال ظاہر کرتا ہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا ایک دوست لڑکپن کے زمانہ کا بھاوہ کنعان سے مصر میں آیا۔ حضرت سے ملاقات ہوئی۔ فرمایا کہ یار ہمارے واسطے کیا تحفہ لایا ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ حضرت تمھارے لائق تو کوئی چیز مجھ کو میسّر نہ آئی کہ تحفۃً لاتا مگر ہاں! آپ کی نذر کے لیے آپ ہی کو لایا ہوں، یہ کہہ کر ایک آئینہ پیش کیا ؎

آئینہ اور دمت اے روشنی ۔۔۔ تا چو بینی روئے خود یادم کنی

آئینہ بیروں کشید او، از بغل ۔۔۔ خوب را آئینہ باشد مشتغل

اسی طرح اللہ جل شانہ بروزِ قیامت ہر ایک سے تحفہ طلب کرے گا پس جو شخص تَطْهِيْرُ الْقَلْبِ عَنْ مَّا سِوَى اللّٰهِ کا آئینہ یعنی قلب سلیم زنگارِ دوئی سے صاف وشفاف کیا ہوا پیش کرے گا وہی پسند و مقبول ہوگا۔ ورنہ شرمساری اُٹھائے گا۔ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ[1] ؎

دل چہ باشد مطلعِ انوارِ حق ۔۔۔ دل چہ باشد منبعِ اسرارِ حق

در حقیقت داں کہ دل شد جامِ جم ۔۔۔ می نمائی اندروں ہر بیش و کم

دل بود مرآتِ وجہِ ذوالجلال ۔۔۔ در دلِ صافی نماید حق تعال

پیشِ سالک عرشِ رحمٰن است دل ۔۔۔ جملہ عالم چوں تن و جان است دل

---

[1] جس دن نہ کام آئے کوئی مال اور نہ اولاد مگر جو کوئی آیا اللہ پاس لے کر دل چنگا ۱۲ منہ۔

دل مقام استوائے کبریاست | دل نہ باشد آں کہ باکبر و ریاست

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت محی الدین کا قول ہے کہ اَلْکَشْفُ حَیْضُ الرِّجَالِ وَالْکَرَامَتُ نِفَاسُ الرِّجَالِ یعنی کشف و کرامت مردوں کا حیض و نفاس ہے۔ اُس کے معنی لوگوں نے یہ لگائے ہیں کہ کشف و کرامت نکمّی چیز ہے، لیکن ہماری سمجھ میں تو یہ بات آتی ہے کہ جیسے حیض عورتوں کے لیے نشانِ بلوغ ہے اسی طرح کشف سالک کے لیے علامت بلوغ ہے۔ اور جیسے نفاس بعدِ ولادتِ فرزند ظاہر ہوتا ہے اسی طرح کرامت بعد حصولِ یقین ظہور پکڑتی ہے۔ یعنی جیسا حیض و نفاس کے درمیان ایک نتیجہ ہے ایسا ہی کشف و کرامت کے درمیان یقین ہے۔ اور بغیر یقین کامل کے کمالِ ایمان و اطمینانِ قلب نہیں ہوتا۔ اسی واسطے مردانِ خدا نتیجہ کو اصل سمجھتے ہیں نہ اُس کے اطراف یعنی کشف و کرامت کو۔ پس کشف و کرامت راہِ سلوک میں دو مقام ہیں نہ اصلِ مقصود۔ اولیاء اللہ ہمیشہ وراء الورا میں قدم رکھتے ہیں اور حصولِ معرفت میں ھَلْ مِنْ مَّزِیْد کا دم بھرتے ہیں ؎

ہر کشف برآں چہرہ نقابے دگرست | ہر بحر دریں راہ سرابے دگرست
از رفع حجابِ خویش مغرور مباش | کایں رفع حجاب ہم حجابے دگرست

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جنابِ الٰہی میں عرض کیا کہ وَاِذْ قَالَ اِبْرَاھِیْمُ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَۃً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْھُنَّ اِلَیْکَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْھُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُھُنَّ یَاْتِیْنَکَ سَعْیًا ۔ جس وقت کہا ابراہیم علیہ السلام نے کہ الٰہی دکھا مجھ کو کیوں کر زندہ کرے گا تو مُردے کو۔ حکم ہوا کہ کیا تو ایمان نہیں لایا؟ عرض کیا کہ ایمان تو لایا ہوں میں، لیکن اس واسطے کہ اطمینان ہو میرے قلب کو۔ فرمایا تو پکڑ چار جانور اُڑتے پھر ان کو ملا اپنے ساتھ پھر ڈال ہر پہاڑ پر اُن کا ٹکڑا ایک ایک۔ پھر اُن کو پکار کہ آئیں تیرے پاس دوڑتے۔ جب سب کچھ دیکھ بھال لیا تو خاموش ہو بیٹھے۔ اب فرمائیے خود پیغمبر تو اس طرح اطمینان کریں اور ہم کو ایمان بالغیب کی ہدایت ہو یہ عجیب بات ہے ؎

گہ چنیں بنماید و گہ ضد ایں | جز کہ حیرانی نہ باشد کار دیں

ایک[۱۸۰] روز ارشاد[1] ہوا کہ ؎

بُو کی طرح سے غنچہ و گُل میں سمائے | فصلِ بہار آئی ہے کچھ رنگ لائیے
زلفِ دوتائے یار میں دل کو پھنسائے | جس رنگ میں ہو یار وہی رنگ لائیے

جب حضرت بایزید بسطامی کو فقر میں عروج حاصل ہوا تو عرش پر پہونچے اور عرشیوں سے سوال کیا کہ خدا کہاں ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ واہ صاحب! ہم تو سنا کرتے ہیں کہ خدا زمین پر ہے۔ تعجب ہے کہ آپ یہاں ڈھونڈھنے آئے ہیں۔ واہ! سبحان اللہ تعالیٰ شانہٗ عَمَّا یَصِفُوْنَ؁

یہاں بیت الصنم خالی وہاں بیت الحرم خالی | پتا لگتا نہیں اُس کا عرب خالی عجم خالی
ہست در ہر ذرہ یعقوبے دگر | یوسفِ گم گشتہ را پُرسد خبر
ایں طرفہ کہ از محملِ لیلیٰ خبرے نیست | برداشت زجا بادیہ را شورِ جرسہا
نہیں مِلتا تیرے ناقے کا پتہ اے لیلیٰ | چھان مارے تیرے مجنوں نے بیاباں کتنے

مجنوں سے مُراد عارف ہے اور بیابان سے ہفت وادی فقر یعنی اوّل طلب دوم عشق سوم عرفاں چہارم توحید پنجم استغنا ششم فنا ہفتم بقا۔

ایک[۱۸۱] روز ارشاد ہوا کہ

عرفان و حق شناسی نہ کسی گناہ سے زائل ہو نہ چوری سے مٹے، نہ زنا سے گھٹے۔ ہاں! جو اُمور کسبی ہیں یا داخلِ مراتب ہیں البتہ جاتے بھی رہتے ہیں۔ دیکھو شیطان ملعون و مردود ہو گیا۔ اپنے رتبہ سے خارج کیا گیا، لیکن عرفان و حق شناسی میں جو کچھ اس کو حاصل تھا اب بھی ہے۔ اُس میں کچھ فرق نہیں آیا۔ مثلاً کسی کو قل ہو اللہ یاد ہو تو وہ کسی حالت میں بھول نہیں سکتا۔

ایک[۱۸۲] روز ارشاد ہوا کہ ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں | گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

سلطان محمود غزنوی کی اکثر یہ عادت تھی کہ رات کو لباس تبدیل کر کے شہر میں پھرا کرتا۔ ایک شب

---

[1] ایک روز مولانا نائل حسن نے حاضر خدمت ہو کر یہ عرض کیا ؎

بازگو از نجد و از یاران نجد | تا در و دیوار ہا آرے بہ وجد

اس وقت زبان فیض ترجمان سے یہ ارشاد فرمایا ۱۲۔

ایسا اتفاق ہوا کہ ایک ویرانہ میں چار آدمی نظر پڑے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ تم کون ہو۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ ہم چور ہیں۔ اُس نے کہا کہ میں بھی تمھارا ہم مشرب ہوں۔ صلاح ٹھہری کہ چلو آج بادشاہی محل میں چوری کریں۔ سلطان نے کہا کہ اپنے اپنے اوصاف بیان کرو۔ ایک چور بولا کہ میں جانوروں کی بولی سمجھتا ہوں۔ دوسرے نے کہا کہ میں قوتِ شامہ سے خزانہ کی جگہ معلوم کر لیتا ہوں۔ تیسرے نے کہا کہ میں بغیر کنجی قفل کھول لیتا ہوں۔ چوتھے نے کہا کہ میں جس شخص کو شبِ تار میں دیکھ لوں تو لاکھوں میں پہچان سکتا ہوں۔ اب سلطان کی باری آئی یہ بولے کہ مجھ میں یہ کمال ہے کہ اگر مجرم کو پھانسی ملتی ہو اور میں ذرا سر ہلا دوں تو فوراً رہائی ہو جائے۔ چور اس بات سے نہایت خوش ہوئے اور کہا کہ بھائی تیرا کمال سب سے بڑھ کر ہے، جب تو ہمارے ساتھ ہے تو پھر کیا خوف ہے۔ پانچوں آدمی محلِ شاہی کی طرف چلے۔ راہ میں ایک کتّا بولا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ یہ کتّا کیا کہتا ہے۔ پہلا شخص بولا کہ کتّا یوں کہتا ہے کہ تم میں ایک بادشاہ ہے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ بھلا ہم میں سے کس کو بادشاہ بتاتا ہے۔ اُس نے کہا کہ بس اتنا ہی کہہ کر چپ ہو گیا۔ پھر محل کے اندر پہونچے۔ ایک نے خزانہ پہچانا۔ ایک نے بغیر کنجی قفل کھولا۔ مال لے کر اپنے گھر کو جانے لگے۔ اُس وقت بادشاہ نے نام و نشان سب کا پوچھ لیا۔ صبح کو شور و غل ہوا کہ بادشاہی خزانہ میں چوری ہو گئی۔ بادشاہ نے اُن چاروں چوروں کو گرفتار کرا منگایا۔ اور حکم دیا کہ ہمارے سامنے مت لاؤ سولی دینے کے واسطے لے جاؤ۔ مگر جب تک ہم حکم نہ دیں سولی نہ دینا۔ جب وہ چور زیرِ دار پہونچے تو آپس میں کہا کہ ہمارا پانچواں یار کہاں ہے۔ ایک بولا کہ میاں رات کتّے نے خبر دی تھی شاید کہ وہ بادشاہ ہو۔ چوتھے چور نے کہا کہ اگر رات بادشاہ تھا تو میں اس وقت ضرور پہچان لوں گا۔ یہ گفتگو کر کے سرہنگانِ شاہی سے کہا کہ خیر سولی تو ہمارے لیے تیار ہے۔ ایک دفعہ ہم کو بادشاہ کے روبرو لے چلو۔ یہ اطلاع حضورِ سلطان میں کی گئی۔ حکم دیا کہ اچھا بلاؤ۔ جب سامنے گئے تو جس چور میں شناخت کا کمال تھا وہ بولا کہ حضور ہم چاروں کے اوصاف تو ظاہر ہو چکے۔ اب آپ کا سر کس وقت ہلے گا کہ یہ چار مجرم سزائے دار سے رہائی پائیں ؎

جو کچھ کیا سو تیں کیا اور میں نے کیا کچھ نانھ ۔۔۔ تجھ بن میں نے کیا کیا تو بھی تھا مجھ مانھ

آپ کے ہاتھوں میں سارا کام ہے   آپ کرتے ہیں جہاں کا نام ہے

اُس وقت بادشاہ کو ہنسی آگئی اور سب چوروں کو رہا کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک عرفانِ سلطان ہم راہ نہ تھا سب مجرم تھے۔ جب عرفان حاصل ہوا کہ ہمارا فعل عین فعلِ سلطان تھا۔ پھر جرم کیسا اور پھانسی کس کو! یہ سب بکھیڑا تو دوئی اور خود بینی میں ہے ؎

مردِ عارف کیست بے باک از ہمہ   آبِ صافی چیست او پاک از ہمہ

ایک روز ارشاد ہوا کہ کروڑوں میں کسی ایک کو فقر حاصل ہوتا ہے۔ اور جب حاصل ہوگیا تو پھر کسی طور سے زائل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ نقل ہے کہ غوث بہاء الحق زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ ایک روز بالاخانہ پر تشریف رکھتے تھے۔ زیرِ دیوار شور و غل مچا۔ معلوم ہوا کہ کوئی آدمی کوئیں میں گر پڑا ہے۔ آپ نے غرفہ میں سے ہاتھ بڑھا کر اس غریق کو تہہ چاہ سے نکال کر باہر کھڑا کر دیا۔ ایک فقیرِ شکستہ حال جو مردانِ خدا میں سے تھا۔ اُس طرف سے گذرا کیفیتِ صدورِ کرامت ملاحظہ کی اور کہا کہ صاحب زادہ! یہ تو بازیچۂ اطفال ہے اگر سیکھنا ہے تو فقر سیکھو!! آپ بامِ خانہ سے اُترے اور فقیر صاحب سے جا کر ملے۔ پوچھا کہ فقر کیا چیز ہے! اُنھوں نے جواب دیا کہ صاحب زادہ! فقر وہ شئے ہے کہ نہ حرام سے جائے نہ زنا سے بگڑے، نہ شراب سے خراب ہو، نہ چوری سے زائل۔ کوئی اس کو مٹا نہیں سکتا۔ وہ بے زوال اور پائیدار چیز ہے۔ آپ خاموش ہو کر گھر چلے گئے اور خیال کیا کہ اس شخص کا امتحان کرنا چاہیے کہ اپنے کام میں پکّا اور بات کا پورا ہے یا نہیں۔ اور اُس کا قول مطابقِ فعل ہے یا صرف دعوئی ہی دعوئی ہے۔ یہ سوچ کر ایک پلّا کتّے کا ذبح کیا۔ اُس کا قو پلاؤ دم کرایا۔ اور اپنی کنیز کو لباسِ فاخرہ پہنا کر سمجھا دیا کہ تو کچھ ہجر مجر مت کیجیو اور ایک بوتل شراب کی دی اور کہا کہ جا فلاں مقام پر ایک فقیر صاحب ہیں اُن سے کہہ کہ یہ سامانِ دعوت آپ کی خدمت میں ارسال کیا ہے۔ وہ تو جانتے ہی تھے کہ یہ امتحانی ضیافت ہے۔ پہلے تو شراب نوش کی پھر اُس کنیز کی بانگی دیکھی۔ پھر پلاؤ چٹ کیا۔ اور کہلا بھیجا کہ ان ڈھکوسلوں سے کیا ہوتا ہے۔

اشعار

اُن[1] سنتوں کی وارنی جن کے پورن منت — بھگت بیج پلٹی نہیں جی جگ جائیں انَنت
نیچ اُدتم پر کرت سے کیا کرے کُسنگ[2] — بکھ چندن لاگی نہیں جو لپٹی رہے بھونگ

کنیز نے جاکر تمام کیفیت بیان کی۔ جب تو حیرت میں آئے۔ اگلے روز گھوڑے پر سوار ہو ان کی ملاقات کو چلے۔ راہ میں ایک ندی تھی۔ جب بیچ دھار میں پہونچے تو گھوڑے نے لید اور پیشاب کیا۔ اُس کنارے سے فقیر بہ نوش للکارا! دیکھو! صاحب زادے! کیوں دریا کو ناپاک کرتے ہو۔ یہ بولے کہ واہ حضرت! بھلا کہیں لید و پیشاب سے دریا ناپاک ہوتا ہے۔ شاید آپ مسائلِ فقہ سے بھی واقف نہیں ہیں۔ مردِ فقیر ہنسا اور کہا کہ سبحان اللہ! آپ بھی خوب فقیہ ہیں کہ ذرا سی ندی تو لید و پیشاب سے گندہ نہ ہو اور معرفتِ الٰہی کا بحر ناپیدا کنار جس کی ابتدا نہ انتہا۔ کُتّے کے پِلّاؤ اور شراب و کنیزک سے ناپاک ہو جائے۔ حضرت بہاء الحق سمجھ گئے کہ حقیقت میں کشف و کرامت اور چیز ہے اور فقر دوسری شے ہے ؎

فقر حق ست و نہ حق از وے جدا — فقر لایحتاج باشد از خدا

از روے ارادت فقیر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے فرمایا کہ یہ چلّے اور چلّی جو مدت العمر سے آپ کیا کرتے ہیں، اُن کو ترک کیجیے اور مردانِ خدا کا طریقہ اختیار فرمائیے۔ اتنی بات کہہ کر چل دیے۔ پس فقیری کا حاصل کرنا اور فقیر بننا آسان بات نہیں ہے۔ بلکہ جب تک تمام مقاصدِ دین و دنیا اور مراتب و مدارج اور کشف و کرامت کو ترک نہ کرے اور نامرادی و ناکامی کے میدان میں قدم نہ رکھے فقر کی ہوا بھی نہیں لگتی ؎

تا ایماں کفر و کفر ایماں نہ شود — یک بندۂ خاصِ حق مسلماں نہ شود
تا مدرسہ و منارہ ویراں نہ شود — یک کارِ قلندری بہ ساماں نہ شود

بڑے بڑے ہوشیار اور علمائے فضیلت شعار اور زاہدانِ پرہیزگار مراتب و مدارج

---

[1] یعنی اُن مردوں کے قربان جایئے کہ جن کے قلب سلیم میں بیج فقر کا ہرگز خراب نہیں ہوتا اگر جہان اُلٹ پلٹ جائے ۱۲

[2] یعنے بڑا آدمی نیکوں سے کچھ بُرائی نہیں کرسکتا جیسے درخت صندل کو زہر کچھ اثر نہیں کرتا باوجودے کہ سانپ لپٹے رہتے ہیں ۱۲ منہ۔

اور منازل و مقامات اور کشف و کرامات پر فریفتہ ہو کر فقر سے رہ جاتے ہیں اور انھیں معراجِ کمال سمجھ کر بیٹھ رہتے ہیں ؎

جلیں گڑیں بڑیں اُڑ جائیں ۔ پر کایا پر دیش کرائیں
اور پرائے من کے جانے ۔ چل کر جائیں تہاں من مانے
بھولیں چھان چتر اور گیانی ۔ ان کو تجے بھگت تن جانی

اور اس زمانہ میں تو فقیری مرید ہوتے ہی حاصل ہو جاتی ہے۔ جہاں رنگین کپڑے پہنے اور حال کھیلنے لگے پھر تو کچھ شک و شبہ ہی باقی نہیں رہتا۔ پورے قطب الاقطاب و غوث الاعظم اور شیخ المشائخ بن کر اَنَا خَیْرٌ مِّنْ کُلِّ الْمَوْجُوْدَاتِ کا دم بھرنے لگتے ہیں ؎

معرفت کا رنگ جس کو نا ہوا ۔ گیروے کپڑے کیے تو کیا ہوا
در قزاگند مرد باید بود ۔ بر مخنث سلاحِ جنگ چہ سود
سرِ مد غمِ عشق بو الہوس را نہ دہند ۔ سوزِ دلِ پروانہ مگس را نہ دہند
عمرے باید کہ یار آید بکنار ۔ ایں دولتِ سرمد ہمہ کس را نہ دہند

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہم کو ایک نقل یاد آئی کہ حضرت شبلی نے جنگل میں ایک کھوپڑی پڑی پائی اُس پر بخطِ سبز تحریر تھا خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ۔ جو شخص اُس کو دیکھتا ٹھوکر مارتا کہ لاحول ولاقوۃ، کوئی بڑا ہی مردودِ ازلی ہے جس کی پیشانی پہ داغِ شقاوت لگایا گیا ہے حضرت نے اُس کو نہایت ادب و تعظیم سے اُٹھایا اور بڑے اُنس و محبت سے اُس پر بوسہ دیا۔ لوگوں کو حیرت دامن گیر ہوئی۔ پوچھا کہ آپ نے اس کی تعظیم و تکریم کیوں کی؟ فرمایا کہ میاں! یہ کھوپڑی کسی مردِ کامل کی ہے کیوں کہ جس کو خسرانِ دنیا و آخرت کا مرتبہ حاصل ہو، وہی واصل بہ حق ہوتا ہے اَلْفَقْرُ سَوَادُ الْوَجْہِ فِی الدَّارَیْنِ ؎

---

[1] یعنے یہاں چلے اور جگہ ظاہر ہو گئے اور یہاں دفن ہوئے اور جگہ موجود ہو گئے یہاں غرق ہوئے دوسری جگہ نکل آئے اور یہاں سے اُڑ کر دوسرے شہر میں پہونچ گئے یا دوسرے کے جسم میں چلے گئے یا دوسرے کے دل کا حال معلوم کر لیا یہ مقام ایسا ہے کہ بڑے بڑے ہوشیار مراتب میں رہ جاتے ہیں جب تک اُن کو ترک نہ کرے فقر محال ہے ۱۲ [2] نقر دونوں جہان میں روسیاہی ہے ۱۲ منہ۔

چاشنیِ دردِ عشق قابلِ ہر سفلہ نیست — نہ ہر ز خوانِ شہاں ناموے رادہند
اسرارِ محبت را ہر دل نہ بود قابل — دُر نیست بہ ہر دریا زر نیست بہ ہر کانے

ایک شب[۱۸۱] ارشاد ہوا کہ ایک جوہری تھا۔ جب مرنے لگا تو اپنے فرزند کو وصیت کی کہ میں تیرے واسطے ایک صندوق چھوڑتا ہوں۔ اُس میں ایک تو جوہر بیش بہا ہے اور ایک پتھر ہے، تو کسی جوہر شناس کو دکھالینا وہ بتادے گا۔ جب باپ کا انتقال ہوگیا تو جوہری بچہ ایک جوہری کے پاس اپنا جوہر اور پتھر لے گیا اور شناخت کی درخواست کی۔ اُس نے کہا کہ تو پانچ برس تک میری ملازمت اختیار کر تب بتاؤں گا۔ وہ راضی ہوگیا اور پانچ سال تک جوہری کی دُکان پر کام کرتا رہا۔ اس عرصہ میں اقسام وانواع کے جواہرات اس کی نظر سے گذرے۔ یہاں تک کہ اُس کو ایک بصیرت اور ملکہ شناختِ جواہرات کا حاصل ہوگیا۔ بعد مدتِ موعود کے سوال کیا کہ صاحب! اب وعدہ پورا کیجیے۔ اُس نے کہا کہ اچھّا اب اپنے جواہر لاؤ۔ لایا تو پوچھا کہ اب تو خود بتا کہ ان میں جوہر کون سا ہے۔ اُس نے فوراً پہچان لیا۔ اُس وقت جوہری نے کہا کہ میری غرض اس تامل سے یہی تھی کہ تو خود عارفِ جوہر ہو جائے اگر اوّل روز میں بتادیتا تو نہیں معلوم تجھ کو یقین آتا یا نہ آتا۔ اور تو کس قیمت پر اُس کو دے ڈالتا اب کہ تجھ کو عرفان حاصل ہوگیا اور تو خود واقف و شناسا ہوگیا، اختیار ہے جو چاہے سو کر۔ کسی کا دھوکا نہیں کھا سکتا۔

علم آموزی طریقش قولے است — حرفت آموزی طریقش فعلے است
فقر خواہی آں بصحبت قایم است — بے زبانت کار می آید نہ دست
دانشِ انوار است در جان رجال — نے ز راہ دفتر و نے قیل و قال

ایک شب[۱۸۲] ارشاد ہوا کہ ایک مقام پر کوئی انگریز خیمہ زن تھا۔ جنگل میں دیکھا کہ سپیروں کا مجمع ہے۔ حال دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس مقام پر ایک سوراخ میں کلی ناس سانپ رہتا ہے۔ اُس کا یہ خاصہ ہے کہ اگر ایک شخص کو کاٹے تو اُسکے تمام خاندان کا ناس ہو جائے۔ اور اُس کی پھنکار سے درخت تک جل جاتے ہیں۔ کوئی سپیرا یہاں ایسا نہیں کہ اُس کو پکڑ سکے اس واسطے بڑے بڑے افسوں گر بنگالہ سے بلائے گئے ہیں اُن کے انتظار میں

یہ لوگ پڑے ہیں۔ صاحب نے اُن سے کہا کہ کچھ پروا نہیں تم لوگ اُس کے سوراخ کے گرد اگرد لکڑیوں کا ڈھیر لگا دو اور بین بجاؤ کہ وہ نکلے۔ ایسا ہی کیا گیا۔ سانپ نکلا اور پھنکار ماری تو لکڑیوں میں آگ لگ گئی۔ آگ سے ڈر کر ہر جانب دوڑنے اور پھنکار مارنے لگا۔ اس سے سب طرف آگ لگ گئی۔ آخر اُسی آگ میں جل بھُن کر خاک ہو گیا اُسی کی آگ تھی جس نے لکڑیوں میں سرایت کی اور بھڑک اُٹھی۔ اور وہ اپنی ہی آگ سے خوف کرنے لگا۔ یہاں تک کہ جل مرا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہمارے دوست مولوی محبوب علی صاحب جب زیارتِ بیت اللہ شریف سے مشرف ہو کر واپس آئے تو اُنھوں نے کہا کہ ہم بمبئی سے چل کر ایک بستی میں آئے۔ وہاں چند روز رہنے کا اتفاق ہوا۔ شب کو نمازِ تہجّد کے لیے مسجد میں گئے تو دیکھا کہ مؤذّن ذکر میں مشغول ہے۔ جب لا کھینچتا ہے تو غائب ہو جاتا ہے اور الا اللہ کہتا ہے تو موجود۔ یہ دیکھ کر مجھ کو حیرت ہوئی۔ بعد نمازِ فجر مسجد سے باہر نکلا تو دیکھا کہ قریب مسجد کے ایک کنچنی کا مکان ہے۔ اور اُس کے دروازہ پر ایک فقیر لنگوٹ بند بیٹھا ہے۔ مجھ کو دیکھتے ہی بولا کہ مولوی صاحب! آپ کو تو بڑا ہی تعجب ہوا۔ خیر کل ہم بھی تماشا دکھائیں گے۔ دوسرے دن میں بوقت تہجّد مسجد میں آیا تو وہ فقیر بھی آموجود ہوا۔ غسل کیا اور میری چادر باندھ لی پھر نفی اثبات کرنے لگا۔ جب لا کو کھینچتا تھا تو اُس وقت میں اور نہ فقیر اور مسجد سب نفی ہو جاتی تھی بلکہ میرا علم بھی مفقود ہو جاتا تھا۔ اسی طرح دس بارہ ضربیں لگائیں پھر لنگوٹ باندھ کر چل دیا اور کہا مولوی صاحب! اس کو فقیری نہیں کہتے یہ تو ایک شعبدہ ہے۔ فقیری کچھ اور ہی چیز ہے جو زبان پر نہیں آسکتی۔ ع

نکتہ داں را گنگ باید شد ز حرف

صبح کو میں نے دیکھا تو وہ فقیر صاحب رنڈیوں کے چانٹے اور جوتیاں کھا رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ حضرت یہ کیا؟ فرمایا کہ ہمارے واسطے یہی حکم ہے کہ حرام کے لقمے کھانا اور جوتیوں کی مار سہنا، نہ روزہ ہے نہ نماز، نہ حج ہے نہ زکوٰۃ۔ اس کے بعد جناب وقبلہ نے ارشاد فرمایا کہ اگر نفی و اثبات میں کمال حاصل ہو جائے تو کیا ہے۔ خدا کا پتہ تو اس صورت میں بھی نہیں لگتا۔

بروایں دام بر مرغِ دگر نہ — کہ عنقا را بلند ست آشیانہ

۱۸۱ **ایک روز ارشاد ہوا** کہ کسی نصرانی کے گلے میں صلیب تھی دیکھا تو نہ دارد۔ نہایت تشویش ہوئی۔ جابجا ڈھونڈھا، تلاش کیا، کہیں پتہ نہ ملا۔ ایک شخص نے اُس کو پریشان حال دیکھ کر کیفیت دریافت کی۔ کہا کہ میرے گلے میں صلیب تھی وہ گم ہو گئی ہے۔ وہ ہنسا اور کہا کہ تم ناحق تردّد میں مبتلا ہو۔ صلیب گم نہیں ہوئی، ہم تلاش کر دیں گے۔ جب اُس کو بہت اضطراب اور بے قراری ہوئی تو اُس نے گردن کے پیچھے سے اُٹھا کر سامنے کر دی اور کہا کہ تیرے ہی گلے میں پڑی ہے۔ یہ تمام فکر و تردّد اُس وہم کا ہے جو دل میں بیٹھ گیا ہے

دوست نزدیک تر از من بہ من است — ویں عجب تر کہ من از وے دورم

پس ہادی و مرشد صرف تعلیم کر دیتا ہے، ورنہ جو بات ہے وہ عالم و جاہل کے لیے برابر ہے اور ہر ایک کی ذات میں موجود ہے نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ[۱]۔ سمجھ اپنی اپنی جدا ہے کسی کو علم ہوتا ہے کسی کو نہیں۔ کوئی جلد سمجھتا ہے کوئی بہ دیر، جیسے تہہ زمین میں پانی سب جگہ موجود ہے کہیں دور نکلتا ہے کہیں پاس۔

۱۸۲ **ایک روز ارشاد ہوا** کہ حضرت[۲] عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک عورت تھی اُس کو اپنے شوہر سے بدرجۂ غایت محبت تھی، لیکن شوہر کو نہایت نفرت۔ ہر طرح کی تدبیریں کیں کوئی کارگر نہ ہوئی۔ اُس نے سُنا کہ مدینۂ منورہ میں ایک عورت بڑی ساحرہ ہے۔ ناچار اُس کے پاس گئی اور اپنا دردِ دل ظاہر کیا۔ اُس نے کہا کہ اچھا میں تجھ کو سلطان الساحرین کے پاس لے چلتی ہوں، وہ کچھ علاج معقول کر دے گا۔ رات کے وقت دونوں مدینۂ طیبہ سے باہر نکلیں۔ دیکھا کہ دو جانور[۳] سیاہ رنگ دگدھے کے برابر کھڑے ہیں۔ دونوں سوار ہو کر روانہ ہوئیں۔ آناً فاناً میں ملک عراق کے اندر چاہِ بابل کے کنارہ جا اُتریں، جہاں ہاروت ماروت آویختہ ہیں۔ وہ ساحرہ کنوئیں کے اندر گئی اور اپنے ساتھ والی کی شفارش کی۔

---

۱ ہم قریب تر ہیں طرف بندے کے گردن کی شہ رگ سے ۱۲ ۲ اس قصہ کو تفسیر بحر الحقائق و کشف البیان نے آیۃ فیتعلمون منہما ما یفرقون بہ بین المرء وزوجہ کی تفسیر میں بروایت ہشام از پدر خود از عائشہ صدیقہ بیان کیا ہے ۱۲ ۳ تفسیر بحر الحقائق میں دو جانور بصورت کبش سیاہ اور کشف البیان میں دو جانور بصورت سگ سیاہ لکھا ہے ۱۲ منہ۔

وہ دونوں سیدھے ہوکر بیٹھ گئے اور کہا کہ بلاؤ۔ عورت گئی اور اپنا تمام حال بیان کیا۔ پہلے تو اس کو سمجھایا کہ تو جادو نہ سیکھ اہلِ اسلام کو یہ بات زیبا نہیں مگر اُس عورت نے اصرار کیا۔ ہاروت وماروت نے کہا کہ خیر تیری خوشی۔ باہر ایک تنور ہے جا اور اُس میں پیشاب کر۔ وہ عورت گئی اور یوں ہی بیٹھ کر چلی آئی پیشاب نہ کیا۔ واپس آئی تو پوچھا کہ کیا دیکھا۔ اُس نے کہا کچھ بھی نہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تو نے پیشاب نہیں کیا۔ پھر جا اور پیشاب کر اُس نے دوسری بار بھی ایسا ہی کیا۔ تب فرشتوں نے کہا کہ جب تک پیشاب نہ کرے گی مطلب حاصل نہ ہوگا۔ ناچار تیسری بار اُس نے پیشاب کیا اور دیکھا کہ ایک سفید چیز جسم کے اندر سے نکلی اور ایک سیاہ چیز داخل ہو گئی۔ اُن سے آکر یہ کیفیت بیان کی کہا کہ جا! اب تو پوری ساحرہ ہو گئی۔ جس طرح گئیں تھیں دونوں رخصت ہوکر واپس چلیں لیکن اُس عورت کا تردّد نہ گیا۔ پہلی ساحرہ نے پوچھا کہ اب کس لیے پریشان ہے اُس نے کہا کہ مجھ کو تشفی و اطمینان کیا خاک ہو! نہ کوئی جنتر نہ منتر، نہ پڑھنت نہ تعلم نہ تلقین۔ میں تو جیسی تھی ویسی ہی اب بھی ہوں۔ اُس نے جواب دیا کہ یہاں پڑھنے پڑھانے کی کچھ حاجت نہیں۔ شاید تجھ کو اپنے سحر آموزی پر یقین نہیں ہوا۔ ذرا اس درخت کی طرف جو سامنے ہے بہ نظرِ غضب دیکھ۔ اُس نے جو دیکھا تو درخت فی الفور خشک ہو گیا۔ پھر کہا کہ اب بنظرِ رحمت دیکھ۔ رحمت کی نظر ڈالی تو معًا سرسبز ہو گیا۔ کہا کہ اب بھی تجھ کو یقین آیا یا نہیں۔ بس تیرے ارادے پر موقوف ہے جو چاہے گی وہ ہو جائے گا۔ تب اُس عورت کو اطمینان ہو گیا گھر میں آئی اور شوہر کو بہ نظرِ محبت دیکھا۔ اُسی دم مطیعِ فرمان ہو گیا۔ ایک روز اظہارِ محبت کے لیے اپنے شوہر سے یہ تمام ماجرا کہہ دیا کہ تمھارے واسطے ایسی مشقت اُٹھائی۔ جادو سیکھ کر تم کو بس میں کیا اور طرح طرح کے جادو اور طلسم اُس کو دکھائے۔ وہ شخص نہایت حیران و پریشان ہوا۔ جب صبح ہوئی تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں اُس کو لے گیا اور تمام حال اُس کا بیان کیا۔ آپ نے غسل کا حکم دیا۔ پھر فرمایا کہ اب کلمۂ شہادت پڑھ۔ اُس نے کلمۂ توحید پڑھا۔ کچھ معلوم نہ ہوا آپ نے فرمایا کہ نہیں کلمۂ شہادت پڑھ۔ غرض تیسری دفعہ اُس نے کلمۂ شہادت پڑھا اُس وقت ایک سیاہ چیز جسم کے اندر سے نکلی اور ایک سفید چیز

داخل ہوئی۔ جناب وقبلہ نے فرمایا کہ سبحان اللہ! کیا ایمان اور کیا کفر ہے!! کبھی خارج ہوا اور کبھی داخل۔ مگر جاننے والے خوب جانتے ہیں اس میں عجب باریک اسرار ہیں ؎

اگر در خانہ کس است حرفے بس است

ایک[۱۹۰] روز ارشاد ہوا کہ حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا کو کسی شخص نے رنڈی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ چوں کہ آپ نہایت حسینہ و جمیلہ تھیں اُس نے زیور و لباس سے حُسنِ خداداد کو جلا دے کر اُن کو بالاخانہ پر بٹھا دیا۔ مشتاقوں کا ہجوم ہونے لگا۔ مگر بوقتِ شب جس شخص کو نائکہ اُن کے پاس بھیجتی، اُس سے کہتیں کہ اوّل وضو کر کے دوگانہ پڑھ لو۔ جہاں دوگانہ پڑھا اور حضرت رابعہ نے ہمتِ باطنی مبذول کی۔ پھر تو اُس شخص کی آنکھیں کھل جاتی تھیں اور صبح کو چُپ چاپ چلا جاتا تھا ؎

نازم بہ چشم خود کہ جمالِ تو دیدہ است — اُفتم بہ پائے خود کہ بہ کویت رسیدہ است
ہر روز بوسہ ہا زنم ایں دستِ خویش را — کو دامنت گرفتہ بہ سویم کشیدہ است

سال بھر تک اسی طور سے فیض جاری رہا کہ جو شخص ایک شب اُن کے پاس رہا وہ پھر نہ آیا ؎

قدغن ہے کہ اس گھر میں کوئی آنے نہ پائے — گر لے خبر آجائے تو پھر جانے نہ پائے

نائکہ نے خیال کیا کہ یہ کیا بات ہے۔ جو شخص ایک دفعہ آتا ہے دوبارہ صورت نہیں دکھاتا۔ اس کے حسن و جمال اور ناز و ادا اور صورت و سیرت میں کسی طرح کی کسر نہیں لیکن ؎

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

ایک رات پوشیدہ ہو کر نائکہ نے تمام کیفیت دیکھ لی۔ صبح کو اُن کے قدموں پر گر پڑی کہ میرا قصور معاف کرو۔ مجھ کو حال معلوم نہ تھا۔ آج سے میں نے تم کو آزاد کیا۔ فرمایا کہ ارے احمق تو نے مجھ کو کیا آزاد کیا، فیض برباد کیا۔ خیر مرضیٔ خدا ایسی تک تھی۔

ایک[۱۹۱] روز ارشاد ہوا کہ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ایک روز نمازِ فجر کے لیے مسجد میں تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ ایک شخص قبلہ رو پہلوئے راست پر سو رہا ہے۔ خیال کیا کہ شاید نماز پڑھ کے سو گیا ہے۔ پھر ظہر کے وقت گئے تب بھی اُسی کروٹ سے سوتے پایا۔ پھر عصر و مغرب کے اوقات میں بھی وہی کیفیت دیکھی۔ جب وقتِ مغرب

تنگ ہونے لگا تو اُس کو جگایا اور فرمایا کہ نماز قضا ہوئی جاتی ہے۔ وہ شخص جاگا اور وضو کر کے اوّل نمازِ فجر کی نیّت کی تو سب دیکھتے ہیں کہ ٹھیک صبح کا وقت اور نور کا تڑکا ہے۔ اُس نے ظہر کی نیّت کی تو وقت ظہر معلوم ہونے لگا۔ اور جب عصر کی نیت باندھی تو وقت عصر موجود تھا۔ اور مغرب کی نیت کی تو مغرب کا۔ پھر مجدّد صاحب سے اُس نے کہا کہ نماز کے لیے تو آپ نے جگا دیا مگر میرا حال نہ پہچانا کہ کیا ہے۔ بھلا اُس حالت کے روبرو نماز کیا شے ہے۔ لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ نماز کچھ شے نہیں۔ البتہ ایسی حالت کے فقیر ہر وقت نماز میں رہتے ہیں گو ظاہر میں نماز نہ پڑھیں۔

ایک[۱۹۱] روز ارشاد ہوا کہ ایک درویش کو از راہِ کشف معلوم ہوا کہ ایک آدمی مسجد کے اندر فعلِ شنیع کر رہا ہے۔ چوں کہ نیا نیا عرفان حاصل ہوا تھا درویش کے دل میں جوشِ غضب پیدا ہوا اور ہمّتِ باطن سے مسجد اُلٹ دی۔ اُس کے مُرشد کو خبر ہوئی، کہا کہ ہیں! یہ کیا کیا! مُرید نے جواب دیا کہ حضرت خانۂ خدا اور ایسا فعل!!! مجھ کو تحمّل نہ ہو سکا۔ مُرشد نے کہا کہ اے احمق! تو کون تھا؟ جس گھر میں یہ فعل ہو رہا تھا کیا اُس کا مالک علیم و بصیر و خبیر نہ تھا۔ تو نے کیوں دخل دیا؟ ؎

برنقشِ خود است فتنۂ نقاش کس نیست دریں میاں تو خوش باش

غرض یہ ہے کہ فقیر اللہ تعالیٰ کے کاموں میں دخل نہیں دیتے۔ نہ کسی کے لیے دُعا کرتے ہیں نہ کسی کے واسطے بد دُعا۔

ایک[۱۹۲] روز ارشاد ہوا کہ ہم کو ایک نقل یاد آئی۔ ایک راجہ تھا۔ وہ ہردوار میں آیا اور منادی کرائی کہ فلاں تاریخ گنگا کے کنارے بڑا بھاری دان کروں گا جس کو لوٹنا ہو آئے۔ اور لوٹے تاریخِ مُعینہ پر خلقت جمع ہوگئی۔ راجہ نے کنارۂ دریا پر قسم قسم کے میووں اور طرح طرح کے کھانوں اور عمدہ عمدہ پوشاکوں اور آرائش کی چیزوں کے ڈھیر لگا دیے۔ اور ایک چھوٹی سی کشتی مرصّع و رنگین، تمام ساز و سامان سے آراستہ کرائی۔ اُس پر فانوس روشن کیے گئے اور بیچ میں ایک گھڑا سر بہ مُہر رکھوایا جس پر عجیب و غریب نقاشی اور طلائی کام

لہ ایک روز کسی شخص نے یہ سوال کیا کہ معرفت اور وصول الی اللہ کے کیا معنی ہیں اُس کے جواب میں زبان فیض ترجمان سے یہ ارشاد فرمایا تھا۔۱۲

ہو رہا تھا۔ وہ کشتی منجدھار میں چھوڑی گئی اور حکم عام دیا گیا کہ جس کا جی چاہے لوٹ لے۔ لوگ ٹوٹ پڑے اور اپنی خواہش کے موافق لوٹنے لگے وہ کشتی جو اس شان و شوکت سے دیکھی سمجھے کہ بڑی دولت اور بیش بہا جواہر ضرور اس کشتی میں ہوں گے۔ اس طمع میں ہزاروں آدمی دریا کے اندر کود ے۔ کوئی کنارہ پر ڈوبا، کوئی دو قدم چل کر، کوئی چار قدم چل کر۔ غرض بہت سی جانیں تو کشتی کی آرزو ہی میں گئیں، لیکن چند آدمی ہاتھ پاؤں پیٹ کر کشتی تک جا پہونچے اور بڑے ذوق و شوق کے ساتھ اُس گھڑے کو کھولا۔ دیکھا تو بالکل خالی۔ بس اسی پر تم اپنے سوال کا جواب قیاس کر لو ؎

اگر در خانہ کس است حرفے بس است

ایک[۱۹۴] روز ارشاد ہوا کہ فقیری میں صحبت کو بڑا اثر ہے۔ اور مردانِ خدا نے اسی کو جزوِ اعظم سمجھا ہے ؎

یک زمانے صحبتے با اولیا ۔۔۔ بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

جو باتیں بچپن سے دل میں سمائی ہیں وہ کانوں کی راہ سے آئی ہیں اور کانوں کے راستہ سے نکلیں گی ؎

بھو بھاگت بھاگے ۔۔۔ رنگ لاگت لاگے
بہت دنوں کا سویا منوا ۔۔۔ جاگت جاگت جاگے

یعنی رفعِ اوہام اور شکوک کے لیے ایک مدت چاہیے ع

عمرے باید کہ یار آید بہ کنار

مگر اس زمانہ کے لوگوں کا تو یہ حال ہے کہ آج مُرید ہوئے وظیفہ پوچھ کر گئے دوسرے دن ہی اگر شکایت کرتے ہیں کہ کچھ اثر نہیں ہوا۔ یہ نہیں سوچتے کہ عمر بھر کی کثافت کو ایک دن کا وظیفہ کیا دور کر سکتا ہے۔ اور مُرشد کو ایسی کیا غرض پڑی ہے کہ اپنی صفائی وقت کو چھوڑ کر دوسرے کے حال پر متوجہ ہو۔ بالفرض ایسا بھی کرے تو مُرید کا تمام عمر کا علم مٹانا اور اس کی بجائے اپنے علم کو جمانا کوئی ہتھیلی کی سرسوں تو ہے نہیں۔ ہاں رفتہ رفتہ عرصۂ دراز کی صحبت میں اصلاح خوب ہوتی ہے۔ اگر دفعۃً نظر ڈالی جائے تو مُرید سے تحمّل کب ہو سکتا ہے۔ جیسے میاں

جعفر شاہ بٹالوی نے ہمارے ہم سبق کو مار دیا تھا۔ طریقہ تعلیم کا بتدریج ہے۔ جس طرح لوہار لوہے کو گرم کرتا ہے، پھر چوٹ لگا کر بڑھاتا ہے یا سُنار آہستہ آہستہ کوٹ پیٹ کر تار کو بار بار جنتری میں نکالتا ہے، تب وہ درستی کے ساتھ تیار ہوتا ہے۔ اگر بے ڈھنگے طور پر زور لگائیں تو کیا ہوگا۔ فوراً چیز ٹوٹ پھوٹ کر خراب و ضائع ہو جائے گی، پس ہر کام میں صبر ضرور ہے ؎

در بلا صبر ے بباید مرد را   صبر خود کے باشد اہلِ درد را

ایک[۱۹۴] روز ارشاد ہوا کہ ہم کو ایک نقل یاد آئی ہے۔ کسی چیلے نے اپنے گرو سے شکایت کی کہ گرو جی مجھے چار سال ہو گئے اب تک کچھ اثر تب نہیں ہوا، ہنوز روزِ اول ہے۔ کہا اچھا! دیکھا جائے گا۔ دوسرے روز گرو جی نے بھنگ گھوٹ کر خود بھی پی اور اُس چیلہ کو بھی پلا دی۔ تھوڑی دیر کے بعد پوچھا کہو چیلے جی! کیا حال ہے۔ کہا گرو جی کچھ نہ پوچھو! ایک دھوندو کال ہے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ گرو نے کہا کہ یہاں دھوندو کال کے سوا اور کچھ نظر نہیں آئے گا۔ بس اسی دھوندو کال میں سب چلے گئے تو بھی چلا جا۔ سو صاحب یہاں سوائے توحید کے اور کیا رکھا ہے جو نظر آئے اور اگر کسی نے کچھ دیکھا ہے تو یہ اُس کے تخیلات اور وہمیات پر محمول ہے۔ ان شعبدات کا کیا اعتبار۔ اللہ تعالیٰ ان سب سے مُنزّہ و مُبرّا ہے پس ماسوا اللہ سب ہیچ ہے ؎

ئے صِرفِ وحدت کسے نوش کرد   کہ دنیا و عقبیٰ فراموش کرد

ایک[۱۹۵] روز ارشاد ہوا کہ ؎

سالکے پرسید از شبلی سوال   گفت ما التوحید اے صاحب خصال

گفت شبلی ہر کہ بد ہد ایں جواب   ثابت است الحاد او زاہم عذاب

چوں کسے ثابت شود توحیدِ او   مشرک است در عالم سر نگو

لہ جناب قبلہ کے ایک مرید نے اپنے دوست کو لکھا کہ مجھے خاندان نقشبندیہ میں مرید فرما کر تعلیم فرمائی اور چند روز میں بہت فیض فائدہ پہونچا۔ دوسرے صاحب پرانے مرید تھے اُن کو قلق ہوا کہ افسوس ہم اب تک محروم رہے۔ اتفاق سے جب وہ حاضر خدمت ہوئے تو اثنائے گفتگو میں حضرت قبلہ نے اپنی زبان فیض ترجمان سے یہ ارشاد فرمایا ۱۲۔

ہر کہ بہ شناسد بتوحیدش خدا — کافرست آں مرد در ہر دو سرا
سوئے توحیدش اشارت ہر کہ کرد — بت پرست او را بداں اے نیک مرد
گر کسے دارد ز توحیدش سوال — جاہل ست آں مرد نبود اہلِ حال
دم مزن ایں جا نشاید دم زدن — ہرچہ گوئی نیست حق وہم ست و ظن
صورت از بے صورتے گردد عیاں — ہمچناں صورت شود بے جسم و جاں
روح پنہاں است و صورت شد عیاں — فہم از معنی بود صورت بیاں
لفظ بے حرف است و حرف از لفظ شد — معنی و صورت یکے باشد بخود
عارفاں ہستند ایں جا بے نشاں — بے بصر بے سمع بے حس بے زباں
عقل ایں جا ہست سرگرداں و خام — نیست مدرک در معانی فہم عام

ایک روز[۱۹۶] ارشاد ہوا کہ ایک رنگریز تھا۔ جب کوئی شخص اُس کے پاس کپڑا رنگنے کے واسطے لاتا اور کہتا کہ فلاں قسم کا رنگ مطلوب ہے تو وہ کہتا کہ میاں صاحب! یوں تو ہر قسم کا رنگ مجھ کو رنگنا آتا ہے، لیکن میرے نزدیک تو سیاہ بھُجنگ سب سے بہتر ہے۔ بس ہم سے پوچھو تو توحید کے سامنے سب مدارج و مراتب ہیچ ہیں، لیکن یہ ایسی بات نہیں کہ تم کو زبانی بتادیں، نہ کوئی اس کی کتاب ہے کہ سبق پڑھا دیں، کیوں کہ یہ امر حال و وجدان سے ہے نہ قال و بیان سے۔ عبارت و اشارت میں اس کی گنجائش نہیں۔ دیکھو اس حجرہ کو اگر کہا جائے کہ عین درگاہِ قلندر صاحب ہے تو یہ بھی غلط اور اس کا عکس بھی غلط۔ اور دونوں صحیح بھی ہیں۔ ع

سمجھنے کی ہے بات کہنا نہیں

ایک روز[۱۹۷] ارشاد ہوا کہ مدارج دینی و دنیوی جب تک پروردگار نہ عطا فرمائے اپنی کوشش سے حاصل نہیں ہوتے۔ ہزارہا اولیاء اللہ گذرے اور صدہا غوث و قطب گذرے لیکن درجہ محبوبِ سبحانی۔ غوث الاعظم شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کو عطا فرمایا۔ اور درجہ محبوبِ الٰہی۔ سلطان المشائخ نظام الدین چشتی بداؤنی قدس سرہٗ کو عطا فرمایا۔ ؎

جاکو وہ چاہے وہی سہاگن ہوئے

یہ درجۂ محبوبیت سوائے ان دو بزرگوار کے اور کسی ولی کو اللہ جل شانہٗ نے مرحمت نہیں فرمایا۔

ایک ۱۹۸ روز ارشاد ہوا کہ علامتِ نفر خاکستر ہونا ہے یعنی جس طرح خاکستر خوشبو اور بدبو دونوں کو ڈھانپ لیتی ہے اسی طرح فقیر بھی لوگوں کے عیب و صواب اور نیک و بد پر نظر نہیں کرتا ؎

گرچہ تیر از کماں ہمی گذرد | از کماں دار بیند اہلِ خرد
از خدا داں خلافِ دشمن و دوست | کہ دلِ ہر دو در تصرف اوست

ایک ۱۹۹ روز ارشاد ہوا کہ یقین کی تین قسمیں ہیں۔ایک علم الیقین، دوسری عین الیقین، تیسری حق الیقین۔دیکھو یہ گھڑا جو سامنے دھرا ہے۔تم اس کی صورت دیکھ کر جان سکتے ہو کہ اس کے اندر پانی ضرور موجود ہے، جو صاف وسفید وسیّال ہے اور جو تشنگی کو رفع کرتا ہے۔پس یہ علم الیقین ہے۔لیکن جب تم اُس گھڑے کا ڈھکنا اُٹھا کر آنکھ سے دیکھ لو کہ بے شک اس کے اندر پانی ہے اور وہ اُن تمام صفات سے موصوف ہے تو یہ یقین عین الیقین ہے۔پھر تم گھڑے میں سے پانی انڈیل کر پی لو، تو اُس وقت پانی کی حقیقت ایسی منکشف اور عیاں ہو جائے گی کہ علم اور عین دونوں پر پانی پھر جائے گا۔تم میں اور پانی میں کوئی واسطہ اور حجاب باقی نہ رہے گا، بلکہ تمھاری اور اُس کی حقیقت واحد ہو جائے گی۔یہ حق الیقین ہے۔

ایک ۲۰۰ روز ارشاد ہوا کہ طےِ سلوک تک پیر کا واسطہ رہتا ہے مگر منزلِ عرفان کے بعد جو قرب مرید کو حاصل ہوتا ہے۔اُس کی خبر پیر کو بھی نہیں ہوتی، جیسے دولھا دُلھن کے ہر کام کے کفیل اُن کے ماں باپ ہوتے ہیں، مگر پردۂ خلوت کے اندر جو کیفیت پیش آتی ہے اُس کو اُن دونوں کے سوائے کوئی غیر نہیں جان سکتا ؎

حالِ خلوت شاہ داند یا عروس

ایک ۲۰۱ روز ارشاد ہوا کہ خاندانِ نقشبندیہ میں تو صفائی اور معلومات مبتدی کا دل بہلاتی اور ہمت بڑھاتی ہیں۔ایسے ہی خاندانِ چشتیہ میں ذوق و شوق کی چاٹ طبیعت کو اُچاٹ نہیں ہونے دیتی۔مگر خاندانِ قادریہ میں مبتدی کو بجز بے حاصلی کے

اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اسی لیے بعض طالب مایوس ہو کر ہمت کھول دیتے ہیں۔ البتہ مدتِ دراز اور مجاہدۂ کثیر کے بعد آخر میں یہ کیفیت ہوتی ہے کہ گویا دفعۃً صور پھونک دیا یا کنواں کھودتے کھودتے یک بارگی بم پھٹ گئی۔ پھر تو سبحان اللہ! سب کیفیتیں اس کے سامنے گرد ہیں۔ اور اگر طالب کو کچھ حاصل نہ ہوا اور اس راہ میں کھپت رہا تو یہ ہزار مُراد سے بہتر ہے۔ کیوں کہ راہِ خدا میں حاصل وحصول کیا، جو قدم اُس طرف اُٹھا، وہی نقدِ وقت ہے۔

ایک[۲۰۲] روز ارشاد ہوا کہ نطفہ لے قرار پانے کو تو ایک ہی صحبت بس ہے ورنہ ہزار میں بھی کچھ نہیں ہو سکتا۔

ایک[۲۰۳] روز ارشاد ہوا کہ ریاضت و مجاہدہ بھی ایک امر ضروری ہے دیکھو جب کہربا کی قوّت دھیمی پڑ جاتی ہے تو رگڑنے سے پھر تیز ہو جاتی ہے اسی طرح طالب کا قلب مجاہدہ سے تر و تازہ رہتا ہے۔

ایک[۲۰۴] روز ارشاد ہوا کہ حضرت مخدوم علاؤ الدین صاحب صابر قدس سرہ کو اس قدر جلال تھا کہ جو شخص یا جو چیز آپ کے سامنے آتی سوختہ ہو جاتی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مخدوم صاحب کو تجلّیِ ذات و مشاہدۂ ذات دوامی تھا اور ایسا مشاہدہ و جلال چند ہی اولیاء اللہ کو ہوا ہے۔

ایک[۲۰۵] روز ارشاد ہوا کہ ایک بزرگ نے جنابِ الٰہی میں عرض کیا کہ جب غلام بوڑھا اور بے کار ہو جاتا ہے تو دستور ہے کہ اُس کو خدمت سے آزاد کر دیتے ہیں، پس میں چاہتا ہوں کہ آئندہ مجھ کو بھی بندگی سے آزادی ملے۔ حکم ہوا کہ اور جو چاہو مانگ لو مگر آزادی طلب نہ کرو۔ اُس بزرگ نے پھر یہی درخواست کی اور قبول ہو گئی۔ اس کے بعد کسی نے اُن سے پوچھا کہ کہو! اب کیا حال ہے؟ جواب دیا کہ ؎

بندگی شد محو و آزادی نماند ذرّۂ در دل غم و شادی نماند

لے ایک روز ایک صاحب جن کو خدمتِ مبارک میں شرفِ ارادت حاصل تھا حاضر ہوئے اور اپنے دل میں سوچنے لگے کہ افسوس ہم بسبب بُعدِ مسافت اور شغلِ ملازمت کبھی کبھی زیارت سے مُشرّف ہو جاتے ہیں، بڑے خوش نصیب ہیں یہ لوگ جن کو ہر روز دولتِ حضوری اور فیضِ صحبت حاصل ہوتا ہے۔ اُس وقت اُن کا خیال محسوس کر کے یہ ارشاد فرمایا تھا ۱۲۔

عارفم اَمّا نہ دانم معرفت بے صفت گشتم نہ گشتم بے صفت

غرض یہ ہے کہ بغیر کسی مشغلہ کے لطفِ زندگی نہیں۔ آدمی کو کچھ نہ کچھ دھندا ضرور چاہیے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ اس مصرع کے معنی بیان کرو۔ ع

بجسمِ پاکِ پیغمبر مگس ننشست و نہ نشیند

جب حاضرین میں سے کسی نے جواب نہ دیا تو فرمایا کہ ننشست کے معنی تو ظاہر ہیں اور نہ نشیند سے یہ مراد ہے کہ جو لوگ فنا فی الرسول ہو جاتے ہیں اُن کے جسم پر بھی مکھی نہیں بیٹھتی۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ منشاء سرکاری یہی ہے کہ انسان اپنے آپ کو نہ دیکھے جیسے آنکھ تمام جہان کو دیکھتی ہے لیکن اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتی ؎

چشم بیند ہر کم و ہر بیش را لیک نتواند کہ بیند خویش را

اسی طرح ناک ہر شے کی خوشبو و بدبو سونگھتی ہے۔ الّا اپنے پیٹ کی بدبو سے محض بے خبر ہے۔ ہاں! اگر فضلِ خدا شاملِ حال ہوا اور کوئی مردِ خدا اپنے وجود کی سیر کرائے تو سبحان اللہ ؎

وہ ہے پاس میرے مری بد گمانی لیے پھرتی مجھ کو کہیں سے کہیں ہے

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت ابراہیم ادھم کا ایک صحرا میں گذر ہوا۔ دیکھا کہ چند اولیائے خدا مردِ میدانِ تسلیم و رضا اپنے حال میں مستغرق اور مراقبہ میں مصروف ہیں۔ یہ اُن کی صحبت کو غنیمت سمجھ کر بیٹھ گئے اور مشغولِ مراقبہ ہوئے۔ اُس وقت حضرت ابراہیم ادھم کو از راہِ باطن منکشف ہوا کہ ایک جہاز سمندر کے اندر مبتلائے طوفان ہے اور بادِ مخالف کے سخت جھوکے ایسے لگتے ہیں کہ جہاز قریبِ غرق ہے۔ اہلِ جہاز غایت عجز و نیاز اور خضوع و خشوع اور گریہ وزاری کرتے ہیں۔ اُن کی فریاد و واویلا سے شورِ قیامت برپا ہے۔ یہ کیفیت مشاہدہ کر کے براہِ ترحّم ان کا جی بھر آیا اور از راہِ باطن جہاز کی مدد کی اور اُس کو صحیح و سلامت طوفان سے نکال دیا۔ اولیاء بزرگ باہم بولے کہ دیکھو! یہ فضولی ہم میں سے کس نے کی؟ — سب نے انکار کیا۔ حضرت ابراہیم بولے کہ صاحبو! مجھ کو ایسا رحم آیا کہ زیادہ صبر نہ ہو سکا — میں نے یہ کام کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سنو صاحب! سرکار کو تو خود اُس جہاز کا بچانا منظور تھا۔ اگر ڈبونا ہوتا تو تمھاری ہمّت سے کیا ہو سکتا تھا۔ تم نے دخل دے کر مفت اپنے ذمّہ

ایک الزام دے لیا۔ ہماری تمہاری صحبت راس نہ آوے گی۔ یہ کہہ کر سب غائب ہوگئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ حضرت ابراہیم ادھم کا ابتدائی تھا ورنہ دعا نہ کرتے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم ادھم نے اُن کو یہ جواب دیا کہ جہاز کا بچانا بھی تو تقدیر الٰہی میں میری دعا پر موقوف تھا، جو میں نے دعا کی ورنہ میں دُعا کب کرتا۔

ایک[۲۰۹] روز ارشاد ہوا کہ رے داس اپنے مکان کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ایک برہمن سے جو گنگا اشنان کے لیے جاتا تھا پوچھا کہ مہاراج کہاں جاتے ہو۔ کہا گنگاجی کے اشنان کو۔ رے داس نے اُس کو ایک ٹکا دیا اور کہا کہ جب تو ہر کی پیڑی پر پہونچے اور اشنان کر چکے تو اوّل میرا سلام کہنا۔ اگر گنگاجی اپنا ہاتھ پانی سے نکالیں تو پھر یہ ٹکا اُن کے ہاتھ پر رکھ دینا ورنہ واپس لے آنا۔ اُس برہمن نے بعد اشنان کے ایسا ہی کیا۔ ایک نازنین ہاتھ برآمد ہوا۔ ٹکا اُس پر رکھ دیا۔ گنگاجی نے ایک کنگن نہایت عجیب و غریب مُرصّع و بیش بہا اُس برہمن کو دیا کہ لے رے داس کو بعد سلام یہ کنگن دے دینا۔ برہمن واپس آیا اور کنگن اُن کو حوالہ کیا۔ رے داس نے اُسی برہمن کو دے دیا۔ اُس نے راجہ کی نذر کیا۔ راجہ نے رانی کو دیا۔ رانی نے فرمایش کی اس کی جوڑی کا دوسرا کنگن پیدا کرو۔ راجہ نے برہمن سے کہا۔ اُس نے رے داس سے عرض کیا کہ صاحب یوں معاملہ ہے۔ اب دوسرا کنگن بھی دلوائیے۔ ورنہ میں مارا جاؤں گا۔ رے داس ایک ٹکا لے کر اپنے کٹھوت[۱] کے کنارے کھڑا ہوا اور کہا کہ من گا تو کٹھوت ہی میں گنگا۔ اتنا کہنا تھا کہ وہی ہاتھ کٹھوت کے پانی سے برآمد ہوا۔ ٹکا دے دیا اور کنگن لے آیا غرض اس بیان سے یہ ہے کہ آدمی کا قلب سلیم ہونا چاہیے۔ پھر جو چاہے سو موجود ہے۔ کچھ حاجت کہیں آنے جانے کی نہیں۔ اور یہ بجز توحید کے نہیں ہو سکتا ؎

چوں از و گشتی ہمہ چیز از تو گشت   چوں از و گشتی ہمہ چیز از تو گشت

ایک[۲۱۰] روز ارشاد ہوا کہ حضرت نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک عزیز خلیفہ تھا جو خلیفۂ بغداد کا پیر تھا۔ ایک روز مجمع عام میں اُنھوں نے کہا کہ پیر کامل مرغی کی مانند ہوتا ہے یعنی مرغی تلے جس قسم کے انڈے رکھ دو گے اُن کو سے کر بچے نکال دے گی۔ تیتر کے بچے

۱؎ کٹھوت چمڑہ رنگنے کی جگہ کو کہتے ہیں ۱۲ منہ۔

جنگل میں جا اُڑیں گے۔ مرغی کے خاک میں لوٹیں گے۔ بط کے دریا میں تیریں گے۔ ہم بھی مثل بچۂ بط کے دریائے توحید میں شناوری کرتے ہیں ؎

بچۂ بط اگرچہ بیضہ بود آب دریاش تا بسینہ بود

یہ ماجرا کسی شخص نے حضرت نجم الدین کُبریٰ کے سامنے عرض کیا کہ آپ کے خلیفہ آپ کو مُرغی سے تشبیہ دیتے ہیں اور ایسا کہتے ہیں۔ یہ سُن کر فرمایا کہ وہ نالائق دریا میں ڈوبے گا۔ وہ خلیفہ صاحب چونکہ بادشاہ کے پیر تھے اس لیے محلات شاہی میں اُن سے پردہ نہ تھا۔ بے تکلف چلے جایا کرتے تھے۔ اتفاقًا ایک دن تشریف لائے تو بادشاہ گھر میں نہ تھا۔ یہ اُس کے پلنگ پر سو رہے۔ ذرا دیر بعد بیگم آئی اور وہ بادشاہ کے خیال میں اُن کے برابر لیٹ کر سوگئی۔ کچھ دیر بعد بادشاہ آیا اور یہ تماشا دیکھا۔ چپ چاپ واپس چلا گیا اور دل میں بدگمانی پیدا ہوئی۔ جب میاں صاحب کی آنکھ کھلی تو بیگم کو پاس دیکھ کر وہاں سے چل دیے۔ بادشاہ سے ملاقات ہوئی۔ اُس نے ملاحوں کو حکم دیا کہ آج حضرت پیر و مرشد کو سیر دریا کراؤ اور اُن کو اشارہ کر دیا کہ کشتی منجھدار میں لے جا کر ڈبو دینا۔ ملاحوں نے حکم کے بموجب عمل کیا۔ جب بادشاہ رات کے وقت محل میں آیا تو بیگم نے دن کا قصہ سُنایا اور تمام حال بیان کیا۔ یہ قصہ سن کر بادشاہ کو نہایت ملال ہوا کہ میں نے بڑا ظلم کیا اور پیر و مرشد کو ناحق ڈبو دیا۔ اب یا تو قصاص لازم ہے یا خون بہا۔ یہ خیال کرکے بہت سارا روپیہ لے کر حضرت نجم الدین کبریٰ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض حال کے بعد روپیہ اور شمشیر برہنہ سامنے رکھ دی کہ خون بہا بھی حاضر ہے اور سر بھی موجود ہے جیسا حکم ہو۔ اُس وقت حضرت حالتِ جذب میں تھے۔ فرمایا کہ ہاں میرے عزیز مُرید کو مار کر اب روپیہ اور سر لے کر آیا ہے۔ کیا اُس کی اتنی ہی قدر و منزلت تھی۔ نہیں اُس کے خون بہا میں اوّل میرا سر، پھر تیرا سر اور جتنے اس زمانہ کے اولیاء اللہ ہیں اور ساداتِ عُظّام و علماء کرام اور اُمرائے ذوی الاحتشام ہیں ایک ایک کا نام لینا شروع کیا یہاں تک کہ فریدالدین عطار کا سر وغیرہ وغیرہ بغداد کا نام شروع کیا اور لفظ بغ[1] زبان سے نکلا تھا کہ ایک مُرید نے اُن کا منہ بند کر لیا کہ یہ تو ہمارے پیروں کا مکان ہے۔ پھر چپ ہو گئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ہلاکو نے تاتار سے

---

[1] یعنی بغداد کہنا چاہتے تھے کہ مرید نے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا جو کہ نصف بغداد یعنی بغ منہ سے نکل چکا تھا نصف بغداد بھی قتل ہوا ۱۲ منہ۔

خروج کیا۔ پہلے حضرت کا سر کاٹا، پھر اُس بادشاہ کا اور ملک خراسان اور ایران کو بھی تہ تیغ کر دیا اور نصف بغداد کو بھی قتل و غارت کیا۔ جب لشکرِ مغل نیشاپور کے قریب پہونچا تو حضرت فریدالدین عطّار نے اپنا پیالہ چوبین اوندھا کر دیا۔ شہر تمام لشکر کی نگاہ سے پوشیدہ ہو گیا۔ فوج حیران ہو کر اپنے خیمہ گاہ پر آن پڑی۔ اگلے روز ہلاکو نے پھر لشکر روانہ کیا۔ شام کو ٹکریں کھا کر لشکر واپس آیا اور شہر کا پتہ نہ چلا۔ ہلاکو نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے اس شہر میں کوئی مردِ کامل ہے۔ خیر کل کو میں خود لشکر کا رہنما بنوں گا اور شہر پر تاخت کروں گا۔ یا وہ نہیں یا میں نہیں۔ چناں چہ اگلے روز اُس نے نیشاپور کا قصد کیا۔ اُدھر حضرت عطار نے اپنا پیالہ اُلٹنا چاہا کہ حضرت خضر علیہ السلام پہونچے اور حضرت عطّار کا ہاتھ پکڑ لیا کہ بس رہنے دو۔ حکم سرکاری تمھارے قتل کے واسطے جاری ہو چکا ہے۔ بولے کیا قصور؟ حضرت خضرؑ نے کہا قصور کچھ نہیں، بلکہ اختیار ہے ؎

جہاں دار داند جہاں داشتن   یکے را بُریدن یکے کاشتن

اور تم موحد ہو کر غیریت سمجھتے ہو۔ وہ شانِ جمال تھی یہ شانِ جلال ہے۔ یہ کیا میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو ؎

وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ   ان نینن کا یہی پر یکھ

اور اگر اب پیالہ اُلٹو گے تو کچھ بھی نہیں ہونے کا۔ بس اب کرامت اپنی رہنے دو۔ ناچار شیخ عطّار صاحب نے سر جھکا دیا اور قتل کیے گئے۔ اس کے بعد جناب و قبلہ نے فرمایا کہ میاں! ہم تو یہی کہتے ہیں ؎

خواہی ز فراق در فغاں دار مرا   خواہی ز وصال شادماں دار مرا
من با تو نگویم کہ چناں دار مرا   زاں ساں کہ دلِ تست چناں دار مرا

اور اگر ہم دعا بھی مانگیں تو یہ مانگیں ؎

نہ دارم ذوقِ رندی نے خیالِ پاک دامانی   مرا دیوانہ رخود کن بہر رنگے کہ می‌دانی

ایک روز ۲۱ ارشاد ہوا کہ بخت نصر بادشاہ ابتدا میں نہایت نیک بخت و صالح تھا حضرت ذکریا و یحییٰ علیہما السلام کی نہایت اطاعت کرتا تھا۔ اتفاقاً اُس نے ایک عورت سے نکاح کیا جس کے ہمراہ ایک لڑکی نہایت حسینہ و جمیلہ پہلے شوہر سے تھی۔ جب وہ لڑکی

سن بلوغ کو پہونچی تو بادشاہ حسن کی بہار دیکھ کر فریفتہ و دیوانہ ہوگیا۔ اُس کی ماں کو پیام دیا۔ وہ بہت خوش ہوئی مگر دل میں اندیشہ کیا کہ بادشاہ پیغمبروں کا مطیع فرمان ہے اور یہ نکاح پیغمبرانِ خدا کی شریعت کے خلاف ہے۔ وہ کاہے کو اس کام کی اجازت دیں گے۔ اس لیے بادشاہ سے کہا کہ تم اس کا مہر ادا نہ کرسکو گے۔ اُس نے دریافت کیا کہ ایسا کتنا مہر ہے جو کچھ کہو میں دوں گا۔ عورت نے کہا کہ اس کا مہر تمھارے دونوں پیغمبروں کا سر ہے۔ اگر تم یہ مہر ادا کرسکو تو لڑکی حاضر ہے ورنہ اس کا نام مت لو۔ بادشاہ نے کہا کہ یہ بے چارے دو مسکین خدا کے دوست بیت المقدس کے مجاور ہیں۔ کسی کام میں دخل نہیں دیتے بلکہ ہمارے خیر خواہ و دعاگو ہیں ان کو بے جرم و گناہ قتل کرنا ظلمِ عظیم ہے۔ اس کے سوا جو کچھ مانگو جو مہر کہو مجھ کو منظور ہے اُس نے کہا کہ اس کے سوا اور کوئی مہر نہیں ہے۔ بادشاہ نے ہوائے نفسانی سے مغلوب ہوکر فوج کو حکم دیا کہ دونوں بے گناہوں کا سر کاٹ لاؤ۔ حکم کے بموجب سپاہیوں نے جاکر اوّل حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بیت المقدس میں قتل کیا۔ اور حضرت زکریّا یہ حال دیکھ کر جنگل کی طرف بھاگ نکلے۔ فوج پیچھے ہوئی اور شیطان نے اُن کی رہ نمائی کی۔ جب سپاہیوں نے آدبایا اور گھیر لیا تو حضرت زکریّا علیہ السّلام نے ایک درخت سے التجا کی کہ تو مجھ کو اس وقت پناہ دے۔ وہ درخت پھٹ گیا۔ یہ اُس کے اندر سما گئے۔ وہ بند ہوگیا۔ لیکن قدرے کپڑا باہر رہ گیا۔ فوج متحیّر ہوئی کہ کہاں غائب ہوگئے۔ شیطان نے نشان دیا کہ اس درخت کے اندر ہیں اور یہ کپڑا اُن کے ہونے کی علامت ہے۔ پھر شیطان نے آرہ کی ترکیب بتائی۔ درخت چیرا گیا جب نوبت آرہ کی سر تک پہونچی تو حضرت نے سِسکی بھری۔ حکم الٰہی نازل ہوا کہ اگر اُف کروگے تو پیغمبری سے خارج کردیے جاؤ گے۔ تم نے غیر سے کیوں پناہ مانگی۔ اگر ہم سے التجا کرتے تو کیا ہم پناہ نہیں دے سکتے تھے۔ اب اس کا مزہ چکھو اور چپ چاپ سر پہ آرہ چلنے دو۔ غرض کہ سر سے پاؤں تک جسم چیرا گیا اور حضرت زکریّا نے دم نہ مارا۔

عشّاقِ از دو دیدہ گشند ابتلائے ما ــــــ سِرّے است در حقوقِ محبت برائے ما

تاقدر تم بہ بیند اندر سرائے ما ــــــ ما آدم از بہشت پئے ایں کشیدہ ایم

مانوح را ز طوفاں، سرگشتہ کردہ ایم — موسیٰ بغیب یافتہ، قوتِ عصائے ما
انگشتری سلیماں، بادیو، دادہ ایم — یعقوب خود نگاہ کند در قضائے ما
گاہے در افگنیم، بآتش خلیل را — قرباں کند اگرچہ پسر، در رضائے ما
گہ ارہ را بتارکِ سر زکریا کشیم — یحییٰ کشیم، دم نہ زند، در قضائے ما
دندانِ مصطفےٰ را اے دوست بشکنیم — ایوب صابر آمدہ، از کرم ہائے ما
گہ چاشنیِ زہر بحلقِ حسنؓ کنیم — گہ تیغ بر حسینؓ کشد کربلائے ما
بیگانہ را چہ کار بود در بلائے غم — آں را رسد کہ خاص بود آشنائے ما
فرعون را نہ دادیم اے دوست دردِ سر — زیرا کہ او نداشتِ سرِ دردہائے ما
شدّاد را بہ نعمتِ چنداں رساندہ ایم — ہشتم بہشت آورد اندر سرائے ما
ماپروریم دشمن و مامی کشیم دوست — کس را مجال نیست بہ چون و چرائے ما
حافظ ہمیشہ نالہ کند در بلائے غم — باشد کہ خود علاج کند دردہائے ما

غرض اس بیان سے یہ ہے کہ بجز اللہ تعالےٰ کے کسی سے استعانت نہ چاہے، بلکہ حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کی طرح خدا سے بھی کچھ طالب نہ کرے۔ ع

کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند

مصرع:- بن مانگے موتی ملیں مانگے ملے نہ بھیک

" :- اُس کی رضا پہ چھوڑ دو بہر خدا جو ہو سو ہو

جب دونوں پیغمبر اس طرح بے دردی سے قتل کیے گئے تو غضبِ الٰہی نازل ہوا۔ دن تاریک ہوگیا! ایک بادشاہ فوجِ خونخوار لے کر چڑھا اور اُس شہر کے باشندوں کو گرفتار کر لیا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا خون بند نہ ہوتا تھا۔ جب قبر میں رکھتے تھے تو قبر خون سے لبریز ہو جاتی تھی۔ بادشاہ لشکر کش نے قسم کھائی کہ جب تک خون بند نہ ہوگا میں قتل سے باز نہ رہوں گا۔ ہزارہا آدمی تہ تیغ کر دیے لیکن خون بند نہ ہوا۔ اُس وقت ایک شخص حضرت یحییٰؑ کی لاش پر آیا اور کہا کہ تم پیغمبر ہو یا ظالم۔ ایک خون کے بدلے میں ہزارہا آدمی قتل ہو چکے۔ اب کیا سارے جہان کو قتل کراؤ گے۔ اتنا کہنا تھا کہ اُن کا خون بند ہو گیا۔ جامعِ دمشق میں حضرت کی

قبر ہے ۵

بڑے بھئے دکھ بہت ہے چھوٹے سے دُکھ دور	تارے سب نیارے رہیں کہیں چاند اور سورج
خوب پرکھ کے دیکھ کبیرا، یہ مُردوں کا گاؤں	اس میں جگ بھر کوئی نہ جیا کس کا لیجے ناؤں
پیر پیمبر مر گئے، مر گئے جنگم جوگی	راج کرنتا راجہ مر گئے، مر گئے بید اور روگی
چندا مرے سورج مرے، مرے برن اکاسا	چودہ طبق پانی میں ڈوبیں اِن کی چھوڑو آسا
راما مر گئے، کرشنا مر گئے، مر گئی لکھو بائی	اُس کو سادھو کیوں نہیں پوجو جس کو موت نہ آئی
ایک سمرے[۱] الکھ نرنجن جن یہ جگ اُپجایا	کہیں کبیرا سنو رے سادھو جھوٹی جگ بھرمایا

اس شعر پر حضرت نے فرمایا یہاں کبیر بھی چوک گیا۔ اِس جہان کو جھوٹا کہنا کمالِ نادانی ہے

رَبَّنَا[۲] مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۵

پس مگو کایں جملہ دُنیا باطل اند	باطلاں در بوئے حق دام دل اند
پس مگو جملہ خیال ست وضلال	بے حقیقت نیست در عالم خیال
وانکہ گوید جملہ حق ست احمقے ست	وانکہ گوید جملہ باطل او شقے ست

ایک[۲۱۲] روز ارشاد ہوا کہ سلطان محمود غزنوی حضرت ابوالحسن خرقانی کی زیارت کے لیے خرقان میں پہونچا۔ پہلے پیام بھیجا کہ میں آپ کی زیارت کے واسطے غزنی سے یہاں تک آیا ہوں آپ خانقاہ سے خیمہ تک قدم رنجہ فرمائیے۔ اور قاصد کو سکھا دیا کہ اگر وہ انکار کریں تو یہ پڑھیو اَطِیْعُوا[۳] اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ۔ حضرت نے جواب دیا کہ ہم کو معذور سمجھو اُس نے یہ آیت پڑھی۔ فرمایا کہ در اطیعوا اللہ چناں مستغرق ام کہ از اطیعوا الرسول خجالت ہا دارم تا باولی الامر چہ رسد۔ قاصد نے آکر محمود کو یہ جواب سنا دیا۔ محمود نے اپنی پوشاک ایاز کو پہنا کر سلطان بنایا اور دس کنیزوں کو مردانہ لباس پہنا کر غلام بنایا اور خود ہتھیار باندھ کر اُس کی اردلی میں چلا۔ حضرت کے حجرے پر پہونچا۔ حضرت نے تعظیم نہ دی۔ محمود نے کہا کہ آپ نے

---

۱ یعنی ایک کو اختیار کر ایسا ایک جو نظر نہیں آتا اور سب گھٹ میں سمایا ہوا ہے جس نے جہان کو پیدا کیا کبیر کہتا ہے سنو یارو جھوٹے جگ میں پھر کوئی آیا ہے ۱۲ منہ ۲ اے پروردگار ہمارے نہیں پیدا کیا تو نے یہ جہان بے فائدہ ۱۲ ۳ یعنی فرماں برداری کرو اللہ کی اور رسول کی اور حاکم کی جو تم میں سے ہو ۱۲ منہ۔

سلطان کی کچھ توقیر نہ کی۔ فرمایا تم نے جال لگایا ہے۔ محمود نے کہا کہ بے شک جال تو لگایا تھا مگر آپ اس جال کی چڑیا کاہے کو ہیں۔ پھر محمود بولا کہ کچھ ارشاد فرمائیے۔ کہا کہ ان نامحرموں[ع] کو باہر کردو۔ پھر محمود نے دعا کی درخواست کی اور ایک تھیلی اشرفیوں کی پیش کی۔ آپ نے ایک ایک سوکھی روٹی جو کی نکال کر سامنے رکھ دی۔ محمود نے کھائی مگر نوالہ گلے میں اٹکتا تھا۔ فرمایا ایسی ہی تمھاری اشرفیاں ہمارے حلق سے نہیں اُتریں گی۔ بس اُٹھاؤ ہم اس کو طلاق دے چکے ہیں۔ پھر محمود نے عرض کی کہ اپنی کوئی یادگار عنایت فرمائیے۔ شیخ نے اپنا ایک کپڑا دیا اور فرمایا کہ اگر تم کو کہیں بڑی مشکل پیش آئے جس کی عقدہ کشائی دشوار ہو۔ تو اس کے ذریعہ سے دعا کرنا۔ اللہ تعالےٰ قبول فرمائے گا۔ جب محمود رخصت ہونے لگا تو اُس وقت تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اُس نے پوچھا کہ آتے وقت کچھ نہ تھا تو اب جاتے وقت تعظیم کیسی۔ جواب دیا کہ اے محمود تو بادشاہی کے گھمنڈ میں امتحان کے لیے آیا تھا۔ مگر اب تو فقیری اور انکساری کی دولت لے کر چلا ہے۔ پس میں تیری شاہی کی تعظیم کے لیے نہیں اُٹھا بلکہ فقیری کی تکریم کے واسطے کھڑا ہوا ہوں۔ محمود واپس ہوا اور وہاں سے آکر سومنات پر حملہ کیا۔ جب معرکہ سخت پیش آیا اور تردد پیدا ہوا تو اس لباس کو لے کر دعائے فتح مانگی اور منت مانی کہ جو کچھ غنیمت ہاتھ آئے گی درویشوں کو نذر کردوں گا۔ چنانچہ اُسی روز محمود کا لشکر فتح یاب ہو گیا۔ رات کو محمود نے خواب میں دیکھا کہ حضرت ابوالحسن خرقانی فرماتے ہیں کہ تو نے ہمارے خرقہ کی بھی آبرو کھوئی۔ اگر تو دعا کرتا تو تمام کفار کو خدائے تعالےٰ اسلام نصیب کرتا۔ اس فتح سومنات میں مالِ کثیر سلطان کے ہاتھ آیا۔ مولویوں سے دریافت کیا کہ یہ غنیمت کس کو دینی چاہیے کہا کہ علما کو۔ تاکہ علمِ دین کی ترقی ہو۔ پھر غازیوں اور امیروں اور لشکریوں سے یہی سوال کیا ہر ایک نے اپنے اپنے مطلب کی کہی۔ سب کے بعد ایک مجذوب سے پوچھا، جو لشکر میں رہتا تھا۔ اُس نے جواب دیا کہ سُن محمود! اگر خدا سے آئندہ کچھ مطلب ہے تو بموجب اقرار کے فقرا پر تقسیم کر ورنہ جو مقصد آپ کا تھا وہ تو ہو ہی چکا آئندہ خدا سے کچھ توقع مت رکھ اور مالِ غنیمت کو اپنے خرچ میں لا۔ بادشاہ نے یہ جواب سُن کر حسب وعدہ تمام مال غربا کو لٹا دیا۔

ل یعنی امتحان لیا ۱۲ ع یعنی یہ کنیزیں جو بظاہر غلاموں کے بھیس میں ہیں ۱۲ منہ۔

ایک[۲۱۳] روز ارشاد ہوا کہ جب بابا فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بہ ارادۂ بیعت حاضر ہوئے تو اُس وقت خواجہ صاحب ایک درخت خشک سے تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ بابا صاحب کو خیال آیا کہ تعجب ہے جس درخت کو خواجہ صاحب نے کمر لگائی وہ خشک رہے۔ ایک نظر جو ڈالی تو درخت سرسبز ہوگیا۔ خواجہ صاحب نے نگاہ کی تو وہ پھر خشک ہوگیا۔ غرض دو بار اسی طرح اُلٹ پلٹ ہوئی۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ میاں فرید تم فقیری کرنے آئے ہو یا خدا سے لڑنے۔ مرضیِ الٰہی تو یوں ہے کہ درخت خشک رہے۔ تم اُس کو ہرا بھرا کیا چاہتے ہو۔ جاؤ قطب الدین کے پاس وہ ذرا تمھاری خبر لے گا اور وہیں تمھارا حصہ ہے۔ حسب ارشاد پُرانی دلی میں آئے اور قطب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کی عمر کم تھی بچوں کے کھیل کود کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ بابا فرید کے دل میں خیال آیا کہ پیر تو ملا مگر لڑکا ہے۔ اُن کو یہ ضمیر منکشف ہوئی۔ فوراً حجرہ کے اندر گئے اور بوڑھے بن کر نکل آئے۔ فرمایا کہ لو! اب تو میں تمھاری پیری کے قابل ہوگیا۔ بابا صاحب بیعت ہوئے اور حضرت کے وضو کرانے کی خدمت اختیار کی۔ ایک دفعہ موسم سرما میں آدھی رات کے بعد پانی گرم کرنے کے لیے آگ کی ضرورت ہوئی۔ تمام شہر میں تلاش کی، کہیں نہ ملی۔ بہت گھبرائے۔ آخر بہ ہزار دقت ایک بڑھیا کے گھر پتہ لگا۔ اُس نے کہا کہ آگ کے بدلے اپنی آنکھ نکال دے تو آگ دیتی ہوں۔ یہ راضی ہوگئے۔ آنکھ دے کر آگ لائے اور جھٹ پٹ گرم پانی حضرت کے لیے تیار کیا۔ وقت پر وضو کرایا۔ صبح کو آنکھ پر پٹی باندھے قطب صاحب کے روبرو آئے۔ پوچھا کہ یہ کیا ہوا۔ عرض کیا حضور آنکھ آئی ہے۔ قطب صاحب نے فرمایا کہ خیر آئی ہے تو سوائی ہے۔ پٹی کھولی تو پہلے سے سوائی آنکھ تھی۔ اس کے بعد خرقۂ خلافت عنایت فرمایا اور رخصت کر دیا۔ اُس وقت سے حضرت بابا صاحب کی اولاد میں ایک آنکھ بڑی ہوتی ہے۔

ایک[۲۱۴] روز ارشاد ہوا کہ جس وقت بابا فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مخدوم علی احمد صابر اپنے ہمشیرہ زادہ کو تعلیم کیا تو اُن پر ایک ایسی حالت طاری ہوئی کہ حضرت کا طواف کرتے تھے اور یہ شعر وردِ زبان تھا ؎

کعبہ خوانم یا پیمبر مصحفت ست ایں، یا خدا　　اصطلاح شوق بسیار ست و من دیوانہ ام

بعد مدت کے مخدوم صاحب نے عرض کیا کہ میرا ارادہ دہلی کا ہے۔ بابا صاحب نے فرمایا کہ میری

مُہر قطب جمال ہانسوی کے پاس ہے تم اپنی سند لے جاؤ اگر مہر کر دیں تو چلے جانا۔ آپ سند لے کر ہانسی میں پہونچے۔ مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ بعد ملاقات کہا کہ بھائی صاحب اس عرضی پر مُہر کر دو۔ اُنھوں نے فرمایا کہ ابھی آپ تھکے ہوئے تشریف لائے ہیں۔ انشاء اللہ فجر کے وقت مہر ہو جائے گی۔ خاطر جمع فرمائیے مخدوم صاحب نے کہا کہ نہیں حضرت ابھی مہر کر دیجیے۔ قطب صاحب نے فرمایا کہ صاحب زادے اس وقت چراغ موجود نہیں، صبح تک صبر کیجیے، ایسی کیا جلدی ہے؟ حضرت علی احمد صاحب نے اپنی انگلیوں پر پھونک ماری، فوراً پانچوں انگلیاں روشن ہو گئیں۔ قطب صاحب نے فرمایا کہ کیا تم اپنی کرامت دکھاتے ہو۔ یہ کہہ کر سند کو چاک کر دیا۔ حضرت علی احمد نے اُن کی جانماز لے کر پھاڑ ڈالی اور کہا کہ تم نے ہماری سند ولایت پھاڑی۔ ہم نے تمھاری قطبیت قطع کر دی۔ قطب صاحب نے پوچھا کہ ماضی کی یا استقبال کی۔ آپ نے فرمایا کہ استقبال کی۔ کہا کہ الحمد للہ بھلا پچھلی تو بچی۔ آخر مخدوم علی احمد صاحب وہاں سے روانہ ہو کر بمقام کلیر کہ شہر عظیم اور نہایت آباد تھا، پہونچے " اور وہاں رہنا اختیار کیا۔ جمعہ کے روز مسجد میں نماز کے لیے اول وقت پہونچے اور پہلی صف میں مقابل مصلائے امام جا بیٹھے۔ چوں کہ آپ کی صورت فقیرانہ اور کپڑے پھٹے پُرانے تھے جو شخص آتا اُن کو اُٹھا کر خود بیٹھ جاتا، حتیٰ کہ صفِ نعال میں جا پہونچے۔ آپ کو غصہ آیا جب نمازی سجدہ میں گئے تو فرمایا کہ اے مسجد! تو کیوں کھڑی ہے، ذرا جھک جا۔ مسجد نمازیوں پر گر پڑی اور سارے آدمی دب کر مر گئے، یہاں تک کہ تمام شہر برباد ہو گیا۔ اُس بڑھیا کا لڑکا بچا جو آپ کی خدمت کرتی تھی۔ چناں چہ اب تک وہ شہر ویران پڑا ہے۔ آخر کار آپ کو حیرت نے گھیرا۔ ایک گولر کی شاخ پکڑ کے کھڑے ہو گئے کئی برس تک اسی طرح کھڑے رہے۔ جب بابا فرید صاحب کو معلوم ہوا کہ صابر عالمِ حیرت میں متحیر کھڑا ہے تو آپ نے مریدوں کو جمع کر کے فرمایا کہ کوئی ایسا ہے کہ ہمارے صابر کو جا کر بٹھا دے۔ ہم اُس کو انعام دیں گے۔ حضرت خواجہ شمس الدین ترک پانی پتی نے کہ جوانِ خوش طلعت و خوش دل تھے، دست بستہ عرض کیا کہ اگر ارشاد ہو تو میں جاؤں۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا۔ لیکن سامنے کھڑے نہ ہونا۔ خواجہ صاحب رخصت ہو کر کلیر میں پہونچے۔ دیکھا کہ جناب علی احمد صابر صاحب بہ صورت تصویر سکتہ کا سا عالم، آنکھیں کھلی ہوئی نظر بہ طرفِ آسمان، مقامِ حیرت میں مستغرق

کھڑے ہیں۔ خواجہ صاحب بہ جانب چپ کھڑے ہو کر غزل گانے لگے۔ مخدوم صاحب کی طبیعت عروج سے مائل بہ نزول ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہوش میں آگئے اور فرمایا کہ شمس الدین بیٹھ جاؤ۔ آپ نے عرض کیا کہ غلام بیٹھے اور مولیٰ کھڑا رہے، یہ تو کمالِ بے ادبی ہے۔ فرمایا کہ اچھا ہم کو بٹھا دو۔ چوں کہ مدت مدید سے کھڑے کھڑے پاؤں اکڑ گئے تھے، اس لیے بیٹھ نہ سکے۔ لٹا دیا۔ پھر آپ نے پوچھا کہ شیخ اچھے تھے۔ کہا کہ فضلِ الٰہی ہے تھوڑی دیر میں آپ کو نیند آگئی۔ اَلنَّوْمُ رَاحَتُ الْبَدَنِ وَزِیَادَۃُ الْعَقْلِ۔ بدن کو آرام مع عقل کو زیادتی ہوئی۔ جب بیدار ہوئے تو فرمایا کہ اچھا رخصت وہاں سے رخصت ہو کر حضرت بابا صاحب کی خدمت میں پہونچے۔ تمام حال عرض کیا۔ فرمایا کہ بھلا ہم کو بھی پوچھتے تھے۔ جواب دیا کہ حضرت ہاں ایک دفعہ پوچھا کہ شیخ اچھے تھے۔ یہ لفظ سُن کر آپ کو ایک حالتِ وجد طاری ہوئی۔ اُس وجد میں فرماتے تھے کہ آج ہم شیخ ہوئے۔ بعد فرو ہونے حالت کے خواجہ صاحب نے انعامِ موعود کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا کہ جاؤ علی احمد صابر تم کو انعام میں دیا۔ خواجہ صاحب پھر وہاں سے چلے اور مخدوم صاحب کی خدمت میں پہونچ کر رہنا اختیار کیا۔ چند روز کے بعد تعلیم فرما کر خواجہ صاحب کو حکم دیا کہ جاؤ سواروں میں نوکری کرو۔ جس روز تم سے کوئی کرامت صادر ہوگی وہ روز ہمارے انتقال کا ہوگا۔ رخصت ہوئے اور بادشاہی سواروں میں نوکری کر لی۔ جب سلطان علاء الدین خلجی چتوڑ گڈھ کو سر کرنے گیا اور مدت تک محاصرہ کیا مگر قلعہ فتح نہ ہوا تو فقرا کی طرف رجوع کی ایک فقیر نے کہا تم کیوں جابجا پھرتے ہو۔ خود تمھارے لشکر میں ایک ایسا کامل ہے کہ اگر وہ اس وقت فرمادے تو ابھی قلعہ فتح ہو جائے اور اللہ تعالےٰ نے یہ فتح اُسی کی زبان پر منحصر کی ہے۔ اور علامتِ شناخت یہ ہے کہ آج آدھی رات کو آندھی آئے گی سب کے چراغ گل ہو جائیں گے مگر اُن کا چراغ جلتا رہے گا۔ بادشاہ خوش ہوا اور وقت کا انتظار کرنے لگا۔ جب نصف شب ہوئی تو آندھی آئی تمام لشکر کے چراغ پٹ ہو گئے صرف ایک چراغ روشن تھا ؎

اگر گیتی سراسر باد گیرد | چراغِ عاشقاں ہرگز نہ میرد

بادشاہ وہاں پہونچا اور روبرو خیمہ پر دست بستہ کھڑا رہا۔ آپ اُس دم تلاوتِ قرآن مجید میں

مشغول تھے۔ ذرا دیر میں نظر اُٹھائی تو دیکھتے کیا ہیں کہ بادشاہ کھڑا ہے۔ سمجھے کہ آج خیر نہیں۔ آپ نے قرآن شریف کو بند کیا اور کھڑے ہو کر بادشاہ سے پوچھا کہ حضور آپ اس وقت کیوں تشریف لائے۔ عرض کیا کہ حضرت میرا قصور معاف ہو۔ مجھ کو آپ کی قدر و منزلت معلوم نہ تھی۔ دُعا کیجیے کہ یہ قلعہ فتح ہو جائے۔ جواب دیا کہ حضور میں تو آپ کا ایک ملازم ہوں کسی نے آپ کو بہکا دیا ہے۔ بھلا میں اس قابل کہاں ہوں جو آپ سمجھے ہیں۔ بادشاہ نے کہا کہ کوئی عذر میں نہ مانوں گا۔ آپ کو دُعا کرنی ہی پڑے گی۔ فرمایا کہ خیر۔ لیکن شرط یہ ہے کہ میرا استعفا منظور ہو۔ اور تنخواہ مل جائے۔ یہاں سے تین کوس پر جا کر دُعا کروں گا۔ آپ صبح دم دھاوا کریں۔ انشاء اللہ تعالےٰ قلعہ فتح ہو جائے گا۔ خواجہ صاحب سمجھ گئے کہ آج ہمارے پیر کا انتقال ہو گیا۔ بادشاہ نے اُسی وقت تنخواہ دی اور رخصت کیا۔ آپ نے تین کوس پر جا کر دُعا کی قلعہ اُسی دم فتح ہو گیا۔ آپ وہاں سے چل کر منزل بہ منزل پیران کلیر پہونچے۔ دیکھا کہ فی الحقیقت حضرتؒ نے انتقال فرمایا ہے اور نعش مبارک کے گرد شیر و بھیڑیے درند و چرند حلقہ کیے بیٹھے ہیں جب خواجہ صاحب پہونچے تو سب جانور چلے گئے۔ تجہیز و تکفین کر کے سپرد خدا کیا۔ تین روز کے بعد حکم ہوا کہ پانی پت جاؤ۔ حسب الارشاد پانی پت میں پہونچے یہاں مخدوم جلال الدین کبیر الاولیار رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ شرف الدین بو علی قلندر صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ہمیشہ استدعائے بیعت کیا کرتے تھے اور قلندر صاحب ہمیشہ یہ جواب دیتے کہ تمھارا پیر آنے والا ہے، ابھی صبر کرو، ہم بتا دیں گے۔ جب حضرت خواجہ شمس الدین صاحب واردِ پانی پت ہوئے تو قلندر صاحب نے مخدوم صاحب سے فرمایا کہ جاؤ تمھارے پیر آتے ہیں، اُن کا استقبال کرو۔ آپ گھوڑے پر سوار شہر سے باہر نکلے۔ دیکھا کہ ایک فقیر چلے آتے ہیں۔ بعد سلام علیک خواجہ صاحب نے فرمایا کہ ارے میاں بانکے جوان! ذرا اپنے گھوڑے کی چال تو دکھاؤ۔ آپ نے چاق چو بند کر کے گھوڑے کی باگ اُٹھائی اور خوب چلت پھرت اُس کی دکھائی خواجہ صاحب بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ زہے اسپ و زہے سوار۔ مخدوم صاحب چارپروں خانہ چیت گرے۔ جو کچھ دینا تھا اُسی وقت دے دیا اور بیعت کر کے خلافت عطا فرمائی۔ تا زیست پانی پت میں مقیم رہے۔ چناں چہ مزار بھی ان تینوں صاحبوں کے پانی پت میں

مشہور و معروف ہیں۔ مخدوم جلال الدین صاحب کو مطالعہ تو قلندر صاحب کرا چکے تھے لیکن تعلیم خواجہ شمس الدین صاحب پر منحصر و موقوف تھی۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب حضرت نظام الدین صاحب سلطان الاولیا بابا فرید صاحب کی خدمت میں پہونچے تو دیکھتے ہی آپ نے فرمایا ؎

اے آتش فراقت دلہا کباب کردہ سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

بات یہ تھی کہ خاندانِ چشتیہ میں بزرگانِ متقدمین نے بشارت دی تھی کہ ایک محبوبِ الٰہی اِس خاندان میں پیدا ہوگا۔ ایک دوسرے کو وصیت کرتے چلے آئے تھے کہ جس کو اُس محبوب کی ملاقات میسر ہو، ہمارا سلام کہہ دے۔ غرض کہ بابا فرید صاحب کو ملاقات میسر ہوئی اس لیے آپ نے یہ شعر زبانِ مبارک سے فرمایا کہ اگلے بزرگ تمھارے اشتیاق میں چلے گئے۔ اُسی زمانہ میں بابا صاحب نے ایک خواب دیکھا تھا کہ ہم نے جال لگایا ہے اُس میں صدہا چڑیاں آکر پھنسیں ہیں لیکن ایک شاہ باز بھی آ پھنسا ہے۔ اُس سے مراد حضرت سلطان نظام الدین تھے۔ بابا صاحب نے اُسی وقت ایک لوٹا اور ایک بوریا عنایت فرمایا۔ آپ رات بھر اُس کا طواف کرتے رہے۔ لوگوں نے بابا صاحب کو خبر دی کہ اُن کا یہ حال ہے آپ نے فرمایا کہ "ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات"۔ جب مقصود کو پہونچ گئے تو بابا صاحب نے فرمایا کہ تم دہلی جاؤ اور قطب جمالِ ہانسوی سے ہماری مُہر اپنی سند پر کرا لینا۔ آپ بموجب فرمان قطب صاحب کی خدمت میں پہونچے۔ قطب صاحب نے مزاج پُرسی کے بعد ایک حجرہ قیام کے لیے بتا دیا۔ آپ رہنے لگے۔ دو مہینے کے بعد قطب صاحب نے پوچھا کہ بھائی صاحب آپ کیوں تشریف لائے ہیں۔ سلطان جی نے کہا کہ اگر آپ کو معلوم نہ ہو تو میں عرض کروں۔ قطب صاحب خاموش ہو گئے۔ دو مہینہ بعد پھر یہی سوال کیا اور آپ نے وہی جواب دیا۔ فرمایا کہ اچھا سند لائیے۔ قطب صاحب نے اُس پر تحریر فرمایا ؎

ہزاراں درود و ہزاراں سپاس کہ گوہر سپردم بہ گوہر شناس

وہاں سے رخصت ہو کر دہلی میں پہونچے اور قیام فرمایا۔ دہلی میں ایک ہندو فقیر تھا سلبِ مرض میں بہت بڑا کمال رکھتا تھا۔ اتفاقاً ایک بار سلطان جی سخت مریض ہوئے۔ اپنے مریدوں کو

فرمایا کہ مجھ کو اُس کافر کے پاس ہرگز نہ لے جانا۔ جب مرض کا غلبہ ہوا اور حضرت بے ہوش ہو گئے تو مرید گھبرائے۔ ناچار اُس کے پاس حضرت کو لے گئے اُس نے فوراً مرض سلب کر لیا۔ آپ ہوش میں آئے اور دیکھا کہ اس کافر نے سلب مرض کیا ہے۔ اس کو کچھ انعام دینا چاہیے۔ فرمایا کہ تم کو یہ کمال کس طرح حاصل ہوا۔ اُس نے کہا کہ نفس کے خلاف کرنے سے۔ آپ نے فرمایا کہ بھلا تمہارا نفس اسلام کو قبول کرتا ہے۔ اُس نے کہا نہیں۔ فرمایا کہ پھر یہ بھی تو خلافِ نفس کرو۔ وہ اوّل تو خاموش ہوا۔ پھر اسلام لایا اور حضرت نے اُس کو تعلیم فرمایا۔ سلطان جی نے حضرت امیر خسرو کو قلندر صاحب پانی پتی اور مخدوم علی احمد صابر کی خدمت میں بھی بھیجا تھا۔ مگر چونکہ خدا کو منظور تھا نہی ہوا یعنی خلافت حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کو عطا ہوئی اور حضرت سلطان جی کا لقب اولیا اس واسطے ہوا کہ اولیا جمع ہے ولی کی اور حضرت مرتبہ میں مجموعۂ اولیاء اللہ تھے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب طالب سالک کو مرشدانِ کامل تعلیم کرتے ہیں تو کان میں ایک بات پھونک دیتے ہیں چنانچہ بابا فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سلطان نمازی کے کان میں وہ پھونک ماری تو چھ مہینے تک بے خود و سرمست رہے۔ اور اسی پھونک کی تاثیر سے حضرت مخدوم علی احمد صابر آخر دم تک ہوش میں نہ آئے لیکن بعض حوصلے اور ظرف اللہ تعالےٰ نے ایسے بنائے ہیں کہ اُن کو پھونک بھی جگہ سے نہیں ہلا سکتی جیسے حضرت نظام الدین اولیا کہ جب اُن کے کان میں بابا صاحب نے پھونک ماری تو کچھ اثر نہ ہوا تین بار پھونک ماری اور یہ اپنی حالت پر قایم رہے۔ اُس وقت بابا صاحب کو الہام ہوا کہ اُن سے اگر ہزار بار یہ بات کہو گے تب بھی کچھ اثر نہ ہوگا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جناب میاں شاہ فدا حسین صاحب رسول شاہی اگرچہ عالم جید اور ہمارے پیر و مرشد تھے لیکن طریقہ ان کا بالکل خلافِ شرع شریف تھا۔ اسی لیے حضرات نقشبندیہ اُن کے منکر تھے بلکہ یوں فرماتے تھے کہ اُن کے کوچہ میں گذرنے سے قلب پر تاریکی چھا جاتی ہے۔ چنانچہ جناب قبلہ شاہ غلام علی شاہ صاحب نے ایک بار اُن کی نسبت فرمایا کہ وہ انسان پر سحر کر دیتے ہیں۔ میاں شاہ فدا حسین صاحب نے جواب میں

کہلا بھیجا کہ آپ ایک مُرید اپنا جس کو کامل اور خوب پختہ سمجھتے ہوں میرے پاس بھیجیے اور میں اپنا ایک مُرید آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ پھر دیکھیے کس کی تاثیر پڑتی ہے۔ غرض ان کا مرید وہاں گیا اور اُن کا یہاں آیا۔ چار مہینے کے بعد شاہ صاحب کے مرید نے تو سول شاہی طریقہ اختیار کر لیا۔ چار ابرو کا صفایا کرایا، جام وصراحی میں شریک ہوگیا۔ مگر میاں فدا حسین شاہ کا نذر شرب مُرید جیسا تھا ویسا ہی رہا۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت بابرکت کا اثر اُس پر کچھ بھی نہ ہوا۔[۱]

ایک[۲۱۸] روز ارشاد ہوا کہ میاں فدا حسین شاہ صاحب کی مجلس میں جامِ شراب کا دور معمول تھا۔ اتفاق سے ایک دن ہم بھی حاضر تھے کہ پیالہ گردش میں آیا۔ میاں توکل حسین شاہ صاحب ساقی تھے۔ میری نسبت میاں صاحب سے استمزاج کیا تو آپ نے اُن کو منع فرما دیا۔ کہ اُن کی تواضع نہ کرنا، مگر وہ نہ رہ سکے اور میرے سامنے بھی پیالہ پیش کیا۔ میں نے کہا کہ بہت اچھا مجھ کو انکار نہیں بشرطیکہ آپ وعدہ کریں کہ جو نشہ اس وقت چڑھے پھر حشر تک نہ اُترے گا۔ یہ کلمات سن کر میاں صاحب اُن پر خفا ہوئے کہ ہم نے تم کو پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ ان سے نہ بولنا۔ لو اب پلاؤ! اگر کچھ ہمت ہے۔ بھلا تم تو کیا پلاؤ گے، یہ طاقت تو ہم کو بھی حاصل نہیں کہ جو نشہ چڑھ جائے پھر نہ اُترے۔

ایک[۲۱۹] روز ارشاد ہوا کہ یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ انسان کو وقتِ مرگ رنج ہوتا ہے تو رنج کیوں نہ ہو اگر آدمی کسی جگہ دو چار سال بھی رہتا ہے تو وہاں سے نقل کرنا دشوار

---

[۱] جب یہ قصہ جناب وقبلہ نے بیان فرمایا تو ہمارے برادرانِ طریق میں سے ایک بزرگوار کے دل میں ایک شکل وارد ہوئی۔ اُس وقت حضرت قبلہ نے ارشاد کیا کہ ہم کو ایک نقل یاد آئی کہ ایک عورت کا شوہر نہایت شکیل وجمیل تھا مگر اُس عورت نے ایک زبردست ریچھ کو ڈور پر لگا رکھا تھا۔ اتفاقاً شوہر نے ایک بار دیکھ لیا اور اُس سے کہا کہ بھلا میری شکل وصورت اور کارگزاری و محنت میں کیا کسر تھی جو تو نے اس حیوان پر آنکھ ڈالی۔ چوں کہ راز فاش ہوگیا تھا اُس نے بھی صاف صاف کہہ دیا کہ میاں سنو شکل وصورت ڈیل ڈول رنگ وروپ یہ تو سب خوبیاں تم میں ہیں۔ لیکن یہ ریچھ کی یہ مستی میں جو کیفیت ہے اُس کی تم میں بُو بھی نہیں ؎

صلاحِ کار کجا و منِ خراب کجا
بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

گذرتا ہے۔ جسم بھی ایک مکان ہے اور ساری عمر انسان کی اس میں بسر ہوتی ہے۔ اس کا چھوڑنا بُرا کیوں نہ معلوم ہو۔ ہم نے پرشادگر ہندو فقیر سے یہ بات پوچھی تھی کہ تم کو بھی مرنے کا رنج ہوگا یا نہیں۔ کیوں کہ وہ ایک قالب سے دوسرے قالب میں نقلِ روح کر جاتے تھے۔ جواب دیا کہ ہاں! رنج تو مجھ کو بھی ہوگا۔ اس واسطے کہ بہ خوشی خاطر کسی جگہ سے نکلنا اور بات ہے اور زبردستی نکالا جانا اور بات۔ دونوں کا فرق ظاہر ہے۔

ایک [۲۲۰] روز ارشاد ہوا کہ مولانا فخر صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے شاہ ولایت دہلی کا پتہ دریافت کیا۔ آپ نے بتادیا کہ فلاں تُرّہ فروش ہے اور ایسا مستغرق ہے کہ ہر چیز ٹکے دھڑی لگادی ہے۔ اس لیے انتظامِ سلطنت بھی خراب ہے۔ دیکھا تو فی الحقیقت ایسا ہی پایا۔ تُرّہ فروش کا انتقال ہوگیا تو اُس شخص نے پھر پوچھا کہ حضرت اب کون ہے۔ فرمایا کہ اب ایک سقّہ ہے، چاندنی چوک میں پانی پلایا کرتا ہے۔ نہایت ہوشیار اور بیدار آدمی ہے۔ اسی واسطے انتظامِ سلطنت بھی درست ہے۔ وہ شخص اُن کی زیارت کو گیا۔ پانی مانگا تو دو کوڑی لے کر ایک کٹورہ بھر دیا۔ اُس نے قصداً پانی پھینک کر کہا کہ یہ صاف نہ تھا اور دیجیے۔ سقے صاحب نے کہا کہ دو کوڑی دو اور پانی لو۔ یہاں ٹکے دھڑی کا بھاؤ نہیں ہے۔ اور خبردار اُس بڈھے سے کہہ دینا کہ ذرا اپنی حد میں رہو۔ تم اپنا کام کرو ہم اپنا کام کرتے ہیں۔ راز فاش کرنا اچھی بات نہیں ہے۔ اُس شخص نے حضرت سے یہ حال عرض کیا۔ فرمایا کہ میاں ہم نہ کہتے تھے کہ وہ بہت ہوشیار ہے۔ بھائی آئندہ اُس کے پاس نہ جانا۔ حاکمِ وقت ہے۔ نہیں معلوم کیا کر بیٹھے۔

ایک [۲۲۱] روز ارشاد ہوا کہ مولانا فخر صاحب کے زمانہ میں ایک جوان کمبل پوش وارد ہوئے اور اُس مسجد میں ٹھہرے جہاں ایک حافظ مُرید حضرت کا رہا کرتا تھا۔ جب حافظ مسجد سے باہر جانے لگا تو فقیر نے پوچھا کہ تم کہاں جاتے ہو۔ اُس نے بیان کیا کہ میں دن میں دو وقت مولانا کی مسجد میں حاضر ہوتا ہوں۔ فجر کو تو درسِ حدیث ہوتا ہے اور عصر کے وقت مثنوی معنوی۔ فقیر بولا بھلا حدیث تو کیا لیکن مثنوی سمجھ بھی لیتے ہیں۔ حافظ چوں کہ مُرید تھا اُس کو یہ بات بُری معلوم ہوئی۔ حضرت سے یہ حال گذارش کیا۔ حضرت مولانا فخر صاحب نے فرمایا کہ واقع میں

وہ بزرگ سچ کہتا ہے۔ چونکہ منصف مزاج اور صاحب کمال تھے خود اُس کے پاس تشریف لائے اور درخواست کی کہ آپ کی زبانِ مبارک سے حدیث و مثنوی سننا چاہتا ہوں کمبل پوش نے کہا کہ حدیث تو آپ کیا سمجھیں گے لیکن کچھ مثنوی کے اشعار سناتا ہوں۔ یہ کہہ کر اول تو ایسے معنی بیان کیے کہ عام فہم تھے۔ دوبارہ ایسے مطالب بیان کیے کہ صرف مولانا صاحب سمجھے۔ تیسری بار جو شرح کی تو حضرت بھی نہ سمجھ سکے۔ تمام مجلس بے خود ہو گئی اور وہ شخص چل دیا۔ فی الحقیقت مردانِ خدا کے حالاتِ باطن کو کوئی تمیز نہیں کر سکتا ؎

قالِ مرداں را نمی فہمی تو نیز   حالِ مرداں را کجا داری تمیز

ایک[۲۲۲] روز ارشاد ہوا کہ ارے میاں! ایک روز شیخ کریم الدین دہریہ نے تو بڑا ہی غضب کیا تھا۔ اگر مجاورانِ درگاہ دیکھ پاتے تو مار ہی ڈالتے۔ پیران کلیر شریف کا ذکر ہے کہ وہ ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا کہ مرد آدمی تو ہمیشہ بُت پرستی اور قبر پرستی میں مصروف رہا۔ کبھی رجوعِ الی اللہ نہ ہوا۔ آ میں تجھ کو ایک تماشا دکھاؤں۔ دیکھوں تو تیرا خدا جس پر بہت بھروسہ کیے بیٹھا ہے میرا کیا کرے گا۔ یہ کہہ کر کم بخت شہدے نے حضرت مخدوم علاء الدین صابر صاحب قبلہ کے مزار متبرکہ پر جھٹ پیشاب کر دیا۔ میں نے اُس خبیث کو بہت للکارا اور مار پیٹ کے باہر نکال دیا۔ چھ سات گھڑے پانی سے غلافِ لطیف اور قبر شریف کو غسل دیا۔ مجاوروں نے آ کے دریافت کیا۔ تو میں نے صرف اس خیال سے کہ یہ شخص مارا جائے گا، ناچار دروغِ مصلحت آمیز پر عمل کیا اور اُن سے کہہ دیا کہ صاحب بندر نے پیشاب کر دیا ہے۔ خیر بات تو رفع دفع ہو گئی۔ پھر ملا تو کہنے لگا کہ میں تم کو رجوع الی اللہ کرتا ہوں۔ دیکھو یہ صرف مٹی کے ڈھیر ہیں ان سے کچھ بھلا بُرا نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ کریم الدین دہریہ بڑا پختہ کار آدمی تھا۔ اور کسی کا اعتقاد نہیں رکھتا تھا۔ اگر کچھ خوف اس کے دل میں ہوتا تو بے شک ظہور پکڑتا۔ اور اس فعلِ نالائق کی سزا ملتی ؎

تا کے بہ زیارتِ مقابر   عمرے گذرانی اے فسردہ
یک گربۂ زندہ پیشِ عارف   بہتر ز ہزار شیرِ مردہ

ایک[۲۲۳] روز ارشاد ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیٹ میں درد ہو گیا۔

جنابِ باری میں التجا کی۔ حکم ہوا کہ سونف کھاؤ۔ سونف کھائی درد جاتا رہا۔ ایک بار پھر درد ہوا تو پھر التجا کی۔ اُس وقت حکم ہوا کہ اب جالینوس حکیم کے پاس جاؤ۔ حسب الحکم اُس کے پاس گئے۔ بتایا کہ نیم بریاں کی ہوئی سونف کھاؤ۔ چناں چہ اُس کے کھانے سے صحت ہو گئی۔ حضرت موسیٰؑ نے جنابِ باری میں عرض کیا کہ الٰہی اُس کے پاس جو بھیجا تو نے ہی یہ نسخہ کیوں نہ بتا دیا۔ حکم ہوا کہ طب کا پیغمبر وہی ہے۔ مقتضائے حکمت یہ ہے کہ جو کام جس کے سپرد ہے اُسی کی معرفت ہو۔

ایک روز[۲۲۴] ارشاد ہوا کہ کبیر صاحب ایک دن اپنا تانا سنوار رہے تھے۔ کسی شخص نے پوچھا کہ مہاراج کیا کرتے ہو؟۔ جواب دیا کہ ادھر سے توڑتا ہوں اور اُدھر جوڑتا ہوں۔ پھر پوچھا کہ یہ آپ کے سر پر کیا ہے۔ کہا کہ کوچ سچ تو یہ ہے کہ جب تک انسان کے سر پر کوچ سوار نہیں ہوتا ادھر سے توڑنا اور اُدھر جوڑنا بہت مشکل ہے۔

ایک روز[۲۲۵] ارشاد ہوا کہ ہمارے پیر و مرشد حضرت میر اعظم علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ قصبۂ مُہم سے دہلی کو واپس آتے ہوئے اثنائے راہ میں ایک عجیب معاملہ پیش آیا۔ دوپہر کے وقت ایک درخت کے سایہ میں گاڑی ٹھہرا دی تاکہ ذرا آرام لے کر اور نماز ظہر پڑھ کر بعد فرو ہونے تمازتِ آفتاب کے آگے کو چلیں گے۔ تھوڑی دیر بعد ایک فقیر صاحب وارد ہوئے۔ ہم نے روٹی پانی کی تواضع کی۔ کھا پی کر وہ بھی سو گئے اور ہم بھی۔ جب آنکھ کھلی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہماری گاڑی ایک سرائے میں کھڑی ہے۔ بیل گھاس کھا رہے ہیں، بھٹیاری کھانا پکا رہی ہے اور فقیر صاحب پڑے سوتے ہیں۔ ہماری حالت سکتہ کی سی ہو گئی کہ الٰہی یہ کیسی سرائے اور کون سا شہر ہے اور ہم یہاں کیوں کر پہونچے۔ ہم نے بھٹیاری سے دریافت کیا کہ اس شہر کا نام کیا ہے۔ کہا کہ حیرت افزا۔ اری نیک بخت! یہ سرائے کس کی ہے۔ کہا انھیں فقیر صاحب کی اور جتنے روز تم یہاں ٹھہرو گے سب خرچ بھی اُن کے ذمہ ہے۔ آٹھ روز تک ہم اس شہر میں رہے۔ نہ اُس کی ابتدا معلوم ہوئی نہ انتہا۔ حقیقت میں وہ شہر حیرت افزا تھا۔ آدمی وہاں کے نیک سیرت، پاکیزہ صورت مرفہ حال۔ مکانات خوش قطع اور مصفا، اشیا رنگا رنگ موجود، بازار نہایت مکلف و پُر بہار۔ جدھر جاتے صورت تصویر بن جاتے۔ جامع مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔

اسلام کا زور و شور پایا۔ ہر شخص کو یادِ خدا میں مشغول دیکھا۔ قال اللہ و قال الرسول کے سوا کچھ ذکر نہ تھا۔ غرض آٹھویں رات کو جب ہم سو کر اُٹھے تو گاڑی اُسی درخت کے تلے کھڑی ہے اور وہی وقت ہے۔ فقیر صاحب بھی سوتے ہیں۔ ہم نمازِ ظہر پڑھ کر روانہ ہوئے۔ فقیر صاحب بھی ہمارے ساتھ ہو لیے راستہ میں جس شخص سے پوچھا وہی تاریخ، وہی دن، وہی مہینہ بتایا۔ ہم کو حیرت ہوئی کہ یہ آٹھ دن کہاں گئے۔ آخر بہادرگڈھ پہونچے وہاں ایک مکان میں ٹھہرے۔ فقیر صاحب نے فرمایا کہ بعد نمازِ عشا ہماری روٹی اس مسجد میں لے آنا۔ جب ہم روٹی لے کر مسجد میں پہونچے تو دیکھا کہ نماز پڑھتے ہیں۔ بعدِ فراغت کھانا کھایا۔ باتیں کرنے لگے۔ جب آدھی رات گئی تو فرمایا کہ شہر کے دھوبی کپڑے دھو رہے ہیں جاؤ ہمارا لنگوٹ دھلوا لاؤ۔ میں نے کہا کہ حضرت آدھی رات ادھر آدھی رات اُدھر، بھلا اس وقت کون کپڑے دھوتا ہوگا۔ فرمایا کہ ذرا تم لے تو جاؤ۔ میں چلا اور شہر کے دروازہ سے باہر نکلا تو دیکھتا کیا ہوں کہ دو گھڑی دن چڑھا ہے اور دھوبی کپڑے دھو رہے ہیں۔ جب دروازے کے اندر آتا ہوں تو نصف شب معلوم ہوتی ہے اور جب باہر جاتا ہوں تو دو گھڑی دن چڑھا ہوا نظر آتا ہے۔ غرض دھوبیوں کے پاس پہونچے ایک دھوبی نے کہا کہ لاؤ میاں صاحب کا لنگوٹ میں دھو دوں۔ اُس نے دھویا، صاف کیا، دھوپ میں سُکھا کر حوالہ کیا۔ میاں صاحب کی خدمت میں لے آیا۔ مجھ کو ان باتوں کا نہایت تعجب تھا۔ فرمایا کہ تعجب نہ کرو یہ بھان متی کا سانگ ہے اور ایسے شعبدے ہم بہت دکھا سکتے ہیں۔ لیکن فقیری کچھ اور ہی چیز ہے۔ ان باتوں کا خیال مت کرو۔ صبح کے وقت ہم دہلی کو روانہ ہوئے اور فقیر صاحب غائب ہوگئے۔ جب دہلی میں پہونچے تو ہم نے یہ حال مولانا شاہ عبد العزیز صاحب سے بیان کیا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ وہ شخص خضرِ وقت۔ یا ابو الوقت تھا۔

۲۲۶ ایک روز[1] ارشاد ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک دوست تھا مگر نادان۔ اس نے حضرت سے درخواست کی کہ مجھ کو اسم اعظم سکھا دیجیے۔ ہر چند انکار کیا اور سمجھایا کہ تو اس قابل نہیں ہے۔ اُس نے نہ مانا اور نہایت اصرار کیا۔ ناچار بتایا اور امتحان بھی کرا دیا۔ لیکن منع

---

[1] کسی صاحب نے حضرت قبلہ سے تعلیم کی خواہش پیش کی اُس پر یہ ارشاد زبان فیض ترجمان سے فرمایا ۱۲۔

فرمایا کہ آیندہ تو اس کو کام میں نہ لانا ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ یہ فرما کر چل دیے۔ اُس کے دل میں خیال آیا کہ بھلا اب تو دیکھوں اسم اعظم تاثیر کرتا ہے یا نہیں۔ کچھ ہڈیاں نظر آئیں۔ اُن پر اسم اعظم پڑھا۔ فوراً ایک شیر خوں خوار زندہ ہو کر غرّایا اور اُس کو پھاڑ کھایا۔ جب حضرت اُس راہ سے واپس آئے تو دیکھا کہ وہ مرا ہوا پڑا ہے اور شیر کھا رہا ہے۔ شیر سے پوچھا تو نے اس کو کیوں مارا۔ جواب دیا کہ یہ شخص میرا خالق تو بنا تھا مگر رزق کی فکر نہ کی۔ اس لیے میں نے اس کو کھالیا۔

ایک روز[۲۲۷] ارشاد ہوا کہ میر عباس علی صاحب: حضرت بو علی قلندر کے مزار پر جا کر مراقبہ کرو۔ جب میر صاحب بعد از مراقبہ حاضر خدمت مبارک ہوئے تو کیفیت دریافت فرمائی۔ اُنھوں نے عرض کیا کہ حضور مجھ کو کچھ معلوم نہیں ہوا۔ میں از خود رفتہ ہو گیا تھا۔ اُس وقت فرمایا کہ ہم کو ایک نقل یاد آئی ہے۔ جب بیجو باورے کا کمال فنِ موسیقی میں مشہورِ آفاق ہوا تو اکبر بادشاہ نے اپنی مجلس میں اُس کو طلب کیا۔ اُس نے بہ تعمیل حکم شاہی اپنا راگ شروع کیا۔ چوں کہ اہلِ محفل کی طبائع اُس کی متحمّل نہ ہو سکیں۔ ایسی حالت ہوئی کہ کچھ حظ و لطف اور حسن و قبح راگ کا محسوس نہ ہوا۔ اور کسی نے اُس کے کمال کی تعریف و توصیف نہ کی جب کہ اسی طور سے ایک ہفتہ تک اُس کا راگ سنتے رہے تو سامعین کو اُن نغمات کی برداشت ہوگئی۔ اُس وقت سب نے کیفیتِ سماع اُٹھائی اور کہا کہ اب خوب گاتا ہے۔ یہی حال دربارِ قلندری کا ہے کہ جب طبیعت متحمّل ہو جائے تو کیفیت مراقبہ منکشف ہو۔

ایک روز[۲۲۸] ارشاد ہوا کہ شغلِ سرمدی کو ہندی میں انہد کہتے ہیں۔ چنانچہ امیر خسرو نے اس کی کیفیت نظم ہندی میں اس طرح بیان کی ہے ؎

ایکی بھنور گجا رسی دوجے گھر گھر ہوے	تیجے شبد سنگھ کا چوتھے گھنٹہ ہوے
چوتھے گھنٹہ ہوے پانچویں ٹال جو باجے	چھٹے سو مرلی ناتھ ساتویں بھیر جو گاجے
آٹھویں شبد مردنگ کا نویں نفیری نال	دسویں گرجیں سندھ سا سن خسرو یہ نال
دس پرکار انہد بجیں جبت جوگی ہو لین	اندر ری تھگی منوا ان ٹھگے خسرو نے کہدین
انہد باجے باجن لاگے	چورنگر یہ تج تج بھاگے

گرو نجام[1] کی بھی دو ہائی   خسرو نے انتر لو لائی

۲۲۹ ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک حاکمِ ظالم جو معزول ہو گیا تھا ہمارے پاس آیا اور نہایت عجز و انکسار کے ساتھ دعا کا طالب ہوا۔ خیر کچھ مدت کے بعد قدرتِ خدا سے وہ اپنے عہدے پر بحال ہو گیا، لیکن وہی ظلم و ستم کا طریقہ جو پہلے تھا پھر اختیار کیا تو ہم نے اُس کو یہ رباعی تحریر کی ؎

اہلِ[2] کاراں بہ وقتِ معزولی   شیخ شبلی و بایزید شوند
چوں بیایند باز بر سرِ کار   شمرِ ذی الجوشن و یزید شوند

۲۳۰ ایک روز ارشاد ہوا کہ میاں غلام محمد صاحب گنجپوری نے عرض کیا کہ حضرت میرا ارادہ میراں جی کے ٹھکے کا ہے تاکہ شاہ بھیک صاحب کی زیارت کروں۔ اُس وقت ہم نے کہا کہ ہم کو حضرت نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کی رباعی یاد آئی ہے ؎

تا کے بہ زیارتِ مقابر   عمرے گذرانی اے فسردہ!
یک گربۂ زندہ پیشِ عارف   بہتر نہ ہزار شیرِ مُردہ

میاں کہیں ایک جگہ قناعت کر کے بیٹھ رہو خدا مالک ہے ؎

اے دل تو دمے صحبتِ انا بنشیں با صدق و صفا   یا با صنمِ لطیف و رعنا بنشیں، با حلم و حیا
ایں ہر دو ترا اگر میسر نہ شود، از طالعِ خویش   اوقات مکن ضائع تنہا بنشیں، با یادِ خدا

اور اگر تم محبتِ الٰہی میں پھرتے ہو تو کسی مردِ خدا سے ملو ؎

در راہِ نیاز ہر دلے را دریاب   در کوئے حضور مقبلے را دریاب
صد کعبۂ آب و گل بہ یک دل نہ رسد   کعبہ چہ روی برو دلے را دریاب

۲۳۱ ایک روز ارشاد ہوا کہ یہ غزل حضرت شاہ نیاز احمد صاحب بریلوی کی خوب ہے ؎

۱؎ یعنی سلطان نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ ۱۲ منہ

۲؎ بعض نسخوں میں یہ رباعی یوں ہے:۔

عامل اندر زمانِ معزولی   ہمہ شبلی و بایزید بوند
باز چوں قایم و بحال شوند   شمرِ ذی الجوشن و یزید شوند

نیستی ہستی ہے یارو اور ہستی کچھ نہیں — بے خودی مستی ہے یارو اور مستی کچھ نہیں
لامکاں کی منزلت پاتا ہے کب کون و مکاں — ہو کے ویرانہ کے آگے ہے کی بستی کچھ نہیں
کچھ نہیں سب کچھ ہے یارو اور سب کچھ کچھ نہیں — غیر اس کے معنیٔ رمز الستی کچھ نہیں
پر جو کچھ ہونا جسے کہتے ہیں پستی ہے میاں — فقر میں پستی یہی ہے اور پستی کچھ نہیں
بندگی اور حق پرستی کچھ نہ ہونا ہے نیاز — کچھ نہ ہونے کے سوا اور حق پرستی کچھ نہیں

ایک ۲۳۲ **روز ارشاد ہوا** کہ یہ غزل خواجہ حافظ لسان الغیب کی کیا خوب ہے۔ زبان فیض ترجمان سے غزل سن کر اہل مجلس کی عجب کیفیت ہو گئی تھی کہ جو تحریر میں نہیں آ سکتی ہے

حسب حالے نہ نوشتہ شدہ ایامے چند — قاصدے کو کہ فرستم بہ تو پیغامے چند
ما بداں منزلِ عالی نہ توانیم رسید — ہاں! اگر لطفِ شما پیش نہد گامے چند
چوں مے از خُم بہ سبو رفت و گل افگند نقاب — فُرصتِ عیش نگہ دار و بزن جامے چند
قند آمیختہ با گُل نہ علاجِ دلِ ماست — بوسۂ چند بیامیز بہ دشنامے چند
اے گدایانِ خرابات، خدا یارِ شماست — چشم انعام مدارید ز انعامے چند
زاہد از کوچۂ رنداں بہ سلامت بگذر — تا خرابت نہ کُند صحبتِ بدنامے چند
عیبِ مے جملہ بہ گفتی ہنرش نیز بہ گو — نفیِ حکمت مکُن از بہرِ دلِ عامے چند
پیرِ مے خانہ چہ خوش گفت بہ دُردی کشِ خویش — کہ مگو حالِ دلِ سوختہ با خامے چند

ایک ۲۳۳ **روز ارشاد ہوا** کہ دو پتلیاں تھیں۔ ایک دانش مند سے پوچھا گیا کہ ان میں سے کون سی عمدہ اور بہتر ہے اُس نے دونوں کے کان میں ایک ایک تنکا ڈالا۔ ایک کے حلق میں سے نکل آیا دوسری کے پیٹ میں اُتر گیا۔ دانش مند نے جواب دیا کہ جس کے پیٹ میں تنکا اُتر گیا وہی بہتر ہے۔ ایسے ہی جو آدمی بات کو سُن کر ضبط و ہضم کر سکے وہی آدمی ہے۔

ایک ۲۳۴ **روز ارشاد ہوا** کہ تصورِ شیخ ہمارے نزدیک تو شرک ہے اور ابتدائے بُت پرستی بھی اسی سے ہوئی ہے۔ چنانچہ **نقل** ہے کہ جس وقت حضرت ادریس علیہ السلام اپنی اُمت سے ناراض ہو کر بہشت کو چلے گئے تو بعد میں امت کو بڑا قلق ہوا۔ آپ کے فراق میں بے چین رہنے لگی۔ اُس وقت شیطان بہ صورتِ انسان مُتمثّل ہو کر لوگوں کے

پاس آیا۔ اور کہا کہ تم گھبراؤ مت ایسا طریقہ تم کو بتاتا ہوں کہ جب چاہو اپنے نبی کو دیکھ لیا کرو۔ تمام اُمت خوش ہو کر اُس کی گرویدہ ہوگئی۔ تب اُس نے طریقہ تصور کا اُن کو تعلیم کیا۔ اس طور پر عمل کرنے سے وہ لوگ حضرت کی زیارت سے مستفیض و مشرف ہونے لگے جب وہ لوگ نہ رہے تو اُن کی اولاد نے حضرت ادریسؑ کی تصویر بنا کر مشقِ تصوّر کی۔ اُن کی ذرّیات نے سنگین تصویریں تیار کرلیں ع

ہر کہ آمد بر آں مزید نمود

رفتہ رفتہ علانیہ بُت پرستی ہونے لگی۔ اسی واسطے ہم کسی کو تصوّر نہیں بتاتے۔ نہ دوسروں کو بتانے سے منع کرتے ہیں لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ تصوّرِ شیخ سے طالب پر علم شیخ وارد ہو جاتا ہے۔ اور اُس طالب سے اوروں کو فیض نہ فائدہ بہت پہونچتا ہے کیونکہ نسبت اُس کی متعدی ہوتی ہے۔ اور اگر طالب خود اپنا تصوّر کرے تو اُس کی ذات کے لیے بہت فائدہ مند ہے، لیکن دوسروں کو فیض و فائدہ نہیں پہونچا سکتا۔

ایک ۲۳۵ روز ارشاد ہوا کہ زینت المساجد میں کمبل پوش نے ایک دن یہ اشعار پڑھے ؎

ملکِ خدا میں یار و آباد ہیں تو ہم ہیں | تعمیرِ دو جہاں کی بُنیاد ہیں تو ہم ہیں
دیکھا پرکھ پرکھ کے آخر پڑا نظر یہ | گر نقد ہیں تو ہم ہیں نقاد ہیں تو ہم ہیں

ہم نے کمبل پوش سے دریافت کیا (نظر پڑا یہ)، سے کیا مراد ہے۔ کہا کہ انسان ہم نے کہا نہیں یہ سے قلب مُراد ہے۔ کہا کہ بے شک اس کے یہی معنی ہیں اور اب خوب سمجھ میں آگئے۔

ایک ۲۳۶ روز ارشاد ہوا[1] کہ جب تک کوئلہ دہک نہیں جاتا چٹختا ہی رہتا ہے اور دھواں بھی دیتا ہے مگر جب آگ اُس کے اندر بخوبی سرایت کرجاتی ہے اور وہ ہم رنگِ آتش ہو جاتا ہے تو پھر نہ دھواں رہتا ہے نہ آواز۔ چناں چہ کہا گیا ہے اَلْوَجْدُ

---

[1] میر محمد تقی صاحب نے ایک روز عرض کیا کہ حضرت یہ کیا بات تھی کہ ابتدائے حال میں شاہ سلیمان صاحب تونسوی حال بہت کھیلتے تھے لیکن آخر زمانہ میں یہ حالت نہیں رہی تھی۔ اس وقت زبان فیض ترجمان سے یہ ارشاد فرمایا تھا ۱۲

فِی الْاَوَّلِ مَحْمُوْدٌ وَفِی الْاَوْسَطِ سُرُوْرٌ وَفِی الْاٰخِرِ مَذْمُوْمٌ یعنی ابتدا میں وجد کرنا نیک ہے اور درمیان خوشی اور سرور اور آخر میں برا ہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ قلندر صاحب کو کس بزرگ سے بیعت تھی۔ اس باب میں اقوالِ مشائخ مختلف ہیں۔ بعض نے فرمایا ہے کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی چشتی رحمۃ اللہ علیہ سے تھی۔ اور بعض کا قول ہے کہ حضرت عاشقانِ عاشق خلیفہ خواجہ قطب الدین صاحب سے تھے، لیکن صحیح قول یہ ہے کہ قلندر صاحب علما، مشاہیر سے تھے، اور شہر دہلی میں درس و تدریس کیا کرتے تھے۔ اُس زمانہ میں بادشاہ وقت نے ایک عورت سے نکاح کیا جب اُس کے پاس جاتا تو قادر نہ ہوتا، لیکن اور حرموں کے ساتھ یہ کیفیت نہ تھی۔ بادشاہ کو نہایت تشویش ہوئی۔ تمام علمار کو جمع کر کے کشفِ راز چاہا چوں کہ یہ کتابی مسئلہ نہ تھا سب متحیر ہوئے۔ کوئی شافی جواب نہ دے سکا۔ بادشاہ نے غضبناک ہو کر حکم دیا کہ اگر کل تک جوابِ باصواب نہ دوگے تو سب کو دار پر کھینچ دوں گا۔ سب کے ہوش اُڑ گئے۔ بارگاہِ الٰہی میں دست بہ دعا ہوئے۔ اُس روز ایک مجذوب یعنی حضرت عاشقان عاشق خلیفہ خواجہ قطب الدین، قلندر صاحب کے مدرسہ میں تشریف لائے۔ اور طلبا، سے دریافت کیا کہ تمھارے اُستاد کہاں ہیں؟۔ جواب دیا کہ بادشاہ نے کسی امرِ اہم کے لیے طلب فرمایا ہے۔ فرمایا کہ خیر اُن کی کوئی کتاب لاؤ طالب علموں نے کتاب دی۔ اُنھوں نے بادشاہ کے سوال کا جواب مفصّل تحریر فرمایا اور کہہ دیا کہ جس وقت تمھارے اُستاد آئیں تو یہ کتاب دینا اور ہمارے آنے کا حال کہنا۔ قلندر صاحب واپس تشریف لائے تو یہ کیفیت سُنی۔ فوراً کتاب دیکھی اُس میں لکھا تھا کہ بادشاہ نے جس نوجوان خوب رو عورت سے نکاح کیا ہے یہ اُس کی بیٹی ہے۔ اتنا عرصہ ہوا کہ بادشاہ نے ناراض ہو کر ایک بیگم کو جنگل میں نکلوا دیا تھا۔ اُس مصیبت زدہ نے ایک دھوبی کے گھر پناہ لی۔ وہاں یہ لڑکی پیدا ہوئی۔ سات برس کے بعد بیگم نے انتقال کیا۔ اور دھوبی نے چوں کہ لاولد تھا اس لڑکی کو مثلِ اولاد پرورش کیا۔ جب یہ بڑی ہو گئی اور حسن و جمال کا شہرہ دور دور پہنچا تو حرمِ شاہی میں داخل ہوئی۔ چوں کہ یہ بادشاہ حاکمِ اسلام اور

نائب رسول اللہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کو اس گناہ سے محفوظ رکھا۔ اگر بادشاہ کو کچھ شک ہو تو دھوبی کو بلوا کر پوچھ لے۔ کیونکہ مرتے وقت بیگم نے اپنی سرگذشت دھوبی سے بیان کر دی تھی۔ قلندر صاحب یہ قصہ پڑھ کر بہت خوش ہوئے۔ اگلے روز بادشاہ کے حضور میں سب حال عرض کیا۔ بادشاہ نے دھوبی کو طلب کیا۔ اُس نے بھی تصدیق کی۔ اُس وقت تمام علما کو رہائی ملی اور جان میں جان آئی۔ قلندر صاحب بھی اپنے مکان پر واپس آئے اور آتے ہی کتب خانہ دریا برد کر دیا۔ پھر اُن مجذوب کی تلاش میں نکلے۔ تیسرے روز ملاقات ہوئی۔ قلندر صاحب نے بیعت کی درخواست کی۔ اُنھوں نے انکار کیا اور فرمایا کہ مجھ کو یہ طاقت نہیں کہ تم کو تعلیم کروں، لیکن تم کو تمھارے پیر و مرشد کے پاس پہونچا دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر حضرت قلندر صاحب کا ہاتھ حضرت علی مُرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ حضرت علیؓ مُرتضیٰ نے تعلیم فرمایا۔ اُسی دم مجذوب ہو گئے اور بو علی قلندر ان کا لقب ہوا۔ ورنہ اصلی نام شرف الدین تھا۔ پس قلندر صاحب کا مرشد سوائے حضرت علیؓ مُرتضیٰ کے اور کوئی نہیں۔ اور یہ بات کچھ تعجّب کی نہیں ہے بعض بزرگوں کو اسی طور سے فیض ہوا ہے۔ چناں چہ حضرت ابوالحسن خرقانی کو بایزید بسطامی سے فیض ہوا، حالاں کہ اُن کے انتقال کو سو برس گذر چکے تھے۔

۲۳۸ ایک روز ارشاد ہوا کہ گو حضرت قلندر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مزار تین جگہ مشہور ہے، پانی پت۔ کرنال اور بُڈھا کھیڑا۔ لیکن اربابِ صفا ہر جگہ سے فیض اُٹھا سکتے ہیں حضرت کے مزار شریف کی کیفیت یہ ہے کہ بعدِ وفات حضرت مبارز خاں صاحب کے اپنے استاد حضرت حافظ سراج الدین مکّی کو وصیت کی کہ جب فقیر کا انتقال ہو جائے تو اس فرزند کے پائینِ مزار دفن کرنا۔ چند روز کے بعد آپ کی طبیعت ایسی اُچاٹ ہوئی کہ کرنال کو تشریف لے گئے اور ایک گوشۂ صحرا میں درخت کی شاخ پکڑ کے شغل ہوائی شروع کیا۔ اسی حالت میں کھڑے کھڑے آپ نے انتقال فرمایا۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا تو آپ کو کرنال ہی میں دفن کر دیا۔ بوقتِ شب جنابِ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت سراج الدین مکّی جو قلندر صاحب کے اُستاد تھے ارشاد فرمایا کہ شرف الدین نے بمقام کرنال انتقال کیا ہے۔ تم جاؤ اور یہاں لاکر دفن کرو۔ چناں چہ وہ حسبِ ارشاد گئے اور چاہا کہ قلندر صاحب کی نعش کو پانی پت لے آئیں مگر

اہلِ کرنال مانع ہوئے۔ بہت کچھ شور و فساد برپا ہوا۔ آخر میاں سراج الدین صاحب ایک مصنوعی جنازہ بنا کر قلندر صاحب کے مزار کی ایک اینٹ رکھ کے لے چلے اور خیال کیا کہ اگر کامل ہیں تو خود اس میں آجائیں گے۔ جب قریب پانی پت پہونچے ہیں تو ایک امیر تفریحاً سیر کو نکلا تھا اُس نے پوچھا کہ یہ جنازہ کس کا ہے؟ معلوم ہوا کہ حضرت قلندر صاحب کا جنازہ ہے۔ اُس نے زیارت کی تمنا کی اور چادر اُٹھا کر روئے مبارک دیکھا تو فی الحقیقت آپ کا جسم موجود تھا۔ تب لوگوں نے یہاں لا کر حسبِ وصیت آپ کو دفن کر دیا۔

ایک روز[229] **ارشاد ہوا** کہ بعض بزرگوں نے کہا ہے کہ ایک فقیر دوسرے سے نعمت باطنی چھین سکتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مراتب البتہ کم ہو جاتے ہیں، لیکن قرب یا جو بات کسب سے حاصل ہوئی ہو اُس کو کوئی نہیں چھین سکتا۔ ہم نے سورۂ الحمد و قل ہو اللہ پڑھی ہے اور ہم کو یاد ہے۔ بھلا کوئی چھین تو لے، بلکہ فسق و فجور سے بھی اس کو زوال نہیں۔ یہ سن کر کسی نے عرض کیا کہ بعض کا قول ہے کہ حضرت نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کی ولایت بوعلی قلندر نے سلب کر لی تھی، اس کی کیا اصل ہے؟ ارشاد ہوا کہ یہ بات غلط ہے۔ حضرت نظام الدین بھی بڑے صاحب کمال تھے۔ یہ مرتبۂ معشوقی میں تھے اور قلندر صاحب مرتبۂ عاشقی میں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ ایک دفعہ حضرت امیر خسرو صاحب قلندر صاحب کی خدمت میں آئے قلندر صاحب نے فرمایا کہ کچھ پڑھو۔ چناں چہ امیر خسرو صاحب نے اپنا کلام پڑھا۔ پھر قلندر صاحب نے اپنی غزل پڑھی تو امیر خسرو رونے لگے۔ قلندر صاحب نے پوچھا کہ تم ہمارا کلام سمجھ گئے جو روتے ہو۔ اُنھوں نے عرض کیا کہ حضرت اس لئے روتا ہوں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اُس پر حضرت قلندر صاحب بہت خوش ہوئے فرمایا کہ لو میں کچھ دیتا ہوں۔ جب دینا چاہا تو دو ہاتھ غیب سے پیدا ہوئے اور اس فیضاں کو لے گئے یہی معاملہ دو یا تین بار واقع ہُوا۔ آخر قلندر صاحب نے فرمایا کہ تمھارے مقسوم کی نہ تھی۔ جب امیر خسرو حضرت نظام الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے تو فرمایا کہ قلندر صاحب آپ جیسا بنانا چاہتے تھے، لیکن تم متحمل نہ ہو سکتے اس واسطے اس فیض کو ہم نے لے لیا تھا۔ بعد موت کے تم کو دیا جائے گا۔ اس کے بعد جناب و قبلہ نے فرمایا کہ بزرگانِ کامل طالبِ صادق کے لیے مثل حکیم ہوتے ہیں۔ اور وہ اس کی ہمت و حوصلہ

اور استعداد و قابلیت کو خوب تشخیص کر لیتے ہیں۔ جیسا مناسبِ حال ہوتا ہے تعلیم کرتے ہیں۔ مثلاً خوشبودار پھول سب کو بھلا معلوم ہوتا ہے اور سب اُس کے طالب ہوتے ہیں، لیکن کسی کے دماغ کو بوئے گل فرحت و انبساط بخشتی ہے اور کوئی متحمل نہیں ہو سکتا، اُس کو نزلہ و زکام و دردِ سر پیدا کرتی ہے۔ جو کمال وہبی ہوتا ہے وہ کسبی سے افضل ہے۔ اور کمالِ وہبی کے واسطے کچھ حاجت، مجاہدہ وغیرہ کی نہیں ہے لیکن جو کمال کسبی کسی صاحب کمال سے پہونچے، وہ بھی مثل وہبی ہو جاتا ہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ فقرائے ہنود مثل بزرگانِ اسلام کے فیض رسانی کر سکتے ہیں اور جیسے کہ لطائفِ ستہ صوفیۂ اسلام میں متعارف ہیں ایسے ہی فقرائے ہنود میں بھی ہیں۔ ہر ایک لطیفہ کا ہندی نام زبانِ مبارک سے لیا پھر فرمایا کہ میاں! دونوں میں فرق ہے صرف حفظِ مراتب کا جیسے آبِ پاک و پیشاب کہ عکسِ آفتاب دونوں میں مساوی ہے اور دیکھنے میں دونوں یکساں نظر آتے ہیں مگر ایک میں بدبو ہوتی ہے اور ایک میں نہیں۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ میاں! قلندر صاحب تو سیرِ جہان میں مصروف تھے اور مخدوم علی احمد صابر صاحب رحمۃ اللہ علیہ سیرِ جان میں۔ دونوں حضرات دریائے حیرت میں مستغرق تھے۔ مراتب کی طرف تو سب دوڑتے ہیں لیکن اُجاڑ گانوں اور بیابانِ لق و دق میں کس کی شامت آئی ہے جو جائے اور اپنے آپ کو ہلاک کرے بھلا توحید[1] کے دریائے بے پایاں و ناپیدا کنار میں کون زورق چلا سکتا ہے۔ اہلِ اسلام کا تو یہاں گذارا ہی دشوار ہے ؎

چو شبہا نشستم دریں دیر گم | تحیر گرفت آستینم کہ قُم
بہ ترسد خردمند ازیں بحرِ خوں | کزو کس نہ بُرد ست کشتی بروں
دریں ورطہ کشتی فرو شد ہزار | کہ پیدا نہ شد تختہ بر کنار

جہاں نہ منزل ہے نہ مقام، نہ کچھ پتا نہ کوئی ٹھکانہ، وہاں آدمی جائے تو کہاں جائے جس بحرِ ذخار میں، نہ ساحل نہ منارہ، نہ بانس لگے نہ بلّی، اس سے عبور ہو تو کیوں کر ہو۔ البتہ

---

[1] اس حکایت سے یہ مراد نہیں کہ ان دونوں صاحبوں کو توحید حاصل نہ تھی۔ نہیں بلکہ اس مقام پر ٹھہرے نہیں جلدی نکل گئے ۱۲ منہ۔

کوئی مردِ مردانہ ایسا ہوتا ہے کہ نامُرادی کا لنگر باندھ کر اس محیطِ اعظم میں کود پڑے اور یہ بات شیطان ہی پر ختم ہے ۔

نامُرادی را کُنی گر توشۂ فارغ آئی از غم و اندیشۂ
راہ را ایں جادۂ ناکامی است کامرانیک در بدنامی است

شیطان نے بھی سمجھ لیا ہے کہ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو ہی لیا۔ اب کیوں کسر باقی رکھیں اور کس لیے فکر و تردّد کریں ع

اب کیا رہا ہے جس پہ رقیبوں کا ڈر کریں

مگر ہم لوگوں کی یہ کیفیت ہے کہ خوف و رجا کے مارے مرے جاتے ہیں ۔ یہ خیال ہی نہیں جمتا کہ جو کچھ ہونا ہے وہ تمھارے واسطے بھی ہو چکا ہے ۔ پھر حسرت و آرزو بے سود اور بیم و رجا عبث۔ اگر انسان غور کرے تو اہلِ مدارج و مراتب کیا؟ اور ناکام و نامراد کیا؟ سب کا مبدا، و معاد ایک ہے ؎

آں وطن مصر و عراق و شام نیست آں وطن شہریست کانرا نام نیست

اس وقت ایک **نقل** یاد آئی۔ امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے پیچھے اُن کے بھائی احمد غزالی نماز نہیں پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن امام صاحب نے اپنی والدہ ماجدہ کے سامنے بھائی کی شکایت کی۔ اُنھوں نے احمد غزالی کو بُلا کر سمجھایا کہ اپنے بھائی کی اقتدا کرو۔ کہا کہ بہت خوب۔ چنانچہ صبح کی نماز میں شامل جا ہوئے۔ مگر ایک رکعت کے بعد نیت توڑ الگ ہو بیٹھے۔ بعد نماز لوگوں نے چرچا کیا کہ یہ بھی کیا آدمی ہیں یا تو نماز ہی نہ پڑھتے تھے اور جو پڑھی تو ایک رکعت۔ امام صاحب کو بہت رنج ہوا۔ والدہ سے کیفیتِ واقعہ عرض کی ۔ اُنھوں نے احمد غزالی سے جواب طلب کیا۔ کہا کہ جب تک بھائی صاحب نماز میں مشغول تھے، میں اُن کے پیچھے رہا۔ جب یہ حیض و نفاس کے مسائل میں مصروف ہوئے، میں نیت توڑ کے الگ ہو گیا۔ والدہ نے سن کر فرمایا کہ تم دونوں نالائق ہو۔ کام کا ایک بھی نہ ہوا۔ وہ حیض و نفاس میں گیا اور تو اُس کے پیچھے ہو لیا۔ رجوع الی اللہ نہ تو ہوا نہ وہ۔ نماز خدا کی پڑھتا تھا یا اُس کے دل کی؟ ۔

ایک روز[۲۴۲] ارشاد ہوا کہ مخدوم علی احمد صابر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس قدر استغراق تھا کہ اُن کو دن رات ہوش نہیں ہوتا تھا۔ مگر خادم بہ وقتِ نماز حق حق کان میں کہتے تھے تو آپ گھبرا کر آنکھیں کھول دیتے اور فرماتے کہ کیا قیامت قائم ہوگئی۔ اُس وقت ریشِ مبارک کے بال سفید ہو جاتے تھے۔ تب خادم عرض کرتے کہ حضرت قیامت نہیں نماز کا وقت آگیا۔ یہ سُن کر حالتِ اصلی پر آجاتے اس کا سبب یہ تھا کہ تصفیۂ ما سوائے اللہ سے پہلے استغراق وارد ہو گیا تھا، ورنہ قیامت یاد نہ رہتی۔

ایک روز[۲۴۳] ارشاد ہوا کہ مثنوی میں سے حکایت شبان پڑھو۔ محمد احسان اللہ صاحب برادر مولوی فتح محمد صاحب مرحوم بھی حاضر تھے۔ میاں احسان اللہ مثنوی معنوی خوب پڑھتے تھے حکایت حفظ شروع ہوئی اور جناب قبلہ کے چہرۂ مبارک کا رنگ سُرخ اور آنکھیں مثل شمع روشن ہوگئیں۔ آنسو ٹپ ٹپ مینھ کی طرح برسنے لگے۔ تمام مجلس کی یہ حالت تھی کہ ایک کی دوسرے کو خبر نہ رہی۔ ایک عجیب و غریب کیفیت طاری تھی کہ بیان میں نہیں آسکتی۔ اٹھارہ برس کے عرصہ میں صرف اُس روز حضرت کو روتے ہوئے دیکھا۔ جناب قبلہ بھی کبھی کبھی اس حکایت کے اشعار پڑھا کرتے تھے۔ ؎

دید موسیٰ یک شبانے را براہ   کو ہمی گفت اے خدا و اے الٰہ
تو کجائی تا شوم من چاکرت   چارقت دوزم کنم شانہ سرت
اے خدائے من فدایت جانِ من   جملہ فرزندان و خان و مانِ من
تو کجائی تا سرت شانہ کنم   چارقت را دوزم و بخیہ زنم
جامہ ات دوزم شپشہایت کشم   شیر پیشت آورم اے محتشم
ور ترا بیمارئے آید بہ پیش   من ترا غمخوار باشم ہم چو خویش
دستکت بوسم بمالم پایکت   وقتِ خواب آید بروبم جائیکت
گر بہ بینم خانہ ات را من دوام   روغن و شیرت بیارم صبح و شام
ہم پنیر و نانہائے روغنی   خمرہا جغراتہائے نازنین
سازم و آرم بہ پیشت صبح و شام   از من آوردن ز تو خوردن طعام

اے فدائے تو ہمہ بزہائے من
اے بیادت ہے ہے و ہیہائے من

این نمط بیہودہ می گفت آں شباں
گفت موسیٰ با کیستت اے فلاں

گفت باآں کس کہ ما را آفرید
این زمین و چرخ ازو آمد پدید

گفت موسیٰ ہائے خیرہ سر شدی
خود مسلماں ناشدہ کافر شدی

این چہ ژاژ است این چہ کفرست و فشار
پنبہ اندر دہان خود فشار

گند کفر تو جہاں را گندہ کرد
کفر تو دیبائے دیں را ژندہ کرد

چارق و پاتابہ لائق مر تراست
آفتابے را چنیں ہا کے رواست

گر نہ بندی زیں سخن تو حلق را
آتشے آید بسوزد خلق را

آتشے گر نامدہ است ایں دود چیست
جان سیہ گشتہ رواں مردود چیست

گر ہمی دانی کہ یزداں داور است
ژاژ گستاخی ترا چوں باور است

دوستی بیخرد چوں دشمنی ست
حق تعالیٰ زیں چنیں خدمت غنی ست

با کہ می گوئی تو ایں باعم وخال
جسم و حاجت در صفات ذوالجلال

شیر او نوشد کہ در نشو و نماست
چارق او پوشد کہ او محتاج پاست

گفت اے موسیٰ دہانم دوختی
در پشیمانی تو جانم سوختی

جامہ را بدرید و آہے کرد تفت
سر نہاد اندر بیابانے و رفت

وحی آمد سوئے موسیٰ از خدا
بندۂ ما را ز ما کردی جدا

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

تا توانی پا منہ اندر فراق
ابغض الاشیاء عندی الطلاق

ہر کسے را سیرتے بنہادہ ام
ہر کسے را اصطلاحے دادہ ام

در حق او مدح در حق تو ذم
در حق او شہد و در حق تو سم

در حق او نور و در حق تو نار
در حق او ورد و در حق تو خار

ما بری از پاک و ناپاکی ہمہ
وز گراں جانی و چالاکی ہمہ

من نہ کردم خلق تا سودے کنم
بلکہ تا با بندگاں جودے کنم

ہندیاں را اصطلاحِ ہند مدح	سندیاں را اصطلاحِ سند مدح
من نہ گردم پاک از تسبیحِ شاں	پاک ہم ایشاں شوند و درفشاں
ما بروں را ننگریم و قال را	ما دروں را بنگریم و حال را
ناظرِ قلبیم اگر خاشع بود	گرچہ گفتِ لفظ ناخاضع بود
موسیا آداب داناں دیگراند	سوختہ جانوں رواناں دیگراند
عاشقاں را ہر نفس سوزیدنیست	بر دہِ ویراں خراج و عشر نیست
گر خطا گوید ورا خاطی مگو	گر شود پر خوں شہیداں را مشو
خوں شہیداں را از آب اولیٰ تراست	ایں خطا از صد صواب اولیٰ تراست
در درونِ کعبہ رسمِ قبلہ نیست	چہ غم ار غواص را پاچیلہ نیست
تو ز سرمستاں قلاؤزی مجو	جامہ چاکاں را چہ فرمائی رفو
ملّتِ عشق از ہمہ دینہا جداست	عاشقاں را مذہب و ملّت خداست
بعد ازاں در سرِ موسیٰ حق نہفت	رازہائے کاں نمی آید بگفت
بر دلِ موسےٰ سخنہا ریختند	دیدن و گفتن بہم آمیختند
چند بیخود گشت و چند آمد بخود	چند پرّید از ازل سوئے ابد
بعد ازاں گر شرح گویم ابلہی ست	زانکہ شرحِ ایں ورائے آگہی ست
گر بگویم عقلہا را بر کند	ور نویسم بس قلمہا بشکند
ور بگویم شرح ہائے معتبر	تا قیامت باشد آں بس مختصر
لاجرم کوتاہ کردم من زباں	گر تو خواہی از دروں خود بخواں
چونکہ موسیٰ ایں عتاب از حق شنید	در بیاباں در پئے چوپاں دوید
بر نشانِ پائے آں سرگشتہ راند	گرد از پردہ بیاباں برفشاند
گام پائے مردمِ شوریدہ خود	ہم ز گامِ دیگراں پیدا بود
یک قدم چوں رخ ز بالا تا نشیب	یک قدم چوں فیل رفتہ بر اریب
گاہ چوں موجے برافرازاں علم	گاہ چوں ماہی روانہ بر شکم

گاہ بر خاکے نوشتہ حالِ خود
هم چو رمالے کہ رملے بر زنند

گاہ حیراں ایستادہ گہہ دواں
گاہ غلطاں ہم چو گوئی از صولجاں

عاقبت دریافت او را و بدید
گفت مژدہ دہ کہ دستورے رسید

ہیچ آدابے و ترتیبے مجو
ہر چہ می خواہد دلِ تنگت بہ گو

کفرِ تو دین است و دینت نورِ جاں
ایمنی از تو جہانے در اماں

اے معاف یفعل اللہ مایشاء
بے محابا رو زباں را بر کشا

گفت اے موسیٰ ازاں بگذشتہ ام
من کنوں در خونِ دل آغشتہ ام

من ز سدرۂ منتہیٰ بگذشتہ ام
صد ہزاراں سالہ زاں سو گشتہ ام

تازیانہ بر زدی اسپم بگشت
گنبدِ گرداں ز گردوں بر گذشت

محرمِ ناسوتِ بالا ہوت باد
آفریں بر دست و بر بازوت باد

حالِ من اکنوں بروں از گفتن ست
اینچہ می گویم نہ احوالِ من ست

ایک[۲۴۴] روز ارشاد ہوا کہ ایک بادشاہ نے نقالوں سے کہا کہ شیر کی نقل لاؤ، مگر دن میں۔ اُنھوں نے عذر کیا کہ دن میں راز کھلتا ہے۔ حکم دیا کہ اگر نقل مطابقِ اصل نہ لائے تو تمھارے لیے اچھا نہ ہوگا۔ وہ لوگ بہت گھبرائے کہ دن میں نقل کس طرح بنائیں۔ جب بہت متردد ہوے تو ڈھولک بجانے والا جس کے سر پر تان ٹوٹا کرتی تھی بولا کہ میاں! کیوں گھبراتے ہو "شب در میان مترس از بلا" کل کی بات کل دیکھی جائے گی۔ اگلے دن نقال محلِ شاہی میں طلب ہوے۔ باہم صلاح کی۔ ڈھولک نواز نے کہا کہ مجھ پر چادر ڈال دو۔ چادر ڈال دی۔ الا اللہ کا نعرہ مار کر چادر میں سے ایک کھری شیر بن کر اس طرح گونجتا ہوا نکلا جیسے بن کے اندر سے اصلی شیر برآمد ہوتا ہے۔ تمام محفل تھرّا گئی۔ شیر نے اطرافِ محفل میں گشت لگایا۔ جب بادشاہ کے روبرو پہونچا تو شہزادہ جو بادشاہ کی گود میں بیٹھا تھا اُس کے ایسا طمانچہ مارا کہ فوراً مر گیا۔ بادشاہ نہایت بے قرار و مضطرب ہوا۔ وزیر نے کہا کہ حضور گھبرائیے نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کوئی کامل ہے۔ آپ ان کو حکم دیجیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نقل لاؤ۔ نقالوں سے کہا گیا۔ ڈھولک والے

نے کہا کہ حضرت عیسیٰؑ کی نقل فلاں مقام پر حضرت شمس تبریزؒ ہیں وہ لائیں گے۔ اور یہ بات کہہ کر غائب ہوگیا۔ بہت سے خوش آواز گانے والے حضرت شمس تبریزؒ کے پاس بھیجے گئے چوں کہ وہ الحان کو پسند کرتے تھے سنتے ہوئے بادشاہی محفل تک چلے آئے۔ یہاں نقلِ عیسیٰؑ کی درخواست کی گئی۔ کہا کہ اچھا۔ تین بار فرمایا قُم باذن اللہ، مگر لڑکے نے جنبش نہ کی۔ آخر غصہ میں آکر ایک ٹھوکر ماری اور کہا کہ قُم باذنی۔ شہزادہ اُسی دم زندہ ہوگیا ؎

اولیا را ہست قدرت از الٰہ — تیرِ جستہ باز گرداند ز راہ

جب علماء کو یہ حال معلوم ہوا تو بہ جُرم تکفیر فقیر کو تعزیر دی۔

ایک روز[1] ارشاد ہوا کہ: ؎

این شنیدستی کہ در عہدِ عمرؓ — بود چنگی مطربے با کرّ و فر
بلبل از آواز او بیخود شدے — یک طرب ز آوازِ خوبش صد شدے
مجلس و جمع دمش آراستے — وز نوائے او قیامت خاستے
ہم چو اسرافیل کآوازش بہ فن — مردگاں را جاں در آرد در بدن
ہیں کہ اسرافیلِ وقت اند اولیا — مُردہ را ز ایشاں حیات است و نما
جانہائے مُردہ اندر گور تن — بر جہد ز آوازِ شاں اندر کفن
گوید این آواز را آواز جداست — زندہ کردن کارِ آوازِ خداست
ما بمردیم و بکلّی کاستیم — بانگِ حق آمد ہمہ برخاستیم
بانگِ حق اندر حجاب و بے حجیب — آں دہد کو داد مریم را ز جیب
اے فنا تاں نیست کردہ زیر پوست — باز گردید از عدم ز آوازِ دوست
مطلق آں آواز خود از شہ بود — گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود
گفت او را من زبان و چشمِ تو — من حواس و من رضا و خشمِ تو
رو کہ بی یسمع و بی یبصر توئی — سر توئی چہ جائے صاحب سر توئی
مطربے کز وے جہاں شد پر طرب — رستہ ز آوازش خیالاتِ عجب

---

[1] ایک روز مولانا گل حسنؒ حاضرِ خدمت ہوئے اُس وقت جناب قبلہ نے پیرِ چنگی کی حکایت کے یہ اشعار ارشاد فرمائے تھے ۱۲۔

از نوایش مرغِ دل پرّاں شدے / وز صدائش ہوشِ جاں حیراں شدے
چوں برآمد روزگار و پیر شد / باز جانش از عجز پشہ گیر شد
پشت او خم گشت ہمچوں پشت خم / ابرواں بر چشم ہم چوں پاردم
گشت آواز لطیف و جانفزاش / ناخوش و مکروہ و زشت و دل خراش
چونکہ مطرب پیر تر گشت و ضعیف / شد ز بے کسبی رہینِ یک رغیف[۱]
گفت عمرے مہلتم دادی بسے / لطفہا کردی خدایا با خسے
معصیت ورزیدہ ام ہفتاد سال / باز نگرفتی ز من روزے نوال
نیست کسب امروز مہمانِ توام / چنگ بہر تو زنم کان توام
چنگ را برداشت شد اللہ جو / سوئے گورستان یثرب آہ گو
گفت خواہم از حق ابریشم بہا / کو بہ نیکوئی پذیرد قلبہا
چنگ زد بسیار و گریاں سر نہاد / چنگ بالیں کرد و بر گورے فتاد
خواب بردش مرغِ جاں از حبس رست / چنگ و چنگی را رہا کرد و بجست
گشت آزاد از تن و رنج جہاں / در جہانِ سادہ و صحرائے جاں
آں زماں حق بر عمر خوابے گماشت / تا کہ خواب از خویش نتوانست داشت
در عجب افتاد کایں معہود نیست / ایں ز غیب افتاد بے مقصود نیست
سر نہاد و خواب بردش خواب دید / کامدش از حق ندا جانش شنید
ایں ندا کہ اصل ہر بانگ و نواست / خود ندا آنست و ایں باقی صداست
ترک و کرد و پارسی گو و عرب / فہم کردہ آں ندا بے گوش و لب
خود چہ جائے ترک و تاجیک است و زنگ / فہم کردست ایں ندا را چوب و سنگ
بانگ آمد مر عمر را کاے عمر / بندۂ ما را ز حاجت باز خر
بندۂ داریم خاص و محترم / سوئے گورستاں تو رنجہ کن قدم
اے عمر برجہ ز بیت المال عام / ہفت صد دینار در کف نہ تمام

---
۱ یعنے نان ۱۲ منہ۔

پیش او بر کاے تو مارا اختیار
این قدر لبستاں کنوں معذور دار

این قدر از بهر ابریشم بها
خرچ کن چوں خرچ شد اینجا بیا

پس عمر زاں ہیبتِ آواز جست
تامیاں را بهر این خدمت بہ بست

سوئے گورستاں عمر بنهاد رو
در بغل همیاں دواں در جستجو

گرد گورستاں دواں شد او بسے
غیر آں پیر او نہ دید آں جا کسے

گفت این نبود دگر بارہ دوید
ماندہ گشت و غیر آں پیر او نہ دید

گفت حق فرمود ما را بندہ ایست
صافی و شایستہ و فرخندہ ایست

پیرِ چنگی کے بود خاصِ خدا
حبّذا اے سرّ پنہاں حبّذا

بارِ دیگر گرد گورستاں بگشت
ہمچو آں شیر شکاری گرد دشت

چوں یقیں گشتش کہ غیرِ پیر نیست
گفت در ظلمت دل روشن بسیست

آمد و با صد ادب آں جا نشست
بر عمر عطسہ فتاد و پیر جست

مر عمر را دید و ماند اندر شگفت
عزم رفتن کرد و لرزیدن گرفت

گفت در باطن خدایا از تو داد
محتسب بر پیرکِ چنگی فتاد

چوں نظر اندر رخ آں پیر کرد
دید او را شرمسار و روئے زرد

پس عمر گفتش مترس از من مرم
کت بشارت ہا ز حق آوردہ ام

چند یزداں مدحتِ خوئے تو کرد
تا عمر را عاشقِ روئے تو کرد

پیش من بنشین و مہجوری مساز
تا بگوشت گویم از اقبال راز

حق سلامت می کند می پرسدت
چونی از رنج و غمانِ بیحدت

نک قراضہ چند ابریشم بہا
خرچ کن ایں را و باز اینجا بیا

پیر لرزاں گشت چوں ایں را شنید
دست می خائید و بر خود می طپید

بانگ می زد کاے خدائے بے نظیر
بسکہ از شرم آب شد بیچارہ پیر

چوں بسے بگریست و از حد رفت درد
چنگ را زد بر زمیں و خورد کرد

گفت اے بودہ حجابم از الٰہ
اے مرا تو راہ زن از شاہ راہ

اے بخوردہ خون من ہفتاد سال — اے زتو روئیم سیہ پیش کمال
اے خدائے با عطائے با وفا — رحم کن بر عمر رفتہ بر جفا
داد حق عمرے کہ ہر روزے ازاں — کس نداند قیمت آں در جہاں
خرچ کردم عمر خود را دمبدم — در دمیدم جملہ را در زیر و بم
آہ کز یاد رہ و پردہ عراق — رفت از یادم دم تلخ فراق
وائے کز تری زیرافگند[1] خورد — خشک شد کشت دلِ من دل بمرد
وائے کز آواز ایں بست و چہار — کارواں بگذشت و بیگہ شد نہار
اے خدا فریاد ازیں فریاد خواہ — داد خواہم نے زکس زیں داد خواہ
داد کس چوں من نہ دادم در جہاں — عمر شد ہفتاد سال از من جہاں
داد خود از کس نیابم جز مگر — زانکہ ہست از من بمن نزدیکتر
کیں منی از وے رسد دم دم مرا — پس ورا بینم چو ایں شد گم مرا
ہمچو آں کو با تو باشد از سمر — سوئے او داری نہ سوئے خود نظر
ہم چنیں در گریہ و در نالہ او — می شمردی جرم چندیں سالہ او
پس عمر گفتش کہ ایں زاری تو — ہست ہم آثار ہشیاری تو
بعد ازاں اورا ازاں حالت براند — زاعتذارش سوئے استغراق خواند
ہست ہوشیارے زیاد ماضی — ماضی و مستقبل ست پردہ خدا
چوں کہ فاروق آئینہ اسرار شد — جان پیر از اندروں بیدار شد
ہمچو جاں بے گریہ و بے خندہ شد — جانش رفت و جان دیگر زندہ شد
حیرتے آمد درونش آں زماں — کہ بروں شد از زمین و آسماں
جستجوئے ماورائے جستجو — من نمی دانم تو می دانی بگو
حال و قالے از ورائے حال و قال — غرق گشتہ در جمال ذوالجلال
چوں کہ قصہ حال پیر ایں جا رسید — پیر جانش روئے در دریا کشید

---

[1] نام آواز ۱۲ منہ۔

پیر دامن راز گفت و گو فشاند نیم گفتہ در دہانِ او بماند

ایک[۲۷۶] روز ارشاد ہوا کہ ہم کو ایک نقل یاد آئی ہے۔ حجاج بن یوسف ایک دن شکار کو گیا۔ راہ میں پیاس کی شدت ہوئی۔ ایک غریب بڑھیا نے خوب سرد پانی پلایا۔ نہایت خوش ہوا۔ کہا کہ میرے دربار میں آ تجھ کو ایسا انعام دوں گا کہ آج تک کسی نے نہ دیا ہوگا۔ بڑھیا بے چاری دوڑی آئی کہ دیکھیے کیا کچھ دے گا۔ جب دربار میں حاضر ہوئی تو حجاج بولا کہ دنیوی اشیا میں سے اگر کوئی شے تجھ کو دوں تو اُس کو قیام نہیں۔ اس لیے جی یوں چاہتا ہے کہ تجھ کو اپنے ہاتھ سے جامِ شہادت پلاؤں۔ یہ سُن کر بڑھیا کے ہوش اُڑ گئے۔ بولی کیا دُنیا میں نیکی کا بدلا بدی ہے۔ اُس نے کہا نہیں میں تو ایک پیالہ پانی کے عوض تجھ کو جامِ شہادت پلاتا ہوں۔ اور تو ہمیشہ بہشت کے اندر حوضِ کوثر سے سیراب رہے گی۔ بھلا اس سے بڑھ کر انعام کیا ہو سکتا ہے؟ غرض تلوار کھینچ کر بڑھیا کا سر اُڑا دیا۔

ایک[۲۷۷] روز ارشاد ہوا کہ میاں مردان شاہ صاحب سے ایک بار ہم نے پوچھا کہ میاں صاحب! کیا فقیری اسی کا نام ہے کہ مُرید ہو کر رنگین کپڑے پہن لیے، ترتیب دوازدہ تسبیح پڑھ لی اور ڈھولک کی گت پر ناچ لیے یا کچھ اور بھی ہے؟ بقول شخصے ایک جاٹ کسی گرو کا چیلہ تھا جاڑے کے موسم میں گرو کی زیارت کو گیا۔ وہاں کھچڑی کھانے کو ملی اور ایک عمدہ لحاف اوڑھنے کو۔ رات بھر خوب چین سے پاؤں پھیلا کر سویا۔ صبح کو اُٹھا تو گرو جی سے عرض کیا۔

کھانے کو کھچڑی اوڑھنے کو سوڑ گرو جی ٹکت یہی ہے یا کچھ اور

یعنی اگر یہی ہے تو بس حاصل ہو گئی۔ اور اگر کچھ اور رہے تو اُس کی تعلیم فرمائیے۔ سو حضرت اگر فقیری یہی ہے جو میں نے بیان کی تو کچھ بڑی بات نہیں۔ صرف ایک پیسہ کا گیرو خرچ ہوتا ہے، لیکن یہ گیرو کا نسخہ شاید متقدمین کے زمانہ میں ایجاد نہ ہوا ہوگا، ورنہ کیوں طلب و تلاش میں عمر کھوتے اور دنیا کی خاک چھانتے۔ یہ بات سُن کر مردان شاہ تو خاموش ہو رہے۔ کچھ

لہ کسی صاحب نے حضرت کے روبرو یہ شکایت پیش کی تھی کہ فلاں شخص پر میں نے بہت احسان کیے ہیں اب وہ اُلٹا میری جان کا خواہاں ہے۔ تو زبان فیض ترجمان سے یہ نقل ارشاد فرمائی تھی ۱۲

جواب نہ دیا مگر اُن کے پیر و مرشد میاں غلام علی شاہ صاحب خفا ہو گئے۔ اور بولے واہ صاحب! تم فقیروں کا خاکا اُڑاتے ہو اور ہم پر ہنستے ہو۔ مردان شاہ نے اُن سے کہا کہ حضرت خفگی تو دوسری بات ہے ورنہ انصاف شرط ہے۔ جو کچھ میاں صاحب نے فرمایا اس زمانہ کی فقیری کا تو بے شک یہی حال ہے۔

۲۴۸ ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک بزرگ تشریف لائے۔ تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگے کہ حضرت میں تو آپ کی بڑی تعریف سُن کر آیا تھا لیکن آپ تو بالکل خالی ہیں۔ ہم نے کہا صاحب! ہمیں تو آج تک یہ بھی معلوم نہ ہوا تھا کہ ہم خالی ہیں یا بھرے۔ بہت سے فقراء سے ملے۔ اکثر بزرگوں کی خدمت میں گئے۔ کسی نے یہ پتہ نہ دیا۔ بارے الحمد للہ کہ آپ کی زبان سے یہ عقدہ حل ہو گیا۔ اتنی بات کہہ سُن کر وہ بزرگ قلندر صاحب کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے گئے۔ وہاں سے روتے پیٹتے ہوئے بھاگے آئے اور جناب قبلہ کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ اور عذر و معذرت کرنے لگے کہ برائے خدا میرا قصور معاف فرمایئے۔ مجھ کو یہ حال معلوم نہ تھا۔ حضرتؒ نے فرمایا صاحب وہ بھی تمہارا ہی گمان تھا اور یہ بھی تمہارا ہی خیال ہے۔ ہم تو جیسے جب تھے ویسے ہی اب ہیں۔ نہ آپ کے اقرار سے کچھ بیشی ہوئی۔ نہ انکار سے کچھ کمی۔ ہمارا قصور تو آپ نے کچھ کیا نہیں جس کی معافی واجب ہو۔

۲۴۹ ایک روز ارشاد ہوا کہ راجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں کشمیر کے اندر ایک مجذوب تھے، کباب دہی نہایت رغبت سے کھایا کرتے تھے۔ ایک شخص اُن کے واسطے کباب دہی لایا۔ اُنھوں نے کھایا اور کہنے لگے "کیا خوب کباب اور کیا خوب دہی ہے"۔ یہی کہتے کہتے دہی لانے والے کا قلب مثل آئینہ ہو گیا کہ سات سو کوس کا حال اُس کو نظر آنے لگا۔ پھر وہ شخص مرغزار کشمیر میں جا بیٹھا۔ بیس برس تک یہی کیفیت رہی، مگر ایک دن مثلِ شمع گُل ہو گئی۔ اور جیسا تھا ویسا ہی رہ گیا۔ اس کے غم و الم میں وہ شخص جا بجا پھرتا رہا۔ سجان شاہ کے پاس بھی آیا تھا۔ اُنھوں نے سُن کر فرمایا کہ بھائی یہ بات تو ہمارے خواب و خیال میں بھی نہیں۔ تم سلیمان شاہ صاحب کی خدمت میں جاؤ۔ اس زمانہ کے مشہور و معروف بزرگ ہیں۔ غرض اُن کے پاس گیا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ میاں! جو بات تو بیان کرتا ہے خود ہم پر بھی

نہیں گذری، بھلا ہم کیا تعلیم کریں۔ ہمارا طریقہ تو یہی ذکر اور اذکار ہے۔ وہ شخص شاہ صاحب کا مُرید ہو گیا۔ ایک بار ہم سے بھی ملاقات ہوئی کہنے لگا کہ سلیمان شاہ صاحب کا میں مُرید ہو گیا ہوں لیکن جو بات پہلے تھی اب خواب میں بھی نہیں۔ وہ مجذوب پھر کہیں نہ ملے شاید اُن کا انتقال ہو گیا۔ جناب قبلہ نے فرمایا کہ بلا جذبہ جو اُس کو مل گئی تھی، اگر چند روز اُن بزرگ کی خدمت میں رہتا تو قیام و ثبات اس حالت کو ہو جاتا۔ وہ شخص کامل و مکمل تھا جس کی ایک نظر میں یہ بات پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن یہ اپنے خیال میں کامل ہو گیا تھا کہ خدمت میں رہنا اختیار نہ کیا اور وہ بات قائم نہ رہی چراغ کے گُل ہوتے ہی اندھیرا ہو گیا۔

ایک[۲۵۰] روز ارشاد ہوا کہ ایک فقیر پہاڑ میں رہتے تھے ان کے تصرّف سے پرشادگر کو نقلِ روح کرنا حاصل ہو گیا تھا۔ چھ سات روز کچھ ریاضت پرشادگر نے کی تھی۔ وہ فقیر صاحبِ کمال تھا۔ مگر پرشادگر میں اتنی تاب و طاقت نہ تھی کہ اور کو بھی ایسا کر دیتا۔ ہم نے جو اس بات کو سوچا تو ایسا معلوم ہوا کہ جس روح کی نسبت قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ فرمایا ہے اُس کا نقل و انتقال تو کیا اگر اُس کو دیکھتا بھی تو ہوش بجا نہ رہتے ہاں؛ عالمِ مثال کی روح جو کہی گئی ہے اُس کا یہ حال ہوگا۔ پرشادگر نے ہم سے بھی کہا تھا کہ تم سیکھنا چاہو تو اُن فقیر صاحب کے پاس چلو، مگر ہمارا جانا نہ ہوا۔

ایک[۲۵۱] روز ارشاد ہوا کہ کتاب تحفۃ الہند جو مولوی عبیداللہ صاحب نے ردّ ہنود میں تصنیف کی ہے ہم نے بھی دیکھی ہے اس قسم کی کتاب اگر خواجہ معین الدین چشتی یا اور بزرگ جو صاحب طاقت گذرے ہیں لکھتے تو زیبا تھا۔ مولوی صاحب نے جو اوتاروں کے استدراج لکھے اور اُن کا رد کیا تو کس برتے پر؟ اگر مولوی صاحب کو اس قسم کی طاقت اُن سے بڑھ کر ہوتی تو رد لکھنے کا مضائقہ بھی نہ تھا۔ یہ قاعدہ ہے کہ انسان اپنی غلاظت پر نظر نہیں کرتا مگر دوسرے کی بُری معلوم ہوتی ہے۔ جیسے اپنی آب دست تو بغیر نفرت لیتے ہیں مگر دوسرے کی آب دست سے گھن معلوم ہوتی ہے۔

ایک[۲۵۲] روز ارشاد ہوا کہ لوگ عدمِ حصول کی شکایت کرتے ہیں۔ واہ؛ سبحان اللہ! کے آمدی و کے پیر شدی؟ کل مُرید ہوئے، آج کامل ہونا چاہتے ہیں۔ ارے میاں! ؎

سالہا بُرد ند مرداں انتظار تا یکے را بار شد از صد ہزار

ایک مدت دراز میں لاکھوں کروڑوں سے کوئی ایک اپنی مراد کو پہونچتا ہے۔ کچھ راہِ فقر ہنسی کھیل نہیں ؎

روزہا باید کہ تا یک مشتِ پشم از پشتِ میش ۔۔۔ زاہدے را خرقہ گردد، یا حمارے را رسن
ہفتہ ہا باید کہ تا یک پنبہ دانہ ز آب و گل ۔۔۔ شاہدے را حُلّہ گردد یا شہیدے را کفن
ماہ ہا باید کہ تا یک قطرۂ از پشت و رحم ۔۔۔ صفدرے خیزد بہ میداں یا عروسِ انجمن
سالہا باید کہ تا یک سنگِ قابل ز آفتاب ۔۔۔ لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن
قرنہا باید کہ تا یک کودکے از فیضِ طبع ۔۔۔ عالمے دانا شود یا شاعرِ شیریں سخن
عمرہا باید کہ تا گردونِ گرداں یک شبے ۔۔۔ عاشقے را وصل بخشد یا غریبے را وطن
دورہا باید کہ تا یک مردِ صاحب دل شود ۔۔۔ بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن
یا برو ہمچو زناں نیرنگ بازی پیشہ کن ۔۔۔ یا بیا ہمچوں سنائی گوئے در میداں بزن

ایک روز[۱][۲۵۳] ارشاد ہوا کہ ہم کو ایک نقل یاد آئی ہے جب حضرت عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نئی فقیری حاصل کرکے گھر میں تشریف لائے تو اتفاقاً قحط ہوگیا۔ آپ نے ایک دیگ پلاؤ کی مسلمانوں کے واسطے باورچی سے اور ایک دیگ موہن بھوگ کی ہندوؤں کے واسطے برہمن سے پکوائی۔ اور شہر میں منادی کرادی کہ تمام مسلمان اور ہنود آئیں اور کھائیں۔ دیگوں کا یہ حال تھا کہ جتنا کھانا دیگ میں سے نکالتے تھے پھر اُسی قدر زیادہ ہوجاتا تھا۔ اور ہردم گرماگرم نکلتا تھا۔ تین دن تک یہی حال رہا۔ چوتھے روز الہام ہوا کہ عبدالقدوس فقیری تو کرچکا مگر اب رزّاقی میں بھی قدم رکھنے لگا۔ بھلا ہم پوچھتے ہیں کہ تم کون ہو۔ عرض کیا کہ تیرا بندہ۔ بھلا وہ لوگ کون ہیں؟ کہا کہ تیرے بندے۔ حکم ہوا کہ پھر تو کون ہے دخل دینے والا۔ کیا ہم سے زیادہ حکمت والا؟ یا ہم سے زیادہ مخلوق پر مہربان ہے؟۔ اس کے بعد شاہ عبدالقدوس نے توبہ کی اور وہ دیگیں توڑ ڈالیں۔ پس اُس کی مخلوقات ہے جس طرح چاہے رکھے۔ ہم سے زیادہ حکیم و رحیم ہے۔ جدھر رب اُدھر سب ؎

اُس کی رضا پہ چھوڑ دو بہرِ خدا جو ہو سو ہو

---

[۱] ایک بار قحط ہوا۔ ایک شخص نے حاضرِ خدمت ہوکر درخواست کی کہ آپ دعا فرمائیں کہ بارانِ رحمت نازل ہو۔ اُس وقت زبانِ فیض ترجمان سے یہ نقل ارشاد فرمائی ۱۲۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ہم کو ایک نقل یاد آئی۔ دو یار ہم سفر تھے۔ ایک نے کہا کہ اگر خدائے تعالےٰ مجھ کو سلطنت عطا فرمائے تو ایسا عدل و انصاف کروں اور جود و کرم کی داد دوں کہ کبھی کسی نے سنا بھی نہ ہو۔ دوسرا بولا کہ اگر میں بادشاہ ہو جاؤں تو ہر روز ایک آدمی کو قتل کیا کروں۔ اور ایسے ایسے ظلم ایجاد کروں جو کسی کے خیال میں بھی نہ گذرے ہوں۔ خدا کی قدرت کچھ مدت کے بعد وہ ظلم دوست آدمی، صاحب تاج و تخت ہو گیا۔ اور اپنے ارادہ اور منشا کے موافق اُس نے ایسے ظلم شروع کیے کہ تمام مُلک میں شورِ قیامت برپا ہو گیا۔ اتفاقاً وہ عدل پسند یار بھی وہاں آگیا۔ لوگوں نے اُس کے روبرو واویلا کی کہ صاحب بادشاہ تمہارا قدیم دوست ہے، کچھ تم ہی سمجھاؤ کہ جورِ بے حد سے باز آئے۔ اس نے تنہائی میں نصیحت کی کہ یار، کچھ تو خدا سے ڈر۔ کیوں خلقت کو تباہ کرتا ہے! اُس نے جواب دیا کہ اے احمق! اگر اللہ تعالےٰ کو لوگوں پر رحم کرنا منظور ہوتا تو مجھ کو دولت و سلطنت کیوں دیتا۔ تجھ ہی کو بادشاہ نہ بناتا۔ کیا تجھ کو یاد نہیں؟ کہ میں نے اُس سفر میں کیا کہا تھا ؎

چو خواہد کہ ویراں کُند عالمے   نہد مُلک در پنجۂ ظالمے

غرض یہ ہے کہ عدل ہو یا ظلم سب تقدیرِ الٰہی سے وابستہ ہیں، پھر چون و چرا کیسی؟ اور یہ عدل و ظلم بھی انسان کی نسبت سے معتبر ہیں ورنہ در اصل نہ کوئی ظلم ہے نہ عدل ؎

کفر ہم نسبت بہ خالق حکمت ست   ور کنی نسبت بما کفر آفت ست

ایک روز[1] ارشاد ہوا کہ ایک مقام پر اژدہا سرِ راہ پڑا تھا۔ خوف کے مارے اُدھر کا راستہ مسدود ہو گیا۔ اتفاقاً اُس راہ سے ایک فقیر باتاثیر گذرا ہر چند لوگوں نے منع کیا اور خوف دلایا مگر اُس نے کہا خیر جو پیش آئے گا دیکھا جائے گا۔ جب پاس پہونچا تو اژدہا پھنکارا۔ فقیر نے کہا کہ بس خاموش۔ فقیر تو چل دیا مگر اژدہا خاموش رہ گیا۔ کچھ مدت کے بعد اُسی راہ سے فقیر واپس آیا تو اُس کا بُرا حال پایا۔ سوائے استخوان و پوست کے کچھ

---

[1] ایک دن کسی شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضور فلاں حاکم بہت ظالم ہے۔ آپ اللہ تعالےٰ سے دعا فرمائیں کہ مخلوق کو اس کے ظلم سے نجات مل جائے۔ اس کے جواب میں زبان فیض ترجمان سے یہ نقل ارشاد فرمائی ۱۲۔

باقی نہ تھا۔ پوچھا تیرا کیا حال ہے اُس نے جواب دیا کہ مجھ کو لوگ بہت ستاتے ہیں ۔ کوئی لکڑی مارتا ہے، کوئی پتھر، کوئی اوپر چڑھ بیٹھتا ہے ۔ میں نہایت سختی میں ہوں ۔ فقیر صاحب نے فرمایا کہ ایسا تحمل بھی مت کیا کر کہ لوگ تجھ کو مار ہی ڈالیں ۔ ذرا پھوں پھاں کر کے ڈرا بھی دیا کر ۔ اسی طرح فقیر کو بھی لازم ہے کہ نہ ایسا میٹھا بن جائے کہ لوگ کھا جائیں اور نہ ایسا کڑوا کہ تھوک دیں ؎

تحمل بایدت لیکن نہ چنداں ۔۔۔ کہ گردد چیرہ گرگِ تیز دنداں

ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک دن ہمارے پاس ایک مولوی صاحب آئے ۔ ہم نے اُن سے کہا کہ مولوی صاحب چھوٹے صاحب زادے کو کلام مجید حفظ کیوں نہیں کرایا ۔ اُنھوں نے عرض کیا کہ حضرت کم عمری میں ایسی محنت شاقہ سے بچوں کے قوائے ذہنی مضمحل ہوجاتے ہیں پھر وہ کسی علم و ہنر کی تحصیل کے قابل نہیں رہتے ۔ میں نے اُس کو انگریزی پڑھانی شروع کرادی ہے ۔ سمجھ آنے تک کچھ نہ کچھ اس زبان سے آشنا ہو جائے گا پھر آگے کی تحصیل میں آسانی ہو گی ۔

حضرت نے تو اس بات کے جواب میں کچھ نہ فرمایا لیکن مولانا گُل حسنؒ بول اُٹھے کہ سبحان اللہ آپ کے خیالات بہت عالی ہیں ۔ اگر عربی الفاظ کے تحفظ سے قوائے ذہنی کو نقصان پہونچتا ہے تو انگریزی الفاظ سے بھی وہی اثر مترتب ہو گا ۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ اس میں دینی فائدہ ہے اُس میں دنیوی ۔ سو آپ خوب سمجھے کہ نقد کو چھوڑ کر کیوں نسیہ کے انتظار میں پڑے ؎

اب تو آرام سے گذرتی ہے ۔۔۔ عاقبت کی خبر خدا جانے

اور اگر واقعات پر لحاظ کیجیے تو حفظ قرآن کے بعد مولوی راغب اللہ صاحب جاہل کیوں نہ رہ گئے ۔ مولوی عبد الرحمٰن صاحب کو ایسا فضل و کمال کیوں حاصل ہو گیا کہ آج ہندوستان میں ان کا جواب نہیں ۔ بہت سے مسلمان جنھوں نے قرآن کا ایک حرف بھی نہیں پڑھا کیوں جاہل ہیں ۔ ان حالات پر غور کرنے سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ حفظ قرآن سے حافظہ اور بھی قوی ہو جاتا ہے اگر ذہن رسا ہے تو تحصیلِ علوم بہت آسان ہو جاتی ہے مگر اس میں

شک نہیں کہ انگریزی کا سانقد ثواب اس میں کہاں ہے کہ ادھر پڑھی اور اُدھر گورنمنٹ کی نوکری حاصل ہو گئی۔

یہ سُن کر جناب قبلہ نے فرمایا کہ ہم کو ایک نقل یاد آئی ہے۔ ایک باباجی میں یہ کمال تھا کہ جو بات منھ سے نکالتے وہی ہو جاتی۔ راجہ نے اُن سے پوچھا کہ مہاراج آپ کو یہ کمال کیونکر حاصل ہوا۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ میں بارہ برس سے اپنا گوہ مُوت کھاتا پیتا ہوں۔ اُسی کی بدولت میری زبان کو یہ تاثیر ہے کہ ایک فقیر کو بادشاہ یا راجہ کہہ دوں تو فوراً ہو جائے۔ راجہ نے کہا کہ پھر آپ کو کیا؟ بادشاہ بنا تو دوسرا، راجہ ہوا تو اور، آپ کی قسمت میں تو وہی گُوہ موت رہا۔

ایک روز[۲۵۷] ارشاد ہوا کہ لالہ بانکے رائے وکیل میرٹھ بڑے فقیر دوست اور درویشوں کے خادم تھے۔ بہت سے بزرگوں اور فقیروں سے ملے اور مُروت و فیاضی میں کبھی دریغ نہ کیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو کسی بزرگ نے راہِ خدا نہ بتائی۔ بات یہ ہے کہ لالہ بانکے رائے اپنے مال و دولت کے ذریعہ سے اس راہ کا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ پس مردانِ خدا کچھ خدا فروش تو ہوتے ہی نہیں کہ مالِ دُنیا کی طمع میں نامِ خدا کو بیچ ڈالیں۔ اور جو مال و متاع کے لالچی ملے وہ خود اس راہ سے ناواقف تھے اور کو کیا فیض و فائدہ پہونچاتے ؂

او خویشتن گُم است کرا رہبری کند

ایک روز[۲۵۸] ارشاد ہوا کہ اَلْیَدُ الْعُلْیَا[عہ] اَفْضَلُ مِنْ یَدِ السُّفْلٰی۔ اس حدیث شریف سے فقر کی فضیلت ثابت ہوتی ہے نہ غنا کی۔ اس لیے کہ یدِ عُلیا فقر حاصل کرتا ہے۔ اور یدِ سُفلیٰ یعنی نیچے کا ہاتھ تونگری۔

ایک روز[۲۵۹] ارشاد ہوا کہ کسی نے اپنے گھر کے جھگڑے قصے بیان کرنے کے بعد فضائل

عہ ایک روز حجرہ شریف کے حضار میں اس بات کی گفتگو ہونے لگی کہ فقیری بہتر ہے یا تونگری اتنے میں جناب قبلہ باہر سے تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ کس باب میں بحث ہے۔ حافظ سعد اکبر صاحب نے حال عرض کیا اور یہ حدیث شریف پڑھی اس پر حضرت نے یہ ارشاد فرمایا ۱۲۔

لہ حضرت نے تو ارشاد کے بعد سکوت فرمایا اور مولانا گل حسن نے اس سلسلہ میں کچھ اور بھی عرض کیا۔ آخر مولوی صاحب بولے کہ گو میری بات بعض صاحبوں کو ناگوار ہو لیکن مجبوری ہے کہ اپنی اپنی سمجھ جُدا ہے ۱۲۔

و درستی معاملات میں ہم سے رائے طلب کی ہے۔ ہم نے کہا کہ ہم کو ایک نقل یاد آئی ہے۔ کسی زمانہ میں ایک شخص نے دعویٰ پیغمبری کا کیا تھا۔ بادشاہِ وقت کو خبر ہوئی۔ اُس کو بُلایا اور کہا کہ اگر تیرا دعویٰ سچا ہے اور تو پیغمبر برحق ہے تو اس قفل کو کھول دے۔ اُس شخص نے جواب دیا کہ "دعوائے پیغمبری کردہ ام نہ آہنگری"۔ سو ہمارے تو نہ جورو نہ بچے۔ ان معاملات کے نشیب و فراز کی ہم کو کیا خبر ہے! وہ جانیں اور اُن کا کام۔

ایک ۲۶۰ روز ارشاد ہوا کہ ایک صاحب کا خط آیا ہے جس میں قدم بوسی کا اشتیاق، ارادت کا اظہار اور بیعت کی درخواست کی گئی ہے۔ مولانا گل حسنؒ کو ارشاد ہوا کہ اُن کو لکھ دو کہ پہلے ہم کو اپنے گھر کے کاروبار کی ایک فہرست بنا کر بھیج دیں یعنی بعد مُرید ہونے کے جو جو کام ہم سے لینے ہوں ابھی سے اُن کے لیے تیار رہیں، کیوں کہ دُنیاداروں کے پیر تو اسی مصرف کے ہوتے ہیں اُن کی نوکری چاکری کے لیے بال بچّوں کی صحت و تندرستی کے لیے دُعا کیا کریں۔

ایک ۲۶۱ روز ارشاد ہوا کہ ہم کو بھی بدن ڈھاپنے اور پیٹ بھرنے کے لیے دو چار روپیہ ماہوار کی حاجت ہوتی ہے۔ سو یہ کام اُن لوگوں سے چلتا ہے جو دُنیوی غرض لے کر ہمارے پاس آتے ہیں۔ اگر وہ ایک روپیہ ہم کو دیتے ہیں تو ہم اُن کا کام دو روپیہ کا کر دیتے ہیں۔ مگر جس کو نامِ خدا بتایا جاتا ہے البتہ اُس سے کسی قسم کی خدمت لینا حرام ہے۔

ایک ۲۶۲ روز ارشاد ہوا کہ کیا یہاں کوئی ذکر کر رہا ہے؟ عرض کیا گیا کہ میر صاحب کو نیند آگئی تھی۔ قصہ یہ تھا کہ ایک روز حسبِ دستور بعد نمازِ عشاء حجرۂ مبارک میں خدّام حاضر تھے اُس وقت ایک صاحب بیٹھے بیٹھے سو گئے یہاں تک کہ آوازِ خرّاٹے کی بلند ہوئی۔ جنابِ قبلہ نے از راہِ طیبت یہ ارشاد فرمایا کہ ہاں ظُنُّوا الْمُؤْمِنِیْنَ خَیْرًا کے یہی معنی ہیں۔ چناں چہ ایک بزرگ تھے۔ مُراقبہ اور ذکر میں اکثر مشغول رہا کرتے تھے۔ قضارا ایک رات بائیں طرف مادہ فالج گرا اور وہ جاں بحق ہو گئے۔ چونکہ بائیں طرف کو گردن جُھک گئی تھی، مُریدانِ خوش اعتقاد نے خیال کیا کہ ذکرِ قلبی میں مستغرق ہیں۔ کچھ دن چڑھے ہم بھی گئے۔ میاں صاحب کو دیکھا تو اُن میں دم نہ تھا۔ حکیم صاحب بُلائے گئے۔ وہ ایسے سادہ لوح مومن تھے کہ نہ سینہ میں دم تھا نہ نبض میں جُنبش مگر یہی کہتے رہے کہ کچھ ڈر نہیں ہے حضرت تو نفی اثبات کر رہے ہیں۔

ہم نے کہا کہ میاں صاحب بے چارے کو تو نہ ذکر کی خبر ہے نہ فکر کی اطلاع، لیکن تمھارا خیال بے شک ظَنُّوا المؤمنین خیرا کا مصداق ضرور ہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک ولایتی پٹھان کے گھر لڑکا پیدا ہوا۔ تقریب تہنیت میں تمام خویش و اقارب جمع تھے۔ اتفاقاً پٹھان سے گوز سرزد ہو گیا۔ اُس کو ایسی خجالت چڑھی کہ ترکِ وطن کر کے کسی دوسرے مُلک کو چلا گیا۔ بارہ برس کے بعد پھر واپس آیا اور رات کو گھر کے دروازہ پر آ کر کھڑا ہوا کہ دیکھوں اب تو میری بات کسی کو یاد نہیں۔ یہ کان لگائے کھڑا تھا کہ گھر میں لڑکے نے شرارت کی۔ کسی نے کہا کہ او پد وڑے کے لڑکے مانتا نہیں۔ یہ بات سُن کر پھر بھاگ گیا۔ اگر وہ پٹھان اس حرکت کو اپنے وہم میں جُرمِ عظیم، قابلِ ترکِ وطن نہ سمجھتا تو لوگوں کو خیال بھی نہ ہوتا۔ لیکن اُس کے نکل جانے نے اور بھی اس بات کو مشہور کر دیا اور اُس کی اولاد پر بھی داغ بدنامی لگ گیا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ؎

کھال دھونتی رہ گیو اور تر بجھ بھئے انگار | اہرن کو ٹھکو مٹو اور اُٹھ گئے میت لوہار
سدا نہ پھولیں توریاں اور سدا نہ ساون ہوئے | سدا نہ جوبن ٹھہر رہے اور سدا نہ جیوے کوئے

شنیدم کہ در روزگارِ کہن | شدہ عنصری شاہ صاحب سخن
چو اورنگ از عنصری شد تہی | بہ فردوسی آمد کلاہِ مہی
چو فردوسی از دورِ فانی گذشت | نظامی بہ ملکِ سخن شاہ گشت
نظامی چو جامِ اجل درکشید | بسر چترِ اشعارِ سعدی رسید
چو اورنگ سعدی فرو شد زکار | سخن گشت بر فرقِ خسرو نثار
وزاں پس چو نوبت بجامی رسید | جہانِ سخن را تمامی رسید

عدم ہے یا کوئی کوئے صنم ہے | چلی جاتی ہے وہاں خلقت خدا کی

یہ اشعار مرزا نوشہ کی خبر انتقال سُن کر ارشاد فرمائے تھے۔ پھر فرمایا نہایت خوب آدمی تھے۔

عجز وانکسار بہت تھا۔فقیر دوست بدرجۂ غایت اور خلیق از حد تھے۔ایک روز جو ہم اُن کے پاس گئے تو اُنھوں نے اپنے یہ دو قطعے پڑھے تھے:۔

قطعہ

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انکار ساقی و مُغنّی و شرابے و سرودے
زنہار ازاں قوم نہ باشی کہ فریبند حق را بہ سجودے و نبی را بدرودے

قطعہ

بہ روزِ حشر اگرچہ نامۂ عملم کنند باز کرآں روز بلذ خواہِ من است
بکن مقابلہ آں را بہ سرنوشتِ ازل اگر زیادہ و کم باشد آں گناہِ من است

رند مشرب، بے شر، رحم دل تھے اور فنِ شاعری میں تو اپنا جواب نہ رکھتے تھے، لیکن افسوس کہ یہ ہمارے محب بھی چل دیے ؎

ندی ناؤ کا بیٹھنا پلک ایک کی پریت پل میں بچھڑے جات ہیں یہی جگت کی ریت
ہم دیکھیں جگت جات ہے جگ دیکھے ہم جائیں ہم تو بیٹھے راہ پر کس کس کو پچھتائیں

ایک روز[۲۱۵] ارشاد ہوا کہ دیکھو یہ نئی بچھیرا پلٹن سرکاری تیار ہو رہی ہے۔پرانے قواعد داں فوج کو خبر نہیں کہ ایک دن یہی پلٹن جنگی بجانے میں اُن کی جگہ چھین لے گی۔بڈھوں کی بجائے جوان وارث بنتے ہیں۔جوانوں کی جگہ بچوں کی بھرتی جاری ہے۔ایک مرتا ہے دوسرا اُس کے منصب پر قائم ہوتا ہے۔اگر آدمی غور کرے تو یہ نئی پود عبرت کے لیے کافی ہے ؎

نشستی بجائے دگر کس بسے نشیند بجائے تو دیگر کسے

ایک روز[۲۲۶] ارشاد ہوا کہ موت فرق و امتیاز کی دور کرنے والی اور تعلقات و اضافات کی اٹھا دینے والی ہے۔اَلْمَوْتُ جِسْرٌ یُوصِلُ الْحَبِیْبَ اِلَی الْحَبِیْبِ۔اُس کا ذائقہ عوام و خواص، صلحا و اولیا و انبیا سب کے واسطے مسلّم ہے۔جس طرح تانبے، لوہے اور سونے چاندی سب کا تار بغیر جنتری میں نکلے تیار نہیں ہو سکتا۔اسی طرح موت بھی ہر بھلے بُرے کے لیے ضروری ہے ؎

---

[۱] ایک روز قلندر صاحب کے چوک میں بچوں کے ایک غول کے کھیل کود کو دیکھ کر یہ ارشاد فرمایا تھا۱۷۔

موت جسرٌ موصل آمد سوئے یار   مرگ را آمادہ باش اے ہوشیار
این خوش باشد کہ سوئے شہ روم   واصل درگاہ آں بیچوں شوم
وقت آمد کز جہانِ بے کسی   پائے کوباں سوئے بامِ او رسی
زیں سبب فرمود احمدؐ مجتبیٰ   تحفۃ المومن کہ الموت اے فتیٰ
گر نہ بودے موت در دنیائے دوں   سخت می گشتیم عاجز بس زبوں
شکر حق کہ مخلصے بہ نہادہ است   غرفہ سوئے آں جہاں بکشادہ است
پس بسوئے واحدیت تا احد   سر برآرد از تعین می رہد
منتہی سوئے خدا شد زیں سبب   ہست رجعے سوئے او خود بے طلب
معنیِ کلٌّ الینا راجعون   فہم کن واللہ اعلم بالعیون
زیں سبب فرمود آں احمدؐ لبیب   موت جسرٌ موصل آمد تا حبیب
تاکہ وجہ حق برو ظاہر شود   در تجلیٰ واحدے احدے رود
خود فنا گردد بقا حاصل کند   قطرہ را تا بحر کل واصل کند
باز شہ اکنوں سوئے سلطاں پرید   پردہائے عاریت را بر درید
ہست چوں کل الینا راجعون   می شود مر اصل خود را سرنگوں

غرض موت آخر نعمائے الٰہی میں سے ہے مقامِ تہنیت ہے نہ جائے تعزیت

ایک [۲۶۷] روز ارشاد ہوا کہ آخری وقت کا اضطراب و استقلال کچھ کرتب پر منحصر نہیں۔ ہم نے ایک دفعہ میرٹھ میں دیکھا کہ دو آدمیوں کو پھانسی دینے کے واسطے لے چلے۔ ایک تو لاؤنیاں گاتا اور خوش ہوتا چلا جاتا تھا۔ دوسرے کو ایسا سہم چڑھا کہ منکا ڈھل گیا تھا۔ جرم میں دونوں برابر، قصاص میں مساوی مگر ایک بشاش اور ایک خوف زدہ۔ نہ اس نے کوئی کرتب کیا تھا، نہ اُس نے۔ صرف فرق تھا تو یہ تھا کہ قدرت نے ایک کو ایسا دلاور بنایا تھا اور دوسرے کو اتنا بودا۔

ایک [۲۶۸] روز ارشاد ہوا کہ روح ندائے ربانی پر عاشق ہے۔ جب آدمی کا وقت آخر ہوتا ہے تو وہ ندا آتی ہے۔ اُس کو سنتے ہی روح پرواز کر جاتی ہے۔ چناں چہ مولانا

روم نے اس ندا کو لفظ ارغنون سے تعبیر کیا ہے ؎

پس عدم گردم عدم چوں ارغنوں گویدم کانا الیہ راجعوں

ایک روز[۲۶۹] ارشاد ہوا کہ ہمارا حال اس چوپائے کے مطابق ہے۔

آلس[لہ] ننج پڑے جل بھیتر اُدّم ہیں دو بیسر جو تیا
بھور بھئی بس دلدھر بھئے اک بھوک لگی دوجے پانی پیو تیا
ایسے کے پیٹ کو توہی بھرت ہو مہا چتر اور گن کی دو تیا
بھور سے سانجھ لو سانجھ سے بھور لو ہم سا کپوت نہ تو سا دوتیا

سوائے دو وقت کھانے پینے اور سو رہنے کے اور کچھ کام ہم سے نہیں ہو سکتا۔ یہ اُسی کی رحمتِ کاملہ ہے کہ ہم جیسوں کو اپنی رنگارنگ نعمتوں سے پرورش فرماتا ہے۔

ایک روز[۲۷۰] ارشاد ہوا کہ جب نواب راج گڈھ نے اڑھائی ہزار روپیہ بطور نذر بھیجا تو لوگوں نے ہم سے کہا کہ آپ ایک مکان تیار کرالیں۔ کسی نے صلاح دی کہ ایک زمین خرید لیں۔ اُس وقت ہم کو یہ نقل یاد آئی کہ ایک شخص سنیاس متا میں دتاترہ نامی ہندو فقیر ہوا ہے۔ اُس نے چوبیس گرو کیے ہیں۔ اُن میں سے ایک[۱] سانپ بھی ہے کہ کبھی اپنا گھر نہیں بناتا جہاں سوراخ پایا وہیں جا گھسا۔ فقیر کو یہ بات پسند آئی اور اس بات کا سانپ کو گرو مانا۔ دوسرے[۲] کُتا کہ سوائے اپنے مالک کے دوسرے کے دروازہ پر نہیں جاتا۔ یہ تعلیم کُتّے سے حاصل کی۔ تیسرے[۳] چیل کہ جب اُس کو ایک چھچھڑا گوشت کا مل جاتا ہے تو چیل کوّے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ ناچار گوشت کو پھینک ایک اونچی ٹہنی پر سب سے الگ جا بیٹھتی ہے۔ اور حریصوں کے جنگ و جدال کا تماشا دیکھتی ہے۔ ہم نے سوچا کہ تمام عمر تو خانہ بدوشی میں گذاری بھلا ہم کو گھر بار بنانے سے کیا سروکار۔ ہمارے والد ماجد کی نصیحت بھی یہی تھی کہ گھر بنا کر کبھی نہ رہنا۔ جہاں جگہ مل گئی آرام کر لیا۔ پس ہم نے اُس روپیہ کو اپنے روبرو نہ آنے دیا میاں

لہ یعنی ست و بیکار اور بے دست و پا پانی میں پڑا ہوا کنگال دونوں وقت کھانے والا صبح ہوئی تو دلدری بن کے کھا پی لیا ایسے کے پیٹ کو توہی بھرنے والا ہے اے بڑے خبردار اور اوصاف کے دینے والے صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک مجھ سا کپوت نہیں اور تجھ سا دینے والا نہیں ۱۲ منہ۔

مفتاح الاسلام اور مختار ان نواب سے کہہ دیا کہ تم لوگ خود تقسیم کر دو۔ ہم فقیر آدمی اتنا روپیہ رکھ کر ایک مُفت کی بلا اپنے ذمّہ کیوں لیتے۔ کوئی چوری کی تاک لگاتا، کوئی مانگنے آتا، کوئی خوش ہوتا، کوئی ناخوش ہوتا۔ ہم تو اس بکھیڑے سے الگ ہی رہے اور چیل کے گوشت کی طرح اُس کو پھینک کر لوگوں کا تماشا دیکھتے رہے۔

پھر ارشاد ہوا کہ اس روپیہ کے آنے سے پہلے ہم نے ایک خواب دیکھا تھا کہ جسم کا زیریں حصہ براز سے آلودہ ہو رہا ہے لیکن ہاتھ ہمارے بالکل صاف ہیں۔ اگلے روز یہ روپیہ آیا تو ہم سمجھ گئے کہ اُس خواب کی یہی تعبیر ہے۔ چناں چہ ہم نے اُس کو ہاتھ نہ لگایا۔ نہ اُس میں سے کچھ کھایا۔

ایک[۱۷۱] روز ارشاد ہوا کہ ایک درویش دل ریش پیٹ پر بہت سا گودڑ لپیٹے رسیوں سے مضبوط باندھے ہوئے حاضر ہوا اور ہم سے کہا کہ یا حضرت! میرا پیٹ پھٹ گیا۔ آنتیں نظر آنے لگیں کچھ علاج فرمائیے ورنہ میں مرا۔ ہم نے پوچھا کیا تم ذکر ارّہ کیا کرتے ہو؟ اُس نے کہا کہ ہاں۔ ہم نے کہا کہ تم اپنے پیر کی خدمت میں جاؤ۔ اُس نے کمرر کہا کہ حضور ہی کچھ علاج فرمائیں ورنہ میری جان جاتی رہے گی۔ اس وقت پیر کی خدمت میں پہونچنا دشوار ہے۔ للہ علاج فرمایئے اُس وقت ہم نے بتایا کہ اچھا تین روز تک یہ شعر خواجہ حافظ کا پڑھ لیا کرو ؎

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

پھر تین روز کے بعد حاضر ہوا۔ نہ پیٹ پر گودڑ تھا نہ رسی تھی، نہ ذکر ارّہ کی تاثیر تھی۔ اس شعر کے پڑھنے سے وہ بات جاتی رہی۔ جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے پھر آپ نے فرمایا کہ اگر تمھارا ارادہ ہو تو اپنے پیر کے پاس چلے جاؤ۔ "قدرِ نعمت است بعدِ زوال" کا معاملہ تم کو سمجھا دیں گے۔

ایک[۱۷۲] روز ارشاد ہوا کہ میں مولوی شاہ اسحٰق صاحب سے مشکوٰۃ شریف کا سبق پڑھ رہا تھا۔ یومنون بالغیب کا ذکر آیا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت اس کے معنی سمجھ میں نہیں آتے کیونکہ لَیْسَ الْخَبَرُ کَالْمُعَایَنَۃِ۔ شاہ صاحب نے ہمارے والد ماجد سے پوچھا کہ فرمایئے تو ان کو معنی سمجھا دیے جائیں۔ اُنھوں نے کہا کہ حضرت نہیں۔ ابھی یہ بچہ ہے۔

۲۷۳ **ایک روز ارشاد ہوا** کہ کسی شخص نے ایاز سے سوال کیا کہ بندہ کے کیا معنی ہیں۔ اُس نے کہا کہ پرسوں آنا۔ وہ حسبِ وعدہ پہونچا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایاز کے گلے میں طوق پاؤں میں زنجیر ہاتھوں میں ہتھکڑی پڑی ہے۔ اور کشاں کشاں لیے جاتے ہیں۔ پوچھا کہ یہ کیا کہا کہ بندہ کے یہی معنی ہیں اُس دن تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ کی شان کا ظہور تھا آج تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ کی شان نمودار ہے۔ نہ اُس میں کچھ خوشی تھی نہ اس حال میں کچھ رنج ہے۔ جیسے تھے ویسے ہی اب بھی ہیں۔ نہ وہ رہا نہ یہ رہے۔

۲۷۴ **ایک روز ارشاد ہوا** کہ ہمارے والد بزرگوار کی یہ نصیحت تھی اگر مال دینے سے جان بچے تو مال کو فدا کردو۔ اور مال و جان کے دینے سے عزت قائم رہے تو جان و مال کو فدا کر دینا چاہیے ؎

مرد کی آن سے گذرتی ہے — حیز کی نان سے گذرتی ہے

اور اگر مال و جان و عزت تینوں کے قربان کرنے سے دین ہاتھ آئے تو ان سب کو دین پر قربان کر دینا چاہیے۔ اگر ان سب کے عوض میں خدا ہاتھ آئے تو دین کو بھی نثار کر دینا واجب ہے۔ مال و جان و عزت و دین سب دے دے مگر خدا کو حاصل کرلے۔

جو لاج دھن دیجیے ایک پریت کی کاج — دھن دے جی کو راکھیے جی دے رکھیے لاج

ہر دو عالم قیمتِ خود گفتۂ — نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے "کفرے کہ بہ خدا رساند عین اسلام است و اسلامے کہ از خدا باز دارد عینِ کفر۔ حکیم سنائی ؎

بہر چہ از راہ دا مانی چہ کفر آں حرف و چہ ایماں — بہر چہ از دوست وا مانی چہ زشت آں نقش و چہ زیبا

۲۷۵ **ایک روز ارشاد ہوا** کہ میاں معراج الدین صاحب نے اپنے بھائی جلال الدین صاحب کی وحشت و بے قراری کی شکایت کی اور بیان کیا کہ اکثر آہ و نالہ کرتے ہیں اور نماز پڑھتے نہیں۔ اُس وقت ہم کو یہ رباعی یاد آئی ؎

مارا نہ مریدِ وِرد خواں می باید — نے زاہد و حافظِ قرآں می باید

صاحب دردے و سوختہ جاں می باید — آتش زدۂ بہ خان و ماں می باید

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت جنید فنونِ سپہ گری میں یکتائے زمانہ تھے، خصوصاً پہلوانی میں بڑے نامی وگرامی تھے۔ ایک بار ایک شخص آیا اور بادشاہ سے کہا کہ میں تمھارے پہلوان سے لڑوں گا۔ بادشاہ نے کہا کہ ہمارا پہلوان بہت زبردست ہے۔ تم دُبلے پتلے آدمی بھلا اُس سے کیا لڑو گے۔ مگر اس شخص نے نہ مانا اور بہت اصرار کیا۔ آخر دنگل ہوا۔ جب حضرت جنید خم ٹھوک کر مقابل ہوئے اور دونوں کی پکڑ ہونے لگی تو اُس شخص نے چپکے سے ان کے کان میں کہا کہ میں سید ہوں اور محتاج ہوں آئندہ تم کو اختیار ہے۔ حضرت جنید لڑتے لڑتے گر پڑے۔ جب تو بڑا شور وغل ہوا۔ بادشاہ نے نہ مانا دوبارہ کشتی کرائی۔ پھر پچھڑ گئے۔ تیسری بار کشتی ہوئی پھر چاروں خانہ چت آئے آخر بادشاہ نے اُس کو انعام دیا اور حضرت جنید کو بلا کر پوچھا کہ سچ کہو یہ کیا بات تھی۔ اصل حال بیان کر دیا۔ بادشاہ بہت متعجب ہوا کہ مجمعِ عام میں اپنی ذلت اور سید کی عزت گوارا کی فی الحقیقت یہ بڑی پہلوانی اور بہادری تھی۔ اُسی شب رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو جنیدؒ نے خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں کہ شاباش! اے جنید! تو نے ہماری اولاد کے ساتھ سلوک کیا ہم بھی تیرے ساتھ سلوک کریں گے۔ دوسرے روز بادشاہی ملازمت ترک کی اور فقرا کی تلاش میں پھرنے لگے۔ آخر اپنے ماموں حضرت سرّی سقطی سے بیعت ہوئے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک دن حضرت جنید علیہ الرحمہ کو بادشاہ نے کسی مسئلہ کی تحقیق کے واسطے طلب فرمایا ان کے ہمراہ حضرت شبلی بھی گئے۔ بادشاہ نے حضرت جنیدؒ سے سخت کلامی کی۔ چونکہ حضرت شبلی جوان آدمی تھے اور نئی فقیری کا جوش تھا، آپ کو غصہ آگیا۔ شیرِ قالین کو تھپکا۔ وہ مجسم بن کر اُٹھنے لگا۔ حضرت جنید نے اُس پر نظر کی تو پھر اصلی حالت پر آگیا۔ دوبارہ بادشاہ نے پھر بے ادبانہ کلام کیا۔ حضرت شبلی نے پھر قالین پر ہاتھ مارا۔ غرض تین بار یہی معاملہ پیش آیا۔ آخر دفعہ میں بادشاہ نے بھی شیر کو اُٹھتے ہوئے دیکھ لیا خوف کے مارے بدحواس ہو گیا۔ فوراً تخت سے اُتر حضرت جنیدؒ کے قدموں پر گر پڑا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ آپ اس لڑکے کی بات کا کچھ خیال نہ فرمائیں۔ یہ بچہ ہے۔ آپ کو وہی بات زیبا ہے اور ہم کو یہی بات لازم ہے۔ اَطِیعُوا اللّٰهَ وَاَطِیعُوا الرَّسُولَ

وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ یعنی اطاعت کرو تم اللہ کی اور اللہ کے رسولؐ کی اور حاکم متشرع کی الغرض بادشاہ نے اپنا قصور معاف کرایا اور عزت کے ساتھ اُن کو رخصت کیا۔ پس وجہ تسمیہ حضرت شبلی کی یہ ہے کہ شبل بچہ شیر کو کہتے ہیں۔ جب سے یہ ماجرا گذرا تو اُن کا لقب شبلی یعنی شیر والا ہو گیا ورنہ اصلی نام اُن کا ابوبکر تھا اور حضرت جنید کے مُرید بھی تھے اور ہمشیرہ زادہ بھی۔

ایک روز [۲۷۸] ارشاد ہوا کہ جس وقت حضرت غوث الثقلین رحمۃ اللہ علیہ حضرت بایزید بسطامی قدس اللہ سرہ العزیز کے مزار پر تشریف لے گئے تو آپ کو خیال آیا کہ منزل میں تو بایزید کے برابر ہوں لیکن دو باتیں مجھ میں زیادہ ہیں۔ ایک یہ کہ سیّد ہوں، دوسرے محبوب ہوں۔ جب مزار پر متوجہ ہوئے تو یہ شعر لکھا ہوا پایا ؎

ہر کہ عاشق شُد جمالِ ذات را او ست سیّد جملہ موجودات را

حضرت یہ شعر پڑھ کر نہایت خائف ہوئے۔ اُس وقت روح بایزید ظاہر ہوئی اور کہا کہ صاحب زادہ یہ میرا قصور نہیں بلکہ یہ تعلیم تم کو ذاتِ پاک کی جانب سے ہوئی ہے اور فی الحقیقت مجھ سے تو آپ ہر رتبہ میں بہتر و برتر ہیں۔

ایک روز [۲۷۹] ارشاد ہوا کہ ایک چور شب کو چوری کرنے نکلا تھا۔ چوکیدار نے دیکھ لیا۔ وہ چور بھاگا۔ تمام چوکیدار پکڑنے کو دوڑے۔ وہ جھٹ پٹ کبیر کے گھر میں گھس گیا اور کہا کہ میں چور ہوں مجھ کو سپاہی پیادے پکڑنے کو آتے ہیں۔ کبیر نے اس سے کہا کہ یہ میری بیٹی سوتی ہے اس کے پاس تم بھی سو جاؤ۔ چناں چہ اُس کے پاس لیٹ گیا۔ جب سپاہی پیادے کبیر کے گھر آکر چور کو دریافت کرنے لگے اُس نے کہا کہ صاحب یہاں چور تو نہیں لیکن یہ میری بیٹی اور داماد سوتے ہیں۔ وہ اُن کو سوتے دیکھ کر چلے گئے۔ پھر چور اُٹھا اور تائب ہوا۔

ایک روز [۲۸۰] ارشاد ہوا کہ یہ اشعار حضرت غوث الاعظم کی شان میں ہیں ؎

سیّد و سُلطاں فقیر و خواجہ مخدوم و غریب بادشاہ و شیخ و درویش و ولی مولانہٗ
میر صالح، فاطمہ ثانی اسامی والدین بوسعید پیر ایشاں، مردِ حق مردانہٗ
زینب و بی بی نصیبہ خواہرانِ حضرت اند ایں اسامی شانزدہ باید کہ ہر فرزانہٗ
ضم کند با فاتحہ اخلاص خود فرمودہ اند تا قبول افتد دریں صورت فقط اُلانہٗ

اور حضرت کے فرزندانِ صلبی دس ہیں۔

رزاق و وہاب است وہادی عزیز — شرف دین و موسیٰ و یحییٰ است نیز
براہیم واسحاق و بونصر داں — کہ پسرانِ غوث اند اندر جہاں

کہتے ہیں کہ گیارھویں فرزند حضرت کے محی الدین ابنِ عربی ہیں۔ حال یہ ہے کہ اُن کے والدِ ماجد حضرت غوث الاعظم کے مرید تھے۔ ایک بار تمنائے اولاد ظاہر کی اور طالبِ دعا ہوئے۔ فرمایا کہ تمھاری قسمت میں تو ہے نہیں۔ لیکن ہم اپنا فرزند کہ محی الدینِ ثانی ہوگا تم کو دیں گے۔ کل صبح کے وقت اثنائے وظیفہ میں ہماری پشت سے پشت لگا دینا اور بے ادبی کا خیال نہ کرنا۔ "الامر فوق الادب" دوسرے دن تعمیلِ حکم کی اور اپنے گھر گئے تو نو مہینہ بعد حضرت محی الدین کی ولادت ہوئی۔ علمِ ظاہر و باطن میں یکتائے زمانہ تھے۔ لیکن آپ کا علم لدنی تھا۔ نہ تو کسی اُستاد سے کچھ سیکھا نہ کسی مرشد سے کچھ تعلیم پائی۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت ابراہیم قندزی نے دعا کی کہ بارِ خدایا میرے واسطے جو کچھ عذاب مقدر ہے سو دنیا ہی میں بھگت جاے۔ چناں چہ اُن کو مرضِ جذام ہوگیا۔ قبرستان میں ایک قبر کھودلی۔ وہیں پڑے رہتے۔ ایک دن کھجوروں کے باغ میں پہونچے جو حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے باپ کا تھا۔ خواجہ صاحب اُن دنوں نو دس برس کے تھے۔ کچھ کھجوریں توڑ کر پیش کیں۔ فرمایا کہ بیٹا میرے ہاتھ نکمے، منھ زخمی، تو ہی اپنے ہاتھ سے کھلادے۔ اُنھوں نے کھلانی شروع کیں۔ جو گٹھلی پھینکتے یہ اُس کو اُٹھا کر کھا جاتے تھے۔ آپ نے معلوم کیا کہ یہ لڑکا ہونہار ہے۔ کھجوریں کھا کر فرمایا کہ جاؤ مکۂ معظمہ سے تحصیل علم کرکے آؤ تاکہ تمھاری امانت جو ہمارے پاس ہے دی جائے۔ جب تحصیلِ علم کرکے واپس آئے تو درخواست کی کہ حضرت اب بیعت فرمائیے۔ جواب دیا کہ تم حضرت عثمانؒ ہارونی کے پاس جاؤ۔ اُن کے پاس پہونچے بعد تعلیم کے ارشاد کیا کہ اب تم جاؤ، حضرت ابراہیم قندزی کا وقت قریب آگیا ہے اور وہ تمھارے منتظر ہیں۔ اُن کے پاس واپس آئے تو پہچان نہ سکے کیوں کہ بیماری سے صحت پا چکے تھے۔ دیکھا کہ ایک نہایت خوب صورت آدمی بیٹھا ہے۔ سلام کیا فرمایا کہ آؤ ہمارا ابھی وقت قریب ہے۔ تعلیم کی اور فرمایا کہ ہمارا کفن دفن کرکے اپنے پیر پاس چلے جانا۔

چناں چہ خواجہ صاحب نے ایسا ہی کیا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب حضرت عبدالحق محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مدینۂ منورہ میں حدیث ختم کر چکے تو حضرت سرور کائنات نے خواب میں ارشاد کیا کہ تم ہندوستان میں جا کر علمِ حدیث کو شائع کرو تاکہ لوگ فیض یاب ہوں، لیکن خاکسارانِ ہند سے بھی ملتے رہنا۔ آپ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ بغیر حضوریٔ آستانۂ مبارک میری زندگی کس طرح کٹے گی۔ حکم ہوا کہ تم رات کے وقت مراقب ہو کر بیٹھا کرو۔ ہمارے پاس پہونچ جایا کرو گے۔ جب بیدار ہوئے تو بہ تعمیلِ حکم ہندوستان کی راہ لی۔ جس وقت سورت یا بمبئی سے ہندوستان کو روانہ ہوئے جابجا فقراء سے ملنا شروع کیا۔ ایک جگہ پہونچے تو لوگوں سے پوچھا کہ یہاں کوئی فقیر ہے؟ کسی نے نشان دیا کہ فلاں محلہ میں ہے۔ فجر کے وقت ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دیکھتے ہی فقیر بولا کہ مولوی عبدالحق صاحب آپ کا بڑا انتظار تھا۔ آپ چپ بیٹھ گئے۔ بعد مزاج پُرسی فقیر صاحب نے جام و صراحی نکال کر ایک ساغر نوش کیا۔ دوسرا جام لبریز کر کے مولوی صاحب کو دیا۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ میں تمھارے فعل پر معترض نہیں، لیکن میرے واسطے حرام ہے۔ تین بار انکار کیا اُس نے کہا کہ پی لے ورنہ پچھتائے گا۔ جب رات کو مراقب ہوئے تو دیکھا کہ جہاں خیمۂ دربارِ رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم ایستادہ ہے، اُس سے سو قدم آگے وہ فقیر لٹھ لیے کھڑا ہے۔ ہر چند مولوی صاحب نے آگے جانے کا قصد کیا، لیکن فقیر نے جانے نہ دیا ناچار واپس آئے۔ صبح کے وقت پھر اُس فقیر کے پاس پہونچے۔ اُس نے پھر جام پیش کیا۔ آپ نے نہ لیا کہ میرے واسطے حرام ہے۔ تیرے حکم سے خدا و رسول کا حکم افضل ہے۔ فقیر نے کہا کہ پی لو ورنہ پشیمانی اُٹھاؤ گے۔ رات کو پھر وہی معاملہ پیش آیا۔ نہایت حیران ہوئے تیسرے روز پھر اُس فقیر کے پاس پہونچے۔ اُس نے پھر پیالہ پیش کیا۔ آپ نے انکار کیا۔ چوتھی شب جو مراقب ہوئے تو فقیر کو پھر سدِّ راہ پایا۔ فقیر لٹھ لے کے اُن کی طرف دوڑا کہ خبردار جو اس طرف قدم اُٹھایا۔ اُس وقت اضطراب میں آپ کی زبان سے نکلا یارسول اللہ الغیاث۔ اُس وقت رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی سے فرمایا کہ عبدالحق چار شب سے حاضر نہیں ہوا

دیکھو تو باہر کون پکارتا ہے۔ بلاؤ۔ اُنھوں نے دونوں صاحبوں کو حاضر کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ عبدالحق چار رات سے تو کہاں تھا۔ اُنھوں نے سارا قصہ بیان کیا۔ حضرت نے اُس فقیر کی نسبت کہا اُخْرُجْ یَا کَلْبُ صبح کے وقت پھر شاہ صاحب فقیر کے پاس پہونچے۔ اُس کا حُجرہ بند پایا۔ دو چار مُرید بیٹھے ہوئے تھے۔ پوچھا کیا سبب ہے کہ پہر دن چڑھا اور یہ دروازہ نہیں کھولا۔ دیکھو تو ہیں بھی یا نہیں۔ دروازہ کھولا تو پیر ندارد۔ حیران ہوئے۔ شاہ عبدالحق نے فرمایا کہ کوئی جانور یہاں سے نکلا ہے یا نہیں۔ وہ بولے کہ ایک کالا کتّا تو ہم نے یہاں سے جاتا ہوا دیکھا تھا۔ فرمایا کہ بس وہی تمھارا پیر تھا کیوں کہ رات یہ معاملہ پیش آیا۔ اب چاہے تم بیعت رکھو یا فسخ کرو، تمھارا پیر کتا ہو گیا۔ غرض اس قصہ سے یہ ہے کہ فقیر کو کسی امر میں ضد لازم نہیں کہ ضد میں خود نمائی ہے اور خود نمائی خلافِ فقر۔ پس فقیر اس مقام میں ضرور خطا کھاتا ہے اور مارا جاتا ہے۔

ایک [۲۸۳] روز ارشاد ہوا کہ ایک فقیر رند مشرب مولانا شاہ **عبد العزیز** رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ مولوی بابا! ہم کو شراب پلوا۔ شاہ صاحب نے ایک روپیہ اُس کی نذر کیا اور فرمایا کہ جو چاہو سو کھاؤ اور پیو تم کو اختیار ہے۔ وہ بولا کہ ہم نے تو آپ کا بڑا نام سنا تھا۔ لیکن آپ تو قید میں ہیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ کیا شاہ صاحب آپ قید میں نہیں ہیں۔ کہا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر کسی روش کے مقید نہیں ہو تو آج غسل کرو اور جبّہ و عمامہ باندھ کر مسجد میں چلو۔ اور نماز پڑھو۔ ورنہ جیسے تم رندی کی قید میں مبتلا ہو اسی طرح ہم شریعت غرّا کی قید میں پابند ہیں۔ تمھاری آزادی ایک خیالِ خام ہے۔ یہ بات سن کر فقیر نہایت چپ ہوا اور شاہ صاحب کے قدم پکڑے کہ درحقیقت ہمارا خیال محض غلط تھا جو ہم آزادی کا دم بھرتے رہے۔

ایک [۲۸۴] روز ارشاد ہوا کہ میاں جی احسان علی ساکن کانٹھ نے کہ وہ شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مُرید تھے ایک دن شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت کشفِ قبور کیا چیز ہے۔ مجھ کو یقین نہیں آتا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ تم کسی قبرستان میں جا کر یہ آیت پڑھو سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّنَا وَرَبُّ الْمَلٰٓئِكَةِ وَالرُّوْحِ ٥ میاں جی نے یہ آیت

شاہ ولی اللہ صاحب کی قبر پر جاکر پڑھی۔ اوّل روز دیکھا کہ تمام قبروں کے اندر مردے لیٹے ہوئے ہیں۔ دوسرے دن دیکھا کہ مُردے بیٹھے ہیں۔ تیسرے دن جاکر پڑھا تو یہ اثر ظاہر ہوا کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے اُن کی طرف دیکھا اور کہا کہ "ہے" اتنا کہنا تھا کہ ایک شعلہ سا میاں جی کے جسم میں داخل ہوا اور اُس کی چکاچوند سے بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ شام کو شاہ صاحب نے اپنے طالب علموں سے کہا کہ قبرستان میں جاؤ اور میاں جی کو اُٹھا لاؤ۔ چناں چہ طالب علم گئے اور اُن کو لائے۔ بے ہوشی طاری تھی۔ منھ سے کف جاری تھے۔ تین دن میں ہوش آیا۔ کہتے تھے کہ ہر وقت شاہ ولی اللہ صاحب کی روح مجھ کو اپنے ہمراہ نظر آتی تھی۔ سال بھر تک یہی کیفیت رہی۔ ایک روز مست ہاتھی آتا تھا۔ آدمی بھاگنے لگے۔ مجھ کو شاہ ولی اللہ صاحب نے کہا کہ ڈرومت۔ روح اُن کی میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ہاتھی نکلا ہوا چلا گیا۔ میں بے اندیشہ کھڑا رہا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک شخص کسی فقیر کے پاس مرید ہونے گیا۔ اُنھوں نے چار ٹکے دیے اور فرمایا کہ آج کسی کے پاس رہو۔ پھر آؤ گے تو مُرید کریں گے۔ وہ شخص مُتشرع تھا۔ لاحول پڑھ کر چلا گیا کہ اچھے پیر ملے اور خوب ہدایت کی۔ اتفاق سے اُسی شب کو بیوی کے پاس گیا نطفہ نے قرار پایا اور لڑکی پیدا ہوئی۔ جب سنِ بلوغ کو پہونچی تو فاحشہ ہوگئی اور بازار میں جا بیٹھی۔ اُس شخص کی ایسی بدنامی ہوئی کہ منھ دکھانے کو جگہ نہ رہی۔ پھر اُسی فقیر کی خدمت میں پہونچا اور اپنا دردِ دل بیان کیا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ اُس روز کے چار ٹکے تو اسی لیے تھے کہ یہ بلا تمھارے گلے نہ پڑے۔ رنڈیوں میں پیدا ہوتی اور رنڈی بنتی۔ تمھارا نام بد نہ ہوتا لیکن تم نے نہ مانا اپنے کیے کو بھگتو ؎

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید۔ کہ سالک بے خبر نہ بود ز راہ و رسمِ منزل ہا

ایک روز ارشاد ہوا کہ جس کو جس چیز میں کمال ہوتا ہے اُسی میں مرتا ہے۔ چناں چہ دھنتر وید کو سانپ کے پکڑنے میں کمال تھا اس کو سانپ نے کاٹا اور مر گیا علیٰ ہذا القیاس۔

بِسِلٍّ مَاتَ اَرِسْطَالِیْسُ اَفْلَاطُوْنُ بِافْلِیْجٍ
وَلُقْمَانُ بِسِرْسَامٍ وَجَالِیْنُوْسُ مَبْطُوْنَا

ارسطو سل کی بیماری میں مرا اور افلاطون، فالج میں، لقمان سرسام میں اور جالینوس دستوں کے مرض میں حالانکہ انھیں بیماریوں کے علاج میں کمال رکھتے تھے۔ جس کو جس کی محبت ہوتی ہے اُسی کے خیال میں جان دیتا ہے۔ چناں چہ قارون مال کی محبت میں مرا۔ اور مجنوں لیلیٰ کی محبت میں۔ ایسے ہی طالبِ خدا کو خدا طلبی کی بیماری ہے۔ وہ اسی میں فنا ہو جاتا ہے۔ بیماری سے خالی کوئی نہیں۔ ہر شخص کو کچھ نہ کچھ علّت ضرور ہوتی ہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب مقام بلاس پور سے فیض یاب خاں کا عریضہ آیا کہ میرے لیے دعا فرمایئے کہ میرا دلی مقصد بر آئے۔ ہم نے جواب لکھوا دیا کہ ہم بھی دعا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنا فضل کرے گا۔ غرض دوسرے تیسرے دن اسی مضمون کا خط آنے لگا۔ ہم نے حاجی فریدالدین صاحب اور میاں اللہ بندے صاحب سے مشورہ لیا کہ کیا علاج کریں۔ دونوں صاحبوں نے صلاح دی کہ حضور دو سو روپیہ طلب فرمایئے یقین ہے کہ پھر خط نہ لکھیں گے۔ چناں چہ جواب میں یہی مضمون لکھا گیا۔ انھوں نے ڈیڑھ سو روپیہ کی ہنڈی ارسال کر دی اور لکھا کہ پچاس روپیہ میں خود لے کر فلاں تاریخ کو حاضر ہوں گا۔ جب یہ خط پہونچا تو حاجی فریدالدین سے ہم نے کہا کہ بولو! اب کیا کہتے ہو۔ بڑی مشکل ہوئی۔ اب تو جو کچھ وہ طلب کرے گا دینا پڑے گا اور نہیں معلوم وہ کیا طلب کرے۔ اور اُس کا مقصد دلی کیا ہے۔ آخر فیض یاب خاں باقی روپیہ لے کر حاضرِ خدمت ہوئے اور تنہائی میں اپنا مقصد عرض کیا۔ جب وہ چلے گئے تو جناب و قبلہ نے فرمایا کہ ارے میاں! ہم کو تو بڑا اندیشہ تھا کہ دیکھیے کیا مانگتا ہے مگر لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ مانگا تو کیا مانگا کہ حاکم مجھ سے رضامند رہے۔ سچ یہ ہے کہ سب باتیں تقدیر پر موقوف ہیں۔ چناں چہ نقل ہے کہ ایک بزرگ تھے جب اُن کا انتقال ہونے لگا تو اُن کی بیوی نے کہا کہ بڑا لڑکا فیضانِ باطن سے بالکل خالی رہ گیا۔ اُس کے حال پر توجہ فرمانی چاہیے۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ بیوی نے چند نظریں بیان کیں کہ تمھاری نظر سے فلاں شخص پر حال وارد ہو گیا اور فلاں شخص کامل بن گیا۔ افسوس ہے کہ اپنا ہی لڑکا محروم رہ جائے۔ وہ بولے کہ بے شک اُس وقت میری نظر میں ایسی ہی تاثیر تھی کہ وہ لوگ

تو کیا اگر درخت پر نظر پڑتی تو انا الحق بولنے لگتا۔ یہ میرے اختیار کی بات نہیں۔ البتہ آج سے تیسرے دن ایک بزرگ تشریف لائیں گے۔ تم لڑکے سے کہہ دو کہ جو کچھ اُس کا مدعا ہو اُس بزرگ سے طلب کرے۔ خیر انتقال ہو گیا اور تیسرے روز ایک فقیر آئے۔ گھر والے بہت خوش ہوئے کہ اب اس لڑکے کو کچھ نہ کچھ نعمت و فیضان حاصل ہو جائے گا۔ اُس فقیر نے پوچھا کہ بولو صاحبزادہ! کیا چاہتے ہو؟ کہا حضور میری تمنا تو یہ ہے کہ قصبہ کی نمبرداری مجھ کو مل جائے۔ فرمایا کہ بہت اچھا مل جائے گی۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد وہ نمبردار ہو گیا۔ اب دیکھیے تقدیر نے کہاں اُس کا سر پھوڑا۔ غرض بد قسمتی کا کچھ علاج نہیں ؎

سوزنِ تدبیر ساری عمر گر سیتی رہے ۔۔۔ رخنۂ تقدیر کو ہرگز رفو کرتی نہیں

ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک شخص اس امر کا متفحص و جویا تھا کہ آیا دنیا میں کوئی بندۂ خدا بے فکر و بے غم بھی ہے۔ جا بہ جا جستجو کرتا ہوا ایک شہر میں پہونچا۔ وہاں ایک باغ نظر آیا صحن چمن میں ایک کم سن، نوخیز، امیر زادہ کے گرد و پیش غلامانِ خوش انداز، کمربستہ کھڑے ہیں۔ مُطربانِ خوش الحان گاتے ہیں اور وہ امیر جڑاؤ جھولے کے اندر جھول رہا ہے۔ انواع و اقسام کا سامانِ عیش و طرب مہیا ہے۔ یہ سماں دیکھ کر اُس کی سمجھ میں آیا کہ اب مدعا پایا۔ یہ خوش نصیب ضرور بے فکر و بے غم ہے۔ اُس امیر سے کہا کہ ماشاء اللہ تمام جہان میں ایک آپ کو دل شاد پایا ہے امیر نے کہا میاں صاحب! کس خیال میں ہو! آج شب کو میرے پاس ٹھہر و اور احوال واقعی شنو ؎

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں ۔۔۔ گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں

المختصر رات کو امیر نے پوچھا کہ میاں صاحب! کیا کہتے تھے؟ اب کہیے۔ اُس نے کہا مدت سے اس تجسس میں صحرا نوردی اختیار کی ہے کہ الٰہی اس عالم میں کوئی بے فکر و بے غم آدمی بھی ہے ؎

جس سے پوچھا کہ ہے دل خوش بھی کہیں دنیا میں ۔۔۔ رو دیا اُس نے اور اتنا ہی کہا کہتے ہیں

البتہ آپ کو دیکھ کر شکرِ خدا بجا لایا کہ بھلا ایک تو بے فکر و بے غم پایا اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَةُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا۔ امیر نے یہ سُن کر آہ بھری اور کہا ؎

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا ۔۔۔ وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

میاں صاحب! مجھ جگر خستہ و دل شکستہ کا حال نہ پوچھیے! ؎

کیتم، دل شکستہ، غم زدۂ — بے دل و خستہ و ستم زدۂ
از گداز نفس بتاب و تبے — در بیابانِ یاس تشنہ لبے
دردمندے جگر گداختۂ — از غمِ دہر زہرہ باختۂ

لو! متوجہ ہو اور میری داستان سُنو۔ والدین نے بڑے ناز سے پرورش کیا۔ بچپنا میں شادی کردی۔ بیوی بھی خوب صورت و خوش سیرت ملی۔ اللہ تعالےٰ نے یہ لڑکے جو کھیل رہے ہیں عطا فرمائے۔ قضارا وہ نیک بخت مرضِ مُہلک میں مبتلا ہو کر مر گئی۔ چند روز درد و غم رہا۔ آخر صبر آگیا۔ پھر نکاح کیا۔ دوسری بیوی پہلے سے بھی زیادہ حسین اور نیک سیرت وفادار پائی نہایت خوشی سے زمانہ گذرنے لگا۔ کچھ مدت بعد دفعۃً وہ بھی سخت بیمار ہو گئی۔ اُمید زیست کی نہ رہی۔ میں رونے لگا۔ اُس نے کہا کیوں روتے ہو۔ اگر میں مر جاؤں گی اپنی جان سے جاؤں گی۔ تم اور لے آؤ گے۔ آخر مجھ سے پہلی بیوی پر بھی تو تم عاشق تھے۔ جب میں نے یہ بات سُنی تو غصہ میں آکر اُس کے روبرو اُس یخ فنا کو دور کر کے کہا کہ بس اب تو دوسری بیوی نہیں لاؤں گا۔ اب نیرنگِ قدرت دیکھیے کہ اِدھر تو میں نے یہ حرکت کی اُدھر اُس کو صحت ہونی شروع ہوئی۔ آخر وہ اچھی ہو گئی۔ اب ہم دونوں عجیب حسرت و افسوس میں گرفتار ہیں کہ جس کا بیان محال ہے۔ آپ ہی انصاف فرمائیں کہ مجھ سا کوئی اور بھی دنیا میں دُکھیا ہے ؎

دریں دنیا کسے بے غم نہ باشد — اگر باشد بنی آدم نہ باشد

تن دھر سکھیا کوئی نہ دیکھا جو دیکھا سو دکھیا رے — ڈگر چلنتی سب گھٹ دکھیا کیا گرہے اور بیراگی رے
سکھیا چارج دکھ ہی کے کارن گرہے مایا تیاگی رے — اودے است کی بات کہت ہوں تاکو کرے بیکاری رے
اونچے چڑھ چڑھ دیکھ تماشا گھر گھر ایک ہی لیکھا رے — چاند دکھت ہے سورج دکھیا نس دن بھرمت جائے رے
برہما بشن مہیش دکھت ہیں جن یہ ہاٹ لگائی رے — جوگی دُکھیا جنگم دکھیا تپسیا کو دکھ دونا رے
آسا ترشنہ سب گھٹ پوری ایکو محل نہ سونا رے — دیوتا دُکھی اپدوت دُکھی ہیں ان کا ذکر ہی کتنا رے
کہے کبیر سنو بھائی سادھو کوئی مٹھ نہیں سونا رے

یعنے کوئی جگہ دُکھ سے خالی نہیں ہے ۱۲

ایک روز[۲۸۹] ارشاد ہوا کہ جس زمانہ میں مولوی فضل حق صاحب سررشتہ دار تھے تو ہر جمعہ کو خضاب کیا کرتے تھے۔ مولوی نور الحسن صاحب کاندہلوی نے جو مولوی صاحب سے پڑھتے تھے عرض کیا کہ جناب یہ خضاب کرنا آپ کو زیبا نہیں کیوں کہ آپ عالم ہیں مولوی صاحب سن کر چُپ ہو رہے۔ جب مولوی نور الحسن صاحب کئی مرتبہ یہ بات زبان پر لائے تو ایک دن مولوی صاحب نے جواب دیا کہ سُنو صاحب! کسی نے وعظ کہہ کر دنیا کمائی کسی نے درس تدریس کر کے۔ کسی نے تعویذ گنڈا کر کے کسی نے پیری مریدی کی آڑ میں، ہم نے منھ کالا کر کے دنیا حاصل کی۔ غرض سب کی دنیا ہے۔ اس سے نجات تو جب ممکن ہے کہ ایسا مردِ خدا ملے جو ایک نظر میں بیڑا پار کر دے ؎

لنگکے زیر لنگکے بالا — نے غمِ دُزد نے غمِ کالا
گز کے بوریا و پوستکی — دلکے فارغ ز دوستکے
ایں قدر بس بود جمالے را — عاشق رند لا اُبالے را

لنگ بنکٹا دیکھے سیس بھاری جٹا دیکھے جوگی کن پھٹا دیکھے۔ چھار لائے تن میں
منی ان بول دیکھے گنی میوڑا سر چھول دیکھے کرت کلول دیکھے۔ بن کھنڈ سے بن میں
بیر دیکھے سور دیکھے گُنی اور کوڑ دیکھے مایا کے بھر پور دیکھے پھول رہے دھن میں
اُدھو کے سکھے دیکھے جنم ہو کے دُکھی دیکھے پرواہ ناہ دیکھے جن کے بوجھنا ہیں من میں

ایک روز[۲۹۰] ارشاد ہوا کہ ہم سے ایک شخص نے سوال کیا کہ حضرت! کیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بھی لوبھ سے پاک نہ تھے۔ ہم نے کہا کہ میاں! لوبھ یعنی حرص و طمع کسی کو دنیا ہوتی ہے، کسی کو عقبیٰ کی، کسی کو خدا کی۔ چناں چہ حضرت رسالت پناہ کو جو کام بارگاہِ عزت سے سپرد ہوا تھا یعنی اَبلاغِ رسالت اُس کی حرص بے شک تھی۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ الرَّحِیْمٌ ۵ ترجمہ، تحقیق آیا ہے تمھارے پاس پیغمبر تم میں سے شاق ہے اوپر اُس کے یہ کہ ایذا میں پڑو تم، حرص کرنے والا ہے اوپر بھلائی تمھاری کے، ساتھ مسلمانوں کے شفقت کرنے والا مہربان۔

ایک روز[۲۹۱] ارشاد ہوا کہ ایک بوڑھا رانگھڑ تھا گانوں کا رہنے والا۔ ہم سے سوال کیا کہ اجی میاں صاحب! پیر کے میانی (کیا معنی)، اور مُرید کے میانی (کیا معنی)، ہم نے کہا کہ اے کاکا! ہم کو ایک نقل یاد آئی۔ اس پر میانی (معنی) سمجھ لو۔ **نقل**۔ ایک مرید نے اپنے پیر سے پوچھا کہ پیر کا حق مرید پر کیا ہے اور مرید کا حق پیر پر کیا؟ اُس بزرگ نے جواب دیا کہ اچھا بتادیں گے۔ چند روز کے بعد جس وقت وہ مرید راسخ الاعتقاد حاضر ہوا، پہلے اس سے کہ وہ بیٹھے، پیر نے حکم دیا کہ چلے جاؤ۔ وہ مُرید فوراً ایک طرف کو چل دیا۔ ساتویں روز ایک شہر کے قریب پہونچا۔ وہاں ایک امیر اُسی بزرگ کا مُرید تھا اُس کو اس مُرید مسافر کا حال منکشف ہوا اُس نے اپنے پاس بُلایا اور پوچھا کہ تم کہاں جاتے ہو۔ اُس نے کیفیت بیان کی اور کہا کہ میں نہیں جانتا کہ کہاں جاتا ہوں۔ تب اُس نے کہا کہ تم کو میرے ہی پاس بھیجا ہے۔ آؤ! ٹھہرو۔ چند روز کے بعد ایک ہزار روپیہ دے کر رخصت کیا اور کہہ دیا کہ بس واپس چلے جاؤ۔ وہ چلا تو اثنائے راہ میں ایک شہر میں وارد ہوا۔ اتفاقاً ایک بازاری عورت پر جو حسن و جمال میں بے مثال تھی فریفتہ ہوگیا اور وہ ہزار روپیہ دے کر اُس سے ملاقات کی۔ جب ارادۂ فاسد کیا تو غیب سے ایک طمانچہ لگا۔ تین بار یہی معاملہ گذرا۔ عورت نے پوچھا کہ تم کون ہو اور کہاں سے آتے ہو؟ اُس نے تمام سرگذشت بیان کی۔ وہ بولی کہ معلوم ہوا تمھارا شیخ مردِ کامل ہے۔ اس خیالِ باطل کو چھوڑو اور آؤ ہم تم دونوں اُن کی خدمت میں چلیں۔ یہ لو اپنا روپیہ کمر سے باندھو۔ آخر دونوں پیر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عورت نے افعالِ سابقہ سے توبہ کی اور اس شخص سے نکاح کرلیا۔ چند روز کے بعد اُس مُرید نے پھر وہی سوال پیش کیا۔ تو شیخ نے جواب دیا کہ پیر کا حق وہ تھا جو تو نے ادا کیا یعنی بغیر چون و چرا ہمارے حکم کی تعمیل کی اور مُرید کا حق وہ تھا جو تجھ پر گذرا۔ سو کاکا! اس زمانہ میں نہ تو ایسے مُرید ہیں اور نہ ایسے پیر۔

ایک روز[۲۹۲] ارشاد ہوا کہ ایک شخص بڑا خوش نویس تھا۔ لیکن اُس میں یہ سخت عیب تھا کہ اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ اصلاح ضرور کردیتا تھا۔ ایک شخص نے اُس سے قرآن شریف لکھوایا اور کہا کہ میں اس قدر روپیہ کتابت کا دوں گا مگر اتنی مہربانی کرنا کہ نقل مطابق اصل ہو۔ وعدہ کیا کہ بہت اچھا۔ جب قرآن شریف پورا ہوگیا تو لکھوانے والے نے پوچھا کہ فرمایئے کچھ اصلاح

تو نہیں دی۔ کہا کہ ہاں! کچھ ایسی اصلاح میں نے نہیں دی، البتہ دو جگہ بہ مجبوری صحت کر دی ہے۔ کیوں کہ ایسی فاش غلطی تھی کہ میں رہ نہ سکا۔ ایک تو وَلَقَدْ نَادَانَا نُوْحًا کی بجائے وَانَا نُوحٌ بنادیا ہے کیوں کہ حضرت نوح نادان نہ تھے۔ دوسرے مقام پر خَرَّ مُوْسیٰ صَعِقًا تھا۔ میں نے خرِ عیسیٰ بنادیا ہے۔ چناں چہ خرِ عیسیٰ مشہور و معروف ہے نہ خرِ موسیٰ۔ یہی کیفیت فقیر بے معرفت کی ہوتی ہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ اگلے زمانہ میں اکثر لوگ تحصیلِ علم کے بعد فقیری اختیار کرتے تھے۔ اب وہ زمانہ ہے کہ علم ہو یا نہ ہو مُرید ہوتے ہی فقیری کا دم بھرنے لگتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ جو فقیر ہوتا ہے اُس کو علم بھی حاصل ہو جاتا ہے، بلکہ علماء پر زبانِ طعن و تشنیع دراز کرتے ہیں کہ اُن کو تفسیر و حدیث کے معنی نہیں آتے۔ اور ہم کو اللہ تعالیٰ نے علمِ لدُنی عطا فرمایا ہے۔ اس طرح سے جاہلوں میں بیٹھ کر اپنی تعریف کرتے ہیں اور عجیب و غریب معنی پیدا کرتے ہیں۔ چناں چہ نقل ہے کہ ایک مرید نے اپنے پیر سے پوچھا کہ حضرت اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کے کیا معنی ہیں۔ جواب دیا کہ میاں! یہ بات خلوت میں بتانے کی ہے۔ اس میں بڑا راز ہے۔ عالموں کو ان معنی کی خبر نہیں۔ زنہار کسی کے سامنے بیان مت کیجیو ورنہ پھانسی دیے جاؤ گے۔ عُلما نے بہت فقیروں کو قتل کرا دیا ہے۔ کیا تم نے سُنا نہیں کہ شاہ منصور کو مُلّانوں نے دار پر کھینچ دیا تھا۔ اُنھوں نے اِسی اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کے معنی ظاہر کر دیے تھے۔ لو، سنو! معنی یہ ہیں اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ اللہ میاں کے ایک بلا تھا وَ مَلٰٓئِکَتِہٖ اور بلائی کھا جاتا تھا وَ کُتُبِہٖ اُس کے پیچھے کُتّے لگا دیے وَ رُسُلِہٖ اور اُس کو رسّی سے باندھ دیا وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ اور اُس پر قیامت ہو گئی وَ الْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَ شَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالیٰ اور اپنے کیے کی سزا کو پہونچ گیا۔ اور یاد رکھو کہ فقرا آخر کو یہی بھید مرید کے کان میں کہہ دیتے ہیں اور وہ کامل ہو جاتا ہے۔ پھر خلافت دے کر اُس کو روانہ کرتے ہیں۔ سو آج سے تو بھی ہمارا خلیفہ ہو گیا۔ واہ سبحان اللہ! کیا تعلیم اور کیا فقر ہے۔ بس آج کل ایسی فقیری اور یہ پیری مریدی ہے۔ جس نے علماء کو زیادہ بُرا بھلا کہا وہی فقیر کامل ہے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ لکھنؤ میں ہم نے سُنا کہ یہاں ایک فقیر صاحب توجہ

دیتے ہیں جس کا لوگوں پر بہت اثر ہوتا ہے۔ ہم بھی پہونچے۔ فقیر صاحب نے اوّل مزاج پوچھا۔ پھر آنے کا سبب دریافت کیا۔ جو بات تھی ہم نے صاف کہہ دی۔ بولے کہ اچھا تشریف رکھیے اتنے میں سب مرید جمع ہو گئے۔ شربت پر فاتحہ ہوئی اور پیالہ گردش میں آیا ع

الا یا ایُّہا الساقی ادر کاساً وناوِلہا

ہماری بھی نوبت آئی۔ ہم نے کہا کہ صاحب ہم کو تو نزلہ کا عارضہ ہے۔ اس سے معاف رکھیے بولے کہ اس پر خواجہ نقشبند کی فاتحہ دی گئی ہے اور اُن کی برکات سے توجہ کا خوب اثر ہوتا ہے، بغیر اس کے فیض و فائدہ غیر ممکن ہے۔ ہم نے کہا خیر مرضیِ خدا ہم بھی مجبور ہیں۔ غرض شربت کے بعد توجہ شروع ہوئی اور حریفانِ ہم مشرب لوٹنے اور اُچھلنے لگے۔ ہم تو جیسے گئے تھے ویسے ہی بیٹھے رہے۔ جب مجلس برخاست ہوئی تو ہم بھی اُٹھ کر چلے۔ باہر آکر اُس کے ایک مُریدِ راز دار نے ہم سے کہا کہ میاں صاحب! خوب ہوا جو تم نے شربت نہ پیا۔ اُس میں تو بھنگ ملائی جاتی ہے۔ ہم نے شکر ادا کیا اور لاحول پڑھ کر چلے آئے ؎

از خدا نے بوئے او رانے اثر	دعوتش افزوں ز شیث و بوالبشر
دیو بنمودہ ورا ہم نقش خویش	او ہمی گوید ز ابدالیم بیش
حرف درویشاں بدزدیدہ بسے	تا گماں آید کہ ہست او خود کسے
او ندا کردہ کہ خواں بنہادہ ام	نائب حقم خلیفہ زادہ ام
سالہا باید کہ ستر آدمی	آشکارہ گردد از بیش و کمی
اے بسا ابلیس آدم روئے ہست	پس بہر دستے نباید داد دست

ایک روز ارشاد ہوا [۲۹۵] کہ ایک نواب کا معتمد ہمارے پاس آیا اور نواب کی طرف سے عرض کیا کہ اس عاجز کے لیے وقتِ خاص میں دعا فرمایئے تاکہ اپنے مقصد کو پہونچوں۔ ہم نے کہا کہ ہم کو ایک نقل یاد آئی۔ مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں ایک راجہ حاضر ہوا کرتا تھا۔ گردشِ گیتی سے اُس پر ایک وقت ایسا آیا کہ اُس کا راج پاٹ ضبط ہونے لگا۔ وہ گھبرا کر شاہ صاحب کے پاس دوڑا آیا اور عرض کیا کہ حضرت مجھ پر

آج وقت پڑا ہے۔ ہمت کیجیے ورنہ ناحق میرا ملک ضبط ہوتا ہے۔ میں آج ہی کے دن کے لیے حاضر ہوتا تھا۔ آپ پہلے تو خاموش ہوئے پھر فرمایا کہ راجہ صاحب میں بے چارہ تو مُلّا ہوں۔ کوئی مسئلہ دریافت کرنا ہو تو کرلو اور اس مطلب کے واسطے کوئی فقیر تلاش کرو۔ اُس نے کہا کہ اُس کو بھی آپ ہی بتائیں گے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ ایک بڑے زبردست مجذوب بھولی بھٹیاری کے محل پر رہتے ہیں اُن کی خدمت میں جاؤ۔ اگر تمھارے لیے اُن کی زبان سے کچھ بہتر نکل جائے تو کام بن گیا ورنہ خیر جو مرضیِ الٰہی۔ غرض دوسرے دن وہ راجہ مجذوب کی خدمت میں گیا اُس نے دیکھتے ہی کہا جاؤ تمھارا ملک بحال، انعام و خلعت مزید برآں۔ راجہ یہ مژدہ سُن کر خوش خوش مولوی صاحب کے پاس آیا اور جو مجذوب کی زبان سے نکلا تھا وہ کہہ سنایا۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ جاؤ راجہ صاحب تمھارا کام تو ہو گیا۔ مگر وہ بچہ اس کا خمیازہ بھگتے گا۔ ایک مہینے کے بعد راجہ کو سب خرشوں اور دغدغوں سے فراغ و اطمینان ہو گیا اور انعام بھی ملا اور خلعت بھی۔ شیرینی لے کر شاداں و فرحاں مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک جوڑی سونے کے کڑوں کی بھی نذر کے لیے لایا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ میرا حق نہیں۔ جس نے دعا کی وہی مستحق ہے۔ راجہ مولوی صاحب کے اشارہ کے موافق یہ سب سامان اُس مجذوب کے پاس لے گیا۔ وہ مطلق ملتفت نہ ہوا۔ راجہ نے سونے کے کڑے اُن کے ہاتھوں میں پہنا دیے اور شیرینی تقسیم کرا دی۔ صبح کو شہرت ہوئی کہ وہ مجذوب مارے گئے۔ شاہ صاحب کے سمعِ مبارک میں جب یہ خبر پہونچی تو فرمایا کہ دیکھا جو اپنی جان سے ہاتھ دھوتا ہے وہ ایسے مقدمہ میں زبان ہلاتا ہے۔ بھلا ہم مُلّا آدمی مفت جان کیوں دیتے۔ الحاصل حضرت نے یہ نقل بیان فرما کر ارشاد فرمایا کہ خاں صاحب کسی فقیر کو تلاش کیجیے۔ شاید کوئی خدا کا بندہ ایسا بھی نکل آئے اور ہمارے نزدیک تو خاص وقت میں اگر نواب صاحب یاد آئیں تو اُس خاص وقت پر بھی تین حرف ہیں۔

ایک روز[۲۹۶] ارشاد ہوا کہ صبح کے وقت ایک سیاح محمد صالح عرب ہمارے پاس آیا اور عرض کیا کہ ایک رازِ نہفتہ کے واسطے جو حضور پر روشن ہے فلاں فقیر صاحب نے

آپ کی خدمت میں مجھ کو بھیجا ہے۔ یہ سُن کر آپ نے فرمایا کہ ہمیں ایک نقل یاد آئی **نقل**۔ نادر شاہ دُرّانی کے لشکر نے جب دہلی میں قتلِ عام کیا اور تاخت وتاراج کر کے پھر اپنے مُلک کو چل دیا تو اُس کے کسی سردار کے ہاتھ ایک عورت نہایت شکیلہ و جمیلہ غنیمت میں آئی۔ اتفاق سے یہ عورت دہلی کے کسی امیر کی بیوی تھی۔ اپنے خاوند پر عاشق زار اور وہ بھی اُس کا دل دادہ و جان نثار۔ ایک کو بے دوسرے کے کل نہ پڑتی تھی۔ گردشِ روزگار و تغیر لیل و نہار نے ایک دُرّانی کی قید میں کابل پہونچایا۔ درّانی اس کے حُسن و جمال کو دیکھ کر شیفتہ و بے قرار ہوا اور عقد کا خواستگار۔ ناچار اُس نیک بخت نے جواب دیا کہ میں بیوہ نہیں، جو نکاحِ ثانی کروں۔ خاوند زندہ چھوڑا ہے۔ چھ ماہ صبر کرو، پھر تم مختار ہو۔ میں تمھارے بس میں ہوں، اتنی مہربانی کیجیے کہ ایک مکان مجھے شہر کے باہر بنوا دیجیے تاکہ آیندہ روندہ کو وہاں ہر وقت دیکھتی رہوں۔ امیر نے یہ بات مان لی اور ایک حویلی تعمیر کرا دی۔ چار مہینے بعد اُس کا شوہر اُس کی جستجو میں کابل پہونچا۔ اسی دروازہ سے ہو کر نکلا عورت نے پہچان لیا ؎

وہ چلا جو آتا ہے دوستو ذرا اُس سے بچتے رہا کرو　　کیا قتل جس نے نظیرؔ کو یہ وہی تو خانہ خراب ہے

اور کہلا بھیجا کہ اقرار میں ابھی دو مہینے باقی ہیں۔ وقت ہاتھ سے نہیں گیا۔ اگر تم سے بن پڑے تو رہائی کی کوئی تدبیر نکالو ورنہ یہ قیدِ فرنگ ہے چھوٹنا معلوم۔ اور یہ کام کسی کامل سے نکلے تو نکلے ورنہ اور کوئی چارہ نہیں۔ اُس طالبِ صادق نے یہ اشارہ پا کر کامل کی تلاش میں نہایت تگ ودَو کی آخر جوئندہ یابندہ۔ ایک دن اسی جستجو میں سرگرداں و پریشاں پھر رہا تھا کہ ایک فقیر نے خود اُس سے کہا کہ تم یہاں خراب و خستہ پھرتے ہو۔ تمھارے شہر میں فلاں فقیر فلاں محلّہ کا باشندہ موجود ہے اُس کے پاس چلے جاؤ اور ہمارا اسلام کہو۔ وہ تمھارا کام کر دے گا۔ یہ بے چارہ بہ ہزار خرابی اُفتاں و خیزاں دہلی آیا۔ اُس فقیر کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی سب داستانِ دردِ غم کہہ سُنائی۔ فقیر صاحب نے ہنس کر فرمایا کہ وہ بھی عجب بے وقوف تھے کہ تم کو میرے پاس بھیجا کیا وہ خود نہیں کر سکتے تھے؟ خیر کل ہولی ہونے والی ہے۔ ہم اُس میں کرشن بنیں گے۔ جس وقت رادھا گم ہو کر پھر ملے تو تم کہنا کہ حضرت میری رادھا تو ملی ہی نہیں اُسے بُلا دیجیے۔ غرض دوسرے دن ہولی کا ہنگامہ گرم ہوا اور فقیر صاحب کرشن بنے۔ سانگ

شروع ہوا۔ پہلے غل مچا کہ رادھا گم ہوئی رادھا گم ہوئی۔ پھر بہت تلاش و جستجو کے بعد شور ہوا کہ وہ ملی وہ ملی۔ امیر نے ارشاد کے موافق عرض کیا کہ حضرت میری رادھا تو ملی ہی نہیں۔ شاہ صاحب نے یہ سُن کر کابل کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اُس کی عورت کی چوٹی پکڑ کے سامنے لا کھڑا کیا اور فرمایا کہ یہ لے اپنی رادھا۔ اُس وقت تمام آدمیوں نے ایک شور مچایا کہ یہ سچ مُچ کی رادھا کہاں سے آگئی۔ امیر نے جھٹ پٹ اُس پر اپنی چادر ڈال دی اور خوش خوش گھر لے آیا عورت سے دریافت کیا کہ یہاں تم کس طرح سے پہونچیں۔ اُس نے کہا کہ آج مجھے بہت اضطراب و بے قراری تھی کیوں کہ وعدہ کی گھڑی شام کو پوری ہوا چاہتی تھی۔ میں اس فکر میں تھی کہ دیکھیے پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ پلنگ پر پڑے پڑے آنکھ لگ گئی خواب میں دیکھا کہ پلنگ پر سے گری آنکھ جو کُھلی تو اس مجمع میں کھڑی تھی۔ اس سے زیادہ مجھے خبر نہیں کہ کیا معاملہ ہُوا۔ حضرت نے یہ ارشاد فرما کر سیّاح سے کہا کہ آپ کو ناحق اتنی دور بھیجا۔ آپ اُنھیں کے پاس چلے جائیں۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک جوتشی پنڈت سفر میں تھا اُس نے احکام نجوم سے معلوم کیا کہ فلاں تاریخ و فلاں ساعت میں اگر کوئی شخص عورت سے قربت کرے تو لڑکا پیدا ہو جو بڑا پنڈت بنے اور نجوم و رمل میں دستگاہِ کامل حاصل کرے۔ اسی اُمید پر وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ تاریخ مُعیّنہ پر اپنے وطن کی نواح میں جا پہونچا۔ یکایک زور و شور کی گھٹا اُٹھی اور موسلا دھار مینھ برسنے لگا۔ جنگل میں ایک مکان بنا ہوا تھا پنڈت جی نے وہاں پناہ لی۔ اتنے میں ایک جوان جاٹنی مینھ کے مارے وہیں آگھسی۔ اب مصر جی بار بار آسمان کی طرف گھبرا کر دیکھتے ہیں کہ مینھ تھمے تو میں گھر کی راہ لوں۔ جاٹنی نے یہ کیفیت دیکھ کر پوچھا کہ مہاراج تمھیں ایسی گھبراہٹ کیوں ہے؟ اُنھوں نے تمام قصہ بیان کیا تو جاٹنی بولی کہ بھلا مصر جی وہ گھڑی کب آئے گی۔ مصر جی نے کہا کہ بس وہ یہی گھڑی ہے تب جاٹنی نے کہا کہ مہاراج اب تم گھر تو پہونچ نہیں سکتے اور یہ گھڑی بیت جائے گی۔ ع

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

چونکہ وقت تنگ تھا اور مینھ کے آثار تھمنے کے نظر نہیں آتے تھے۔ ناچار مصر جی نے جاٹنی ہی

کا زائچہ کھولا اور بدھ بلائی۔ قدرتِ خدا بعدِ مدّت معہودہ جاٹنی سے لڑکا پیدا ہوا جب چار برس کا ہوا تو وہ کھیل کے طور پر زمین میں لکیریں کھینچ کر زائچہ ستاروں کا بناتا ؎

طفلی میں بھی ہم کھیل جو کھیلے تو صنم کا

غرض یہ ہے کہ لڑکے کا پیدا ہونا تو پنڈت جی نے دریافت کیا مگر اُس احمق کو یہ معلوم نہ ہوا کہ اُس کے گھر پیدا ہوگا یا جاٹ کے گھر ؎

خدا کشتی آں جا کہ خواہد برد	اگر ناخدا جامہ برتن درد
ایں سعادت بزورِ بازو نیست	تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ایک ۲۹۸ روز ارشاد ہوا کہ ایک دن میر عبد القادر[1] صاحب پانی پتی نے عیالِ کثیر و خرچِ قلیل کی شکایت کی اُس وقت ہم نے کہا کہ فِی السَّمَآءِ رِزْقُکُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ؎

چنتا نہ کر اچنت رہ توری چنتا میں کین	نیار ورزئی روزی کب تک توہے نہ دین
کار سازِ ما بہ فکرِ کارِ ما	فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما
توکّل نہ بود اندیشہ مادہ	چرا غم می خوری اے مردِ سادہ

ایک ۲۹۹ روز ارشاد ہوا کہ ایک دن غلامی شاہ[2] نے چائے تیار کرکے پیش کی۔ ہم نے تو کسی وجہ سے نہ پی مگر اور لوگوں نے پی سب کو دست آنے لگے۔ دوسرے دن یہ احوال معلوم ہوا تو ہم نے غلامی شاہ سے پوچھا کہ چائے کا نسخہ تو بہت خوب ایجاد کیا۔ بھلا اُس میں کیا کیا چیزیں ڈالی تھیں۔ شاہ جی نے خوش ہو کر عرض کیا کہ حضرت اُس میں کچھ سونف، کچھ گاؤزبان اور کچھ سنا اور اڑھائی پتّی نیم کی تھی۔ ہم نے کہا سُبحان اللہ! نسخہ تو عمدہ ہے۔ البتہ جمال گوٹہ کی کسر باقی رہ گئی۔ پھر آپ نے سب لوگوں کو منع کر دیا کہ خبردار ان کی بنائی ہوئی چائے کوئی نہ پیے ؎

خیالاتِ نادانِ خلوت نشیں	بہم بر کند عاقبت کفر و دیں

---

[1] میر عبد القادر حضرت کے مریدوں میں سے تھے ۱۲۔

[2] غلامی شاہ، جناب قبلہ کے خادموں میں سے تھے ۱۲۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک گانوٗں مسلمانوں کا تھا۔ وہاں کوئی ہندو آتا تو بہت تکلیف پاتا کیوں کہ وہاں کوئی گھر برہمن کا نہ تھا۔ نمبرداروں نے باہم مشورہ کیا کہ ایک شخص کو برہمن بنا دینا چاہیے تاکہ اہلِ ہنود بھی آرام پائیں۔ چناں چہ ایک قصاب کو برہمن بنا دیا۔ جو ہندو آتا اُس کے گھر ٹھہرتا۔ اتفاقاً ایک پنڈت جی تشریف لائے۔ تین چار دن کے بعد قصائن نے جو اَب برہمنی تھی پنڈت جی سے بِیوستا یعنی فتویٰ پوچھا کہ مہاراج میرے دو بالک ہیں۔ ایک کا نام خدابخش دوسرے کا نام گنگا رام۔ بھلا میں پہلے خدابخش کا ختنہ کراؤں یا گنگا رام کو جنیو پہناؤں۔ جیسی آپ کی آگیا ہو ویسا کروں۔ پنڈت جی یہ سُن کر نہایت حیران ہوئے۔ بولے کہ نیک بخت یہ کیا بات پوچھی؟ ہماری سمجھ کام نہیں کرتی! ذرا اس کی شرح کر۔ اُس نے تمام حال برہمن بننے کا بیان کر دیا۔ اور کہا کہ خدابخش تو اُس وقت پیدا ہوا تھا جب ہم قصائی تھے۔ اور گنگا رام اُن دنوں میں پیدا ہوا جب ہم برہمن بن گئے تھے۔ پنڈت جی اس شرح کو سن کر بہت گھبرائے اور کہا کہ اے نیک بخت پہلے مجھے تو یہ بتا کہ اب میں جلوں یا گڑوں۔ تیرا خدابخش بھی اچھا اور گنگا رام بھی خاصہ۔

دھرم بھرشٹ ہوا سو ہمارا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ اورنگ زیب عالم گیر نے بنارس میں ایک مندر کو توڑ کر مسجد بنانے کا حکم دیا۔ اُس کے میر منشی چندر بھان کو مذہبی خیال سے یہ بات بڑی شاق ہوئی لیکن حکمِ شاہی میں مجالِ دخل نہ تھی۔ ناچار اپنے دل کے بُخار کو اس شعر کے مضمون میں ظاہر کیا ؎

ببیں کرامتِ بت خانہ مرا اے شیخ　　اگر خراب شود خانۂ خدا گردد

اُس نے یہ شعر بادشاہ کو سنایا۔ عالم گیر بھی سخن فہم تھا۔ اس رمز کو سمجھ گیا اور چندر بھان سے کہا کہ سچ بتا تو نے اصل میں شیخ کی بجائے کیا کہا تھا؟ اُس نے کہا کہ سچ تو یوں ہے کہ میں نے شاہ کہا تھا مگر آپ کے خوف سے اس وقت شیخ پڑھ دیا۔ عالم گیر نے فرمایا کہ بے شک تو نے سچ کہا اور تیرے سچ کے انعام میں ہم اپنا حکم منسوخ کرتے ہیں۔ اور آئندہ کے لیے بھی ممانعت ہے کہ کوئی بت خانہ توڑ کر مسجد تعمیر نہ ہو۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ سرونج میں ایک بڑھیا ہمارے پاس آئی اور اپنی بیٹی کے لیے تعویذ مانگا۔ ہم نے فوراً لکھ دیا۔ وہ بولی کہ اُس پر شہید صاحب آتے ہیں۔ بہت تعویذ گنڈے کر چکی ہوں مگر کسی سے فائدہ نہ ہوا۔ ہم نے تعویذ مانگ واپس لیا اور کہا اری نیک بخت اچھا ہوا جو تو نے کہہ دیا ورنہ رات کو شہید صاحب سے ہماری لڑائی ہوتی۔ وہ نہایت منت و سماجت کرنے لگی۔ ہم نے کہا کہ پہلے شہید کی نیاز کا سوا روپیہ سوا سیر گھی، سوا سیر شکر، ایک تھان لٹھے کا لا اُس وقت تعویذ ملے گا۔ چنانچہ وہ سب چیزیں لائی اور تعویذ لے گئی۔ دوسرے دن آکر خبر دی کہ میاں صاحب! خدا تمھارا بھلا کرے آج کی رات میری لڑکی نہایت آرام سے سوئی۔ ہم نے کہا کہ آرام کیوں نہ ہوتا شہید کو تو ہم نے جانے نہیں دیا۔ تمام رات یہاں لڑتا رہا۔ غرض اس نقد و جنس کا حلوا پکا کر یارانِ ہم سفر کو کھلایا اور تھان کے کپڑے بنوا دیے۔ سچ ہے اَلدُّنْیَا زُوْرٌ لَا یَحْصُلُ اِلَّا بِالزُّوْرِ اور جب تک کچھ لیا نہیں جاتا دنیاداروں کو یقین نہیں آتا۔ ورنہ کون شہید اور کیسا تعویذ۔ یہ بھی اپنا خیال و وہم ہے۔ کسی انگریز کے سر پر کبھی جن بھوت نہ دیکھا۔ حالاں کہ ہندوستانیوں سے زیادہ خوب صورت ہیں۔

ایک روز[۵] ارشاد ہوا کہ تعویذ اور نسخوں کا یکساں حال ہے کبھی فائدہ ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا۔ ہاں! اگر اس کے ساتھ ہمت بھی ہو تو پھر تیر بہدف ہے۔ سونی پت میں ایک شخص نے ہم سے لڑکا ہونے کا تعویذ مانگا۔ ہم نے لکھ دیا۔ جب ایامِ ولادت قریب آئے تو ہم وہاں سے چل دیے کہ خدا جانے لڑکا ہو یا لڑکی، کارخانۂ قدرت میں کسے دخل ہے۔ چند روز کے بعد اُن کا خط آیا کہ لڑکا پیدا ہوا ہے۔

شنیدم کہ ذوالنوں ز مدین گریخت بسے بر نیامد کہ باراں بریخت

---

۵ ایک بار وہ لڑکا بہ عالمِ جوانی جناب و قبلہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بیکاری سے تنگ تھا۔ اُس کو نمائش کی کہ آج خدمتِ مبارک میں یوں عرض کرنا کہ حضور نے مجھ کو لڑکا بنا کر بڑی فکر میں ڈال دیا۔ لڑکی ہوتا تو کسی بھلے مانس کا گھر بستا۔ مجھ کو بیٹھے بٹھائے روٹی ملتی۔ اب یا تو مجھ کو نوکر کرا دیجیے یا اپنے جدِّ بزرگوار کے مزارِ متبرک کا پتہ بتا دیجیے جن کی نظر سے ایک لڑکا لڑکی بن گیا تھا۔ جب یہ مضمون اُس نے عرض کیا تو حضرت ہنس پڑے اور فرمایا کہ اچھا نوکر ہو جاؤ گے۔ چنانچہ سررشتہ دارِ کمشنری دہلی کے نام سفارشی خط لکھ دیا۔ وہاں جا کر وہ نوکر ہو گیا۔ ۱۲

۳۰۴ ایک روز ارشاد ہوا کہ لکھنؤ کے سُنّی اور شیعوں میں ایک دفعہ باہم جنگ ہوئی تماشائیوں کا ہجوم ہوگیا۔ ایک جانب میواتیوں کا گروہ بھی کھڑا تھا۔ پوچھا یہ کیوں لڑتے ہیں۔ کوئی شخص بولا کہ میاں! لڑائی اس بات پر ہے کہ شیعہ چار یار کو گالیاں دیتے ہیں۔ میواتیوں نے تعجب سے کہا کہ چار یار کون ہیں؟ اُس نے کہا کہ یہی تو ہیں خواجہ معین الدین۔ سلار۔ مدار۔ چوکھا پیر۔ یہ بات سُن کر اُن کو تاب نہ رہی کہ جب ہمارے پیروں کو بُرا کہتے ہیں تو ہماری زندگی کس کام آئے گی۔ لٹھ لے کے پل پڑے اور گروہِ شیعہ کو بھگا دیا۔ ع

پائے کج را موزہ می بائیست کج

۳۰۵ ایک روز ارشاد ہوا کہ بمقام سونی پت آخوند عبدالغفور صاحب ہمارے پاس بیٹھے تھے کہ ثناء اللہ دہریہ آیا۔ ایک پتا درخت سے توڑ کر آخوند صاحب کے روبرو پیش کیا اور کہا کہ بھلا کوئی ایسا ہے کہ اس کو پھر جوڑ دے۔ وہ بولے کہ خدائے تعالےٰ کو یہ قدرت ہے اُس نے کہا کہ یہ تو خدا کے باپ سے بھی نہیں لگ سکتا۔ آخوند صاحب اُس کو گالیاں دینے لگے۔ میں نے کہا کہ صاحب آپ کیوں خفا ہوتے ہیں۔ خدائے تعالےٰ تو لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ ہے۔ نہ خدا کے باپ ہوگا نہ پتا لگائے گا۔ اس کو کہنے دیجیے ؎

بری ذاتش از تہمتِ ضد و جنس   غنی ملکش از طاعتِ جن و انس

۳۰۶ ایک روز ارشاد ہوا کہ بابری میں ایک شخص آیا جو اپنے تئیں خدا کہتا تھا۔ اُن دنوں جناب قبلہ میر اعظم علی شاہ صاحب بھی وہیں تھے۔ وہ یہ بات سن کر خفا ہونے لگے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت میں اُن کو سمجھا دوں گا۔ جب اُن سے ملاقات ہوئی تو حال پوچھا۔ کہا کہ میں خدا ہوں۔ ہم نے کہا کہ واہ حضرت، ہم تو مدت سے آپ کی تلاش میں تھے۔ گھر چھوڑا وطن چھوڑا آپ ہی کی جستجو میں جا بجا پھرتے رہے۔ آپ خود ہی تشریف لے آئے۔ بڑی مہربانی اور احسان فرمایا۔ پھر ہم نے اُن کے لیے کھانا منگایا۔ اتفاقاً اُس روز روکھی روٹیاں چنے کی تھیں اُن سے اچھی طرح کھائی نہ گئیں لقمہ گلے سے اُترنا دشوار تھا۔ کچھ ناراض سے ہونے لگے۔ ہم نے کہا ناراضی کی کیا وجہ ہے۔ خود ہی انصاف کیجیے کہ خدا تو آپ ٹھہرے جیسا ہم کو آپ نے دیا وہ سامنے لا رکھا۔ اگر آپ پلاؤ دیتے تو وہی نذر کیا جاتا۔

بعد اس کے ہم نے قرآن کی ایک آیت پڑھی اور اُن سے معنی دریافت کیے۔ کہا کہ میں تو ناخواندہ ہوں ہم نے کہا سبحان اللہ! آپ بھی عجیب خدا ہیں کہ خود ہی قرآن نازل کیا اُس کے معنی نہیں سمجھتے۔ تب وہ نادم ہوئے اور اپنے اُس قول سے توبہ کی۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ باڑی میں ہم نے سُنا کہ ایک ہندو فقیر بھگوان کے درشن کرا دیتا ہے۔ ہم بھی اُس کے پاس گئے اور درخواست کی۔ اُس نے آنکھیں بند کرا کے توجہ دینی شروع کی۔ تھوڑی دیر میں ایک صورت نظر آئی۔ پتیامبر پہنے مکٹ لگائے شام برن مکھ مرلی دھرے گویا بعینہ مہاراج سری کرشن جی موجود ہیں۔ اُس نے پوچھا کیا دیکھا؟ ہم نے بیان کیا۔ بولا کہ بس یہی بھگوان ہے۔ ہم نے اُس کو دھتکارا کہ ابے مسخرے! اس کے خالق تو خود ہم ہیں کیونکہ ہمارے خیال سے پیدا ہوا ہے۔ تو اپنا گرو بتا جس نے تجھ کو یہ تعلیم دی ہے۔ وہ ہم کو اپنے گرو کے پاس لے گیا۔ وہ کہنے لگے میاں صاحب! اس کو جانے بھی دو، یہ تو مورکھ ہے۔ جس کی جیسی سمجھ ہوتی ہے اُس کو ویسی ہی بات بتائی جاتی ہے۔ پھر ہماری اُن کی باتیں ہوئیں البتہ وہ آدمی سمجھدار اور گیانی تھے۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ بمقام کوتانہ ایک پیر جی تھے۔ اُن کے ایک مرید ظریف نے عرض کیا کہ حضرت میں نے رات خواب دیکھا ہے کہ آپ کا ہاتھ تو شہد سے بھرا ہوا ہے اور میرا نجاست سے آلودہ ہے۔ پیر جی بولے کہ بھائی بات یہ ہے کہ تم دنیا دار ہو اور ہیں فقیر۔ اُس نے کہا کہ حضرت آگے بھی تو سن لیجیے۔ آپ کا ہاتھ تو میں چاٹتا ہوں اور میرا ہاتھ آپ چاٹتے ہیں۔ یہ فقرہ سُن کر پیر جی نہایت ناراض ہوئے۔ میں نے اُن سے کہا صاحب! سچ تو کہتا ہے۔ دُنیا کے واسطے لوگوں کو مرید کرنا بے شک گوہ کھانا ہے اور دنیا داروں کے پانچ کمین ہوتے ہیں۔ دھوبی۔ نائی۔ سقا۔ بھنگی۔ اور پانچواں کمین پیرِ دنیا پرست ہے

هر کہ ہست از فقیہ و پیر و مرید ۔۔ و زبان آورانِ پاک نفس
چوں بدنیائے دوں فرود آمد ۔۔ بعسل دربماند ہمچو مگس

ایک روز ارشاد ہوا کہ دنیا دار بے چارے بھی بڑے مخمصہ میں گرفتار ہیں۔

جب کوئی مولوی آتا ہے تو دعوت و نذرانہ کے بعد یہ وعظ سناتا ہے کہ فاتحہ گناہِ کبیرہ ہے۔ علمار کی خدمت جنّت کی دستاویز ہے۔ اور جب کسی مشائخ سے پالا پڑتا ہے تو معمولی دعوت و نذر کے بعد یہ ہدایت ہوتی ہے کہ فاتحہ فرض ہے اور حقیقت میں ورثۃ الانبیار مشائخ کبار ہیں نہ علماءِ ظاہر۔ بزرگوں کی ارادت موجبِ نجات ہے۔ غرض دنیادار بے چارہ بھاڑے کا ٹٹو ہے۔ جس نے چاہا لاد لیا بلکہ اس سے بھی بدتر کیوں کہ اُسے کرایہ تو ملتا ہے اور یہاں اُلٹا گرہ سے کچھ دینا پڑتا ہے۔

ایک ۳۱۰ روز ارشاد ہوا کہ نشانہ پر تیر بار دینے والے تو بہت ہوتے ہیں مگر ایسے تیرانداز بہت کم ہیں جو یہ بھی جان لیں کہ تیر نے کتنا گھاؤ کیا۔ اسی طرح فقرا میں ایسے تو اکثر ہیں کہ طالب پر نظر ڈالیں مگر ایسے باخبر نادرات سے ہیں جو یہ بھی معلوم کرلیں کہ اُس نظر نے کس قدر اثر کیا۔

ایک ۳۱۱ روز ارشاد ہوا کہ شیخ کا فیض تو مرید و غیر مرید سب کو پہونچ سکتا ہے۔ اِلاّ مستحقِ خلافت مرید کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا مثلاً آدمی اپنی دولت جس کو چاہے لُٹائے مگر وراثت خاص اولاد ہی کو پہونچتی ہے۔ اس میں غیر کا دعویٰ اور استحقاق نہیں۔

ایک ۳۱۲ روز ارشاد ہوا کہ ایک شخص بیمار پڑا۔ نزع کی نوبت پہونچ گئی۔ یہاں تک کہ شہر میں مرنے کی خبر بھی اڑگئی۔ اتفاق سے لوٹ پیٹ کر بچ گیا۔ یار دوست مبارک باد کو آئے۔ اُس نے کہا کہ مقامِ تعزیت ہے نہ جائے تہنیت کیوں کہ موت کا ذائقہ بھی چکھ لیا۔ اور مرنا بدستور مرہ رہا۔

ایک ۳۱۳ روز ارشاد ہوا کہ اس زمانہ کے مشائخ نے پیری مریدی کو نہایت آسان کام سمجھ رکھا ہے اور مرید کو دِرَم ناخریدہ غلام خیال کرتے ہیں مگر ہمارے نزدیک تو سخت مشکل کام ہے۔ پیری تو درحقیقت مرید کا مرید بن جانا ہے کیوں کہ پیر کو لازم ہے کہ ہر وقت مرید کے احوال کا نگراں رہے۔ طے مقامات اور منازل پر متوجہ رہے اور یہ بات ممکن نہیں جب تک کہ پیر اپنے مزہ میں خلل نہ ڈالے اور اپنے حال سے باز نہ رہے۔ اگر حکمِ سرکاری ہو تو مجبوراً تعمیل کرنی ہی پڑتی ہے، ورنہ کس کو غرض ہے کہ

دوسرے کی بلا اپنے ذمہ لے۔ البتہ حصولِ دنیا کے لیے یہ کھیتی خوب ہے۔ بغیر درد دسر اور بلا تردد کے سال بہ سال اپنا سالانہ محاصل مُریدوں سے اُٹھایا اور الگ ہو بیٹھے۔

ایک ۳۱۴ روز ارشاد ہوا کہ اس زمانہ کے مشائخ میں تو انجن ہاری کا سا کمال بھی نہیں۔ اس جانور کا خاصہ ہے کہ مرنے سے کچھ پہلے ایک کیڑا لا کر اپنے مٹّی کے گھر میں بند کرلیتا ہے اور اُس پر ایسی توجّہ کرکے مرتا ہے کہ چالیس دن میں وہ کیڑا اپنے پر نکال کر انجن ہاری کی دستارِ خلافت کا مستحق اور سجّادہ نشینِ برحق ہو جاتا ہے۔

ایک ۳۱۵ روز ارشاد ہوا کہ لوگ کہتے ہیں کہ فلاں فقیر چائے نوشی کا سامان اور کھانے پینے کا اسباب بہت کچھ رکھتا ہے۔ ہم کو ایک نقل یاد آئی۔ ایک شخص نے گھر کے کار و بار اور مصارف سے تنگ ہو کر ارادہ کیا ترکِ دنیا کرے۔ ایک بیوی تھی اُس غریب کو تنہا چھوڑ کر نکل گیا اور کسی فقیر کا چیلا بنا۔ گلے میں کفنی ڈال ہاتھ میں کاسہ لے دربدر بھیک مانگنی اختیار کی۔ ایک دن پھرتا پھراتا اُس بستی میں آنکلا جہاں اب اُس کی بیوی رہتی تھی حسبِ عادت صدا کی "بھلا ہو مائی کچھ بھیجو فقیر کو" مائی نے اُس بے وفا کی آواز پہچان لی۔ جھانک کر دیکھا تو وہی ذاتِ شریف ہیں۔ خیر اُن کو چُٹکی بھر آٹا دیا اور کہا کہ شاہ جی گو ہمارا تمھارا میاں بیوی کا رشتہ تو قطع ہوگیا لیکن لاؤ تمھاری روٹی تو پکا دوں۔ کہا اچھا مگر آٹا دال نمک مرچ لوٹا کونڈا توا چمٹا کچھ لکڑیاں سب ضروری اشیا فقیر کی جھولی میں موجود ہیں۔ یہ سامان لو اور پکا دو۔ تب اُس عورت نے زور سے ایک دو ہتّڑ مارا اور کہا کہ بھڑوے سارا سامانِ دُنیا تو اپنی بغل میں مارے پھرتا ہے۔ کیا جورو ہی دنیا ہوتی ہے کہ مجھ غریب کو چھوڑ کر تارک الدنیا بن گیا۔

چیست دُنیا از خدا غافل بُدن نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

ایک ۳۱۶ روز کسی شخص نے اثنائے گفتگو میں کہا کہ حضور فلاں شخص جس قدر مال کثیر رکھتا ہے بخل میں بھی پرلے درجے کا خسیس بلکہ قارون سے بھی اول نمبر ہے۔ لیکن معلوم نہیں اُس روز ڈپٹی کمشنر کو چندہ میں اس قدر روپیہ کیوں دے دیا۔ آپ نے فرمایا کہ اکثر امرا اپنی نام آوری اور مطلب و فائدہ کے لیے ہزاروں روپیہ خرچ کرتے ہیں

لیکن خالصۃً للہ ایک کوڑی کے روادار نہیں ہوتے اس پر ہم کو ایک نقل یاد آئی ہے کہ کسی شخص نے شیطان کے نام کا چلّہ کیا۔ جب چالیس دن پورے ہوچکے تو شیطان آیا اور کہا کہ کیا چاہتا ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ میں نہایت مفلس ہوں میرے لیے کوئی بہبودی کی شکل نکال۔ شیطان نے کہا کہ یہ کیا بڑی بات ہے۔ میں ابھی گھوڑا بنتا ہوں تو فلاں امیر کے پاس لے جاکر بیچ ڈال۔ یہ بات کہہ کر ایک نہایت عمدہ اور بیش قیمت گھوڑے کی صورت بن گیا اُس نے امیر کو دکھایا۔ وہ دیکھتے ہی لٹو ہوگیا۔ اور جھٹ پانچ ہزار کو چکا، دام دے کر باندھ لیا چند روز کے بعد سائیس گھوڑے کو حسب عادت مل دل رہا تھا کہ یکایک گھوڑا دیوار کے سوراخ میں گھسنے لگا۔ اُس نے غل مچایا کہ دوڑو دوڑو گھوڑا چلا۔ جب دیکھا کہ گھوڑا جاتا ہی ہے تو اُس نے گھبرا کر دُم پکڑ لی۔ دُم تو اُس کے ہاتھ میں رہ گئی اور گھوڑا غائب۔ وہ متحیّر ہوا اور دم کو چادر میں لپیٹ، امیر کے روبرو لایا۔ سارا قصہ بیان کیا۔ امیر نے تعجّب کیا۔ چادر کھولی گئی تو دیکھا کہ بجائے دُم کے ایک سارنگی موجود ہے۔ جب امیر نے اُس کو ہاتھ میں اُٹھا کر دیکھا تو کیر خر تھا۔ غرض اس بیان سے یہ ہے کہ مال تو کھا گئے وارث وغیرہ اور دنیا دار بخیل کے ہاتھ میں کیر خر رہا یعنی بجز رنج و حسرت کے اُس کو کچھ حاصل نہیں کما قال اللہ تعالےٰ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ كَلَّا لَيُنبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ؕ۔[1]

ایک روز[۳۱۲] کسی شخص نے سات روپیہ بطور نذر راہ سال خدمت مبارک کیے اور رسید چاہی اُس وقت ارشاد ہوا کہ میاں رشوت کی رسید کا دنیا میں کہیں دستور بھی ہے یہ معاملہ تو خفیہ ہوا کرتا ہے جس طرح اہل کاران سرکاری کو سفارش وغیرہ کے لیے لوگ رشوت دیتے ہیں اسی طرح فقرا کو ہمت و دعا کی غرض سے نذر پیش کرتے ہیں۔ بے غرض تو کوئی کسی کو دیتا نہیں۔ وہ ظاہری رشوت ہے یہ باطنی پھر رسید کیسی؟۔

ایک روز[۳۱۳] جناب قبلہ پک داد پر جو پنڈولہ ران میں تھا مرہم لگا رہے تھے۔

---

[1] خرابی ہے ہر طعنہ دینے عیب چنتے کی جس نے سمیٹا مال اور گن گن رکھا خیال رکھتا ہے کہ اُس کا مال سدا رہے گا اُس کے ساتھ کوئی نہیں اُس کو پھینکتا ہے اُس کو روندھنے والے میں ۱۲۔

کسی شخص نے دریافت کیا کہ حضور یہ کس طرح ہوا۔ فرمایا کہ میاں کیا کہیں اس نے سنّتِ نبوی سے انحراف کیا تھا اس لیے یک داد کی سزا میں گرفتار ہوا اب میں اس کا منھ کالا کرتا ہوں کہ نہ ایسا کرتا نہ اس سزا کو پہونچتا۔

ایک[۳۱۹] روز ارشاد ہوا کہ قلندر صاحب کے عرس میں لکھنؤ کی ایک عورت آئی ہوئی تھی۔ ہمارے سامنے آکر کہنے لگی کہ حضور میں عقیمہ ہوں اور میرا خاوند دوسرا نکاح کرنا چاہتا ہے۔ اُس کے عزیز و قریب میرے خلاف ہیں۔ اگر اُس نے نکاح ثانی کرلیا تو میرا کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔ حسبِ اتفاق اُس وقت ایک قوّال یہ ٹونا گا رہا تھا ؎

ایسا ٹونا کردے ری ماں ایسا ٹونا کردے

ہم نے کہا بھائی یہ جو کچھ گا رہا ہے لکھتے جاؤ اور تعویذ بنا کے اس کو دے دو۔ اللہ مالک ہے ارشاد کے موافق تمام ٹونا لکھ کر تعویذ بنا دیا اور اُس کے حوالہ کیا۔ وہ لے کر چلتی ہوئی۔ چند روز کے بعد پھر خدمتِ اقدس میں آئی اور کچھ نذرانہ لائی۔ عرض کیا کہ حضرت آپ کی توجہ سے میرا خاوند ایسا مطیع ہوگیا ہے کہ بٹھاؤں تو بیٹھے اور اُٹھاؤں تو اُٹھے۔ خدا کا شکر ہے اور حضور کا احسان۔

ایک[۳۲۰] روز ارشاد ہوا کہ ایک روز مغرب کے وقت قلندر صاحب کی مسجد میں مجمع کثیر تھا۔ ہم بھی مسجد میں گئے۔ ایک شخص نے کہا کہ حضرت آپ کے سر پر[۱] یہ ٹوپی بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ ہم نے کہا کہ تم نے تو اس ٹوپی کی بہار دیکھی ہم بھی تو دیکھیں کہ آیا فی الحقیقت یہ اچھی ہے یا

---

[۱] سخاوت نے بھی آپ کے وجودِ باجود میں اس شان سے ظہور کیا تھا کہ باید و شاید۔ جو کچھ آپ کے پاس آتا تھا سب تقسیم فرمادیا کرتے تھے۔ اپنے پاس کبھی کچھ نہیں رکھتے تھے۔ علاوہ عطائے روزمرّہ کے جب کسی شخص کی خواہش کنایۃً یا صراحۃً کسی شے کی نسبت معلوم ہوتی معاً بطیبِ خاطر اُس کو عطا فرماتے۔ ہم نے اٹھارہ برس کی مدّت میں آپ کی توجہ بجز ذات پروردگار کے کبھی کسی چیز کی طرف نہیں دیکھی۔ دنیا و مافیہا آپ کی نظرِ بلند و ہمّت عالی کے سامنے سب ہیچ تھا ؎

دنیا ہمہ ہیچ ست و کارِ دنیا ہمہ ہیچ ۔۔۔ اے ہیچ برائے ہیچ در ہیچ مپیچ

میں چاہتا نہیں دُنیا میں عزّ و جاہِ بلند ۔۔۔ یہی کہ دونوں جہاں سے رہے نگاہِ بلند

تمام سود ہے سودا دُکانِ ہستی کا ۔۔۔ جو تجھ سے نفع ہو سب کو ضرر کسی کو نہ ہو

ہماری خاطر سے تم کہتے تھے سو فی الواقع تمہارے سر پر خوب زیب دیتی ہے۔ اب اس کو تم ہی اوڑھو۔ جناب قبلہ نے بے تکلف اپنے سر پر ایک رومال باندھ کر نماز ادا کی۔

۳۲۱ ایک روز ارشاد ہوا کہ خداوند کریم نے شیخ عطا محمد صاحب مخدوم زادہ پانی پتی کو پیری میں ایک فرزندِ دلبند عطا فرمایا۔ اتفاقاً وہ لڑکا ایک دن علیل ہو گیا شیخ صاحب موصوف ہمارے پاس اس لڑکے کو لائے اور کہا کہ حضرت اس کو جھاڑ دو۔ ہم نے کہا آؤ باپ بیٹے دونوں کو جھاڑ دیں۔ چنانچہ جناب قبلہ نے ایک ہاتھ شیخ صاحب کے سر پر پھیر کر یہ مصرعہ حافظ علیہ الرحمہ کا پڑھا ع

پیرے کہ دم ز عشق زند بس غنیمت است

اور دوسرا ہاتھ لڑکے کے سر پر پھیر کے یہ مصرعۂ ثانی فرمایا ؎

از شاخِ کہنہ میوۂ نو رس غنیمت است

آپ نے دم کیا حاضرین ہنسے اور لڑکا اُسی وقت اچھا ہو گیا۔ اس کے بعد بھی جب اُس لڑکے کو کچھ علالت کی شکایت ہوتی تو شیخ صاحب حضرت قبلہ کی خدمت عالی میں لاتے اور التجا کرتے کہ حضرت وہی دم کر دیجیے۔ آپ تبسم فرماتے اور اُسی طرح دم کر دیتے اور وہ لڑکا بفضلہ تعالےٰ تندرست ہو جاتا۔

۳۲۲ ایک روز ارشاد ہوا کہ سید وزیر علی صاحب ہمارے ہم سفر تھے اور اُن کو تقریر و مباحثہ کا بڑا شوق تھا۔ ہر ایک سے جھگڑنے لگتے۔ ایک روز آ کر فخریہ بیان کرنے لگے کہ میں نے فلاں شخص کو گفتگو میں بہت معقول کیا۔ ہم نے کہا کہ صاحب وہ تو معقول ہوا لیکن یہ بتائیے کہ تم کیا ہوئے۔ اس بات کے جواب میں بولے کہ اب میری توبہ ہے آئندہ کسی سے گفتگو نہ کروں گا۔ اُس دن سے مباحثہ و مناظرہ ترک کر دیا۔

۳۲۳ ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک دن ایک بڑھیا ہمارے پاس آئی اور کہنے لگی کہ حضرت مجھے کچھ پڑھنے کو ارشاد فرمائیے تاکہ میری مشکل آسان ہو۔ ہم نے کہا کہ ہر روز تین مرتبہ گیارہ دن تک دعائے سُریانی پڑھ لیا کر۔ اللہ تعالےٰ تیری مراد پوری کرے گا۔ گیارہ دن کے بعد وہ بڑھیا لٹھے کا ایک تھان اور سوا روپیہ نقد اور کچھ شیرینی لے کر آئی

اور کہا کہ حضور کی دعا کی برکت سے میری مشکل آسان ہوگئی۔ یہ نذرانہ ہے۔ جناب وقبلہ نے فرمایا کہ نذرانہ تو قبول مگر یہ تو بتاؤ کہ دعائے سریانی کو کون سے سُر سے پڑھا تھا جس سے تمھاری مشکل حل ہوئی۔ وہ قبولیت کا سُر ہم کو بھی بتادو۔ ہم ستّر برس سے پڑھتے ہیں مگر آج تک قبولیت کا سُر معلوم نہیں ہوا کہ مشکل آسان ہو۔ حاضرین ہنسے بڑھیا محجوب ہوئی اور نذرانہ رکھ کر چلی گئی۔

ایک روز ۳۲۴ ارشاد ہوا کہ ایک دن ایک مولوی صاحب اپنے بیٹے کو مارتے ہوئے ہمارے پاس لائے اور کہنے لگے کہ حضرت اس اُلّو کے پٹھے کو آپ سمجھائیں یہ پڑھتا نہیں ہم نے کہا مولوی صاحب آپ تشریف رکھیں اُلّو اور پٹھے دونوں کو ہم سمجھائے دیتے ہیں۔ حاضرین ہنسنے لگے مگر مولوی صاحب غصّہ کی حالت میں کچھ نہ سمجھے۔

ایک روز ۳۲۵ ارشاد ہوا کہ میاں بدرالدین مُہر کن کے چھوٹے بیٹے کہ دوسرے تیسرے مہینے ہمارے پاس آیا کرتے تھے۔ حسبِ معمول تشریف لائے۔ ہم نے دریافت فرمایا کہ آپ کہاں سے آئے اُنھوں نے کہا کہ میں بدرالدین مُہر کن کا بیٹا ہوں اور ہمیشہ آستانہ بوس ہوتا رہتا ہوں۔ دہلی سے آیا ہوں۔ ہم نے مزاج پُرسی کے بعد کہا کہ تمھارے بھائی سے ہماری بہت ملاقات ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ حضور سے تو سب کو نیاز حاصل ہے لیکن میں اکثر شرف اندوزِ خدمت ہوتا ہوں پھر ہم نے کہا کہ ہاں! تم تو حاضر ہوتے ہو، مگر تمھارے بھائی سے ہم سے بہت ملاقات ہے۔ پھر اُنھوں نے وہی جواب دیا کہ میں حضور کی خدمت میں دوسرے تیسرے مہینے حاضر ہوتا ہوں اور میرے بھائی تو کبھی کبھی حاضر ہوتے ہیں۔ پھر ہم نے کہا ہاں! تم بھی ہمارے پاس آیا کرتے ہو لیکن تمھارے بھائی سے ہماری بہت ملاقات ہے اور وہ اونچا سنتے ہیں۔ تب اُنھوں نے کہا کہ حضرت مجھ ہی کو کم سُنائی دیتا ہے۔ اُس وقت جناب وقبلہ نے فرمایا کہ واہ! کیا خوب! جب سے کیوں نہ کہا تھا۔ ہم کو ایک نقل یاد آئی۔ ایک صوفی چار ٹکے لے کر حال کھیلا کرتے تھے۔ ایک روز صاحبِ محفل نے چار ٹکے صوفی صاحب کے گھر بھجوا دیے اور اُن کو محفل میں بُلوایا۔ صوفی صاحب کو یہ خبر نہ تھی کہ چار ٹکے گھر پہونچ گئے ہیں۔ اب قوّال ہر چند اچھی غزلیں گاتے ہیں مگر صوفی صاحب کو حال

نہیں آتا۔ صاحب محفل سمجھ گئے کہ صوفی کو یہ اطلاع نہیں دی گئی کہ ٹکے گھر پہونچ گئے ہیں۔ چپکے سے اُٹھ کے کان میں کہہ دیا کہ آپ کا معمول گھر پہونچ گیا ہے۔ یہ کہنا تھا کہ صوفی جی کود پڑے اور کہنے لگے جب سے کیوں نہ کہا تھا۔ اگر یہی بات ہے کہ تم کو کم سُنائی دیتا ہے تو تم سے ہی زیادہ ملاقات ہے نہ تمھارے بھائی سے۔ اس وقت ہمیں ایک قطعہ بھی یاد آیا ؎

مجھے قتل کر کے وہ بھولا سا قاتل — قضارا مری لاش پر آن نکلا
سرہانے کھڑا ہو کے پیٹا کہ ہے ہے — یہ کُشتہ تو کچھ جان پہچان نکلا

ایک روز ارشاد ہوا کہ بدرالدین پانی پتی بساطی ہمیشہ ہمارے پاس آیا کرتے تھے اور یہ بھی ضرور کہتے کہ حضور میرے لیے دُعا فرمائیے۔ لیکن ہم اُن سے یہی کہہ دیتے کہ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ؕ میاں! آج کل ایسے ہی دن ہیں کہ ہماری دُعا برعکس اثر کرتی ہے ؎

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی — آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

ایک دن بعد نمازِ عشا میاں بدرالدین آئے اور کہنے لگے کہ حضرت آج تو ضرور دعا کیجیے۔ ہم نے کہا کہ بھائی آج کل ہماری دُعا الٹا اثر کرتی ہے کیوں کہ دن اچھے نہیں اور پھر یہ نقل بیان فرمائی کہ ایک مجذوب دہلی میں رہا کرتے تھے۔ اتفاقاً امساکِ باراں ہوا اور خلقِ خدا مجتمع ہو کر زار و نالاں قاضی صاحب کے پاس آئی۔ قاضی اُن کو ہمراہ لے کر بادشاہ سلامت کی خدمت میں پہونچے کہ نمازِ استسقا پڑھنی چاہیے۔ بادشاہ نے کہا بہت اچھا چنانچہ تین دن نماز پڑھی کچھ مؤثر نہ ہوئی۔ بادشاہ نے فرمایا کہ کسی فقیر کو میرے پاس لاؤ۔ لوگوں نے ایک مجذوب کو پیش کیا۔ بادشاہ نے اُن سے دُعا کی التجا کی۔ مجذوب نے لنگوٹ کھول کے دیا کہ یہ دھولاؤ اور سوکھنے کو ڈال دو۔ تھوڑی دیر کے بعد بڑے زور و شور سے بارش ہونے لگی۔ بادشاہ نے پوچھا یہ کیا بات ہے؟ مجذوب نے کہا کہ آج کل اللہ میاں سے ہمارا بگاڑ ہو رہا ہے۔ ہم جو بات چاہتے ہیں وہ اُس کے خلاف کرتے ہیں۔ اب ہمارا لنگوٹ سوکھنے نہیں دیں گے۔ جب خوب مینھ برس گیا لوگوں نے اُس لنگوٹ کو آگ پر سکھا دیا۔

مینھ تھم گیا۔ پس میاں بدرالدین ان دنوں میں ایسا ہی معاملہ ہو رہا ہے۔ ہماری دُعا کا اثر خلاف ہوتا ہے۔ اُس نے کہا کہ حضرت اُلٹا اثر ہو یا سیدھا آپ دُعا کیجیے۔ ہم نے کہا کہ اچھا آج دعا کریں گے۔ تم جانو۔ ہنوز جلسہ برخاست نہیں ہوا تھا کہ ایک آدمی دوڑا ہوا آیا اور یہ خبر لایا کہ میاں بدرالدین تمھاری بیوی کنوئیں میں گر پڑی۔ حضرت نے فرمایا لو ابھی تو ہم نے دعا بھی نہیں مانگی، وعدہ ہی کیا ہے۔ میاں بدرالدین یہ سنتے ہی دوڑے اتنے میں تھانہ دار آپہونچا۔ اُن کی بیوی کو کنوئیں میں سے نکلوایا اور پوچھا کہ تجھ کو کس نے گرایا تھا؟ اُس نے میاں بدرالدین کا نام لیا۔ اب وہ غریب ناکردہ گناہ کرنال کی عدالت میں حاضر کیے گئے لیکن حضرت قبلہ نے چلتے وقت یہ فرما دیا تھا کہ مقدمہ کی پیشی کے وقت ہمارا تصوّر کرنا۔ جب مقدمہ پیش ہوا۔ انگریز نے عورت کے اظہار لیے۔ اُس نے تین چار دفعہ یہی کہا کہ بدرالدین نے گرایا۔ اس وقت میاں بدرالدین کو حضرت کا ارشاد یاد آیا۔ تصوّر کرنا شروع کیا۔ عورت خود بخود کہنے لگی کہ صاحب ایک اور بڑا ظلم مجھ پر کر رکھا ہے۔ انگریز نے پوچھا وہ کیا؟ کہا میرے سر پر تین ریچھ بٹھا رکھے ہیں۔ انگریز نے دریافت کیا کہ کہاں ہیں؟ کہا یہ دیکھو بالوں میں پھرتے ہیں۔ حسبِ اتّفاق میاں اللہ بندے صاحب نمبردار حضرت کے خادم بھی وہیں کچہری میں موجود تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ صاحب یہ تو پاگل ہے۔ غرض میاں بدرالدین رہا ہو گئے۔ اُن کی بیوی جب ہوش میں آئی تو شوہر سے مخاطب ہوئی کہ ارے کم بخت! مجھ کو کچہری میں کیوں لایا ہے۔ اُس نے کہا کہ ظالم تو لائی ہے یا میں! آخر پانی پت آئے اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہو میاں بدرالدین! ہم تمھارے لیے دعا کریں؟ کہا کہ حضرت بس میں دُعا سے باز آیا مجھے بغیر دعا کے ہی پانی پت میں رہنے دیجیے۔ آپ نے فرمایا تمھاری خوشی۔ ہم نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا لیکن تم ہی نے نہ مانا تھا۔

۳۲۷
ایک روز ارشاد ہوا کہ ایک دن کسی شخص نے تنگیٔ رزق کی شکایت کی اُس پر ہم کو ایک نقل یاد آئی۔ ایک بڑا تاجر تھا۔ اُس نے جمعہ کے دن وعظ میں یہ آیت سُنی فِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ ۝ اُس کے دل میں شبہ پیدا ہوا کہ ہم دور دراز

ملکوں کا سفر طے کر کے قابلِ پسند اشیاء لاتے ہیں، تب اُن سے نفع حاصل ہوتا ہے اور ہمارا پیٹ بھرتا ہے اگر اسباب خراب و ناکارہ ہو تو بھلا کون مول لے گا اور کیوں کر ہم کو نفع ہوگا۔ یہ سوچ کر بہ ارادۂ امتحان اُس نے سب قسم کی اشیاء تجارتی کو چھوڑ بے ناکہ کی سوئیاں ہزار ہا روپیہ کی بھرلیں کہ دیکھوں اس بے کار چیز کو کون خریدتا ہے۔ خدا کی قدرت چند مدت کے بعد ایک سوداگر بے ناکہ کی سوئیوں کا گاہک آیا۔ تمام دُکانوں پر دریافت کیا تو یہ چیز کہیں نہ نکلی۔ لوگوں نے اس تاجر کا پتہ بتا دیا۔ وہاں پہونچا اور بڑی خواہش ظاہر کی۔ اُس کے حسبِ دل خواہ دام دے دیے اور تمام مال خرید لیا۔ جب سودا بک چکا اور معاملہ ہو گیا تو تاجر بہت متعجب ہوا کہ الٰہی یہ بے وقوف اس نکمّی چیز کو کہاں بیچے گا اور کیا نفع اُٹھائے گا یا کس کام میں لائے گا۔ یہ خیال کر کے اُس کے ہمراہ ہو لیا۔ وہ مال اُٹھوا کر لے گیا اور کشتی میں لاد کر حکم دیا کہ جاؤ اس کو دریا میں ڈال دو۔ اُس وقت اُس نے سوال کیا کہ صاحب تم کون ہو؟ کیوں تم نے یہ سوئیاں خریدیں؟ اور کس لیے دریا میں پھینکنے کا حکم دیا۔ اس نے جواب دیا کہ میں فرشتہ ہوں۔ اللہ تعالےٰ نے تیرے رزق پر متعین کیا ہے جو تیرے لیے مقدر تھا تجھ کو پہونچا دیا۔ یہ تیری بے وقوفی تھی جو تو نے خیال کیا کہ میری کوشش ہی سے رزق ملتا ہے۔ اتنا کہہ کر غائب ہو گیا۔ غرض یہ ہے کہ جو کچھ تمھارے لیے مقدر ہے وہ کسی نہ کسی طرح تم کو بالضرور ملے گا۔ رنج کرو یا خوشی۔ رزقِ مقسوم میں کمی بیشی ممکن نہیں ؎

آں چہ نصیب ست بہم می رسد ورنہ ستانی بہ ستم می رسد

ایک روز ارشاد ہوا کہ اگر ورد و وظائف پر روزی موقوف ہوتی تو دنیا میں مُلّاؤں کے برابر کوئی دولت مند نہ ہوتا بلکہ وظیفہ تو اس معاملہ میں اور اُلٹا اثر کرتا ہے۔ کیوں کہ دُنیا ایک میل کچیل ہے اور نامِ خدا صابون۔ بھلا صابون سے میل کیوں کر بڑھ سکتا ہے۔ تم نے کسی وظیفہ خواں کے گھر ہاتھی گھوڑے بندھے نہ دیکھے ہوں گے۔ بلکہ وظیفہ پڑھنے والے تو اکثر محتاج نظر آتے ہیں۔ خدا کا نام تو صرف اس لیے ہے کہ اُس کی برکت سے دُنیا کی محبت دل سے دور ہو جائے نہ اس لیے کہ آدمی دنیا میں زیادہ آلودہ ہو۔

کسی صاحب نے کشائش رزق کے لیے وظیفہ پوچھا تھا اُس پر یہ ارشاد فرمایا تھا۔ یہ باتیں سُن کر اُس شخص نے پھر اصرار کیا تو فرمایا کہ خیر یَا بَاسِطُ اَلْبُسُطْ فِیْ رِزْقِیْ پڑھا کر لیکن مسجد سے باہر کہ خدا کے گھر میں دنیا طلبی کا کیا کام!۔

۳۲۹
ایک روز ارشاد ہوا کہ ہم کو ایک نقل یاد آئی ہے۔ ایک امیر کسی کھترانی پر عاشق ہوا ہر چند کوشش کی مگر کسی طور سے حصولِ مطلب کی راہ نہ پائی۔ آخر کچھ مدت کے بعد اُس کو پتہ چلا کہ اُس عورت کا شوہر بھینس کا بڑا شوق رکھتا ہے۔ اُس عاشق نے ایک بیش قیمت اور نہایت خوب صورت بھینس عمدہ نسل کی خریدی اور گنواروں کی صورت بنا کر اُس کھتری کے سامنے سے نکلا۔ وہ بھینس کو دیکھتے ہی لوٹ ہو گیا۔ پوچھا کہ چودھری بھینس بیچو گے؟ وہ بولا، لالہ جی! بھینس کیا بیچوں ایک بڑا بھاری روگ لگ گیا ہے۔ اگر کوئی بھلا مانس میرا علاج کر دے تو میں بھینس یوں ہی اُس کو نذر کر دوں۔ لالہ نے پوچھا کہ بتاؤ تو سہی ایسی کیا بیماری ہے؟ اُس نے کہا کہ میری شادی ہو گئی ہے لیکن مجھ کو عورت کی صحبت کا ڈھب یاد نہیں۔ اِس شرمندگی کے مارے جان سے تنگ ہوں۔ جو کوئی مجھ کو یہ کام سکھا دے تو میں اُس کا چیلا ہو جاؤں اور یہ بھینس بھی اُس کو دے دوں۔ یہ بات سُن کر لالہ نے تامل کیا اور اپنی بیوی کے پاس دوڑے ہوئے گئے۔ کہا کہ ایک بے وقوف سا آدمی ہے اور ایک بھینس نہایت عمدہ اُس کے پاس ہے۔ اگر تم اُس کو ذرا یہ بات سکھا دو تو کیا بگڑے گا بھینس ہم کو مفت ہاتھ لگے گی۔ وہ بھی راضی ہو گئی۔ بھینس والے کو اپنے مکان میں ٹھہرا لیا اور رات کو لالہ کی جورو نے اپنے پاس سُلایا۔ مگر وہ چپ چاپ پڑا رہا صبح کو لالہ نے پوچھا کہو جی اب تو تم نے ترکیب سیکھ لی ہو گی؟ بولا نہیں تو لالہ جی، مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں ہوا۔ وہ اپنے گھر میں بہت خفا ہوا اور کہا اس کو خوب سکھا دے تاکہ بھینس دے کر اپنا رستہ لے۔ پھر تو اُس نے خوب دل کھول کر کوک شاشتر کا سبق پڑھایا۔ لالہ نے اُس سے دریافت کیا تو اُس نے کہا کہ ہاں اگر ایک مہینے تک اسی طرح مجھ کو سکھایا جائے تو البتہ سیکھ جاؤں گا۔ ورنہ آج کا آموختہ کل کا ہے کو یاد رہے گا۔ لالہ نے سوچا کہ یہ تو کوئی بڑا ہی مورکھ ہے۔ اگر لوگوں کو یہ بات معلوم ہوئی تو بڑی روسیاہی ہو گی۔ اُس سے کہا کہ جاؤ میاں صاحب کہیں اور جا کے سیکھو وہ امیر اپنی بھینس کا رسّا پکڑ چلتا ہوا اِسی طور سے

شیطان دنیا داروں کو دنیا کی بھینس دکھا کر طمعِ دنیا میں پھانس لیتا ہے۔ وہ اپنا ننگ و ناموس بھی کھوتے ہیں اور دنیا بھی ہاتھ نہیں آتی۔

ایک[۳۳۰] روز ارشاد ہوا کہ ایک دن ایک منشی صاحب مختار کار نواب مڑہل رئیس کرنال، ہمارے پاس آئے اور بڑی شد و مد کے ساتھ خودستائی کرنے لگے کہ حضرت دیکھیے میں نے نواب صاحب کے کیا کیا کام انجام دیے۔ نسب نامہ درست کرایا جاگیر مقرر ہوئی۔ سرکار سے مراتب پائے یہ میری ہی خوبیِ تدبیر و حُسنِ خدمت کا نتیجہ ہے۔ ہم نے کہا کہ منشی صاحب ہم کو ایک نقل یاد آئی۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ شیطان کو طلب فرمائے گا اور بعد حساب وکتاب ستر ہزار فرشتوں کو حکم دے گا کہ اس لعین کو زنجیروں سے جکڑ کے کشاں کشاں دوزخ میں لے جاؤ وہ یہ سن کر میدانِ قیامت میں گر پڑے گا ہرچند فرشتے زور کریں گے وہ اپنی جگہ سے جنبش نہ کرے گا پھر اور ستر ہزار فرشتوں کو حکم ہوگا وہ بھی مل کر طاقت آزمائیں گے وہ ہلے گا بھی نہیں۔ پھر اور ستر ہزار فرشتوں کو حکم ہوگا وہ سب مل کر زور لگائیں گے مگر شیطان کو حرکت نہ ہوگی۔ غرض چار بار ستر ستر ہزار فرشتے زیادہ ہوں گے اور جنبش بھی نہ کر سکیں گے اُس وقت اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اے ملائکہ یہ ملعون تم سے نہیں ہلے گا اس کی گردن میں طوقِ لعنت کا بارِ گراں ہے یہ اُسی کی طاقت ہے کہ اُٹھائے پھرتا ہے تم سے وہ جنبش بھی نہ کر سکا۔ یہ ہمارا عاشقِ صادق ہے جس وقت ہم حکم دیں گے خود بخود دوزخ میں جا گرے گا تم اس کو چھوڑ دو۔ سو فی الحقیقت یہ آپ ہی کے دم قدم سے ہوا۔ دوسرے کا حوصلہ نہ تھا۔ منشی صاحب چپ رہ گئے اور نہایت نادم و خجل ہوئے اور حاضرینِ مجلس ہنسنے لگے۔ ع

ثنائے خود بخود گفتن نہ زیبد

ایک[۳۳۱] روز ارشاد ہوا کہ آج ایک نقل[۱] ہمیں یاد آئی ہے کہ ابوبکر واسطی جو بڑے

---

[۱] حکیم محمد حسین پانی پتی سے کسی صاحب نے استفسار کیا کہ کبھی آپ نے جناب مولوی غوث علی شاہ صاحب سے کوئی کشف یا کرامت بھی دیکھی۔ اتنی مدت سے آپ اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے تو کبھی خیال نہیں کیا۔ اب جو حاضرِ خدمت ہوئے تو یہ بات یاد آ گئی۔ جناب وقبلہ نے انھیں اپنے پاس بٹھایا۔ مزاج پرسی کے بعد اور حاضرین کو مخاطب کر کے یہ نقل زبانِ فیض ترجمان سے ارشاد فرمائی تھی ۱۲۔

عالم تھے حضرت جنیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سال بھر تک ساکت وخاموش وہاں کی صحبت کا رنگ ڈھنگ دیکھتے رہے۔ جب کوئی کشف وکرامت حضرت جنیدؒ کی جو پابند شرع تھے نہ دیکھی تو دل برداشتہ ہو کر حضرت سے رخصت چاہی۔ آپ نے اُن کا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا کہ بھلا مولوی صاحب آپ برس دن تک یہاں رہے نہ اپنی کہی نہ ہماری سنی، یہ بات ہے تو کیا ہے؟ اُس وقت موقع پاکر ابوبکر واسطی نے عرض کیا کہ حقیقت میں بات تو یہ ہے کہ میں بیعت کے ارادہ سے حاضر ہوا تھا۔ سال بھر رہ کر دیکھا کیا مگر آپ سے کوئی کشف وکرامت ظاہر نہیں ہوئی۔ وہی عالموں کا سا طور وطریق ہے۔ نماز روزہ تہجد واشراق، چاشت درس تدریس۔ جب آپ میں اور عالموں سے کوئی فوقیت نہیں پائی ناچار اجازت چاہی۔ حضرت نے یہ سُن کر فرمایا کہ بھلا اس سال بھر میں جنید سے کوئی امر خلاف سنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بھی سرزد ہوا؟ ابوبکر نے جواب دیا کہ نہیں۔ اُس وقت حضرت نے اُن کا ہاتھ جھٹک کر فرمایا کہ جا جنید کی یہی کرامت ہے۔ ہاتھ جھٹک کر یہ کہنا تھا کہ ابوبکر نے کپڑے پھاڑ کر جنگل کی راہ لی۔ بعد چھ مہینے کے پھر آئے، تو حضرت نے مثل سابق وہی ارشاد فرمایا۔ جواب پاکر پھر ہاتھ جھٹکا ابوبکر نے نعرہ مارا اور بیابان کا راستہ لیا۔ غرض تیسری دفعہ جب چھ مہینے کے بعد آئے تو حضرت نے ہاتھ پکڑ کے وہی ارشاد کیا، تو ابوبکر نے کہا کہ میں آپ میں کوئی امر خلاف سنت رسول اللہ نہیں پاتا مگر یہ[1]۔ یہ کہنا تھا کہ حضرت نے چھاتی سے لگالیا اور حاضر جوابی سے خوش ہو کر خرقۂ خلافت عطا فرما کر رخصت کیا۔ حکیم صاحب کہتے ہیں کہ میں اس نقل کو سُن کر مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا اور بہت منفعل ہوا۔ پھر بھول کر بھی ایسا خیال دل میں نہیں لایا۔ بعد وصالِ حضرت یہ بات بھی زبان پر آئی ورنہ پہلے خاموش رہا۔

---

[1] یعنے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کسی کا ہاتھ جھٹک کر چھ بار کب خراب کیا تھا یہ بات تو خلاف سنت پائی ۱۲۔

باب ششم

کیفیّت اوقاتِ شریف

زمانۂ قیام پانی پت میں جناب و قبلہ کا ابتدا میں یہ معمول تھا کہ رات کے دو بجے بیدار ہوکر اوّل وضو پھر تیمم کرتے اور اکثر فرماتے کہ یہ تیمم اس لیے ہے کہ خاکساری پسندِ بارگاہ کبریائی ہے پھر نمازِ تہجد ادا فرماکر فجر تک اورادِ معمولی پڑھتے۔ نمازِ فجر جماعت کے ساتھ مبارز خاں صاحب کی مسجد میں پڑھ کر قلندر صاحب کے روضہ میں تشریف لاتے۔ نمازِ اشراق و چاشت وہاں ادا فرماکر حُجرۂ مبارک میں جلوہ افروز ہوتے۔ بارہ بجے تک خدّام اور طالبین کا مجمع رہتا۔ خطوط کے جواب تحریر ہوتے۔ ہر خاص و عام صادر و وارد جو حاضر ہوتا اُس کا مدّعا استفسار فرماتے اور نہایت مہربانی و شفقت کے ساتھ جواب باصواب دیتے گویا کہ خُلقِ عظیم و فیضِ عمیم کا دریا جوش زن تھا۔ جو تشنہ کام آتا سیراب و شادکام جاتا۔ نقول و حکایات لطائف و نکات اشعار و امثال مطابق ہر موقع اور مناسب ہر حال ارشاد ہوتے۔ پھر درِ حجرہ بند فرماکر دو بجے تک آرام کرتے۔ نمازِ ظہر مسجدِ مذکور میں جماعت کے ساتھ پڑھ کر پھر حجرہ کو بند فرمالیتے۔ وقت عصر تک تلاوتِ قرآن مجید میں مصروف رہتے۔ پھر عصر کی نماز کے لیے مسجد مسطور میں تشریف لاتے۔ بعد انفراغ نمازِ عصر، مغرب کے وقت تک حُجرہ کے اندر دربارِ عام ہوتا۔ لطائف و ظرائف اور معارف و حقائق زیبِ بیان رہتے۔ پھر مغرب کا وضو اُس حوض میں کرتے جو حجرہ کے سامنے تھا۔ قلندر صاحب کی مسجد میں جماعتِ کثیر کے ساتھ نماز ادا فرماتے۔ قلندر صاحب کے روضہ میں تا بہ عشا نوافل پڑھتے۔ بعد نمازِ عشا نو بجے کے قریب حُجرہ میں تشریف فرما ہوتے۔ تناولِ طعام کے بعد طالبین کو بعیت سے مشرّف فرماتے۔ اس کے بعد پھر مجمع شروع ہوتا۔ موسمِ گرما

میں بارہ بجے تک اور ایام سرما میں دس بجے تک مشتاقانِ دیدارِ پُرانوار و تشنگانِ کلامِ فیض نظام حاضر رہتے۔ پھر سب کو رخصت کرکے استراحت فرماتے۔ اوائل میں آپ کا یہ معمول رہا کہ بعد ہر نماز کے سورہ ہائے مسنون اور بعد فرض نماز مغرب سجدہ میں نود و نہ ۹۹ نام باری تعالےٰ پڑھا کرتے۔ سجدہ سے اُٹھ کر سورۂ حٰم سجدہ اور باقی نماز و نوافل وادابین وغیرہ تا نماز عشا پڑھتے رہتے۔ کبھی کبھی نماز مغرب کے بعد کچھ نوافل پڑھ کر سورۂ یٰسٓ، سورۂ دخان، سورۂ محمدؐ، سورۂ فتح، سورۂ مزمل، سورۂ مدثر اور کبھی آخر کی منزل یعنی سورۂ ق سے والناس تک تا بعد عشا پڑھا کرتے اور ہر روز مختلف اوقات میں قصیدۂ بردہ، حزب البحر، سورۂ یوسف، درود مستغاث، درود کبریت احمر، مناجات ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، مناجات حضرت علی کرم اللہ وجہہ، مناجات حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ پڑھتے رہتے۔ پھر ایک عرصہ کے بعد ان اوراد کے لیے شب جمعہ مقرر ہوئی۔ پھر مہینے میں ایک بار پڑھنے لگے اور جب وصال کا زمانہ قریب آیا تو نماز کے سوائے کچھ نہیں پڑھتے تھے۔ ابتدا میں نماز جمعہ جامع مسجد میں اور نماز عیدین عیدگاہ میں ادا کرتے تھے۔ لیکن کچھ مدت کے بعد نماز جمعہ و عیدین مبارز خاں صاحب کی مسجد میں اور بعض اوقات قلندر صاحب کی مسجد میں پڑھتے تھے۔ جمعرات کے دن قبل از عصر حضرت شاہ ولایت شمس الدین صاحب ترک پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر اور ہر مہینے کی پہلی تاریخ امام بدرالدین صاحبؒ کے مزار پر تشریف لے جاتے دس برس تک یہی وتیرہ رہا۔ پھر چار برس یوں گذرے کہ ہر روز علی الصباح قلندر صاحب کے روضہ میں اور ہر چاند کی پہلی کو حضرت شاہ ولایت صاحب کے مزار پر اور سال میں ایک بار امام صاحب کے مزار پر تشریف لے جاتے۔ ایک سال یہ دستور رہا کہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ قلندر صاحب کے مزار پر جاتے۔ مابین مغرب و عشا قلندر صاحب کی مسجد میں نوافل ادا فرماتے اور حجرہ میں آکر اہلِ ارادت کو بیعت سے مشرف کرتے۔ انیسویں سال میں سب جگہ کا آنا جانا ترک ہو گیا تھا۔

سر برہنہ نیستم دارم کلاہ چار ترک ترکِ دنیا، ترکِ عقبیٰ، ترکِ مولیٰ، ترکِ ترک

ظاہری توجہ یعنی مریدوں کو سامنے بٹھا کر اور آنکھیں بند کرکے متوجہ ہونا جیسا کہ حضرات مشائخ کا معمول ہے کبھی آپ کا دستور نہ تھا۔ بلکہ یہ باطن توجہ ہوتی تھی اور بظاہر ہر مجلس میں بذلہ ہائے

شیریں ونکات دل نشیں وامثالِ رنگیں کا ایراد واشعار فارسی وعربی و ہندی وسنسکرت کی تضمین ہر کلام وگفتگو میں نہایت برجستہ و پُر مذاق ہوتی تھی۔ اکثر اوقات مجالس خاص میں حقائق الٰہی ومعارفِ ربانی اور دقائق معانی کا بیان بطون پاک کے سرچشمہ سے اس طرح جوش مارتا تھا کہ گویا بحر زخّار و دریائے ناپیدا کنار موج در موج چلا آتا ہے یا عالم غیب کا ابر گوہر بار فضا رشہود پر رُشحاتِ فیض برساتا ہے۔ اُس وقت مستمعانِ باخبر تو درکنار در و دیوار بھی وجد میں آجاتے تھے۔ وہ بزمِ اُنس اور وہ صحبتِ پاک بوستانِ ہمیشہ بہار تھی۔ جس میں اندوہ و ملال کی خزاں کا اثر کبھی نہیں دیکھا گیا۔ ہمیشہ مسرّت و خورسندی کی نسیم اور بے خوفی و بے غمی کی صبا اُس چمن میں چلتی رہی۔ چناں چہ اقوالِ گرامی اور ملفوظاتِ سامی سے یہ بات ظاہر ہے ؎

چوں کہ گُل رفت وگلستاں شد خراب   بوئے گُل را از کہ جوئیم از گلاب

شمائل وخصائل مبارک

جناب وقبلہ کا حلیۂ مبارک یہ ہے:۔ قوی الجثّہ، بلند بالا، متناسب الاعضا، جسم نہ فربہ نہ لاغر، رنگ سرخ وسفید، سر بزرگ، پیشانی وابرو کشادہ، بینی بلند، چشم متوسط، ریش سفید ومنوّر وشگفتہ۔ دندان مبارک تابندہ ومتفرق، سینہ فراخ، کفِ دست پر گوشت، انگشت دراز، جلد زانو و ساقِ پا بہ سبب مجاہدہ وکثرتِ نوافل سخت وسیاہی مائل، رفتار مردانہ وبے تکلف، آواز پر شوکت نشست وبرخاست دلاویز۔ ہر مجلس ومجمع میں وجیہ وسربلند ورفیع الشان معلوم ہوتے تھے۔ ہر جمعہ کو حجامت کُل سر کی ہوتی تھی۔ فرقِ مبارک پر ایک نشانِ شگاف بہ شکل چلیپا بہ قدر ایک انگشت تھا۔ خط محتاج اصلاح نہ تھا۔ البتہ مونچھیں مقراض سے پست کرا دیتے تھے۔ سینہ اور شکم کے بال بھی صاف کیے جاتے تھے۔ ایک بار کسی شخص نے وجہ پوچھی تھی تو آپ نے بطورِ ظرافت فرمایا کہ ہاں فقیر کا سینہ جھاڑ جھنکاڑ سے پاک صاف چاہیے۔ بصارت وسماعت وذہن وحافظہ نہایت تیز اور نیز تمام حواسِ ظاہری وباطنی قوی تھے۔ فصاحت وبلاغت، متانت ورزانت، لطافت وظرافت تو گویا آپ کی ذات پر ختم تھی۔ کلام وگفتگو نہایت شگفتہ روئی اور خندہ پیشانی سے

فرماتے اور ہمیشہ آثارِ فرحت و انبساط چہرۂ مبارک سے نمایاں رہتے۔ جو ملول و مغموم مجلسِ شریف میں حاضر ہوتا، سب رنج و غم بھول جاتا۔ بیشتر یہ طریقہ تھا کہ حضّارِ مجلس کے خواطر و اوہام و مدعا و مرام کا جواب با صواب نقول و حکایات کے پردے اور تلمیح و کنایہ کے پیرایہ میں ادا فرماتے تھے۔ ہر قصہ مغزِ معانی کا حصہ، ہر افسانہ اسرار کا خزانہ، ہر کہانی رموزِ باطن کی نشانی ہوتی تھی ؎

بلائے جاں ہے غالبؔ اُس کی ہر بات عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

تعظیم و تکریمِ ظاہری ہرگز پسندِ خاطر نہ تھی بلکہ سادگی و بے تکلفی موجبِ رضامندی اور موافقِ طبعِ مبارک تھی۔ اپنے طالبین و خدّام کو دوست و احباب کے سوا کسی اور خطاب سے یاد نہ فرماتے۔ دعوی و طامات کی بات کبھی زبانِ مبارک سے نہیں سنی گئی۔ اگرچہ فوائدِ ظاہر و باطن کے جویا اور ہمت و دعا کے طالب بے شمار آتے اور اُس بحرِ کرم سے سیراب و شادکام ہوتے، لیکن آپ کسی معاملہ کو اپنی طرف نسبت نہ کرتے، بلکہ جملہ امور کو فاعلِ حقیقی کی مشیّت و مرضی پر حوالہ فرماتے۔ تمام عمر توکل و قناعت کے میدان میں مردانہ وار بسر کی۔ جو کچھ فتوحاتِ غیبی سے آیا کھایا کھلایا ایثارِ فقرا اور بذلِ درویشاں و صرفِ مہماناں کیا۔ چناں چہ ایک روز فرمایا کہ دنیا میں تین چیزیں مرغوب و محبوب مشہور ہیں ذَن۔ زَر۔ زَمین۔ سو ہم نے زن تو اختیار نہ کی۔ زمین خدا تعالےٰ نے ہم کو دی نہیں۔ زر البتہ ادھر آیا اُدھر گیا مالِ مفت دلِ بے رحم، نہ کچھ آگے نہ کچھ پیچھے۔ ہم کس کے لیے رکھیں۔ یہی بہتر ہے کہ بقدرِ خواہش کھایا پیا اور ہاتھ جھاڑ کے الگ ہو گئے۔ لباسِ رنگین کبھی پسندِ خاطر نہ ہوا۔ ہمیشہ سفید پوشی سے رغبت رہی اور جامۂ سفید کو ہر قسم کی پوشاک سے بہتر خیال کیا۔ چناں چہ بارہا فرماتے ؎

در فقر اگند مرد باید بود بر مخنّث سلاحِ جنگ چہ سود

خلقِ عظیم و فیضِ عمیم بذل و عطا جود و سخا مہر و وفا احسان و مروّت، شجاعت و فتوت، علوئے ہمت، غرض جملہ صفاتِ کاملہ میں یگانہ اور کمالِ فضائل میں امامِ زمانہ تھے ؎

كَالزَّهْرِ فِي طَرَفٍ وَالْبَدْرِ فِي شَرَفٍ وَالْبَحْرِ فِي كَرَمٍ وَالدَّهْرِ فِي هِمَمٍ

حلم و وقار میں کوہ گرانبار تھے۔ کسی کی عقیدت و ارادت یا شوخی و بے ادبی سے مزاج مبارک میں ذرہ تغیّر واقع نہ ہوتا تھا۔ مدح و ذم دونوں آپ کی ہمت عالی کے سامنے ہم وزن و ہم پلّہ تھیں بلکہ نادانوں کی خیرہ چشمی و گستاخی کے عوض احسانات گوناگوں مبذول فرماتے۔ ع

دریائے فراواں نہ شود تیرہ بہ سنگ

مہماں نوازی اور مسافر پروری میں تو آپ کو خلیلِ وقت کہنا کچھ مبالغہ نہیں۔ مہمانوں کی خاطر اس قدر عزیز تھی کہ پرسشِ احوال سے پہلے آب و طعام اور آسائش و آرام کا انتظام، خدّام کو سپرد ہوتا تھا۔ کوئی دن ایسا نہ تھا کہ امصار و دیار سے مہمان آستانۂ علیا کی زیارت کے واسطے وارد نہ ہوتے ہوں ؂

چو کعبہ قبلہ حاجت شد از دیارِ بعید روند خلق بہ دیدارش از بسے فرسنگ

فتوّت و مروّت، صفائیٔ معاملت اور وفائے عہد آپ کا شیوۂ خاص تھا جس شخص کی رعایت و کفالت کسی امر میں اپنے ذمۂ ہمت پر قبول فرمائی۔ اُس کو آخر عمر تک نباہا۔ یہاں تک کہ جن اشخاص سے کسی زمانہ میں یک گونہ ربط و واسطہ ملاقات کا رہا تھا اُن کی اولاد و متوسلین کے حال پر شفقتِ بزرگانہ و الطافِ مربیانہ ہمیشہ فرماتے رہے۔ بااین ہمہ دُنیا سے بے تعلق اور اہل دنیا سے برکنار تھے ؂

اے بر خلا و ملا خوئے تو ہنگامہ زا بے ہمہ در گفتگو با ہمہ در ماجرا

مخالف و موافق، امیر و غریب سب کے ساتھ خلق و تواضع کا برتاؤ بدرجۂ مساوات تھا۔ کوئی حاکم و امیر ہو یا فقیر و حقیر نہ اس کی تکریم نہ اُس کی تحقیر۔ شاہ سے گدا تک سب کی نسبت مشرب یک رنگی مرعی تھا۔

ایک روز نجف علی خاں صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر دہلی اور منشی امیر علی صاحب تحصیلدار پانی پت حاضر خدمت ہوئے۔ اُس وقت گھٹا خوب گھری ہوئی تھی اور رہاوٹ کی پُھوار پڑتی تھی۔ دو چار باتوں کے بعد تحصیلدار صاحب نے حاضرین کی طرف خطاب کیا کہ سب صاحب براہ مہربانی ذرا باہر چلے جائیں کہ اکسٹرا اسسٹنٹ صاحب کو تنہائی میں کچھ عرض کرنا ہے۔ حاضرین نے اُٹھنے کا ارادہ کیا۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ ذرا ٹھہرو ہم کو

ایک نقل یاد آئی۔ جناب وقبلہ میر اعظم علی شاہ صاحب کو اپنے برادر زادہ سے نہایت اُلفت تھی جب اُس عزیز کا انتقال ہو گیا تو آپ کو نہایت رنج ہوا ایک دن گھر میں فرمانے لگے کہ اگر میرا بیٹا بھی مر جاتا تو مجھ کو اتنا غم نہ ہوتا۔ مائی صاحبہ نے جھلا کر جواب دیا کہ تم خود ہی کیوں نہ مر گئے جو سب جھگڑا بکھیڑا پاک ہو جاتا۔ یہ فرما کر اسسٹنٹ صاحب سے کہا کہ میاں آؤ ہم تم ہی باہر کیوں نہ چلے چلیں تاکہ ان سب کو تکلیف نہ پہونچے۔ غرض باہر تشریف لے گئے اور ان کا حال سن لیا۔ آپ بھیگئے اُن کو بھی بھگویا۔ مگر رُفقا کی تکلیف کو گوارا نہ فرمایا۔

ذکر وصیت و حالاتِ وصال

سنہ ۱۲۹۶ ہجری میں جب رمضان شریف کا چاند نظر آیا تو بعدِ نمازِ مغرب جناب وقبلہ نے مولانا گل حسن کو تنہائی میں بلایا اور فرمایا کہ ہم ایک بات کہتے ہیں تم خیال کر کے سنو۔ وہ یہ ہے کہ ایک بار سید اعظم علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہم کو اپنے ہمراہ پانی پت میں لائے اور قلندر صاحب کے مزار پر چلہ کرایا۔ اخیر چلہ میں یہ دیکھا کہ ایک شخص مجذوب، جسم سانولی رنگت، گھنگرالے بال تشریف لائے اور فرمایا کہ آؤ تم کو تعلیم کریں۔ اتنے میں ایک اور شخص خوب صورت سُرخ و سفید رنگ، سفید ریش، لباس سبز پہنے عصا ہاتھ میں لیے ظاہر ہوئے۔ فرمانے لگے میاں اس دیوانہ سے کچھ نہیں ہونے کا تم کو یہ تعلیم نہیں کر سکتا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت اگر یہ دیوانہ صاحب کچھ نہیں کر سکتے تو آپ ہی کچھ ارشاد فرمائیں۔ اُنھوں نے فرمایا کہ نہ اُن سے کچھ ہو سکے نہ ہم سے۔ تمھارا معاملہ تو ذات سے ہے جو کچھ ہوگا ذات ہی سے ہوگا۔ سب مُردوں اور زندوں کو دل سے مٹا دو۔ کسی سے کچھ نہ ہوگا۔ جس طرح ذات کی طرف متوجہ ہو، اسی طرح چلے جاؤ۔ سوائے ذات کے کوئی تمھارا حامی و مددگار نہیں۔ اور ابتدا ہی سے تم عاشق ذات ہو نہ کسی پیر پیغمبر سے محبت، نہ کسی سے خواہش۔ نہ کسی کی رغبت پھر تم کو کون تعلیم کر سکتا ہے۔ تمھارا اور خدا کا معاملہ ہے، تم جانو اور خدا۔ اس میں ہم لوگوں کو دم مارنے کی تاب و طاقت نہیں۔ اگر ہمارے بس کی بات ہوتی تو کہنے کی کیا حاجت تھی۔

ہاں جو کچھ ہونا ہے۔ ۳-۴-۵-۶ میں ہو جائے گا۔ پھر وصال ہے۔ یہ بات صبح کو میر صاحب قبلہ کی خدمت میں عرض کی گئی۔ آپ رونے لگے کہ میاں خدا کا معاملہ تو بے نیازی کا ہے۔ دیکھیے کیا پیش آئے میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ کیوں روتے ہیں میرا اور خدا کا معاملہ ہے اور میں اسی میں خوش ہوں جس میں اُس کی رضا ہو۔ یہ تو نہایت خوشی کا مقام ہے کہ اللہ تعالےٰ نے سوائے اپنے کسی کی طرف جانے نہ دیا۔ اور کسی کا نیاز مند نہ کیا۔ اور مجھ کو بھی یہی منظور تھا۔ بقول سعدیؒ ؎

حقاکہ باعقوبتِ دوزخ برابرست   رفتن بپائے مردیٔ ہمسایہ در بہشت

ہمیشہ سے میں خدا ہی کا رہا اور الحمد اللہ کہ خدا نے اپنا ہی کر لیا۔ اس سے زیادہ اور کیا خوشی ہوگی۔ بعد اس کے ہم نے ان اعداد کا حساب لگایا جو خواب میں بتائے گئے تھے۔ تو اٹھارہ ہوئے۔ خیال کیا کہ شاید اٹھارہ دن ہیں۔ جب اٹھارہ دن پورے ہو گئے تو اٹھارہ مہینے کا تصور بندھا۔ جب مہینے بھی منقضی ہو گئے تو اٹھارہ سال پر نظر ٹھہری۔ پھر یہاں سے سفر کا اتفاق پڑا۔ پھرتے پھراتے دوبارہ بہ تاریخ بستم ماہ شعبان ۱۲۷۹ھ ہجری پانی پت میں آکر قیام کیا۔ اب پانی پت میں آئے ہوئے اٹھارہ برس دس دن ہو چکے ہیں یہ سال پورا نہیں گذرے گا۔ مطلع رہو۔ اس روز سے جناب وقبلہ اکثر برسر مجلس یہ آیت پڑھتے مَثَلُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَوْلِیَآءَ کَمَثَلِ الْعَنْکَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَیْتًا وَاِنَّ اَوْھَنَ الْبُیُوْتِ لَبَیْتُ الْعَنْکَبُوْتِ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ۝ اور اکثر یہ اشعار زبانِ مبارک پر جاری ہوتے ؎

درختِ خشکم و اُمید برگ و بارم نیست   بغیر سوختن، اے وائے ہیچ کارم نیست
چو عنکبوت بہ دیوار و در نمی بازم   بنائے خانۂ ہستی چو استوارم نیست

دو مہینے کے بعد جناب وقبلہ نے فرمایا کہ ہم نے ایک خواب دیکھا ہے۔ اس کی تعبیر بیان کرو۔ خواب یہ ہے کہ قاضی محفوظ اللہ صاحب اور میاں اللہ بندے اور مولوی فتح محمد صاحب یہ تینوں مرحوم و مغفور میرے پاس آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ کا مکان تیار ہو گیا۔ کنجیاں ہمارے پاس ہیں چل کر ملاحظہ فرمالیجیے۔ ہم نے کہا کہ میاں ہم نے تو کوئی مکان بنایا نہیں۔

جہاں رہے لامکاں و بے نشاں رہے۔ سانپ کی طرح جہاں بنا بنایا مکان پایا وہیں جا بیٹھے۔ نہ ہمارے دادا نے مکان بنایا نہ والد نے بنایا۔ ہمارا مکان کہاں سے آیا۔ پھر اُن تینوں صاحبوں نے کہا کہ صاحب آپ ہی کا مکان ہے۔ چل کر دیکھیے تو سہی۔ ان کے ہمراہ جا کر دیکھا تو ایک بڑا عالیشان مکان ہے قفل کھولنے شروع کئے اور اندر گئے ایک عظیم الشان گنبد نظر پڑا اُس کا بھی قفل کھولا تو ایک مقفل صندوق پُرتکلّف نہایت شان و شوکت سے رکھا ہے۔ مولوی فتح محمد صاحب نے کہا کہ صاحب اس کی کنجی تو ہمارے پاس ہے، لیکن ہم سے کھلتا نہیں۔ اس کو آپ ہی کھولیں۔ ہم نے جو اس صندوق کو کھولا تو دیکھا کہ ایک گولہ رنگ برنگ لباس سے ملفوف رکھا ہوا ہے۔ اُس کو نکال کر غلاف ہائے ملفوفہ اُتارنے شروع کیے۔ اندر سے ایک ڈبیہ برآمد ہوئی۔ کھولا تو اُس میں مُشک تھا۔ پھر ہم نے کہا کہ اب ہمارا بھی جی چاہتا ہے کہ تمھارے پاس آجائیں۔ اُنھوں نے کہا کہ حضرت ابھی کوئی روز اور تشریف رکھیے آپ کی ذات سے لوگوں کو بہت فیض ہے۔ ابھی جلدی نہ فرمایئے۔ ہم نے کہا کہ میاں اب ہمارا جی بہت گھبراتا ہے۔ بہت کچھ سیر و سفر میں رہے۔ اتنے میں آنکھ کھل گئی۔ تم اس کی تعبیر تو بیان کرو۔ میں نے عرض کیا کہ بھلا حضور کے سامنے کیا عرض کر سکتا ہوں۔ لیکن جو کچھ میرے خیال ناقص میں آتا ہے گذارش کرتا ہوں۔ مکان سے مراد دنیا ہے۔ گنبد قبر ہے۔ صندوق جسم۔ ڈبیا قلب۔ مشک نام اللہ کا ہے۔ آگے کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ میرے سامنے تو حضور ایسے خواب بیان نہ فرمائیں۔ میرا دل دو نیم ہوا جاتا ہے۔ فرمایا کہ میاں خواب و خیال کا اعتبار کیا۔ مگر تعبیر تم نے خوب کہی۔

دو مہینے کے بعد پھر مولانا گل حسنؒ کو بُلا کر فرمایا کہ آج ہم نے ایک اور خواب دیکھا ہے۔ اس کی بھی تعبیر کہو۔ مولانا گل حسنؒ نے عرض کیا کہ حضور میں تو خواب نہیں سنتا نہ مجھ کو تعبیر آتی ہے۔ میرے سامنے بیان نہ فرمائیے کیوں کہ مجھ کو صدمۂ عظیم ہوتا ہے اور دل ٹکڑے ہوا جاتا ہے۔ فرمایا کہ میاں تم رنج نہ کرو خواب کا اعتبار کیا ہے۔ لیکن ہم تعبیر خواب میں تمھارا امتحان کرتے ہیں۔ تمھارا ذہن تعبیر خواب میں خوب پہونچتا ہے۔ تم ضرور اس کی تعبیر کہو۔ آج شب کو ہم نے دیکھا ہے کہ ایک ڈبیا ہمارے پاس ہے۔ اُس کو ہم نے کھولا اور ایک سفید کپڑا

نکال کر فرش پر رکھا۔ وہ ہلنے جُلنے لگا ہلتے ہلتے اُس کے پر نکل آئے۔ تھوڑی دیر کے بعد سرخ رنگ ہوگیا اور پر پرزے درست کرکے آسمان کو اُڑ گیا۔ میں نے عرض کیا کہ حضور عیاں را چہ بیاں۔ اس کی تعبیر تو دل دوز وجاں سوز ہے۔ ڈبیا جسم کیڑا روح، جب روح اپنے کمال کو پہونچ گئی تو پر پرزے درست کرکے اُڑا چاہتی ہے۔ فرمایا کہ ہاں تعبیر اس کی یہی ہے پھر میں نے عرض کیا کہ حضور ایسے خواب تو نہ فرمایا کیجیے، نہایت رنج ہوتا ہے۔ ارشاد ہوا یہ جو کچھ ہونا ہے وہ تو ہوکے ہی رہے گا۔ اس سے ایک مہینے بعد ایک روز قلندر صاحب کی مسجد میں قریب بیس بجے کے مجمع عام میں مولانا گُل حسنؒ کی طرف خطاب کرکے فرمایا کہ میاں مرنا ضرور ہے جب ایسا اتفاق ہو تو ہمارے جسم کے چار ٹکڑے کرکے شہر کے چاروں طرف پھینک دینا تاکہ جانور ہی اپنا پیٹ بھر لیں۔ اس جسم سے اور کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ مگر یہ تم سے کب ہوگا اور لوگ ایسا کاہے کو کرنے دیں گے۔ ہم کو الگ جنگل میں ایسی جگہ دفن کرنا جہاں کسی کا سایہ اور وسیلہ بجز خدا کے نہ ہو۔ پھر قلندر صاحب اور مخدوم جلال الدین کے مزار کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ نہ ہم کو ان کا سایہ درکار ہے نہ اُن کا۔ زندگی میں ان سے کیا حاصل ہوا جو آئندہ کی توقع کریں۔ آخر خدا کی رحمت بھی کچھ ہے یا نہیں۔ اس بات کو ایک مہینے سے کچھ اوپر عرصہ گزرا تھا کہ بتاریخ نوزدہم ماہِ صفر ۱۲۹۷ھ ہجری بروز یکشنبہ حضرت کے شکم مبارک میں کچھ گرانی محسوس ہوئی۔ حکیم موجو خاں نے ایک دوائی جوشاندہ بروز دوشنبہ پلائی اور کہا کہ معدہ میں مواد ہے۔ کل کو ایک خفیف مُسہل بھی دوں گا۔ سہ شنبہ کے دن علی الصباح حکیم موجو خاں نے ایک پُڑیا دی۔ جس کے اجزاء اعظم یہ تھے:۔ بیخ حنظل، عصارۂ ریوند اس دوائی تلخ و تند سے اوّل تو دو دست ہوئے پھر ایک قے ہوئی۔ جس سے طاقت سلب ہوگئی اور رنگ متغیر۔ پھر اسہال کا زور رہا۔ اوّل روز تو یہ خیال کیا گیا کہ شام تک افاقہ ہوجائے گا لیکن اگلی صبح تک یہی کیفیت رہی۔ اور دست بند نہ ہوئے۔ ہم لوگوں کو نہایت فکر و تردّد ہوا۔ بہت دوائیں بدلیں۔ تمام اطبا کی سعی ناکام رہی۔ کچھ فائدہ نہ ہوا۔ شبِ جمعہ بارھویں تاریخ کو سرِ شام حکم فرمایا کہ تم سب حجرہ سے چلے جاؤ اور کوئی شخص ہمارے پاس نہ آئے۔ دروازہ بند کردو۔ بموجب حکم کے دروازہ بند کیا گیا۔

سب کو یقین ہوا کہ آج خیر نہیں ۔ حجرہ شریف کے باہر سب خادم تمام شب جمع رہے ۔ بہ وقت چار بجے صبح کے آپ نے پکارا کہ دروازہ کھول دو ۔ ہم لوگ یہ مژدہ سُن کر خوشی کے مارے دوڑے اور دروازہ کھول کر حاضر ہوئے ۔ حضرت نے نوّاب ابراہیم خاں سے فرمایا کہ ہم کو انار کے دانے کھلاؤ ۔ اُس وقت حضور نے یہ چند فقرے سنائے کہ ہر ایک فقرہ دوسرے سے مخالف ہے ۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا بات فرماتے ہیں ۔

فقرۂ اول ۔ جو ہم نے سوچا تھا وہ نہ ہوا ۔

فقرۂ دوم ۔ اور لوگ بھی تو یہیں تک رہے ہے

پنڈت کی پوتھی سُنی اور دھوبی کی چھوچھو گئے سکھوپت نگر میں دونوں کی بھئی تھو تھو

فقرۂ سوم ۔ میاں سنتے بھی ہو اگر ہم دس پانچ برس رہے بھی تو کیا مگر ایسے تو ہم رہیں گے نہیں ہے

ہر چہ دیدیم دریں باغ نہ دیدن بہ بود ہر گُلِ تازہ کہ چیدیم نہ چیدن بہ بود
ہر کجا منزلِ آرام تصوّر کردیم چوں نفس راست نمودیم رسیدن بہ بود
ہر متاعے کہ خریدیم باوقاتِ عزیز بوداگر یوسفِ مصری نخریدن بہ بود

پھر چند بار ان دو شعروں کو آپ نے پڑھا ہے

پیری میں ہم کو یار نے گھر سے طلب کیا افسوس بعدِ فصلِ بہار اپنے پر کھُلے
دیکھا دمِ نزع دلِ آرام کو عید ہوئی ذوق وصلِ شام کو

اس کے بعد کئی روز تک مرض کو افاقہ معلوم ہوتا رہا ۔ مگر ایک روز جناب وقبلہ نے مجمعِ عام میں مولانا گل حسن کو دس روپئے دیے اور ارشاد کیا کہ یہ ہماری تکفین و تدفین کا خرچ ہے اور ہم وصیت کرتے ہیں تم اس پر عمل کرنا ۔

اوّل یہ کہ ہماری قبر شاہ ولایت صاحب کے مزار سے بفاصلۂ دو تین تیر بلکہ چار تیر جانبِ جنوب چٹیل میدان میں بنانا ، جہاں کسی کا سایہ و وسیلہ و ذریعہ بجز ذاتِ خدا کے نہ ہو ۔ اور ظاہرا اور کوئی قبر بھی اُس کے قریب نہ ہو ۔

دوم یہ کہ سوائے اس کے جو ہم نے دیا ہے کسی کا روپیہ کفن و دفن میں نہ لگانا ۔ ہاں! اگر

زمین کی قیمت کوئی مانگے تو تم اپنے پاس سے ادا کر دینا، اور کسی سے طلب نہ کرنا۔

سوم یہ کہ قبر کچی بنانا۔ ایک کھنگر اُس کے سرہانے اور ایک پائنتی رکھ دینا۔

جب نوبت اس وصیت کی پہونچی تو مولانا گل حسن صاحب نے حالتِ اضطراب میں اکثر مریدانِ حضرت کو جو اطرافِ دور دوراز میں تھے، خطوطِ اطلاعی روانہ کر دیے۔ چند روز میں ایک مجمعِ کثیر جمع ہو گیا۔ اکثر سخن فہم و شاعر بھی اس جلسہ میں تھے۔ آپ نے سید وحید الدین پسر حاجی سید فرید الدین صاحب مرحوم کو یاد فرمایا۔ اور اُس قصیدہ کے پڑھنے کا ایما کیا جو میں روز پیشتر سید وحید الدین نے خدمتِ عالی میں پیش کیا تھا۔ اور اُس کے صلہ میں جناب وقبلہ نے ایک دوپٹہ اور ایک روپیہ یا اشرفی جس کو اچھی طرح نہیں دیکھا عطا کیا تھا۔ حالانکہ عمر اس عزیز لڑکے کی ہنوز چودہ سال کی تھی اور گلستاں کا تیسرا باب پڑھتا تھا، لیکن جناب وقبلہ کی نظرِ شفقت اس کے مُربّیٔ حال تھی۔ ایسا زور و شور کا قصیدہ لکھا کہ اُس کا سمندِ سخن انوری و خاقانی سے عنان با عنان معلوم ہوتا ہے۔ اور ایسے لطف و خوبی اور دھوم دھام سے اس لڑکے نے مجمعِ کثیر میں یہ قصیدہ پڑھا کہ اربابِ محفل دنگ و ششدر ہو گئے۔ بعض مستمعین نے اس گمان سے کہ شاید یہ لڑکا طوطی کی طرح زبانِ گویا رکھتا ہے اور طبیعت اس کی فہم مضامین و معانی سے ناآشنا ہے اُس کا امتحان کیا۔ اور جو مطالب و اصطلاحاتِ ادق اُس کے کلام میں وارد ہوئے تھے اُس سے استفسار کیے۔ اُس نے ہر ایک سوال کا جواب شرح و بسط کے ساتھ ایسے اسلوب سے بیان کیا کہ گویا اُس کی طبع بلند اور اُس کا ذہنِ رسا اِن مباحث و علوم پر حاوی ہے۔ وہ قصیدہ بھی ذیل میں لکھا جاتا ہے تاکہ اہلِ بصیرت اُس کو ملاحظہ کریں۔

قصیدہ در محامد حضرت قبلہ و کعبہ

(از تصنیف سید وحید الدین سلیم پانی پتی مرحوم)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صبح دم مہرۂ زر چرخ چو افشاند ز چنگ   خاطرِ ما شدہ بلبل بہ ریاضِ فرہنگ

زده سر پا بہ سر چرخ سمند خامہ | کہ بجولاں دہم از رنگ بہ رنگ شبرنگ
ساحت تسع عرش رواں کن بہ نورد | کہ بتوصیف جنابے زده مفتوں آہنگ
آں جنابے کہ چو از رفعت او گرد ہراس | ہفت طاق فلک آمد بوجود او تنگ
جنبش آید بہ سفینہ بہ سہیل از فرقش | باچہل وچار سوارش چو بجوشیدم رنگ
چوں ہیولائے تجلیش بیسنگارد برق | شمع او مردہ کند سرزنش صرصر تنگ
طرفہ آئینہ قلبش کہ ز تاب عرفاں | درو از جو ہر فرد آمدہ کم نقطہ زنگ
چہ عجب گر ز یکے جلوہ بدشتِ شوقش | ذرّہ ذرّہ شود از فرط تپش برق آہنگ
فیض او خرمی بخشد چو پے روے شرار | سبز و خضر اکندش سبزہ صفت مخمل رنگ
روئے اقدس شدہ با مہر پرخاشش و حرب | نعل کفشش بہ ہلال آمدہ در حربہ و جنگ
عقل و دانش شدہ از جوہر علویش عرض | جوہر فرد تقلبش فلک اخضر رنگ
غضب و رفق از و نشو و نما چوں یابند | آتش و آب بہ تمیز نمایند درنگ
عقد ہا حل کند از چشم زدن تنگ و مضیق | کہ بود غنچۂ منطق بہ لب غایت تنگ
طے کند فاصلۂ جذر قدم قلب اسد | قلب او قلب کند چوں زدر فتش نیرنگ
شمۂ حضرت او شمس رساند بثریٰ | کہ شد از ضبط علو بر فلک رابع تنگ
خشم را بار غضب خشم نہد بر نالش | رفق را رفق دہد گوہر رفعت در چنگ
اشعۂ پرتو او گر ندہد تاب بہ شمس | نقش بندد بہ تصاویر نہ از عکسش رنگ
علمِ حشمت او تا بہ فلک جائے گرفت | حوت را دوخت چو ماہی و مراتب و رنگ
پرتو نور رفتہ گر بہ یم مصر وششش | مرغ زریں نہ کشد شہپر انور بہ فرنگ
مہ نوگشتہ فلاخن بید حاجب شمس | کہ کند بر سر جالوت ظلامش آہنگ
بحر جودش زند ار جوش چو بحر ثالث | ماہ در بحر خضر غوطہ خورد ماہی رنگ
توسن حشمت او گر بود اندر جولاں | توسن چرخ نہ ایں قدر بود شوخ و شنگ
تا بدانہ نور فروزانش بگردونِ نہم | ماہ و خورشید کند حسبت بسویش چو پلنگ
علم رفعت او تا کہ زرفرف سازد | پرچم خویش از انست بعرش اندر چنگ

خلق داند بہ دم نور شعاع خورشید — نے نے قوسش زدہ بر سینۂ او الف خدنگ
رفعتش قوس قزح را بخم و پیچ انداخت — زاں براں شمس چو حربا کند از رنگے رنگ
لعل گویند ولے پارۂ از خوں باشد — شوکتے بادہ کند در جبلش سینۂ سنگ
رتبۂ فرحت و تنشیط بہ عہدش افزود — لالہ را جام لبالب شدہ از خمر فرنگ
یعنے بحر کرم وجود شہ **غوث علی** — قبلۂ عالم لاہوت و شہ چرخ اورنگ
کعبۂ ہر دو جہاں خسرو خسرو دیہیم — مسند آرائے و شہ کشورِ عقل و فرہنگ
کاشف سرّ نہاں واقف علم مکتوم — حضرت اقدس ظل اللہ و دانش آہنگ
در دل آمد کہ کنم مطلع دیگر ترقیم — کہ سراپا بود از مطلع نور فرہنگ

المطلع الثانی

ایکہ از فر تو چوں برق تپد جوہر سنگ — وے کہ روشن ز تو شد کوکب برج فرہنگ
مرکز دائرۂ سبز ز نورت بودار — برق را بر روش جست بود جادۂ تنگ
سبحۂ عقد ثریا بید اقدس تو — گر بود مستی نازش بگذارد بہ شلنگ
خامہ از مدح تو تحریر کند با شنگے — جست از دست زند مست برنگ شبرنگ
تا تماشائے شگفتن ز دولت بیند شمس — خواہد اندر چمن تو کہ بود غنچہ تنگ
دریم نور تو اندر صدف سینۂ تو — یافتہ پرورش از فیض تو دُرِّ فرہنگ
دعوی ہمسری سازند چہ رو گردندت — مہ و خورشید حضور رخ اقدس بیرنگ
جلوۂ تو علم ار برق وش از فرہ کشد — ہم چو خورشید بسوزد رخ خوبانِ فرنگ
در گلستانِ پناہ تو برائے دشمن — گل صلح آمدہ جاوید ز ہر غنچہ تنگ
مانی دل کشد از نقشِ تو بر صفحۂ خویش — دلِ طاؤس کشد نقش برقص و آہنگ
فیض نورِ دلِ شفاف تو آنست کزو — جگرِ لالہ بتبدیل کشد نقطۂ زنگ
فخر سازد بہ قدم بوسیِ تو گر شودش — اے شہنشاہِ معلی طبق نہ اورنگ
بشکند شیشۂ زپرو از فلک را باشد — وصفِ صولت اگرت نقش سر صفحۂ سنگ

تاکہ بر حرف تقابل کشد از روئے تو خط — رخِ گل باد صبا کرد ز سیلئے گل رنگ

قطعہ (ا)

کور مقری اگر از خاکِ پیت در دیدہ — افگند اے شہ خورشید کلہ چرخ اورنگ
بہر دیدار ہمہ صورت معدوم کند — از سراپردۂ بینش بیک آوان آہنگ

قطعہ (ب)

در فرات اے شہ اگر کار بتعذیب دہیش — چوبہ گستاخی تو چرخ بساز آہنگ
برتنِ خویش تند از طرب ایں منشور — کشتی چرخ شکستہ کند اندام نہنگ
ابر جودِ تو بہ نیساں زند از آب حیا — قطرہ را سوئے صدف باشد از وجاو ننگ
خون طوطی بیکے دشنۂ موج ابیض — ریختہ قلزم شفاف تو نادر و درنگ
ہر مثلث کندش تاکہ خجل کیکاؤس — ساختہ سبحۂ تو عقد ثریا آونگ
گر قدم رنجہ بفرمائے بہر وادی شوق — افتد از قلعۂ تن طائرِ جاں صد فرسنگ
برارسطو و فلاطون بہ جولان گہ عقل — خاطرِ اقدسِ تو برق جہاندہ شبرنگ
قیصر و خسرو و خاقاں ز غلامانِ تواند — در شہنشاہی عرفان شدہ زیب اورنگ
اے مدیح تو عضب مطرح و جولانگاہ است — کاشہب خامہ یاقوت فشاں گشتہ لنگ
آید از شعلۂ او لعل بصد جلوۂ طور — شرر افگندۂ از جلوہ مگر در دلِ سنگ
چشم نظارگیانِ قمر انوارت — چہ عجب پیکرِ کیکش بمیاں آرد رنگ
جوہرِ کل بجسم آید بہ ظہورِ عقلت — ذاتِ پاکت شدہ محورِ جہانِ فرہنگ
باریا بندہ نہ زنہار ز اجرامِ فلک — سایۂ تو کشد اندر یم خضرا چو النگ
نسر طائر جہد از شوکتِ تو گر بہ زمیں — پرِ پرواز زند مغفرِ خاقاں چو کلنگ
آتش قہر تو گر شعلہ رساند نہ کند — صوتِ طوطی پئے خونریزیٔ طاؤس درنگ

قطعہ (ج)

شاہد طبع من آمد چو پسِ نامِ جناب — بر سر جوشش معنی بہ بحار فرہنگ
گفت پیرِ خردش طعنۂ امساکِ مدیح — زاں گہر ریختن از عقد سخن کرد آہنگ

وانگہے ریختہ لولوئے معانی طبعم　　عرق افشردہ ز پیشانی خویشم ز تنگ
پس ہمہ مستعد مدح تو گشتند و لے　　حرفے نا وردہ از مدحِ تو دایم فرہنگ
زاں رخ جنگ کن آمد بدم عربدہ سرخ　　ریختہ خنجرِ تو خونِ گلوئے گل جنگ
نور روئے تو اگر در دہدش حسن فروغ　　شررِ طور بخیزد ز دلِ غنچۂ تنگ
سبزۂ گلشن قہر تو ز عکس موہوم　　روئے مریخ فلک را بکند اخضر رنگ
مرأتِ خاطرِ تو جلوۂ کونین نمائے　　وے ضمیرِ تو شدہ خازنِ گنجِ فرہنگ
مہرۂ بیض شود از شرر جلوۂ تو　　ور ید عیسےٰ افلاک نشین لعبت سنگ
ز آتشِ غیرت جودِ تو اگر سوختہ نیست　　لعل در کانِ بدخشاں شدہ چوں آتش رنگ
نگذارد غضبت گرچہ عدو بگریزد　　پہن ارض و فلک آید نظرش ساحت تنگ
ہست از رفق و غضب مختلطت زاں ہر دم　　گاہ منصور و گہے خستہ شود لشکر زنگ

قطعہ (د)

منشیِ چرخ بہ مدح تو ز گردوں آید　　در فراط آمدہ اول کند ایں خوش آہنگ
کلک یاقوت فشاں خار برآرد بہ کفش　　پشت ماہی شود از نقش و نگارش از زنگ
گر بصد سال کند مشق بدیحِ پاکت　　آخر از طعنۂ طبعم فتد آں نیز بہ ننگ
گردہ برہم ہمہ سامان بحار و دریا　　یا نگردد بہ خجالت بہ یم خضر از ننگ
جبہہ ہا بر درِ پاکِ تو شدہ کحل کہ تا　　یافتند از تو علو بر فلک نیلی رنگ
رشتۂ شمع اگر از درِ نورت باشد　　عقدِ پروین بہ تماشاش چو یک یدہ برنگ
اے عدو را ز ہراسِ تو بزیرِ گردوں　　روح را کلبۂ جسم است چو زندانِ فرنگ
چشمِ جبریل شدہ محو جمالِ تو چناں　　کہ بدیوار شدہ ثبت ز شوقِ تو بسنگ
تیغِ قہر تو بحیواں چو رساند تا بے　　بہ فغاں آید و غلغل بکند ہمچوں زنگ
حفظِ تو حافظ روز ست و شب اے شہ ورنہ　　ہر دو در مختلطے ابیض و اسود یک رنگ
نہ طبق جائے تو گر دست بمیزان قیاس　　یافت بر مرکز ثقل آں خود از پلہ تنگ
بوئے خلقِ تو بار واح دہد رائحہ گر　　عطسۂ مغز کند زندگیِ شاں آہنگ

دشنۂ قہر تو در نائے زحل گشتہ وسیع | قلزمِ لطفِ تو در دائرۂ امکاں تنگ
علم بر عقلِ فزونت متمیز گشتہ | عقل از علم بروں از حدِ عقلت در رنگ
روز و شب چونکہ قمر سودہ جبیں بر درِ تو | زاں گہے محو و گہے از فیضِ تو در اصلاے تنگ
بیش افزود و درازی ملتاب کرمت | از سرِ زلف عروس ستم خضر ارنگ
دامن برق گرفتہ است تراشعلۂ قہر | دامنِ ابر گرفتہ است بجودت آہنگ
بخط ناصیۂ مہر شدہ راست عمود | رمحِ خطیِ شکوہت پئے تصنیف آلنگ
جاہت از ملک کدام است معلیٰ مزبور | کہ بدیدش شدہ جاوید بلندی بشلنگ
لوحِ محفوظ شد از نام بزرگ و پاکت | بطرازِ قلم قدرتِ علام ارژنگ
اطلسش زود شکنج آرد دریزد زصفا | نگہے گر نکنی بر فلکِ اخضر رنگ
گوہرِ حکمت و عرفانِ تراہم چو صدف | بہر حفظ است ضمیرِ تو چو خورشید بزنگ
ہر کہ از کوثرِ احسانِ تو یک جرعہ چشید | گلشنِ دل شدہ خورمش چو باغِ فرہنگ
نغمۂ مدحِ تو ہر کس کہ سر آید شودش | از مضامینِ دہن طائرِ دل قفس تنگ

دُعا

شہ خاور بہ فلک بر سپہِ انجم تا | ہست در کاخِ تو آراستہ از نور اورنگ
دشمنت طعمۂ تیغ ستمِ گردوں باد | دوستت گوہرِ مقصود ز لطفِ تو بچنگ

تاریخِ قصیدہ

از دلِ ہفت الف ترجمۂ دل چار زند | یافت ایں مصرعۂ مفتون پئے تاریخ آہنگ

قاعدہ استخراج تاریخ

ترجمہ دل چار = ۷ ۷۷۷ = ۷ × ۱۱۱ = ۷ × (۸۰ + ۳۰ + ۱) = ہفت الف
در ہندی ترجمۂ دل۔ جی = (۳ + ۱۰) × ۴ $\frac{۵۲}{۱۲۹۷}$ و ۷۰ ۷ ۷ کا دل پنچ ستر ہے
اس لیے باون کی اکائی میں دہائی سے ۱۲۹۷ھ ہجری مقدسہ شروع ہوا۔
جناب و قبلہ کی خدمت میں چار آدمی ابتدائے بیماری سے تادمِ وصال ہردم حاضر

ومصروفِ خدمت گذاری رہے۔ یعنی میاں جان محمد صاحب عرف جانا۔ ابراہیم خاں پہلوان عرف نوآب۔ چھوٹے خاں پہلوان۔ اور مولانا گل حسن۔ جب اسہال کی شدت ہوگئی تو چوکی حجرہ کے اندر لگائی گئی۔ لیکن حجرہ میں بلا اجازت آنے کی ممانعت تھی۔ ایک رات آپ حجرے کے اندر گر پڑے۔ میاں جان محمد جھٹ پٹ جا پہونچے۔ آپ ناخوش ہوئے کہ بلا اجازت کیوں آئے۔ اور فرمایا کہ خبردار آیندہ ایسا نہ کرنا۔ ایک روز جان محمد نے عرض کیا کہ حضور جسم مبارک پر ضعف غالب ہے۔ جب حاجت ہو تو آپ کھنکار دیا کریں تاکہ حضور کو پلنگ سے اُٹھا کر چوکی پر اور چوکی سے پلنگ پر پہونچا دیا کریں۔ فرمایا کہ اچھا۔ اس کے بعد تقاضائے حاجت ہوا تو خود ہی اُٹھ کر چوکی پر تشریف لے گئے اور فراغت پاکر آلیٹے۔ اُس وقت کھنکارے۔ ہم لوگ دوڑ کر اندر گئے تو فرمایا کہ بس ہم فراغت پا چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی ہمت عالی عطا کی تھی کہ باوجود شدت مرض وضعف پیری کسی فرد بشر سے نشست و برخاست میں استعانت نہیں کی اور تادم واپسیں وہی استقلال رہا جو ہمیشہ سے تھا۔

ایک روز زمانۂ اشتدادِ مرض میں چاروں خادم ہاتھ پاؤں دبا رہے تھے۔ ارشاد ہوا کہ اس آیت کو پڑھو:۔ مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ٥ ہم سب بڑی دیر تک اس آیت شریفہ کو پڑھتے رہے۔ پھر فرمایا کہ اب یہ آیت پڑھو:۔ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ٥ اس آیۂ کریمہ کو بھی تادیر پڑھتے رہے۔ پھر ارشاد ہوا کہ اب اس شعر کو پڑھو ؎

چیست توحید آں کہ از غیر خدا فرد آئی در خلا و در ملا

ایک روز زمانۂ علالت میں مجمعِ عام کے اندر غلامی شاہ کی نسبت جو کہ خادمِ خاص جناب قبلہ کا ہے اور تہجد کا وضو کرانا اُس کی خدمتِ خاص تھی، یوں وصیت فرمائی کہ تم سب لوگ اس شخص کی خدمت و خاطر کرنا کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ قلندر صاحب کے مجاور و خادم اس کو ایک دم بھی یہاں نہیں ٹھہرنے دیں گے۔ اگرچہ یہ ایک غصہ ناک اور بے وقوف سا

آدمی ہے۔ لیکن تم لوگ اس کی کسی بات پر خیال نہ کرنا۔ زمانۂ علالت میں چند روز کے لیے افاقہ کی صورت بھی ظاہر ہوئی اور ہم لوگ سمجھے کہ اب ازالۂ مرض ہو گیا۔ مگر جناب قبلہ نے اکثر یہی فرمایا کہ جو دوا ہم کو جلاب میں پلائی گئی اُس کا ذائقہ اب تک زبان پر ہے اور اُس کی بُو ہنوز رفع نہیں ہوئی۔

ماہِ ربیع الاوّل ۱۲۹۷ھ ہجری کی چھبیسویں تاریخ کو بوقت فجر کہ مجمع عام تھا۔ آپ نے حجرہ کی طرف انگشتِ مبارک ہلائی اور یہ دو شعر شیخ سعدی علیہ الرحمہ کے پڑھے

شنیدم کہ جمشیدِ فرّخ سرشت — بسر چشمۂ بر بسنگے نوشت

بریں چشمہ چوں ما بسے دم زدند — برفتند چوں چشم بر ہم زدند

تھوڑی دیر کے بعد سب حاضرین کو رخصت کیا اور قدرے کھانا تناول فرمایا پھر درِ حجرہ بند کیا گیا اور ہم چاروں خادم پائے مبارک دبانے لگے۔ جب ظہر کا اوّل وقت ہوا تو آپ نے تیمم کیا اور چارپائی پر رو بہ جنوب فریضۂ ظہر ادا کیا۔ اُس وقت مولانا گل حسنؒ نے یہ آیت پڑھی:۔ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اس کے بعد آثار دگرگوں پیدا ہوئے اور تغیر ظاہر ہوا۔ فرمایا کہ الحمد للہ اور یہ شعر پڑھا ؎

چیست توحید آں کہ از غیر خدا — فرد آئی در خلاو در ملا

جب تین بجے تو مولانا گل حسنؒ نے عرض کیا کہ بہت سے مشتاقانِ دیدارِ پُر انوار آستانۂ مبارک پر حاضر ہیں۔ اگر اجازت ہو تو درِ حجرہ کھولا جائے۔ فرمایا کہ ہاں! کھول دو۔ اوّل منشی فضل رسول صاحب اندر آئے ارشاد ہوا کہ کون ہے۔ مولانا گل حسنؒ نے منشی صاحب کا نام لیا۔ فرمایا کہ آگے آؤ۔ جب قریب تر آئے تو فرمایا کہ کچھ کہو گے۔ منشی صاحب نے عرض کیا کہ میں کیا عرض کروں حضور پر سب حال روشن ہے۔ فرمایا کہ نہیں کچھ کہنا ہو تو کہہ لو۔ تین بار اسی طرح فرما کر اشارہ کیا کہ اچھا بیٹھ جاؤ۔ پھر سید وزیر علی صاحب آئے اُن سے بھی وہی کلمات ارشاد کیے۔ اور سید صاحب نے بھی وہی جواب عرض کیا۔ غرض جو آتا گیا ہر ایک سے وہی ارشاد ہوا اور کسی نے کوئی خاص گذارش نہیں کی۔ جب انبوہِ کثیر ہو گیا تو آپ خاموش ہو گئے اور آنکھیں بند فرما لیں۔ اُس وقت کے بعد پھر کسی کی طرف

آپ نے خطاب نہیں کیا۔ البتہ جب کسی نے مزاج پوچھا تو نہایت استقلال سے یہ جواب دیا کہ "الحمد للہ بہت اچھا" یا اگر کسی نے کوئی بات دریافت کی تو آنکھیں کھول دیں اور جواب دے کر پھر بند کر لیں۔ اُس وقت بھی غایتِ استقلال اور فرحتِ بے اندازہ ظاہر ہوتی تھی۔ چہرۂ مبارک آفتابی آنکھیں سرخ و منوّر گفتگو صاف نبض میں تیزی۔ صرف تنفّس کی زیادتی سے کسی قدر تردد ہوتا تھا۔ آٹھ بجے شام کے ڈاکٹر چُنّی لال صاحب آئے۔ حال دریافت کیا۔ نبض دیکھی کہا کہ کوئی تشویش کی بات نہیں۔ البتہ بلغم کی وجہ سے تنفّس معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ نبض میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ابھی میں دوا بھیجتا ہوں۔ چھاتی پر ملو اور تھوڑا تھوڑا پلاؤ۔ ایک گھڑی بھر کے بعد بلغم رفع ہو جائے گا اور تنفس درست۔ نوّاب ابراہیم خاں ہمراہ گئے اور ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد دوا لائے۔ اب استعمالِ دوا میں حجّت ہونے لگی۔ میں نے کہا کہ یہ وقت دوا کے پلانے کا نہیں۔ کچھ دوا مت دو۔ منشی فضل رسول صاحب بولے کہ نہیں دوا ضرور پلائی چاہیے۔ میں نے کہا میں دوا ہرگز پلانے نہیں دوں گا۔ اب دوا کا وقت نہیں رہا اور دوا کے استعمال سے نہ کچھ فائدہ۔ اس میں بہت حجّت و تکرار ہونے لگی۔ آپ نے آنکھیں کھولیں اور فرمایا کہ میاں کیا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضور منشی صاحب دوا کے پلانے میں بحث کرتے ہیں اور میں منع کرتا ہوں کہ اب وقت نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں سچ تو ہے اب دوا کیا کر سکتی ہے۔ اس کی کچھ ضرورت نہیں۔ منشی جی نے عرض کیا کہ حضرت دوا کا پینا تو سنّت ہے۔ آپ سنّت کا لفظ سنتے ہی خاموش ہوئے اور تھوڑی دیر توقّف کر کے فرمایا کہ اگر سنّت ہے تو لاؤ۔ محمد فخر الدین صاحب جن کے ہاں خاص جناب قبلہ کا کھانا پکتا تھا، پیالی نہ دوا کی اور چمچہ لے کر اُٹھے ایک چمچہ دیا، دوسرا دیا، تیسرے چمچہ کا دینا تھا کہ ایک ہچکی کے ساتھ تمام دوا باہر آئی۔ میں نے کہا شربت یا شہد دو۔ مولوی راغب اللہ صاحب نے دو چمچہ شربت کے پلائے۔ پھر مولوی عبد الصمد خاں ٹونکی نے کوئی دو چار چمچے پلائے ہوں گے کہ آخر پونے دس بجے کا وقت اور شبِ دوشنبہ چھبیسویں ۲۶ تاریخ ماہ ربیع الاوّل سنہ ۱۲۹۷ ہجری مطابق ۱۲ پھاگن سمبت ۱۹۳۶ بکرمی موافق ۷ مارچ سنہ ۱۸۸۰ عیسوی شاہبازِ عالمِ قدس،

گرم پرواز ہوا اور اُس مردِ میدانِ تجرید و شہنشاہِ ممالکِ توحید و سلطانِ جہانِ تفرید نے مردانہ وار آخر نعمائے الٰہی کا جام نوش فرمایا اور نہایت الوصال کا پردہ درمیان سے اُٹھایا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔

ولادت شریف بروز جمعہ ماہ رمضان المبارک ۱۲۱۹ھ ہجری میں ہوئی تھی عمرِ گرامی اٹھتر سال چھ مہینے کچھ دن کی ہوئی۔ اٹھارہ برس سات مہینے چھ روز بلدہ پانی پت میں قیام فرمایا۔

نالۂ چند بطور ترجیع بند

اے شاہِ یگانۂ زمانہ
اے بحرِ محیطِ بے کرانہ
کیوں اہلِ نیاز کے سروں سے
خالی ہے یہ سنگِ آستانہ
وہ محفلِ اُنس اب کدھر ہے
یارب ہے کہاں وہ کارخانہ
وہ بزم نہ وہ جمالِ ساقی
وہ جام نہ وہ مئے مُغانہ
وہ طور ہے اب نہ وہ تجلّی
وہ وقت ہے اب نہ وہ ترانہ
کیا ہوگیا جلوۂ سحر گا
کیا ہوگئی صُحبتِ شبانہ
ہے دل میں ابھی وہی تصوّر
ہے یاد ہنوز وہ فسانہ
وہ فصل نہ وہ بہار باقی
وہ گُل نہ چمن نہ آشیانہ
رہتی ہے اُچاٹ سی طبیعت
ملتا ہی نہیں کہیں ٹھکانہ
جاں حسرتِ دید میں تپاں ہے
دل تیرِ فراق کا نشانہ
ساحل پہ پڑے ہیں سب مسافر
کشتی ہوئی کس طرف روانہ

ہے جوش میں ہجر کا سمندر
یا غوث علی شہ قلندر

اے کعبۂ خاص و قبلہ عام
تھی تیری گلی مقامِ احرام
تھا مامنِ جاں حریمِ اقدس
آغاز کا غم نہ خوفِ انجام

سب محو تھے ظلِ عاطفت میں — خطرات و خیالِ و فکر و اوہام
اُس بحرِ محیط میں تھے سب گم — نیکی و بدی و کفر و اسلام
پُرشور تھے بے لب و دہاں ہم — سرمست، بدونِ بادہ و جام
مشغولِ جمال، بے سر و چشم — مصروفِ سفر بغیرِ اقدام
دریا ہوا، ایک عطا سے قطرہ — پُختہ ہوا، ایک نگاہ سے خام
کیخسرو و کیقباد سے بھی — تھے بخت بلند، تیرے خدّام
دیکھا اب ہجر چار ناچار — دیکھی فرقت بھی کام ناکام
کہہ دیجیو اے نسیم یہ بات! — لے جائیو اے صبا یہ پیغام!

ہے جوش میں ہجر کا سمندر
یا غوثِ علی شہِ قلندر

ہوتی ہے جہاں میں کم کوئی ذات — بے علت و نسبت و اضافات
خورشید تھا، وہ وجود با جود — دریا تھی، وہ ذاتِ فیض آیات
دیرینہ نہنگِ بحرِ توحید — مردانہ قلندرِ خرابات
سلطانِ جہانِ ترک و تجرید — شہبازِ معارج نہایات
نے میلِ مراتب و مدارج — نے رغبتِ کشف و نے کرامات
ملتی تھی مُراد طالبوں کو — اُس در سے بدونِ عرضِ حاجات
اُس بات کی ہو گئی گرہ وا — دل میں بھی نہ تھی ہنوز جو بات
خلوت میں ترا اجمال مفتاح — جلوت میں ترا کلام مشکات
کیا تھی وہ نظر سحابِ رحمت — کیا تھا وہ زمانہ فصلِ برسات
وہ وقت نہ وہ زمانہ افسوس — وہ لطف نہ وہ بہار ہیہات
ایک آن کی آن تھی حضوری — ایک بات کی بات تھی ملاقات

ہے جوش میں ہجر کا سمندر
یا غوثِ علی شہِ قلندر

اے بحرِ حقیقتِ خدائی — اے جلوۂ شانِ کبریائی
باقی نہیں کوئی مشغلہ اب — رندی ہی رہی نہ پارسائی
شاہی کا نہیں خیال سر میں — جی میں نہیں حسرتِ گدائی
نے بندِ قفس نہ شوقِ پرواز — باقی ہے نہ قید، نے رہائی
نے حرص، ہوا نہ کچھ توکّل — نے برگ و نوا نہ بے نوائی
نے فکرِ قصیدہ ہائے عطّار — نے ذکرِ حدیقۂ سنائی
نے قربِ نوافل و فرائض — نے تنگ دلی نہ دل کشائی
بندہ نہ خدا نہ دین و دنیا — کی آپ نے خوب ہی صفائی
لیکن نہ مٹا غبارِ فرقت — ہر چند کہ طاقت آزمائی
مشکل ہوا کاٹنا دنوں کا — دشوار ہوئی تری جدائی
بیتابیِ دل ہے چشمکِ برق — اندوہ کی اک گھٹا ہے چھائی

ہے جوش میں ہجر کا سمندر
یا غوثِ علی شہِ قلندر

ایامِ وصال بھی تھے کیا دن — راتیں تھیں مراد، مدّعا دن
محسوس نہ تھا کہاں کٹی رات — معلوم نہ تھا کدھر گیا دن
کیا جلد گزر گئے وہ دن حیف — ہوتا کوئی اور بھی سوا دن
تھی رات بہت دنوں سے اچھی — راتوں سے زیادہ خوب تھا دن
تھی بزمِ وصال، دن ہوا رات — تھی دیدِ جمال، شب ہوا دن
دنیا میں بزرگ تھی وہی رات — تھا عمر میں بس وہی بڑا دن
ہر صبح عجیب، شام نادر — ہر رات جدید، اور نیا دن
تھی دن کو خوشی کہ اب ہوئی رات — تھی شب کو مسرّت اب ہوا دن
عالم کو زبسکہ ہے تغیّر — رہتے نہیں ایک سے سدا دن
تھا خواب و خیال وہ زمانہ — بجلی ہوئی رات اور ہوا دن

دن رات یہی فغاں ہے لب پر — وہ رات رہی نہ وہ رہا دن

ہے جوش میں ہجر کا سمندر
یا غوثِ علی شہِ قلندر

اے قبلۂ عالمِ معانی — سلطانِ جہانِ بے نشانی
اے بحرِ معارف و حقائق — شاہنشہِ ملک جاودانی
آگاہِ مقاصدِ درونی — دانائے خواطرِ نہانی
یک رنگ و یگانہ و یک آئیں — بے فرق مکانی و زمانی
خصلت میں عجیب دل نوازی — عادت میں کمال مہربانی
تھی آپ پہ ختم بذلہ گوئی — تھی آپ پہ ختم نکتہ دانی
باتوں میں طریقِ دل کشائی — لفظوں میں ادائے خوش بیانی
تھے گوہرِ قدس وہ اشارات — اور غیب سے تھی وہ دُرفشانی
القصہ وہ احسن القصص تھی — جو بات سُنی تیری زبانی
آیا نہ پسند یاں کا رہنا — برباد ہو یہ سرائے فانی
جو کچھ گذرا سو تھا فسانہ — جو کچھ دیکھا، سو تھی کہانی

ہے جوش میں ہجر کا سمندر
یا غوثِ علی شہِ قلندر

اے بحرِ کرم محیط نایاب — لب تشنہ ہیں ماہیانِ بے آب
اے نوحِ سفینۂ مسرت — طوفاں زدہ ہیں تمام اصحاب
پانی پت تھا بقا کا چشمہ — اب کیا ہے غم و الم کا گرداب
روتے ہیں یہاں کے سب در و بام — حوض و حجرہ ستون و محراب
آتے تھے مدام تیرے مہماں — بنگالہ سے لے کے تا بہ پنجاب
جلوہ تھا یہ تیرے دم قدم کا — اب کیا ہے کہ مجتمع ہوں احباب
وحشت زدہ پھرتا ہے غلامی[1] — اور غم زدہ مضطرب[2] ہے بے تاب

۱؎ غلامی شاہ خادم حضور ۱۲-

۲؎ نواب محمد عثمان خاں صاحب رئیس متخلص بہ مضطر ۱۲-

ملفوظ مبارک و گرامی　　ہے زندگیِ حسن کا اسباب
ساحل نہ کہیں نہ تھل نہ بیڑا　　سب بحرِ فراق میں ہیں غرقاب
افسوس ہوا نظر سے پنہاں　　وہ شمسِ منوّرِ جہاں تاب
اے مُلکِ بقا کے جانے والو!　　کہہ دیجیو العبدِ عرضِ آداب!

ہے جوش میں ہجر کا سمندر
یا غوثِ علی شہِ قلندر

دورِ آخر

اے نسیمِ صبحِ ایّامِ بہار　　در حریمِ کعبۂ جاں کن گذار
روئے خود بر خاکِ پانی پت بسائے　　شمۂ احوالِ آں جا بر کشائے
فصلے از غوغائے محشر کن بیاں　　کوسِ رحلت کوفت آں شاہِ زماں
غوث مارا وقتِ رحلت در رسید　　رفت در غیب آں شہنشاہِ رشید
شاہبازِ قدس پرّید از چمن　　شد نورِ دیدہ بساطِ انجمن

بازگو از زائران کوئے او　　بازگو از بیدلان روئے ہو　　بازگو رمزے از آں دریائے راز
موجۂ دریا بدریا رفت باز　　کن حدیثِ بحرِ ناپیدا کنار　　بازگو زاں موجہائے نوربار
بازگو از بزمِ آں شاہِ وحید　　نغمہ سو از فرود سلطان مجید　　اے تو خوانِ غیب را خوش میزباں
اے تو خضرِ راہِ ما گم گشتگاں۔　　اے جہانِ معرفت را آفتاب　　از رخِ روشن برافگندی نقاب
در نگرِ آوارگانِ خویش را　　چارہ کن بے چارگانِ خویش را　　گوشۂ چشمے بسوئے ماں بکن
یک نگہ بر حالتِ دوراں بکن　　بشنو اے سلطانِ ایوانِ بلند　　مرد و زن آہ و زاری میکنند
اے چہ گفتم از غم و بگریستن　　ہست وہم ایں مردن و ایں زیستن　　تو بری از اقتران و افتراق
از خیالات است ایں ہجر و فراق　　وہم ہستی شد مجال اشتیاق　　ہیچ باشد ماتم درد و فراق
بلبل و گل ہیچ و بستاں نیز ہم　　ذوق و شوق و علم و عرفاں نیز ہم　　جذر و مدِّ بحر و ہم موج و حباب
گر بسنجی جملہ یک آبست آب　　وسوسہ بگذار بحر و موج کو　　بے نشانی را حضیض و اوج کو
موج خواند قصۂ ہجر و وصال　　بحر مستغنی ست از نقص و کمال　　بحر اگر ساکن بود امواج لاست

بے تموج بحر را شرح کجاست　　جوششے زد بحر و موج آمد پدید　　شد نمایاں آں قدیم اندر جدید
جوش و بحر و موج بیخوانیش نام　　ورنہ یک ہستی ست بیروں از کلام　　نیست مردانِ خدا را ہیچ بند
برتر ست از جسم و جان بیچون چند　　مُردگاں را خوف مردن در خور ست　　زندگاں را مرگ تن جاں پرور ست
زندہ را ممتنع باشد ممات　　مُردہ را خود روا نبود حیات　　این حیات و این ممات از شرک ہست
وحدت مطلق بود در خویش مست　　آنکہ او زندہ است حی و قائم است　　لایموت و لایزال و دائم ست
دائم است و قائم است و زندہ است　　لایزال و لم یزل پایندہ است　　زندگی بے نہایت بے زوال
برتر آمد از ہمگاپوے خیال　　خود تو بودی خود تو باشی تا دوام　　اے بروں از گفتگو ہا و کلام
تو دُرِ دریائے وحدت بودۂ　　ہم چناں کہ بودۂ آسودۂ　　جانِ تو خود جانِ جانِ زندگی ست
از تو خرم بوستانِ زندگی ست　　سالہا گردیدۂ در بحر و بر　　ہم تو خود مقصود بودی از سفر
سالہا ارشاد را بردی بکار　　ہم تو خود صیاد بودی خود شکار　　از برون در بگفتی ما و من
وز درون خود گوش بودی خود سخن　　از حقائق وز معارف وز یقیں　　نغز تر گفتی بوقت واپسیں

چیست توحید آنکہ از غیر خدا　　فرد آئی در خلاؤ و در ملا
بحر توحید الٰہی خود توئی　　بے تعین بے تشخص بے دوئی
مستی صہبائے تو چوں جوش زد　　گے شود شور من و تو گوش زد
بیخودی بزم خودی آراستہ است　　نعرہ ہا از خاموشی برخاستہ است

اے ندیم الشمس نجم الدیں بیا　　نعرۂ دیگر بزن لب برکشا　　نعرۂ دیگر بزن اے نجم دیں
ہاے وہوئے تست معنی آفریں　　دیدہ چوں بر دیدہ تو شیدا شود　　در درونِ بحر رہ پیدا شود
کاروانِ بحر در شیب ہائے تار　　برکفت بنہد زمام اختیار
باز بنشیں در خرابات سخن　　معنی اندر شیشۂ الفاظ کُن　　باز گو حرفے ز سلطان جلیل
تا نگردد قصۂ ہجراں طویل　　اے درخشاں کوکب نور قدیم　　از کجا جوئیم انفاس کریم
از کجا جوئیم آں شام و سحر　　چوں فتد در حضرت پاکت گذر　　از کجا جوئیم گلبانگ سرور
از کجا یابیم آں انس و حضور　　از کجا جوئیم قرب اختصاص　　اے در تو قبلہ گاہ عام و خاص
از کجا جوئیم آں خوش حال ہا　　کز دل پاکت بروں زد سالہا　　پر تو حالِ خوشت چوں سر زند

مرغ اندوه والم کے پر زند
حسرت و اندوه زاید از خیال
تاخت بیرون دل ز وجود و از عدم
پرتوِ حال تو پاک ست از علل
هست لاشرقی و لاغربی مدام
ذاتِ تو پاکست از حال و مقام
هر مقامے از تو می گیرد وجود
در میانِ گردشِ لیل و نهار
عارفِ بیباک و مردِ کاملے
زندهٔ جاوید و پاک از جسم و جاں
هم شناسا و شناسا گر توئی
لا و الّا هر دو پیشت چیست لا
گفتگو ها محو شد دریاست ایں
نیست جائے گفت و تشبیه و مثال
هم خیال و بے خیالی آنِ تست
هم خدائے بندگانی اے خدا
اے منزّه از یکے و از دوئی
با وجودت نیست چیزے معتبر
تا ز تو گویم به تو افسانه
بت تراشم گر ترا یاد آورم
من چه باشم تا نهم خود را وجود
کشورِ تن را فرو بگذاشتی
گفتگو را غیر ازیں آئیں نبود

پرتوِ حال خوشت چوں کوهسار
نے به بیشِ پرتوِ خورشیدِ حال
پرتوِ حال تو پاک از نیک و بد
استوار و پایدار و بے خلل
پرتوِ حال تو اے سلطانِ حال
شهپرِ عنقائے تو بشکست دام
نقدِ حال تست ذاتِ پاکِ تو
همچو تو کم دیده باشد روزگار
پاک و بیباک و مجرّد از علل
شه سوارِ عرصه هائے بے نشاں
بے نشانے را نشاں آمد ز تو
او و تو گم گشت باقی کیست لا
محو را هم محو کن اے چاره ساز
لیس شئی مثله کم کن خیال
اے بری از مرگ و هم از زندگی
بنده هستی یا خدا یا خود جدا
اے بری از حدّ و اعداد و شمار
عقل تیره گشت و خیره شد نظر
خویش را ثابت کنم تا خواندت
آذرم من گر ترا طاعت برم
دامن از گردِ حدوث افشانده
آئینه از بیش و کم برداشتی
گفتگو بر جاست تا گردیده فوت

هست در عرصاتِ جاں بر یک قرار
پرتوِ حال تو پاک از بیش و کم
بر زده نقشِ ازل را بر ابد
پرتوِ حال تو پاک از فهمِ عام
هست بالاتر ز پروازِ خیال
کشفِ هر حالے ز تو یابد گشود
ذاتِ پاک تست در ادراکِ تو
خضرِ ربانی و فردِ کاملے
شاهبازِ اوجِ افلاکِ ازل
بے نشانے را نشاں او نه توئی
بحر و کاں گوهر فشاں آید نه تو
هر چه میگوییم قولِ ماست ایں
هست فرق از بے نیازی تا نیاز
گر بگوییم ور نه گوییم شانِ تست
نے خدائی زیبدت نے بندگی
خود جدائی خود تو وصلے خود توئی
با وجودت نیست کس را اعتبار
هم چو کافر بایدم بت خانه
سر بنادانی و هم تا دانمت
کافرم من گر ترا آرم سجود
در جهانِ غیب مرکب رانده
گفتگو ها از پسِ آئینه بود
لیک بیرون از لباسِ حرف و صوت

پردۂ صورت ز رو انداختی   معنیٔ معنی نمایاں ساختی   جانِ جاں بودی و جانِ جاں شدی
ہرچہ بودی ہرچہ ہستی آں شدی   بر شکستی ساغر و مینائے ما   اے غنی الطبع بے پروائے ما
بزمِ انسِ بے دلاں برہم زدی   پشتِ پا بر ہستیٔ عالم زدی   بزمِ انس بے دلاں دادی بباد
اے ز رویت انجمن خالی بباد   اے ز تو خالی مبادا جائے تو   منظرِ حق۔ وئے جاں فزائے تو

اے دریغا کاروانِ شہرِ جاں   رخت بربست و بزد طبلِ گراں
اے دریغا روزگارِ وصل شد   جلوہ گرد و بہارِ وصل شد

اے امیر الشرق نجم الدیں بیا   نعرہ می زن شوری کن بے ندا   مشرقت جان و دلِ ویرانِ ماست
بے سر و سامانیت سامانِ ماست   نعرۂ تو دل بہ جنباند ہمی   شورِ تو جانہا بشوراند ہمی
ہمت والا بما ہمراہ کن   رو بسوئے بارگاہِ شاہ کن   شادِ ما پاکست از مرگ و ہلاک
گر فنا گردد دو عالم نیست باک   زندگی و مرگ نبود جز فریب   نیست کس را سود و سرمایہ نصیب
ہر کہ دارد مایۂ بے مایہ اوست   وآنکہ اندر فقر شد بے سایہ دست   ہر کہ جانداری کند بیجاں ترست
وآنکہ ساماں یافت بے ساماں ترست   سود و سرمایہ خیالے بیش نیست   مایۂ درویش جز درویش نیست
نقدِ درویشاں تہیدستی بود   دست مزدِ شاں ہمیں مستی بود   چیست گنجِ خوشدلی کیسہ تہی
اصلِ دانش ہا بود نا آگہی   ہستیٔ مطلق سراسر نیستی ست   اصلِ ہستی نیستی در نیستی ست
زندگی را ترکِ جاں بخشد وجود   خود تو لی اگر بیخودی گیرد نمود   بیخودی و باخودی ہم نارواست
بے نشانے حضرتِ سلطانِ ماست   حضرتِ سلطاں نگردد بیش و کم   نے مثالش نے وجودش نے عدم
حضرتِ سلطاں ندارد ماسوا   راست برجائے خود ست ایں ماجرا   حضرتِ سلطاں بسوئش بار نیست
سالکانش را سر و دستار نیست   حضرتِ سلطاں نمی گنجد بہ گفت   در سخن کس دُرِّ ایں معنی نسفت
من ندانم حضرتِ سلطاں کجاست   دل کجا و تن کجا و جاں کجاست   حضرتِ سلطاں ندارد بوئے غیر
ہست خود بر گرد خود در دور و سیر   حضرتِ سلطاں چہ باشد لب ببند   قاصر آمد تر دبانہا و کمند
ہوش را بفروش و حیرت دام کن   قطرۂ از بیخودی در جام کن   یا کہ گویم کن تو خود کن یا مکن
اعتبارِ قطرہ در دریا مکن   قطرہ گشتی و سوئے دریا شدی   راہ بیخودی و رہ پیما شدی
قطرگی گم گشت و دریا موج زد   وہم ہستی محو شد بر اوج زد   وہم را بشکن کہ برخیزد دوئی

تاتوئی گردی برانگیزد دوئی   از دو بینی ہست ایں مرگِ ہلاک   حضرتِ سلطانِ ما پاکست پاک
پاک را کے مرگ آید در خیال   زندہ را مردن بود امرِ محال
وصلِ او دائم بود با زندگی   ذات او را زندہ گویا زندگی
زندۂ را حلقۂ ماتم چراست   از پئے گنجِ مسرت غم چراست
زندۂ در زندگی بے پردہ شد   مردگاں را دل چرا آزردہ شد
زندہ را بزمِ طرب آراستند   مردگاں بہرِ عزا برخاستند
زندہ گرد از دامنِ جاں برفشاند   مردگاں را صبر و آرامش نماند
مردہ آں باشد کہ وہمش زندگیست   پیشِ وہمِ خویش اندر بندگیست
مردہ پندارد کہ ما خود زندہ ایم   زندگی را لائق وار زندہ ایم   زندہ آں باشد کہ مردن جانِ اوست
خانہ ویراں ساختن سامانِ اوست   زندہ آں باشد کہ از ہستی برست   ہست اندر نیست اندر نیست ہست
زندہ آں باشد کہ بالِ جاں کشاد   نیست گشت و محو گشت و نامراد   زندہ آں باشد کہ پیش از مرگ مرد
مردہ گشت و تن بہ بحرِ جاں سپرد   مرگِ او جانِ او و جانش زندہ شد   در جہانِ خوشدلی تا زندہ شد
او نہ وہم زندگی آگاہ نیست   مرگ را ہم سوئے فراتش راہ نیست
شمسِ ربانی توئی اے نجمِ دیں   برفرازِ منبرِ جاں برنشیں   ہاں بیا و نعرۂ دیگر بزن
خامشی تست سر جوشِ سخن   ہوش را بر درگہِ شہ کن نثار   ہائے و ہوئے برفگن دیوانہ وار
من کجا بودم تو خود بودی مدام   تہمتے بربافتی از ننگ و نام   طوقِ ما کردی ز نیکی و بدی
راہ بنمودی و راہ ما زدی   مردہ گشتم تا مرادادی حیات   گم شدم چوں یافتم راہِ نجات
از دمِ پر عشوہ ماو پر فریب   بے سبب کردی تو ما را ناشکیب   اتحادِ تو مرا بیگانہ ساخت
عقل و ہوشِ تو مرا دیوانہ ساخت   از نزولِ ذات تو پست آمدم   تو کشیدی جام و من مست آمدم
خوئے آزادِ تو در دامم کشید   تو شدی پنہاں مرا کردی پدید   از غنائے تو شدم من مستمند
علمِ تو ما را بہ نادانی فگند   وصلِ تو ما را بہ ہجراں در سپرد   حی و قایم تو شدی ما خورد و مرد
عدلِ تو ما را بظلم آگند و جہل   مشکلِ ما جملہ پیشِ تست سہل   تا تو گردی خندہ من گریاں شدم
تو شدی روپوش و من عریاں شدم   تو بیاسودی شدم من پائمال   من بہ ہجر افتادم و تو در وصال

من شدم سرگشتہ تو برجاستی   من شدم تنہا تو بزم آراستی   تو گرفتی جائے و من رفتم زجائے
سرکشیدی تو من افتادم زپائے   تو شدی گنجے و من ویرانہ ام   عقلِ کل ہستی تو من دیوانہ ام

تو خرامیدی و من رفتم ز دست   تو شدی بت آفریں من بت پرست
تو زمن گشتی و من گشتم ز تو   تو زمن بگذر کہ بگذشتم ز تو
گر نماند ایں من و تو در میاں   نے ترا سود است نے مارا زیاں
چوں تو خود ہستی نمیری زینہار   نیستم من پس کجا گیرم قرار
نجم دیں اے مطلعِ انوارِ جاں   نعرۂ دیگر بزن بے این و آں

خود مخاطب باش و خود مسکین خطاب   خود توئی اصل سوال و ہم جواب   خود بخود با خود بکن گفت و شنید
نعرۂ از قعرِ جاں باید کشید   رمزِ خود بیخوشتن آغاز کن   نعرہ ہائے بے سر و بن ساز کن
آنچہ ناید بر زباں گفتارِ تست   آنچہ مخفی ماند آں اظہارِ تست   من نگویم بلبل و پروانہ
ہاں برائے سوختن مردانہ   بے تبِ ہجران و بے ذوقِ وصال   خود بسوز و خود بساز و خود بنال
از خزاں و از بہاراں درگذر   و ز گدایاں قصہ پیش شہ ببر   اے شہِ والا کہ در رہ آمدی
خود گدا گشتی و خود شہ آمدی   در حریمِ خاص در سیرے شدی   خود یگانہ بودی و غیرے شدی
بازیٔ نیرنگِ خوش درباختے   اسپ و فرزیں پیل و بیذق تاختے   برگشادی پائے رفتارِ ہمہ
فرق پیدا گشت در کارِ ہمہ   لیک در معنی بغیرِ ذات نیست   اندریں بازی تراشہ مات نیست
ذاتِ تو پاکست کے گردد بدل   اے بری از رنج و آفاتِ خلل   ہر چہ داری نے کم آید نے فزوں
نے بہ پیشت فرق بیرون و دروں   نے بہ پیشت جسم و جانہا را وجود   نے مکان و نے زماں دارد نمود
نے بہ پیشت ظاہر و باطن دو چیز   نے بہ پیشت اندک و بسیار نیز   نے بہ پیشِ تو فنا و نے بقا
نے بہ پیشت ابتدا و انتہا   نے بہ پیشت آسمانہا و زمیں   نے شریعت نے حقیقت نے یقیں
نے بہ پیشت ناحہا و نے نشاں   نے بہ پیشت کفر و دیں نے این و آں   نے بہ پیشِ تو وجود ہست و عدم
نے بہ پیشِ تو حدوث و نے قدم   پیشِ تو تعلیل و توجیہات نیست   پیشِ تو امثال و تشبیہات نیست
نیستی ہم پیشِ تو گردید نیست   غرقۂ توحید جز توحید نیست   چیست توحید آنکہ از غیرِ خدا
فردوائی در خلا و در ملا”   خود تو گفتی خود تو بشنودی ز خویش   خود تو رفتی آمدی خود پیش پیش

من چہ گویم من چہ باشم من کیم
خود تو بودی خود تو ہستی من نیم
چوں تو بودی چوں تو خود ہستی بپا
من کجایم من کجایم من کجا
انچہ باشی باش من باشم نہ تو
خود بہ بین و خود بدان و خود بگو
خواہ پنہاں باش و خواہی آشکار
بیدلاں را با فضولی ہا چہ کار
من ندانم تو نہانی یا عیاں
نے بگنجے در یقیں نے در گماں
گر توئی از من نمی آید خبر
ور منم از تو نمی یابم اثر
بے من و تو کار بکشاید بگفت
رمزِ وحدت خود نمی آید بگفت
ایں عبارات و اشارات و خیال
گشتہ پیش سرّ وحدت پائمال
پس چہ باشد زندگانی چیست مرگ
ذاتِ تو قائم بود بے ہیچ برگ
ذاتِ تو لاریب پاکست و صمد
نے ازل گردِ تو گردد نے ابد
ہم ازل مستغرقِ تو ہم ابد
امر کردی قل ہو اللہ احد
قال را بگذار و حال خود بجو
کے بمیرد غرقہ دریائے ہو
حال و قال از تفرقہ ظاہر شود
کیست تا از اصلِ خود ماہر شود
جمع و تفریقے ہمی گردد عیاں
اصلِ ایں ہر دو نیاید در بیاں
آگہی از سرِّ مطلق کے بود
آنچہ در فہمِ تو آید شے بود
راست نبود ہر چہ گوئی زیں نمط
خط غلط انشا غلط املا غلط
از صحیح و از غلط ہم دور باش
ہر چہ خواہی گو بخود مسرور باش
نے غلط کردی نیا وردی صحیح
نے حَسَن پیداست اینجا نے قبیح
نے قبیح و نے حَسَن نے خوب و زشت
نیست کعبہ نیست دیر و نے کنشت
علم و عرفاں نیست گشت و فرق شد
زورق اندر بحرِ وحدت غرق شد
غرقہ را نہ بود مقام و منزلے
غیرِ دریا نیست او را حاصلے
بارگاہِ اوست بے جا و مقام
نے نشانے باشدش نے ہیچ نام
ہر کجا سر بر زند خود جائے اوست
بے سر و سامانیش ماوائے اوست
ہست آزادہ ندارد پائے بند
نے اسیرِ وقت و نے در جائے بند
ہم زمان و ہم مکاں خیزد ازو
احتبارِ جسم و جاں خیزد ازو
نامرادی ہم ازو مقصود ہم
عبد ازو پیدا شود معبود ہم
ہر چہ می خیزد نہ بیرونش بود
ہر چہ غیرست آں نہ مادونش بود
ہیچ گردد نے خود ست و نے خدا
اتحادے نے حلولے نے جدا
پاک از ناپاک و پاک از پاک ہم
اصلِ نور و اصلِ نار و خاک ہم

گفتہ و ناگفتہ یکساں پیش اوست
دیدہ شد نادیدہ چہ دشمن چہ دوست

ہست خود تنہا و ہم خود انجمن
گاہ نو میگردد و گاہے کہن

معنیش واحد عبارت تہا بسے
نیست نقصاں گر نمی فہمد کسے

از عبارت تا بمعنی فرق نیست
گر بدانی ظاہر و باطن یکیست

شد عبارت روئے معنی را حجاب
معنی آمد در عبارت آفتاب

ہم عبارت گشت معنی را شہود
در عدم معنی عبارت در وجود

در نسنجی ایں مثالِ ہیچ ہیچ
غیرِ معنی نیست خود موجود ہیچ

معنی آزاد خود پابست شد
نیست شد معنی عبارت ہست شد

آں عبارت نیست خود معنی ست آں
در نہاں معنی عبارت در عیاں

نیست معنی و عبارت جز مثال
جملہ وہم ست و گمان ست و خیال

از عبارت و ز معانی پاک شو
خاکِ مردانِ خدا را خاک شو

از بیان و گفتگو لب بستہ بہ
خامہ گر جنبش کند بشکستہ بہ

ذکر و فکر و فہم و ادراک و قیاس
ایں ہمہ بگذار و ویراں کن اساس

کار دارد سوختن نے ساختن
ہست کار ایں جا سپر انداختن

قطعۂ تاریخ

شد آں غوث علی سلطانِ ذیشاں
کہ مارا قبلۂ دنیا و دیں بود

مآبِ خلقِ عالم بارگاہش
تو گوئی آسمانے بر زمیں بود

شہِ فقر و فنا دریائے توحید
ورائے عرصۂ علم و یقیں بود

فریدے بے حجابے راست گوئے
بعرفان و حقیقت دوربیں بود

ز ہر گونہ کمالش بہرۂ خاص
نشانِ اوّلین و آخریں بود

دلش تفسیرِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ
کہ فارغ از غمِ دنیا و دیں بود

بہمت پیشرو فردِ جریدہ
بکنجِ خوش دلی عزلت گزیں بود

بہ توحید و توکل یکسوارہ — بترکِ دونِ حق خلوت نشیں بود
بہ ایثار و کرم ابرِ گہر بار — ظہورِ شانِ ربّ العالمین بود
سخن ہائے بلند و ارجمندش — مذاقِ اہلِ حق را انگبیں بود
کلامش ہر یکے صد بابِ حکمت — نکاتش طالباں را دلنشیں بود
براتِ قسمت خود ہر کسے یافت — جہانے خرمنش را خوشہ چیں بود
بجیب اندر محیطِ سرمدی داشت — رموزِ وحدتش در آستیں بود
خراباتِ حقیقت را قلندر — شریعت را امام المتقیں بود
ز آب و گل منزّہ ذاتِ پاکش — اگرچہ درمیانِ ماو طیں بود
کلیدے بود اسرارِ ازل را — نقودِ گنجِ غیبی را امیں بود
ہمش حق الحقیقت بود دیہیم — ہمش ملکِ صفا زیرِ نگیں بود
ندانم من چہ بود آں بحرِ مواج — نہ خود بود و نہ آں بود و نہ ایں بود
بروں از بود و نابود ست بودش — چرا گویم چناں بود و چنیں بود
بہ بحرِ غیب چوں کشتی فرو برد — خرد گفتا کہ خضرِ راہ ہمیں بود
۸۰ ۶ ۱۸

دیگر

شُد غوثِ علی شہِ زمانہ — سلطانِ حقیقت و طریقت
تاریخِ وصال گفت ہاتف — او بود شہنشہِ حقیقت
۹۷ ۵ ۱۲

باب ہفتم

بعض حالات بعد از وصال

(از مولانا گل حسن ؒ)

جس وقت جناب قبلۂ انام وکعبہ خاص و عام کا وصال ہو چکا تو اول اس خاکسارِ دل افگار کو تعمیلِ وصیت کی فکر ہوئی گیارہ بجے شب کے بہ ہمراہی چند صاحبوں کے اسی میدان میں پہونچا جس کا نشان حضرت نے بہ وقتِ وصیت دیا تھا بعد جستجو وہ جگہ پسند آئی جہاں کہ اب مزار مبارک بنا ہوا ہے راقم نے اُس زمین کی کیفیتِ ملکیت وغیرہ دریافت کی تو اہلِ پانی پت سے معلوم ہوا کہ یہ زمین لاوارث ہے بجز ذات پروردگار کے کوئی اُس کا والی وارث نہیں مگر ہاں شاملات طرف افغانان کہلاتی ہے کسی کا خاص دعوٰی اور کسی خاص شخص کا قبض و دخل نہیں ہے۔ علی الصباح اپنے چند پیر بھائیوں کو مع دیگر اشخاص کے زمین مجوزہ میں نے دکھائی سب صاحبوں نے اتفاق رائے کیا۔ اُس وقت راقم نے اپنے ہاتھ سے قبر کا نشان بنا دیا اور تیاری قبر شروع کرادی وہاں سے آن کر تجہیز و تکفین کا سامان کیا اور نمازِ صبح سے پہلے سب اشیاء ضروری خود جاکر بازار سے خرید لایا اور غسل کی تیاری کرادی یہ آدمی شریک غسل ہوئے یعنی مولوی راغب اللہ صاحب و قاضی عبدالحق صاحب و محمد اکبر صاحب و میاں جی عبدالحق صاحب و ابراہیم خاں پہلوان و چھوٹے خاں و جان محمد عرف جانا و مولوی عبدالصمد خاں ٹونکی و نصیب خاں جھاجھری اور راقم۔ خاص حجرہ شریف میں جس میں حضور قیام پذیر تھے دروازہ بند کر کے غسل دینا شروع کیا اور اثنائے غسل میں ایک شخص اجنبی مسافر سفید لباس سر پر عمامہ گندم گوں درمیانہ قد ریش گرد و مقطع سفید بال کم زیادہ سیاہ ہاتھ میں اگر بتی جس کو ہم میں سے کوئی نہیں جانتا تھا بے دھڑک دروازہ کھول حجرہ کے اندر آگیا اور

اگر بتّی کو روشن کر کے لوٹا لے کر غسل میں شریک ہو گیا جب ہم نے حال پوچھا تو کہا کہ میں پیران کلیر سے آتا ہوں ایک اگر بتی مخدوم علی احمد صاحب کے مزار پر روشن کی تھی اور ایک اگر بتی یہاں کے روشن کرنے کے واسطے لایا ہوں ہم نے سمجھا کہ کوئی مسافر ہوں گے خیر تا نماز جنازہ ہمارے شریکِ حال رہے اور جناب مولوی قاری حافظ محدث و مفسّر حضرت اُستاذی مولانا مولوی عبد الرحمٰن صاحب انصاری پانی پتی نے نماز جنازہ پڑھائی اُس کے بعد ہر چند اُس مسافر کو تلاش کیا کہیں اُس کا نشان نہ ملا معلوم نہیں کہاں سے آیا تھا اور کہاں چلا گیا ہزارہا آدمی ہندو مسلمان خاص شہر اور گرد و نواح کے رہنے والے جنازہ شریف کو اُٹھانے کے لیے جمع ہو گئے دو بار نماز پڑھی گئی مجاورانِ قلندر صاحب نے بہت شور و غل مچایا کہ ہم حضرت کو اپنی زمینِ مقبوضہ میں رکھیں گے۔ لیکن ان کا فتنہ و فساد پیش نہ گیا جو کچھ وصیت ہوئی تھی اُس کی تعمیل کی گئی جب قبر تیار ہو گئی تو شیخ بو علی بخش صاحب قریشی نے اس مجمعِ کثیر و جم غفیر میں کہ نائب تحصیلدار و تھانہ دار مع عمال و اہل کاران اور افسرانِ محکمہ بند و بست اور اکثر عمائد و رؤسائے پانی پت اور ہزاروں ہندو مسلمان جمع تھے یہ بات جملہ افغانان پانی پت سے کہی کہ گو یہ زمین لاوارث شاملات طرف افغانان ہے لیکن چونکہ تمھاری پٹی سے منسوب ہے۔ لہٰذا تم سب صاحبوں کی خدمت میں عرض ہے کہ یا تو اس زمین کی قیمت لے کر بیع نامہ تحریر کر دو یا اُس زمین کے عوض میں اور زمین لے لو یا بنامِ خدا وقف کر دو ایسا نہ ہو کہ بعد میں فتنہ و فساد برپا ہو۔ افغانوں نے کہا کہ ہم لوگ باہم مشورہ کر کے جواب دیتے ہیں۔ تمام افغانوں نے الگ بیٹھ کر مشورہ کیا اور حکیم موج خاں نے بطور سرگروہ کے سب کی طرف سے علی الاعلان یہ جواب دیا کہ سنو صاحبو ہم لوگوں نے یہ قطع زمین حضرت کے مزار شریف کے واسطے وقف کیا ہم کو اور ہماری اولاد کو کسی طرح کا دعویٰ نہیں ہوگا خدّام حضرت کو ہر طرح اس قطع زمین کا اختیار ہے اس جواب پر ہر طرف سے صدائے آفریں بلند ہوئی۔ بعدہ اول راقم قبر کے اندر سراہنے اُترا اور محمد اکبر صاحب مخدوم زادہ پائنتی اور کمر ٹیکا قاضی عبد الحق صاحب اور مولوی عبد الصمد خاں نے پکڑا اور وہ جسم لطیف و جسدِ شریف اس چٹیل میدان میں دفن کیا گیا اور حسبِ وصیت ایک گنگھر سراہنے اور ایک پائنتی میں

رکھ کر سب لوگ بادلِ پر درد و آہِ سرد واپس ہوئے اس کے بعد افغان اپنے قول سے منحرف ہو گئے اور لوگ بجائے تحسین کے نفرین کرنے لگے۔

احوال روزِ سوم

جب کہ تیسرا دن ہوا تو موافق رسم زمانہ ایک مجمع عام واسطے فاتحہ خوانی کے مجتمع ہوا حافظ سعد اکبر صاحب مخدوم زادہ پانی پتی نے اس راقم عاجز کی طرف اس طرح خطاب کیا کہ اس وقت تمام عمائد شہر اور تمھارے اکثر برادرانِ طریق موجود ہیں ان کی خواہش ہے کہ دستارِ خلافت تمھارے سر پر رکھیں کیونکہ جناب وقبلہ کی عنایت بے غایت تمھارے حال پر بہت تھی اور نیز ایام ضعف و علالت میں تمھارے ہاتھ پر چند آدمیوں کو خود حضرت نے بیعت کرایا پس سب کے نزدیک تم اس دستار کے مستحق ہو۔ میں نے بہ جواب اس بات کے عرض کیا کہ اول تو میں ایک آزاد سیاح خانماں برباد آج یہاں کل وہاں نہ رہنے کا بھروسہ نہ قیام کا ٹھکانا خلافت کے لیے ایسا شخص چاہیے جو جانشین و گوشہ گزیں رہے دوسرے یہ کہ اگر جناب قبلہ وکعبہ اپنے دست مبارک سے ایک پاپوش بھی میرے سر پر رکھ دیتے تو اس کو فخر دو عالم سمجھتا اور نہ غیروں کے ہاتھ سے تو تاجِ سلطنت بھی ہیچ ہے تیسرے یہ کہ نہ ہمارے قبلہ وکعبہ نے اس طرح کی دستار باندھی نہ میں باندھوں۔ اور جس طرح جناب وقبلہ کو اجازت و خلافت ملی تھی وہ مجھ کو خود عطا فرما چکے ہیں اور اب اس دستار کی کیا ضرورت ہے پھر حافظ سعد اکبر صاحب نے فرمایا کہ اچھا تم جس کو کہو اس کو دستار باندھی جائے کیونکہ ایک آدمی کا رہنا خانقاہِ مبارک پر ضروریات سے ہے میں نے کہا کہ یہ تین صاحب بزرگ موجود ہیں منشی فضل رسول صاحب حافظ محمد یوسف صاحب۔ صاحب زادہ علی حسن صاحب ان حضرات کو اختیار ہے خود باندھیں یا کسی کو بندھوائیں یہ جواب سن کر حافظ صاحب موصوف منشی فضل رسول صاحب کی طرف متوجہ ہوئے منشی صاحب نے جواب دیا کہ میں ایک دنیادار آدمی ہوں اور یہ دستار دستارِ فقر ہے نہ تو میں خود اختیار کر سکتا ہوں نہ کسی کو دے سکتا ہوں اس لیے کہ یہ کام مردانِ معنی یعنی اہل بصیرت کا ہے کہ جس کو قابلِ دستار سمجھیں اس کے سر پہ باندھیں اور اگر یہ دستار

چودھرات یا نمبرداری کی دستار ہے تو آپ لوگ مختار ہیں جس کے سر پر جی چاہے آج رکھ دیجیے کل اُتار لیجیے۔ حافظ صاحب نے جواب دیا کہ صاحب ہم لوگ تو آپ کو فقیر سمجھتے ہیں اور یہ دستار بھی دستارِ فقیری ہے کیوں کہ سجادہ نشینان حضرت قلندر صاحب و شاہ ولایت صاحب و مخدوم صاحب لائے ہیں۔ منشی صاحب نے کہا کہ آپ لوگ دنیا دار ہیں یا فقیر؟ کہا کہ ہم تو دنیا دار ہیں لیکن دستار از جانب فقرا ہے تب منشی صاحب نے فرمایا کہ اگر آپ مجھ کو فقیر تصور کرتے ہیں تو جائے تعجب ہے کہ فقیر دنیا داروں کے ہاتھ سے دستار باندھے۔ ہاں قلندر صاحب و حضرت شاہ ولایت صاحب یا جناب مخدوم صاحب اپنے دست مبارک سے ایک پُرانی جوتی ہمارے سر پر رکھ دیتے تو وہ ہزار دستار سے بہتر و برتر تھی اور اگر ان سجادہ نشین صاحبوں میں کوئی بزرگ صاحبِ بصیرت اور مردِ خدا ہیں تو بسم اللہ وہ خود لائق دستار کو چشم باطن سے منتخب کرلیں گے اور دوسری بات یہ ہے کہ دستار بندی ہمارے خاندان کا دستور نہیں۔ نہ تو ہمارے قبلہ و کعبہ نے کسی کی دستار باندھی ہے نہ ہم باندھیں جس کو اللہ تعالےٰ منظور و مقبول فرمائے گا اُس کو دستار خود عنایت ہو جائے گی بعد ازاں حافظ سعد اکبر صاحب حافظ محمد یوسف صاحب کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا کہ آپ کی کیا مرضی ہے؟ جواب دیا کہ مجھ کو حضرت نے چار دفعہ حیدر آباد جانے کی تاکید فرمائی لیکن مجھ سے بڑی خطا و نافرمانی ہوئی کہ حضور کے سامنے نہ چلا گیا اب عزم مصمم ہے کہ چار روز کے بعد حیدر آباد کو روانہ ہو جاؤں گا پس میں مجبور ہوں۔ البتہ صاحب زادہ علی حسن صاحب کو دستار باندھی جائے تو مناسب ہے۔ اس پر حاضرین مجمع نے کہا کہ صاحب زادہ صاحب کو اختیار ہے کہ مریدوں میں سے جس کو لائق سمجھیں اُس کے سر پر دستار باندھیں نہ یہ کہ مرید کی دستار خود صاحب زادہ باندھ لیں۔ یہ امر خلافِ طریقۂ قدما ہے۔

جب یہ بات طے ہو چکی تو دستار بندی موقوف رہی اور مجلس برخاست ہوئی۔

مولانا گل حسنؒ کے حالات سیاحی

(خود اُن کے قلم سے)

حال اس آوارہ گرد کا یہ ہے کہ جب میری عمر تیرہ برس کی ہوئی تو اُس وقت تک پڑھنے لکھنے کی طرف اصلا توجہ نہ تھی۔ لہو و لعب کے سوا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ سیر و شکار کے سوا کسی چیز کی رغبت نہ تھی۔ حضرت والد ماجد نے یہ کیفیت ملاحظہ فرما کر از راہِ شفقتِ پدری بہ غرض اصلاحِ حال و تحصیل و تکمیلِ علوم مروّجہ بہ خدمت جناب مولوی عبد الغنی صاحب مدرس اعلیٰ اور مولوی احمد حسن صاحب نائب مدرس مدرسۃ التعلیم المعلّمین راولپنڈی روانہ فرمایا۔ مدرسہ میں داخل ہو کر سال بھر تعلیم پائی۔ بفضلہ تعالیٰ امتحان سالانہ میں کامیاب ہوا۔ اور سند حاصل کر کے ملازمت سرکاری اختیار کی۔ دو سال اس شغل میں گذارے۔ پھر چند احباب نے سوات بُنیر کا عزم کیا۔ معلوم ہوا کہ بہ خدمت جناب قبلہ اخوند عبد الغفور صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہ ارادہ بیعت جاتے ہیں۔ میں بھی رخصت لے کر مسافروں کا ہم دم و ہم قدم ہوا۔ لیکن مجھ کو کچھ تمیز نہ تھی کہ اس کام کا مآل اور اس فعل کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اور پیری مریدی کیا چیز ہے۔ خر بہ رفت و خر برفت و خر کفت کا مضمون تھا۔ اُن کی دیکھا دیکھی میں نے بھی شرفِ بیعت حاصل کیا اور واپس آ کر پھر اُسی دھندے میں مصروف ہو گیا۔ جب سات برس نوکری میں گذر چکے اور عمر کا اکیسواں سال ہوا تو ایک روز خیال آیا کہ افسوس تو نے دنیا کا علم تو حاصل کیا مگر علومِ دینی سے بے بہرہ رہ گیا۔ اسی خیال میں استعفا داخل کر دیا۔ لیکن حاکم نے منظور نہ کیا۔ دوبارہ و سہ بارہ دیا تو یہ حکم آیا کہ اگر تم استعفا دو گے تو سزا ملے گی۔ طبیعت کا یہ حال اور حاکم کی یہ کیفیت نہایت حیران و پریشان ہوا کہ الٰہی اب کیا کروں۔ یہ نوکری تو وبالِ جان ہو گئی۔ دو تین دن کے غور و فکر کے بعد یہ بات دل میں ٹھانی کہ خیر جو ہو سو ہو چپ چاپ یہاں سے نکل چلو۔ ہم نے کوئی چوری نہیں کی ہے کہ خواہی نہ خواہی سرکار گرفتار کرے گی۔

یہ سوچ کر ایک رات جنگل کی راہ لی۔ بعد قطعِ منازل وطے مراحل حضرت سلطان باہو صاحب کی خانقاہ میں پہونچا جو ملتان سے تیس کوس بہ جانب شمال وغرب واقع ہے اور دل میں خیال گذرا کہ ان بزرگ سے اس معاملہ میں استصواب کروں گا۔ کہ اب کدھر کو جاؤں اور کہاں سے میرا مطلب حاصل ہوگا۔ کیونکہ یہ مزار اس باب میں مشہور تھا کہ جو شخص اپنے حلِ مطلب کا سوال کرتا ہے اُس کو کچھ اشارہ ہو جاتا ہے۔ بارہ دن اسی توقع میں رہا مگر کچھ سراغ حصولِ مدّعا کا نہ لگا۔ میرے دل میں نہایت پریشانی اور تردّد پیدا ہوا۔ ایک کامل مجذوب اس خانقاہ میں رہتے تھے۔ ایک روز مجھ کو ملول دیکھ کر بولے کہ گل حسن ادھر آؤ۔ مجھ کو نہایت تعجب ہوا کہ اس شخص نے میرا نام کیونکر جان لیا۔ میں اُن کے قریب گیا تو فرمایا کہ تم آزردہ مست ہو۔ کیوں کہ بادشاہ سلامت دہلی گئے ہیں اور وہاں کے اہلِ دفتر نے رخصت لی ہے جب وہ تشریف لائیں گے تو ہم تم کو رخصت کرا دیں گے۔ خاطر جمع رکھو۔ چلو تم کو باغ کی سیر کرا لائیں۔ یہ کہہ کر باغ میں گئے۔ ایک پھول گلاب کا توڑا اور میرے سر پر رکھ دیا۔ سیر کرتے کرتے عصر کا وقت ہو گیا۔ فرمایا کہ چلو نماز پڑھیں۔ ہم دونوں نے ایک کنوئیں پر وضو کیا اور مسجد میں جا کر میں جماعت میں شامل ہو گیا۔ وہ ایک طرف بیٹھ کر بڑبڑانے لگے۔ بعد نماز مجذوب تو چل دیے۔ میں خانقاہ کی مسجد میں بیٹھا رہا دوسرے دن مجذوب مجھ کو تلاش کرتے ہوئے آئے اور کہا کہ چلو بادشاہ سلامت آ گئے ہیں۔ تم کو رخصت کرا دوں۔ میرا ہاتھ پکڑ کر خانقاہ کے اندر لے گئے۔ جھک کر سلام کیا اور ہاتھ باندھ کر عرض کرنے لگے کہ بادشاہ سلامت یہ شخص بہت دنوں سے بیٹھا ہے اس کا گلا کاٹ دو۔ پھر بڑبڑانے لگے۔ ذرا دیر میں بولے کہ چلو تمھاری رخصت ہو گئی۔ میں چلا آیا۔ رات کو سویا تو خواب میں دیکھا کہ سلطان باہو صاحب فرماتے ہیں کہ تم ہندوستان کو جاؤ۔ وہاں تمھارے سب مقاصد حاصل ہوں گے۔ غرض پندرھواں دن تھا کہ میں وہاں سے رخصت ہوا اور براہِ ملتان وپاک پٹن وبنگلہ وفتح آباد وحصار ورہتک وبہادر گڈھ دہلی میں پہونچا۔ چار دن وہاں رہا مگر جی نہ لگا اور دل بہت گھبرایا۔ پانچویں روز دہلی سے بعزمِ لاہور روانہ ہوا۔ جب آثارِ عمارات پانی پت نظر پڑے تو دل نے تسکین پائی۔ اس خاکِ پاک کی آب وہوا نے میری افسردہ طبیعت میں گویا جان ڈال دی۔

شہر میں داخل ہوا تو خود بخود در و دیوار سے دل کشی و دل آویزی ٹپکتی تھی ؎

گفت از جاہا کدام خوش تر است　　گفت آں شہرے کہ دروے دلبر ست

رات کو قلندر صاحب کی خانقاہ میں ٹھہرا۔ دن نکلا تو شہر کی گلی کوچوں میں پھرتا رہا اور بھبوتوں والی مسجد میں قیام پسند کیا ؎

سار باناں بار بکشا ز اشتراں　　شہر تبریز است و کوئے دلبراں

پھر مولوی فتح محمد صاحب سے ملاقات ہوئی اُن سے میزان و منشعب کا سبق شروع کیا۔ چند روز کے بعد خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بزرگ سفید ریش نورانی چہرہ فرماتے ہیں کہ تم قلندر صاحب کی درگاہ میں جایا کرو۔ میں خاموش ہو رہا۔ آنکھ کھلی تو سوچا کہ یہ بھی ایک وہم و خیال ہے۔ دو تین دن کے بعد پھر وہی بزرگ خواب میں آئے اور فرمایا کہ تو گیا نہیں آج سے ضرور جایا کرو ورنہ تیرے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ آنکھ کھلی تو گمان گذرا کہ یہ وسوسہ ہے میں طالب علمی کرنے اور پڑھنے کے واسطے آیا ہوں نہ قلندر صاحب کی زیارت کے لیے۔ بہت سی لاحول پڑھی اور خواب کو دل سے محو کیا۔ دو تین دن کے بعد پھر وہی خواب دیکھا وہ بزرگ غصّہ کی راہ سے فرماتے ہیں کہ تو ہمارا کہنا نہیں مانتا۔ کیا تیری کم بختی آئی ہے؟ میں نے جواب دیا کہ صاحب میں پڑھنے کے واسطے آیا ہوں۔ مجھ کو قلندر صاحب سے کیا غرض۔ کہا کہ جو ہم کہتے ہیں وہ کر، ورنہ تیری گردن توڑ دیں گے۔ میں نے کہا کہ خیر بہت اچھا جایا کروں گا مگر اس شرط پر کہ قلندر صاحب قادری ہوں فرمایا کہ تم کو قادری چشتی سہروردی نقشبندی سے کیا مطلب جو ہم کہتے ہیں سو کرو۔ اتنے میں آنکھ کھل گئی۔ دل پر خوف طاری ہوا کہ الٰہی یہ کون شخص میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ قہر درویش بر جانِ درویش۔ عصر کے وقت قلندر صاحب کے مزار پر گیا اور فاتحہ پڑھ کر حوض کے گوشہ شرقی و شمالی پر جو چبوترہ سنگِ سرخ کا بنا ہوا ہے اُس پر آ بیٹھا اور حوض کی سیر دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد جناب قبلہ و کعبہ مرشدنا و مولانا سید محمد غوث علی شاہ صاحب مبارز خاں صاحب کی مسجد سے تشریف لائے اور میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ۔ میں نے جواب سلام عرض کیا۔ پھر استفسار فرمایا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو اور یہاں کیوں آئے ہو۔ چونکہ

طبیعت میں ایک وحشت تھی میں نے جواب دیا کہ آپ کیوں پوچھتے ہیں۔ آپ کو اس سے کیا۔ فرمایا کہ تمھاری صورت مسافرانہ معلوم ہوتی ہے اور ہم بھی نووارد ہیں چھ مہینے سے یہاں مقیم ہیں۔ قاعدہ ہے کہ مسافر کو دیکھ کر مسافر خوش ہوتا ہے اَلْجِنْسُ یَمِیْلُ اِلَی الْجِنْسِ ہمارا جی چاہتا ہے کہ تمھارا حال سنیں اپنا کہیں تاکہ غم غلط ہو۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت کیا میں ہی مسافر ہوں۔ اس شہر میں اور بہت سے مسافر ہوں گے کسی کو بلا لیجیے اور غم غلط کیجیے۔ میں باتیں کرنے کے لیے یہاں نہیں آیا ہوں۔ آپ ہنس کر بولے کہ اب تو ہماری تمھاری مورچہ بندی ہو گئی جب تک فیصلہ نہ ہوئے گا ہم تم کو چھوڑیں گے نہیں۔ چلو حجرہ میں بیٹھیں۔ اور خوب لڑیں۔ یہ فرما کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور حجرۂ شریف کی طرف لے چلے۔ وہاں بیٹھ کر گفتگو ہونے لگی۔ آخر آپ نے یہ شعر پڑھا ؎

رات تھوڑی حسرتیں دل میں بہت　　　صلح کیجیے بس لڑائی ہو چکی

میں اپنے دل میں بہت نادم ہوا کہ یہ مردِ بزرگ تو مہربانی سے پیش آتے ہیں اور تو وحشت اور سخت کلامی کرتا ہے اس میں تیرا کیا حرج و نقصان ہے اپنا حال سنا دے۔ یہ خیال کر کے میں نے اپنی تمام سرگذشت بیان کر دی۔ فرمایا کہ ہم سے ہر روز ایک دفعہ مل جایا کرو تو کچھ تمھارا حرج نہ ہوگا اور تمھارے دل پر گرمی ہے یہ درود شریف پڑھا کرو اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ سَابِقًا نُوْرُہٗ وَّاٰخِرًا ظُھُوْرُہٗ وَرَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ وُجُوْدُہٗ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ میں نے عرض کیا کہ بہت اچھا پھر میں نے اپنی گستاخی کا قصور معاف کرایا اور رخصت ہوا۔ اس روز سے یہ معمول ہو گیا کہ ہر روز دو بار حاضرِ خدمت ہوتا۔ روز بروز محبت زیادہ ہونے لگی اور کمالِ مہربانی سے قبل از بیعت ہی تعلیم فرمانا شروع کر دیا۔ اور حضور کی فیضانِ صحبت سے پیری و مریدی کا نتیجہ اور بیعت و ارادت کی حقیقت منکشف ہوئی کمترین نے بیعت کی درخواست کی اور بہت اصرار کیا تو فرمایا کہ ابھی وقت نہیں آیا چندے صبر کرو اور حزب البحر کی زکوٰۃ دو۔ بموجب ارشاد کے زکوٰۃ دی۔ فرمایا کہ اس کو ہمیشہ پڑھا کرو۔ پھر میں نے درخواست کی کہ حضرت کوئی ورد تعلیم فرمائیے ارشاد کیا کہ میاں تم تو اجاڑ گاؤں میں رہا کرو۔ میں نے اصرار کیا فرمایا کہ اچھا

آج رات کو قلندر صاحب کے مزار کے دروازہ پر بارہ بجے کے بعد پڑھنا کیونکہ دس گیارہ بجے تک تو ہمارے پاس آدمی ہوتے ہیں اُس وقت تمہاری خبر نہ ہو سکے گی۔ وہ ورد یہ ہے:۔
حَسْبِیْ رَبِّیْ جَلَّ اللہ مَافِیْ قَلْبِیْ غَیْرُ اللہ نُوْرُ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ حسب الارشاد رات کے بارہ بجے درِ مزار پر بیٹھ کر یہ ورد شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک بے ہوشی طاری ہوئی اس حالت میں ایک مارِ سیاہ نہایت دراز جس کے سر پر سیاہ بال بالشت بھر لمبے اور آنکھیں شمع کی طرح روشن میرے گرد تین چکر دے کر اور ران پر سر رکھ کر سو گیا لیکن مجھ کو اصلا خبر نہ ہوئی جب اُس کے سر کی گرمی ران کو پہونچی تو بیدار ہوا۔ چراغ روشن تھا اس اژدھے کی صورت دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔ تسبیح ہاتھ سے گر پڑی سکتہ کا سا عالم ہو گیا۔ اب کروں تو کیا کروں۔ تھوڑی دیر کے بعد خیال آیا کہ یہ تو بہر طور اُٹھے گا اور جو ہونا ہے وہ ہو کے رہے گا تو ہی اس کو بیدار کر۔ میں نے ران کو جنبش دی وہ گھبرا کر اُٹھا اور پھن اُٹھا کر میرے سر کے مقابل کھڑا ہو گیا اور بالشت بھر کی زبان نکالنے لگا۔ یہ کیفیت دیکھ کر حواس جاتے رہے آنکھیں بند ہو گئیں۔ گردن جھک گئی تھوڑی دیر بعد میں نے کن انکھیوں سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ بدستور کھڑا ہے اور بار بار زبان نکالتا ہے پھر میں نے دل کو مضبوط کیا اور سیدھا ہو کر اس سے کہا کہ میں از خود یہاں نہیں آ بیٹھا مجھ کو تو کسی نے بٹھایا ہے اگر تجھ کو کاٹنا منظور ہے تو کاٹ کھا ورنہ چلا جا۔ ناحق ستانے سے کیا فائدہ اتنا کہتے ہی وہ سانپ اپنے چکر کھول کر قلندر صاحب کے روضہ میں چلا گیا۔ حاجی سید فرید الدین مرحوم میرے قریب سوتے تھے آواز سن کر جاگ اُٹھے پوچھا کیا ہے میں نے ماجرا بیان کیا وہ لکڑی لے کر اُٹھے اور سانپ کو ڈھونڈا لیکن پتہ نہ ملا۔ میں پھر تسبیح سنبھال کر سیدھا ہو بیٹھا اور ورد شروع کیا۔ جب صبح کا وقت قریب آیا تو تسبیح رکھ کر دوپٹا باندھنے لگا پھر جو تسبیح اُٹھاتا ہوں تو ایک سانپ میرے ہاتھ کو لپٹ گیا۔ میں نے حاجی صاحب کو پکارا کہ دوڑیو مجھ کو سانپ نے کھا لیا۔ حاجی صاحب مرحوم لاٹھی لے کر دوڑے اور میں نے بہ مشکل تمام سانپ کے بل پہنچے اور باندھے کھولے اور ہاتھ جھٹک دیا سانپ گرا حاجی صاحب نے لکڑی ماری۔ وہ تڑپنے لگا جب غور سے

دیکھا تو وہ ہی تسبیح ہے اور اس ضرب سے کئی دانہ ٹوٹ گئے ہیں۔ حاجی صاحب بھی حیرت میں رہ گئے اور پوچھنے لگے کہ یہ کیا بھید ہے میں نے کہا کہ صاحب میں خود حیران ہوں پھر مسجد میں آیا نماز پڑھی کچھ دیر بعد حاضر خدمت مبارک ہوا تو دیکھا کہ جناب وقبلہ حجرہ کا دروازہ کھولے کواڑوں کو پکڑے ہوئے کھڑے ہیں۔ مجھ کو دیکھتے ہی یہ شعر ارشاد کیا ؎

بانبی پانی بھر گیو اور سر پر لاگی آگ باجن لاگی بانسری ونکسن لاگے ناگ

پھر فرمایا ارے میاں رات یہ کیا شور وغل تھا میں نے تمام کیفیت عرض کی فرمایا کہ ہاں تم نے بانسری بجائی تو سانپ بھی نکلا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت اگر یہی بانسری اور یہی سانپ ہیں تو ایک نہ ایک دن میری روح تحلیل ہو جائے گی آپ ہنسنے لگے پھر میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ کیا بات تھی فرمایا کہ یہ قلندر صاحب کے بہروپ ہیں میں نے عرض کیا کہ نہیں حضور مجھے تو یہ بہروپ زندہ قلندر صاحب کے معلوم ہوتے ہیں یہ بات سُن کر خاموش ہو گئے۔ ایک روز میں نے عرض کیا کہ حضرت کوئی عمل خضر علیہ السلام کی ملاقات کا بھی ہے فرمایا کہ ہاں بہت عمل ہیں لیکن ہم کو تو کوئی نہیں آتا۔ چند روز کے بعد مجھ کو ایک کتاب ضخیم عنایت فرمائی اور ارشاد کیا کہ اس کی سیر کرو اور دیکھو اس میں کیا لکھا ہے۔ میں نے مکان پر جا کر اس کا مطالعہ کیا تو ایک مقام پر یہ عمل نظر پڑا کہ اول دو رکعت نماز نفل پڑھے اور ہر رکعت میں بعد فاتحہ تین بار آیۃ الکرسی تین بار الم نشرح گیارہ دفعہ سورۂ اخلاص اور بعد سلام اس عزیمت کو سات بار پڑھ کر سینہ پر دم کرے اور بصورت محمّد قبلہ رخ شمال کو سر کر کے زمین پر سو رہے تو خضر علیہ السلام کی زیارت سے مشرف ہو تا سہ روز یہ عمل کرے یعنی شب چہارشنبہ۔ پنجشنبہ۔ وجمعہ۔ وہ عزیمت یہ ہے۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ حُبٌّ قُبٌّ كَهَابِيْقَ طَاءٍ طِبٌّ شَافِعٌ وَشَفِيْعٌ وَمُجْتَمِعٌ وَحِرْزٌ وَحَرِيْزٌ وَدِيْقٌ وَجَنَّةٌ بِحَقِّ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ میں نے اس ترکیب کے بموجب عمل کیا تو پہلی شب میں مشرف بہ زیارت خضر علیہ السلام ہوا اور جو کچھ دیکھا گیا بیان میں نہیں آسکتا۔ البتہ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت قلب مثل آئینہ ہو گیا تھا۔ صبح کو یہ کیفیت جناب قبلہ وکعبہ سے عرض کی تو فرمایا میاں دوڑ دوڑ

اُس کتاب کو لاؤ۔ میں جھٹ پٹ گیا اور لایا فرمایا کہ عمل ہم کو بھی نقل کر دو میں نے اپنے قلم سے دیوانِ نیاز پر نقل کر دیا تب ارشاد کیا کہ تم اجازت دو ہم بھی اس عمل کو کریں گے کیوں کہ تم اس کے عامل ہو گئے ہو میں نے عرض کیا کہ حضور آپ کی کتاب اور آپ ہی کا عمل ہے

دیدار می نمائی و پرہیز می کنی بازارِ خویش و آتش ما تیز می کنی

اس کے بعد میں نے بیعت کے لیے بہ اصرار التماس کیا تو فرمایا کہ قصیدہ بردہ حفظ کر لو۔ جب حفظ کر لیا تو اُس کی ترکیب ارشاد کی بہ موجب ارشاد کے رات کو پڑھ کر سو رہا خواب میں دیکھا کہ جناب رسول الثقلین صلے اللہ علیہ وسلم قلندر صاحب کی مسجد میں نماز عصر پڑھاتے ہیں۔ میں بھی وضو کر کے جماعت میں شریک ہو گیا بعد سلام قدم بوس ہوا۔ حضرت نے قرآن شریف کا آخری پارہ عنایت فرمایا۔ بیدار ہوا تو یہ کیفیت جناب و قبلہ سے عرض کی فرمایا کہ آج پھر پڑھو۔ پھر پڑھا رات کو خواب میں دیکھا کہ حضرت رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم مسجدِ مذکور میں نمازِ فجر پڑھاتے ہیں میں بھی وضو کر کے شامل ہوا اور بعد سلام آپ نے تمام قرآن مجید من اوّلہ الی آخرہ عنایت فرمایا۔ بعد بیداری یہ خواب بھی حضرت قبلہ سے عرض کیا حکم ہوا کہ آج پھر پڑھو۔ جب پڑھ کر سویا تو دیکھتا ہوں کہ جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فراق میں دریا و صحرا اور کوہ و بیابان طے کرتا ہوا ایک ریگستان میں پہونچا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا ہوں اور سطح ریگ پر پڑا تڑپتا ہوں کہ ناگاہ محبوب کبریا احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک جماعتِ کثیر کے ساتھ تشریف لائے اور میرے سر کو اُٹھا کر اپنے زانوے مبارک پر رکھا اور ردائے شریف سے گرد و غبار میرے چہرہ کا صاف کیا۔ میں ہوش میں آیا تو حضرت کے روئے منور پر نظر پڑی میں نے رو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ میری فریاد رسی فرمائیے اُس کے جواب میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بیٹا گھبرا مت۔ اللہ تعالےٰ اپنا فضل و کرم کرے گا اور تیرے سارے مقاصد حاصل ہو جائیں گے۔ خاطر جمع رکھ بے قراری مت کر ابھی وقت نہیں آیا۔ تھوڑے عرصہ میں منزلِ مقصود کو پہونچ جائے گا۔ اس کے بعد میری آنکھ کھلی تو اُس وقت ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی کہ عبارت میں نہیں آسکتی صبح کو یہ تمام حال جناب و قبلہ کی خدمت میں عرض کیا فرمایا کہ تم کو مبارک ہو

مبارک ہو میاں یہ حال تو ہم پر بھی نہیں گذرا تھا جو تم پر گذرا ۔ تو تم کو حج بھی نصیب ہوگا۔ اور مدینہ منورہ کی راہ میں تم انھیں آنکھوں سے حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھو گے اور یہ واردات خواب کی بیداری میں تم پر گذرے گی ۔لیکن تم پہچانو گے نہیں۔

ایک روز میں نے عرض کیا کہ حضرت توجہ کیا چیز ہے اور اُس میں کیا کیفیت گذرتی ہے اور اُس کا حاصل کیا ہے ارشاد ہوا کہ میاں کتابوں میں تو یوں لکھا ہے کہ مرشد طالب کو سامنے بٹھا کر اللہ کی ضرب اُس کے قلب پر لگاتا ہے ۔ اُس وقت ایک نور مرشد کے قلب سے نکل کر مرید کے سینہ میں جاتا ہے ۔ اور توجہ کی بہت سی قسمیں ہیں اُن میں سے ایک توجہ اتحادی ہے کہ پیر مرید کو اپنا جیسا بنا لیتا ہے یہاں تک کہ دونوں کی شکل صورت ایک ہو جاتی ہے ۔ کچھ تفاوت باقی نہیں رہتا ؎

اندریں یم ماہیانِ پر فن اند ۔۔۔۔ ماررا از سحر ماہی می کنند

اس توجہ کا اثر قیامت تک رہتا ہے کسی حال میں زائل نہیں ہوتا ۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت میں کتابی بات کا سوال نہیں کرتا بلکہ میری غرض حصولِ کیفیت ہے نہ بیان اُس کا ۔ فرمایا کہ ہاں یہ اور بات ہے اتنے میں کچھ اور گفتگو شروع ہو گئی وہ بات آئی گئی ہوئی ۔ کئی دن کے بعد رات کو میں سویا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک چار دیواری کے اندر کسی بزرگ کی قبر ہے جانب غرب تو جناب و قبلہ بیٹھے ہیں اور جانب شرق ایک مجذوب ہیں میانہ قد فربہ اندام سانولی رنگت کشادہ پیشانی گھنگرالے بال ریش گنجان کچھ سفید کچھ سیاہ اور دونوں حضرات مشغول مراقبہ ہیں ۔ میں نے جاکر سلام کیا جناب و قبلہ نے ارشاد کیا کہ حضرت کی خدمت میں جاؤ ۔ میں مجذوب صاحب کی طرف گیا ۔ اُنھوں نے فرمایا کہ نہیں مولانا صاحب پہلے آپ حضرت فرماتے ہیں کہ نہیں قبلہ پہلے آپ آخر مجذوب صاحب نے فرمایا کہ اچھا بیٹھو اور میرے قلب پر ہُو کی ضرب لگائی ۔ تمام آنکھوں میں ایک تجلی سی کوند گئی اور میں بے خود ہو گیا ۔ تھوڑی دیر میں ہوش آیا تو کہا جناب میری تسلی نہیں ہوئی فرمایا کہ اب مولانا صاحب کی خدمت میں جاؤ ۔ میں ادھر آیا تو جناب و قبلہ نے ایک نگاہ کی فوراً بے ہوش ہو کر تڑپنے لگا ۔ ہوش آیا تو وہی سوال کیا کہ حضرت میری تسلی نہیں ہوئی ۔ فرمایا کہ بس اب مر جائے گا ۔ عرض کیا کہ گو مر جاؤں

میری مراد یہی ہے۔ آپ نے دوبارہ القا فرمایا میں پھر بے ہوش ہوگیا۔ بڑی دیر بعد ہوش و حواس درست ہوئے تو درخواست کی کہ حضرت میری تشفی نہیں ہوئی فرمایا کہ اب تیرا قلب پھٹ جائے گا بس کر۔ اس کے بعد آنکھ کھلی تمام جسم عرق عرق ہے اور ہر بُن مو سے اسمِ ذات جاری ہے۔ قلب کی یہ حالت کہ سینہ سے باہر نکلا پڑتا ہے۔ جسم کو دیکھتا ہوں تو گویا آئینہ حلبی ہے۔ جدھر دیکھتا ہوں شرق سے غرب تک کوئی چیز حاجب نظر نہیں۔ تمام روے زمین من و عن پیشِ نگاہ ہے۔ یہ کیفیت مشاہدہ کرکے دل میں خیال آیا کہ تو عالم بیداری میں ہے یا خواب میں بار بار اپنی آنکھیں ملتا اور یہ شعرِ جامی پڑھتا تھا ؎

بہ بیداری ست یارب یا بخواب است کہ جانِ من بجاناں کامیاب است

دو ڈیڑھ گھنٹہ تک یہی حالت رہی اس کے بعد وہ بات جاتی رہی تو دل میں نہایت بے قراری و بے تابی پیدا ہوئی فجر کے وقت حاضرِ خدمت مبارک ہوا دیکھتے ہی آپ ہنسے اور فرمایا کہ تم تو کوئی بھاری ہی بات لائے ہوگے۔ چوں کہ ہم سے محبت زیادہ رکھتے ہو خواب میں بھی ہم کو دیکھتے ہوگے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھ کو تو اس سے کچھ مطلب نہیں کہ آپ تھے یا کون تھا لیکن ایک روز آپ نے یہ فرمایا تھا کہ کاملین کی توجہ کا اثر قیامت تک رہتا ہے کسی صورت سے نہیں جاتا سو مجھ کو تو دونوں صاحب کامل معلوم ہوتے تھے پھر کیا وجہ ہے کہ جو بات حاصل ہوئی تھی دو گھنٹہ میں سب زائل ہوگئی۔ فرمایا کہ تم سمجھے نہیں یہ روح کی توجہ روح پر تھی اور اس کے اثر کا دو ساعت تک جسم میں قائم رہنا بہت بڑی بات ہے۔ یہ ہر ایک کا کام نہیں ہے اگر ایسی توجہ جسم سے جسم پر ہوتی تو تمہارا جسم جل کر خاکستر بن جاتا۔ میں نے عرض کیا کہ حضور اب تو دونوں طرف جسم موجود ہے آپ مسکرا کر خاموش ہو رہے پھر میں نے پوچھا کہ حضرت وہ مجذوب کون تھے فرمایا کہ جو شکل و شباہت تم بیان کرتے ہو اس سے قلندر صاحب معلوم ہوتے ہیں۔ الحاصل اس چھ برس کے عرصہ میں جو واردات اور جو واقعات مجھ پر گذرے اگر مفصل تحریر کروں تو ایک دفترِ عظیم اور کتابِ ضخیم جداگانہ درکار ہو بقول شیخ ؎

گر ایں جملہ را سعدی انشا کند مگر دفترے دیگر املا کند

اب یہاں سے مختصر حال کچھ بیان کرتا ہوں تاکہ کتاب کو طوالت نہ ہو جائے اور ہمارے

احباب کو تکلیف نہ ہو۔ اس چھ سال کے عرصہ میں طالب علمی کی کیفیت یہ تھی کہ منطق میں ملا حسن۔ فقہ میں کنز۔ شرح وقایہ۔ ہدایہ۔ تفسیر جلالین۔ اور پانچ پارہ بیضاوی۔ اصول شاشی نور الانوار۔ مشکوٰۃ شریف۔ اور کچھ حصہ بخاری شریف کا یہ سب کتابیں طاقِ نسیان میں رکھ دیں۔ اس کے بعد میں نے پھر درخواست بیعت کی حکم ہوا کہ جاؤ پہلے مولوی حبیب اللہ شاہ صاحب رام پوری سے ملو وہاں پہونچا اُن کی عظمت و جلال سے لوگ تھراتے تھے۔ بڑی لڑائی بھڑائی کے بعد ملاقات ہوئی یہ قصہ بہت طول طویل ہے۔ آخر ان بزرگوار نے اپنا عذر تقصیر کیا بیس دن تک ان کی خدمت میں رہا۔ پھر واپس آیا اور ماجرا گذشتہ خدمت عالی میں عرض کیا۔ چند روز کے بعد حج بیت اللہ کا ارادہ ہوا۔ ایک دن کمر باندھ کر خدمت مبارک میں جا کھڑا ہوا۔ پوچھا کہ خیر ہے میں نے اپنا ارادہ ظاہر کیا فرمایا کہ مہینہ بھر تک اور توقف کرو اس روز تو زبردستی ٹھہرا۔ اگلے روز پھر وہی اُمنگ آئی اور کمر باندھ کر پھر طالبِ اجازت ہوا آپ نے خیال فرمایا یہ ٹھہرے گا نہیں۔ اُسی وقت یہ شعر زبان مبارک سے ارشاد کیا ؎

تو عزمِ سفر کردی و رفتی ز برِ ما ۔۔۔ بستی کمرِ خویش شکستی کمرِ ما

جاؤ رخصت اللہ حافظ۔ مگر یہ بات یاد رکھنا ؎

گفت حق اندر سفر ہر جا روی ۔۔۔ باید اوّل طالبِ مردے شوی

یہاں سے روانہ ہو کر بیت اللہ شریف کی زیارت سے مشرف ہوا جب بعد اتمام حج مدینہ منورہ کا قافلہ چلا تو میرے دل میں خیال آیا کہ مدینۃ الرسول کی زیارت کو سوار ہو کر جانا تو بے ادبی ہے۔ پیادہ پا جانا چاہیے۔ چنانچہ پیدل روانہ ہوا اثناء راہ میں ایک دنبل پاؤں میں نکلا تمام ٹانگ سوج گئی چلنا دوبھر ہو گیا درد کی شدت نے بے تاب کر دیا۔ ناچار ایک لق و دق ریگستان میں بے ہوش ہو کر گر پڑا ؎

تو دستگیر شو اے خضرِ پے خجستہ کہ من ۔۔۔ پیادہ می روم و ہمرہاں سوارانند

کچھ ہوش آیا تو خیال گذرا کہ بس اب تیری مدتِ حیات پوری ہو چکی۔ اس بیابانِ بے آب و دانہ میں زندگی معلوم۔ افسوس کہ حضرت رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے روضہ کی زیارت بھی

نصیب نہ ہوئی۔ اس حسرت واندوہ میں بے اختیار آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے میں اسی حال میں تھا کہ یکایک گوشۂ بیابان سے ایک غبار بلند ہوا اور ذرا دیر میں دامنِ گرد کو چاک کر کے ایک جماعت سوارانِ ترک کی نمودار ہوئی وردی پہنے ہتھیار لگائے عربی گھوڑے زیرِ ران۔ میں ان کی زرق و برق کو دیکھ کر حیرت میں تھا کہ وہ جماعت میری طرف متوجّہ ہوئی۔ سردارِ خیل نے میرے پاس آکر فرمایا کہ یا شیخ قم قافلہ راح میں نے جواب دیا یاسیدی انا مریض فی مرض شدید و داء کثیر یہ بات سن کر وہ گھوڑے سے اُتر پڑے اور میرے سر کو زانو پر رکھا۔ ایک رومال سے چہرہ کی گرد و غبار کو صاف کیا۔ اور فرمایا فاین مرضك میں نے دنبل کی طرف اشارہ کیا کہ شفت هذا انھوں نے میری ٹانگ پر ہاتھ پھیرا معًا درد موقوف ہوگیا۔ اس کے بعد بہت تسلّی و تشفّی کے الفاظ فرمائے اور ایک ناقہ سوار کو حکم دیا کہ تم اس کو قافلہ میں پہونچادو۔ اور فلاں شخص کو تاکید کردو کہ بہ آرام تمام مدینہ تک لے جائے۔ وہ ناقہ سوار صبا رفتار مجھ کو لے کر چلا۔ راہ میں بار بار کہتا کہ یا شیخ میرے لیے دعا کر۔ آخر کار قافلہ میں جا ملا اور ایک اونٹ پر سوار کرا کے معلوم نہیں کدھر گیا۔ اہل قافلہ نے نہایت خاطر و مدارات کی۔ میں سمجھا کہ یہ سامان و اسباب اُسی ترکی سردار کا ہے جس کے حکم سے میری خاطر داری ہوتی ہے۔ میرے خیال کو اس بات سے اور بھی تقویت ہوئی کہ جب قافلہ منزل پر مقیم ہوا تو ایک عمدہ خیمہ نصب کیا گیا اور سب سامان اپنے اپنے موقع پر لگادیا گیا۔ میں اُس خیمہ کے زیرِ سایہ منتظر رہا کہ شائد وہ سردار اب آئے گا۔ مگر کوئی نہ آیا اور وہ خیمہ یوں ہی خالی پڑا رہا اُس وقت مہتمم کاروبار سے میں نے کیفیتِ حال استفسار کی اُس نے کچھ نہ بتایا۔ ہر چند اصرار کیا کہا تم کو اس سے کیا مطلب۔ تیسرے روز قافلہ قریب مدینہ منورہ پہونچ گیا۔ اس نے شہر سے باہر مجھ کو اُتار دیا۔ اور پھر اُس کا پتہ نہ لگا کہ کہاں گیا۔ جب مدینہ منورہ طیبہ میں پہونچ لیا تو مجھ کو وہ خواب یاد آیا جو حضرت قبلہ کے روبرو بیان کیا تھا۔ کفِ افسوس مل کر رہ گیا کہ اب کیا ہوتا ہے۔ چالیس دن تک وہاں رہ کر واپس چلا آیا اور بمبئی پہونچ کر قیام کیا۔ دوسرے سال پھر حج کیا اور بیت اللہ شریف میں جناب مولانا ابراہیم رشید صاحب محدّث مصری سے ملاقات ہوئی۔

آپ نے خاندان خضریہ میں بیعت کر کے تمام مراتب و دقائق اس خاندان کے تعلیم فرمائے اور تعلیم کی اجازت دے کر رخصت فرمایا۔ وہاں سے مدینہ طیبہ کی زیارت کو گیا اور پھر بمبئی میں واپس آیا۔ وہاں سے روانہ ہو کر جزیرۂ سراندیپ یعنی لنکا کی خوب سیر کی اور پھر بمبئی میں آ گیا۔ اس سیر و سفر کے بعد چوتھے سال پانی پت میں پہونچا اور جناب قبلہ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوا اور مولوی فتح محمد صاحب کی معرفت درخواست بیعت کی چنانچہ وہ درخواست منظور ہوئی اور شب جمعہ کو خاندان قادریہ جدیہ کی تعلیم فرمائی دو برس تک حاضر آستانۂ عُلیا رہا تیسرے سال سفرِ کابل کا اتفاق ہوا۔ دو برس تک اس ملک کی سیر کی اور پھر پانی پت میں پہونچ کر دولتِ دیدارِ مبارک سے مشرف ہوا۔ اس کے بعد جناب قبلہ نے خاندانِ نقشبندیہ میں بیعت فرما کر مراتب و معمولات اس خاندان کے تعلیم فرمائے۔

ایک روز راقم حاضرِ خدمت تھا کہ میر نصیر الدین صاحب دہلوی منشی نجم الدین صاحب کے دوست دلی کا خط بحضورِ اقدس اس مضمون کا آیا کہ منشی نجم الدین کے فرزند کا انتقال ہوا۔ آپ نے خط کو پڑھ کر تین چار دفعہ فرمایا کہ منشی جی کے فرزند کا انتقال ہوا ہم کو بڑا رنج اور افسوس ہے۔ دوسرے روز پھر یہی ذکر فرمایا۔ تیسرے دن بھی یہی ارشاد ہوا۔ میں خاموش رہا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تمھاری ملاقات نہیں وہ تو اکثر آیا کرتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت میری ملاقات تو درکنار، روشناسی بھی نہیں۔ آپ خاموش ہو رہے۔ اگرچہ ڈپٹی نجم الدین صاحب سولہ برس سے جناب قبلہ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے مگر وہ آزاد، میں بے طمع۔ پھر اُنس ہو تو کیونکر ہو۔ ایک دوسرے کے نام سے بھی واقفیت نہ تھی تین مہینے کے بعد منشی صاحب حاضرِ خدمت ہوئے اُس وقت میں خط لکھ رہا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ میاں نجم الدین آ گئے ہیں جا کر ملو۔ میں نے عرض کیا کہ بہت اچھا خط لکھ کر جاتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں خط رکھ دو پہلے جا کر ملو۔ غرض تین بار ارشاد ہوا کہ ابھی جا کر ملو ناچار بہ تعمیل حکم اُن کے جائے قیام ہو گیا پہلے ہی سے میرے منتظر تھے اُس وقت ملاقات ہوئی۔ طرفین کے دلوں میں خودبخود ایک ایسا انس پیدا ہو گیا کہ جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ اور ہنوز وہی لطفِ اتحاد ہے محبت اخوان الصفا ہم در رفتے وچہ در رفقا۔ جناب قبلہ ان کی شان میں فرمایا کرتے تھے کہ نجم الدین سفید قلندر ہے۔

ایک روز کسی شخص نے شکایت کی کہ نجم الدین حضور کی خدمت میں کبھی عرضی نہیں بھیجتے۔ آپ نے فرمایا کہ ارے میاں وہ سفید قلندر رہے کبھی کبھی اُس کا یہاں آجانا ہی غنیمت سمجھو۔ اگر نہ آوے تو ہم اُس کا کیا کرلیں گے۔ غرض اُن کے حال پر حضرت ہمیشہ نہایت مہربان رہے۔ منشی نجم الدین صاحب کے سبب سے پھر میر نصیر الدین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ پھر مولوی **عبدالحکیم** صاحب میرٹھی سے محبت ہوگئی۔ ان کی شان میں حضرت فرمایا کرتے تھے کہ مولوی عبدالحکیم بڑے ظریف و صاحب ذوق و شوق ہیں۔ پھر مولوی محمد اسمٰعیل صاحب دوست ہم رنگ منشی نجم الدین صاحب سے الفت ہوئی جناب و قبلہ ان کے حق میں فرمایا کرتے تھے کہ اسمٰعیل فرشتہ ہے ہر وقت سکوت کے عالم میں رہتا ہے پھر قاضی فتح محمد صاحب دوست قلبی منشی نجم الدین صاحب سے اتحاد ہوا۔ جناب و قبلہ نے قاضی صاحب کو بہت تعویذ و عملیات ذکر و شغل عطا فرمائے تھے۔ غرض کہ حضور اقدس کی شفقت و عنایت و محبت ان صاحبوں کے حال پر بہ درجۂ غایت تھی۔ اسی واسطے مجھ کو بھی ان صاحبوں سے انس ہوگیا۔

اسی عرصہ میں راج گڈھ علاقہ بندیل کھنڈ کے نواب نے اپنے دو معتمد خاص خدمت عالی میں بھیجے اور درخواست کی کہ یا تو حضور قدم رنجہ فرمائیں یا مجھ کو اجازت حاضری دیں۔ کئی مہینے تک اہل کارانِ نواب اسی تمنا میں حاضرِ آستانہ رہے اور متواتر عرائض نواب صاحب کی طرف سے آئے لیکن آپ نے انکار فرمایا آخر اہل کارانِ نواب نے یہ استدعا کی کہ اپنے کسی خادم ہی کو روانہ فرمائیے۔ بعد بہت اصرار کے یہ بات منظور کی گئی اور راقم کو حکم ہوا کہ معتمدینِ نواب کے ہمراہ راج گڈھ جاؤ۔ ہم جلد تمہیں بلالیں گے۔ عرض کیا کہ بہ تعمیل حکم مستعد سفر ہوں لیکن میں تو کچھ جانتا نہیں۔ وہاں جاکر کیا کروں۔ اُس وقت ایک بات ارشاد کی۔ اور فرمایا کہ خدا پر بھروسہ رکھو کسی بات کا اندیشہ نہ کرو ؎

توچوں ساقی شوی دردِ تنگ ظرفی نمی ماند ... بہ قدرِ بحر باشد وسعتِ آغوشِ ساحل ہا

یہ کہہ کر رخصت کیا۔ راج گڈھ میں پہونچا نواب صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کو ایک ہولناک مرض لاحق تھا کہ جس سے کسی طرح نجات نہ تھی۔ طبیبوں سے عاملوں سے فقراء سے سب سے چارہ جوئی کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ اہلِ طمع بہت آئے اور کھا پی کر چل دیے

نواب سب سے بدعقیدہ اور مایوس ہو گیا لیکن اپنے پیر کا نہایت معتقد اور اُن کو بہت یاد کرتا تھا کیونکہ اُنھوں نے بارہا یہ کمال دکھایا تھا کہ بزرگانِ دین کی زیارت عالم بیداری میں کرادیتے تھے اور اُس پیر کے اس کمال کا شہرہ تمام راج گڈھ میں تھا اور اسی کمال کو دیکھ کر یہ نواب ہندو سے مسلمان ہوا تھا۔ مجھ سے بھی نواب صاحب نے اپنے پیر کی صفت وثنا بیان کی۔ میں وہی بات جو جناب وقبلہ نے ارشاد کی تھی عمل میں لایا اور نواب صاحب کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور جس کی زیارت کو نواب نے کہا وہی شکل وصورت اُس کی آنکھوں کے سامنے آگئی۔ یہ بات دیکھ کر وہ نہایت گرویدہ اور دنگ ہو گئے۔ لیکن میں نے سر دربار یہ بات کہہ دی کہ تم اس کو کمال سمجھتے ہو ہمارے نزدیک تو یہ ایک شعبدہ اور بھان متی کا سانگ ہے۔ بھلا بزرگوں کو کیا مطلب اور کیا غرض ہے کہ اس طرح جابجا دوڑتے پھریں۔ یہ تسخیر جنات کا عمل ہے جس بزرگ کی صورت چاہو نظر آسکتی ہے اس صاف اور بے لاگ تقریر کو سُن کر نواب بہت ہی متحیر ہوا اور بہت اصرار اور التجا سے مجھ کو ٹھہرانا چاہا مگر یہاں تو صرف تعمیل حکم جناب وقبلہ کی تھی کسی شاہ ونواب سے کیا مطلب تھا۔ میں نے ٹھہرنے سے انکار کیا اور چند روز میں کرامت نامۂ حضرت بطلب خادم صادر ہوا وہاں سے چل کر حاضر خدمت ہو گیا اور استدعائے نواب نسبت ازالۂ مرض گذارش کی کچھ دنوں تک آپ خاموش ہو رہتے تھے آخر ایک روز التماس قبول ہوا اور اسی کے مطابق چند روز میں خط آیا کہ نواب صاحب کو صحت کلی ہو گئی۔ جس دن سے کہ میں راج گڈھ سے واپس آیا جناب وقبلہ نے شام کا کھانا اپنے دسترخوان خاص پر مقرر فرمایا تا ہنگام وصال ہمیشہ اپنے ساتھ کھلاتے رہے۔ روز اول سے جس ناز ونیاز کے ساتھ دولتِ دیدار حضرت کی حاصل ہوئی تھی آخر تک وہی طریقہ جاری رہا۔ غالبًا مہینے میں ایک بار وہی صورت پیش آتی تھی میں خفا ہو کر چلا جاتا تو آپ نہایت شفقت ومحبت سے کسی خادم کو بھیج کر بلواتے اور فرماتے کہ میاں ہم بھی مسافر ہیں تم بھی مسافر ہو پس مسافروں کو لڑنا نہیں چاہیے صلح وسلوک سے رہنا مناسب ہے غرض کہ مجھ کو بغیر اس بامزہ جنگ اور پرلطف صلح کے چین نہیں پڑتا تھا۔ اب بجز آہ وزاری اور لطف یادگاری کے کچھ باقی نہ رہا۔ اب کس سے لڑیں اور کس سے صلح کریں۔ کس کی شفقت

ہمارے ناز بیجا اُٹھائے کون ہم سے لڑے اور کون منائے ؎

اے حسنؔ ساری خدائی دیکھ لی — صلح بھی دیکھی لڑائی دیکھ لی
حق نے جو صورت دکھائی دیکھ لی — وصل بھی دیکھا جدائی دیکھ لی

خاتمۃ الطبع از مؤلف

اے قلم پھر سنبھل دو چار قدم اور بھی چل کچھ اپنی سرگذشت کہہ کچھ ہمارا حال سن۔ وہ صحرائے لق و دق جو تیرا مولد و مسکن تھا اور وہ بہار و خزاں اور باد و باران جو تیری پرورش میں مصروف تھے اب کہاں ہیں۔ اس کتاب کے جذب محبت نے تجھ کو کہاں سے کہاں پہونچایا ہم وطنوں سے بچھڑا نیستاں سے اُجڑا بازار میں بکا قلم دان میں بند ہوا اور بالآخر اُس مونس دعم گسار تک پہونچا جس کے لیے تو پیدا ہوا تھا لیکن افسوس کہ تیری خوش قسمتی کے دن بہت کم تھے۔ وہ کتاب جس کی تحریر میں تو نے سال بھر تک جبہ فرسائی کی ہے آج اس کا آخر صفحہ بھی چھپ چکا اب وہ تجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوتی ہے عمر بھر اس کی ملاقات کو ترستا رہے گا اور ایام وصال کی یاد میں ہماری طرح رویا کرے گا۔ اے قلم آج ہمارا مشغلہ اور تیری سعی ختم ہوئی آرخصت ہو اور الوداعی معانقہ کر۔ یہ چند روزہ لطف ملاقات حُسنِ اتفاق سے تھا پھر ہم کہاں تو کہاں اور یہ کتاب کہاں۔ البتہ وہ نقش و نگار جو صفحۂ کتاب پر تجھ سے یادگار ہیں تیری جاں فشانی کو ہمیشہ یاد دلائیں گے۔ اے قلم نہ تجھ کو طاقت رفتار تھی نہ ہم کو تابِ گفتار۔ یہ مضمون و معنی کے نقش و نگار نہ تو نے ایجاد کیے نہ ہم نے بنائے بلکہ چشم بصیرت سے دیکھ کہ یہ سب قلمِ قدرت کی صناعی اور نقاشِ ازل کا کمال ہے نہ ہم کو اُس کی حمد کا یارا نہ تجھ کو اُس کے وصف کی مجال ہے ؎

دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر — ماہم چناں در اول وصفِ تو ماندہ ایم

المنۃ للہ کہ آج وہ کام پورا ہوا جس کا آغاز موہوم اور انجام نامعلوم تھا بار خدایا تیری توفیق رفیقِ حال نہ ہوتی تو یہ مضامین و الفاظ جو دل و دماغ کے اندر وجودِ مثالی بھی نہ رکھتے تھے آج

ایک کتاب کی صورت میں کس طرح جلوہ گر ہوتے ۔ خداوندا وہ داعیہ جو تو نے دل میں ڈالا اس شجر کا تخم نہ بنتا اور تیری تائید اس کی آبیاری نہ کرتی تو اس سوختۂ آفتابِ فراق کو سایہ میں دم لینا کب میسر ہوتا جب حضرت قبلہ وکعبہ کے اندوہِ فراق نے اس جانب طبیعت کو مائل کیا کہ ملفوظاتِ گرامی کی تحریر کا مشغلہ اختیار کر تو اس امرِ اہم کی مشکلات نے ڈرایا کہ نہ تو منشی ہے نہ مولوی نہ صوفی نہ مشائخ یہ کارِ سترگ تجھ سے کس طرح سرانجام ہوگا لیکن اَلْهِمَّۃُ اِسْمُ الْاَعْظَمْ کا خیال کر کے کمرِ ہمت کو چست باندھا اور قلم اٹھایا ۔

دریں دریائے بے پایاں دریں طوفان موج افزا دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰیہا

دوسرے روز ایک جزو کتاب کا لکھ کر منشی فضل رسول صاحب کو سنایا ۔ نہایت پسند کیا اور بہ اصرار تمام فرمایا کہ ضرور اس کو پورا کرو تمام برادرانِ طریقت پر تمہارا احسان ہوگا اور یہ کام تمہارے سوائے کوئی اور نہیں کر سکتا کیونکہ جناب وقبلہ کی خدمت میں عرصہ دراز تک شرفِ صحبت وغیرہ تربیت اس قدر کسی کو میسر نہیں ہوا ۔ غرض کہ ہمیشہ اس کام کی ترغیب و تاکید اور اس کے انجام دینے کی نسبت اصرار و تقاضائے شدید فرماتے رہے یہاں تک کہ ایک سال کے عرصہ میں کتاب تیار ہوگئی ۔ پھر جملہ احباب نے اس کی انطباع کی تمنا ظاہر کی مگر مجھ کو اتنی استطاعت کہاں تھی کہ چھپوا کر دوستوں کو نذر کرتا ۔ اگرچہ مجھ کو یہ صلاح بھی دی گئی کہ کتاب بعد طبع کے فروخت کی جائے یا قبل طبع پیر بھائیوں سے مصارف میں مدد لی جائے لیکن میری ہمت نے اس بات کو گوارا نہ کیا کیوں کہ اس کتاب سے نہ کوئی دینی غرض متعلق ہے نہ دنیوی منفعت ملحوظ ۔ میں نے خیال کیا کہ اگر اس کا چھپنا اور شائع ہونا منظورِ خدا ہے تو کوئی سبیل نکل ہی آئے گی ۔ مصرع

خدا خود میرِ سامان است اربابِ توکّل را

اور جو خدا ہی کو منظور نہیں تو ہماری سعی لاحاصل ہے ۔ ناچار اس کام کو اس وقت کے انتظار میں ملتوی کرنا پڑا جو تقدیرِ الٰہی میں اس کے لیے مقرر ہوا تھا ۔ جب مجھ کو کوئی مشغلہ باقی نہ رہا تو وحشت نے پھر سلسلہ جنبانی شروع کی وہی گرد و غبار اور دشت و بیابان یاد آنے لگے ۔ جن میں اکثر حصہ عمر کا بسر ہوا تھا ۔ بھلا یہ دل جس نے گھر کا رکھا نہ در کا بچپن ہی سے ملک ملک

کی خاک چھنوائی اور جنگل جنگل کی ہوا کھلائی منشی نجم الدین کے بالاخانہ پر کاہے کو چین لینے دیتا ایک دن علی الصباح اس دھن میں چل نکلا کہ اوچھ شریف پہونچ کر جہاں جناب وقبلہ کے آبا اکرام واجدادِ عظام نے اول قدم سرزمین ہند میں رکھا تھا سلسلۂ نسبی کی تحقیق کروں یہاں سے چل کر ملک پنجاب کے شمالی اضلاع کی راہ لی امرت سر۔ لاہور ہوتا ہوا شاہ پور تک پہونچا وہاں سنا کہ ایک درویش میاں شادی شاہ خوشاب کے جنگل میں رہتے ہیں میں نے زیارت کا عزم کیا اور اُن کی خدمت میں پہونچا فی الحقیقت نہایت بزرگ اور صاحب کمال فقیر تھے مگر کسی سے کلام و گفتگو نہیں فرماتے تھے کہ جذب بدرجہ غایت تھا۔ میں اُن کی خدمت میں پہونچ تو گیا اِلّا موسم گرما کی صعوبت اور بیابانِ ریگ کی شدائد نے ایسا درماندہ کردیا تھا کہ اب وہاں سے قدم اُٹھانا دشوار معلوم ہوا۔ میں نے میاں صاحب سے کہا کہ آپ اور کچھ گفتگو تو فرماتے نہیں اب سواری دلوائیے کہ میں چلا جاؤں آپ ہنسے اور چپ ہو رہے۔ اسی فکر میں تھا کہ آدھی رات کو ایک شتر سوار راہ بھول کر اس طرف آنکلا اور کہا کہ راستہ بھول گیا ہوں مجھ کو راہ بتاؤ میں نے کہا کہ خیر تو نے راہ گم کی اور ہم نے راہ پائی آ ہم کو بھی اپنے ساتھ لے۔ میاں صاحب سے میں نے کہا کہ واہ حضرت آپ نے تو خوب راہ زنی کی اس پر بھی آپ ہنسے اور چپ ہو رہے پھر میں نے سلام کیا اور اونٹ کرایہ کرکے اس کے ساتھ روانہ ہوا دریائے سندھ کے کنارے پہونچ کر کشتی میں سوار ہو گیا اثنا راہ میں ایک روز بادِ تند کا ایک طوفان آیا کہ جس نے بہت سی کشتیاں تہ و بالا کر توڑ دیں ہماری کشتی میں بہت سا مال و اسباب تھا دریا میں پھینک کر بہ مشکل تمام سلامت رہے ڈیرہ غازی خاں تک دریا میں سفر کیا پھر بہ راہِ خشکی ملتان و بھاول پور و احمد پور شرقیہ ہوتا ہوا چار مہینے کے عرصہ میں اوچھ شریف پہونچا اول حضرت مخدوم سید محمد غوث اوچی الجیلانی حلبی الرومی کے مزار شریف کی زیارت کو گیا۔ وہاں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ یکایک خواب نے غلبہ کیا آنکھ لگتے ہی مجھ کو اشارہ ہوا کہ بہت جلد میرٹھ جاؤ وہاں تمھارا انتظار ہے اور انطباعِ کتاب منشی نجم الدین کا حصہ ہے میں نے اُس روز وہاں قیام کیا اور اس خاندان شریف کے بزرگوں سے جو بالفعل وہاں موجود ہیں ملا اور جو امور تحقیق طلب تھے معلوم و محقق کرلیے۔ دوسرے روز عالمِ رویا میں پھر وہی اشارہ ہوا

جاول روز ہوا تھا نا چار تیسرے روز وہاں سے چل دیا اور بھاول پور میں مرزا اکبر بیگ صاحب کے پاس پہونچا وہاں منشی نجم الدین صاحب کا خط ملا اور جو اشارہ مجھ کو ہوا تھا اُس کی بالکل تصدیق ہوگئی چند روز میں میرٹھ آگیا اور طبع کتاب کا تہیہ ہو گیا ہمّتِ مرداں مددِ خدا بفضلہ تعالےٰ طبع کتاب کا کام بھی بخیر و خوبی اختتام کو پہونچا۔ جن احباب کو انطباع کی تمنا تھی اُن کے واسطے یہ ہدیہ موجود ہے سب کو سلام ہٰذا مقطع الکلام فقط۔

محررہ تاریخ ۱۴ شعبان المعظم ۱۳۰۱ھ ہجری مطابق ۹ جون ۱۸۸۴ء بروز دوشنبہ افتتاح برات۔

شہر شعبان دوشنبہ بود روز افتتاح
۱۳۰۱ھ

فرد متضمن تاریخ کتاب از مولف

بیار اے گلِ حسن اسنادِ تاریخ — حدیثِ مصطفےٰ الفقرُ فخری

تقریظ و تاریخ از مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی

خیز و یک دم بیا بروضۂ اُنس — وز نخیلِ رضا رطب برچیں
خوش بنہ پا بجادۂ تسلیم — باز بر صُفّۂ صفا بنشیں
اے بسا میوہائے عنبر بوئے — اے بسا ثمرہائے مشک آگیں
اے بسا نار وائے بسا نارنج — اے بسا خوشہائے چوں پرویں
کہ بیابی دریں نعیم مقیم — کہ بہ بینی دریں قرار مکیں
برفشان و بخور بگیر و بدہ — ہرچہ یابی ز علم و عین و یقیں
بسخا تشنگانِ بادیہ را — برسال بر غدیر ماءِ معین
دستِ واماندگاں گرفتہ ببر — بر فرازِ رواقِ علّیّین
بکنایت سخن دقیق شود — می تواں گفت سہل تر ہم ازیں
ہاں بیا و ببیں کتابِ حسن — کہ نمودست رازہائے دریں
مرحبا رازہا چو مہرِ منیر — حبذا نکتہا چو ماہِ مبیں

مژدہ اے طالباں کہ بہرِ شماست — ایں حصارِ بلند و حصنِ حصیں
تیر باراں کنند اگر خطرات — اینک اے سالکاں وثیر روئیں
واصلاں راست قلعۂ محکم — عارفاں راست بارۂ سنگیں
اہلِ حق راست عُروۂ وثقیٰ — اہلِ توفیق راست حبلِ متیں
ناقصاں راست کم ز سنگ و خزف — کاملاں راست بہ ز دُرِّ ثمیں
ہمہ گفتارِ شاہ غوث علی است — آں کہ از فقر داشت تاج و نگیں
از پسِ عُمرہا طلوع کند — آفتابے چناں بروے زمیں
کردہ بود ش خدائے عزّ و جل — قبلۂ عزّ و کعبۂ تمکیں
زدہ بودند سکّہ برنامش — در حدودِ ہدایت و تلقیں
دولتِ پائے بوسِ آں سلطاں — شدہ چندے نصیب ایں مسکیں
باز گردم بسوے وصفِ کتاب — کہ خزینہ ست از علومِ یقیں
رہروِ وادیِ حقیقت را — از تگاپو ہمی دہد تسکیں
در فضائے معانیِ پاکش — نورہا بینی از یسار و یمیں
گر بہ اسرار او رسی بکنی — نظرے بر جمالِ حور العین
سیدی گُل حسن گُل افشاندہ — گُلِ معنی نہ سوسن و نسریں
رنگ و بو دارد از حقیقتِ حق — تا نہ بینی بچشمِ ظاہر بیں
بزمِ اسرار و معرفت خوانم — بحقیقت نہ در حساب سنیں
کنزِ توحید و معرفت دانم — نہ بتاریخ بل نہ راہِ یقیں
نورِ چشمِ بصیرت ار گویم — مدح و توصیفِ شاعرانہ مبیں
نہ مرا گفتہ است مُلہمِ غیب — نہ خبر دادہ جبرئیلِ امیں

برزبانم برفت اے محمودؔ[1]
انچہ فرمودہ است نجم الدیں

---

[1] مولانا کے فرزند اکبر کا نام۔

قطعہ متضمن تقریظ و تاریخ از محمد محمود خلف الرشید مولوی محمد اسمٰعیل صاحب

دوش گوئی کہ در نشیمنِ قدس   خیلِ روحانیاں خرامان است
زدہ اند از نشاط انجمنے   طوبیٰ و سلسبیل و رضوان است
طوطیانند بال و پر از نور   سایہ و شاخسار و ریحان است
بلبلانند نغمہ شان تحمید   چمن و گلشن و خیابان است
قمریانند نعرہ شان تہلیل   سرو و شمشاد و طرفِ بستان است
آہوانند از سرشتِ صفا   سبزہ و جوئبار و میدان است
ماہیانند از خمیرِ ہدے   خضر ساقی و آبِ حیوان است
اخترانند از جلال و جمال   آسمان و زمیں زایقان است
ہمہ از رحمت اہتزازِ نسیم   ہمہ از فیض ابر و باران است
خُم ز تفرید و ساغر از تجرید   طُرفہ اجماعِ بادہ خواران است
نعرۂ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ   از دلِ ہر کہ ہست جوشان است
چوں فراتر شدم ہمی بینم   کہ فراواں تر از فراوان است
ہر کہ با من بدعوی آویزد   گویم آرے دلیل و برہان است
نہ زدم بر طریقِ استدلال   گر ترا نیز نقدِ ایمان است
ورقے زیں کتابِ پاک ببر   کہ ہمانا ز عالمِ جان است
بہوائے طوافِ مضمونش   مرغِ اندیشہ بال افشان است
ہر کہ بر فہم معنیش پے برد   دلش از وجد پائے کوبان است
فہم معنی کہ ہست فوزِ عظیم   نہ ز سعی ست بل ز وجدان است
بودیعت دریں جریدۂ راز   گوہر و لعل و دُرّ و مرجان است
دُرّ و مرجاں و لے نہ از دریا   لعل اما نہ از بدخشان است

دُرّ و مرجانش از لطائفِ غیب | لعلِ رخشاں ز سِرِّ اعیان است
دیدبانِ شواہد اکوال | ترجمانِ مظاہرِ شان است
بتعجب مبیں در اوصافش | کہ ز ملفوظ شاہِ شاہان است
آں کہ در پیشِ ہمتش لاشے | ہرچہ از اعتبارِ امکان است
آں کہ در ظلِ رایتِ فقرش | مامنِ رند و پارسایان است
آں کہ در اوجِ عظمت و شانش | سعیِ اندیشہ ہم ز نسیان است
آں کہ اندر فضائے مدحتِ او | رخشِ فکرت بہ ترکِ جولان است
طُورِ تحقیق را کلیم اللہ | کلکِ توحید را سلیمان است
خرد اندیشہ و زباں گوید | شرحِ اوصافِ او نہ چندان است
دو سہ بیتے دگر کنم انشا | گرچہ ایں کارہم نہ آسان است
یعنی در وصفِ جامعِ ملفوظ | کہ مرآں شاہ را ز خاصان است
راشد و مرشد است و آلِ رسولؐ | لمعۂ آفتابِ تابان است
آنچہ بعد از نبی بہ اُمّت ماند | آلِ پاکِ وے ست و قران است
قبلہ گاہش بظاہر و باطن | شاہِ مردان و شیرِ یزدان است
خرقۂ او حسینی الحسنی است | رقعۂ رحلۂ شہیدان است
ہم بحکمِ طریق و ہم بہ نسب | جدِّ والاش قطبِ گیلان است
اصلِ پاکش ز یثرب و بطحاست | مولدش خطۂ خراسان است
افتادست در دیارِ غریب | چند روزے بہ ہند مہمان است
ایں لآلی کہ در کتاب کشید | خوانِ یغما برائے اِخوان است
چند گویم بہ لہجۂ فارس | خاکِ میرٹھ نہ یزد و طہران است
گفت محمودؒ سالِ ختمِ کتاب | بحرِ توحید و نورِ عرفان است

۱۳۱ھ

؎ مولانا اسمٰعیلؒ کے فرزند اکبر کا نام۔

تاریخ ختم کتابت یکم نومبر نام کاتب محمد اشرف علی لکھنوی